بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوشِ اوّلین

آپ کو یاد ہوگا، اب سے تقریباً بیس سال پہلے "الحرم" میرٹھ سے نکلا۔ پانچ سال تک آسمانِ دینی صحافت پر جگمگایا، ہند و پاک و بنگلہ دیش کے دور دراز علاقوں تک اس کی روشنی کی کرنیں پہنچیں مگر پھر ناسازگار حالات کے بادلوں میں روپوش ہوگیا۔ مدیرِ الحرم بھی دوسرے علمی و تعلیمی کاموں میں لگ گیا مگر اس طویل وقفے میں برابر، دلدادگانِ الحرم اس کو یاد کرتے رہے۔ فرمائشی خطوط کا تانتا لگا رہا اور اس کو دوبارہ جاری کرنے کے تقاضے ہوتے رہے۔

گذشتہ چند سالوں میں مجھے علمی و دینی و تعلیمی اجتماعات کے سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں، بنگال، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ، گجرات، بمبئی، کشمیر اور اپنی نجی ضرورت سے پاکستان کے سفر کے مواقع ملے تو ہر جگہ الحرم کے یاد کرنے والے ملتے رہے۔ مجھے اس وقت "الحرم" کی گیرائی و پذیرائی، عوام و خواص میں اس کی مقبولیت اور اس کے حلقۂ اثر کی وسعت کا اندازہ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ الحرم کے ذریعہ دین کی خدمت کس قدر وسیع پیمانہ پر کی جاسکتی ہے۔ اب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی نظامت دینیات کی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہوچکا ہوں اور اگرچہ اب صبحِ زندگی کی شام ہو رہی ہے مگر یہ بھی سوچتا ہوں کہ شاید قبر کی شبِ تاریک میں یہی عمل میرے لئے سامانِ تابانی و درخشانی بن جائے اور میں اس فانی زندگی کی باقی ساعتوں کو اس مقدس کام میں صرف کرکے آخرت کا سروسامان کرسکوں۔

اس توقع پر اللہ کا نام لیکر، اپنی جسمانی کمزوری و ناتوانی اور علمی بے بضاعتی و بے سروسامانی کے باوجود، لرزتے ہوئے ہاتھ میں قلم اٹھاکر اس وادیٔ سنگلاخ میں ڈگمگاتے ہوئے قدم رکھ رہا ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

مولائے کریم! اس ضعیف و نحیف بندہ کو اپنی نصرت و حمایت کا سہارا دے، اس کے ناتواں جسم میں طاقت اور اس کے کمزور ارادوں میں قوت بخش، اور جس اہم خدمت کی ذمہ داری کو یہ قبول کر رہا ہے اس میں برکت عطا فرما۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

زین العابدین غفرلہٗ

پیغام

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم - دیوبند

حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب قاضی شہر میرٹھ وسابق پروفیسر دینیات جامعہ ملیہ دہلی ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں رسالہ "الحرم" عرصہ تک جاری رہا جو ایک علمی دینی اور اصلاحی پرچہ تھا جس سے ہزاروں ایمان والوں کو فکر وعمل کی قوۃ ملی۔ آج اوسکی تجدید کیجا رہی ہے اور وہ اپنی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ پھر اہل نظر کے سامنے آرہا ہے۔

الحرم کے لفظ میں خود ایک ذاتی عظمت اور کشش ہے یہ لقب اوّل بیت (کعبۂ مقدسہ) کا ہے جو اپنی عظمت اور کشش پر خود شاہد ہے۔ قرآن حکیم نے اوسے حَرَمًا آمِنًا کا لقب دیا اور اوسکی نسبت سے اہل حرم کی طرف لوگوں کے قلوب کی کشش کی شہادۃ دی جو دعاء ابراہیمی فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ میں ذکر فرمائی گئی ہے۔

"لکل من اسمہ نصیب" کے اصول پر جب مقام یا جگہ یا نوشتہ پر بھی الحرم کا لفظ آجائیگا تو ممکن نہیں کہ اس نام کی عظمت سے قلوب گرویدگی کے ساتھ اوسکی طرف متوجہ نہوں۔ اس لئے رسالہ "الحرم" بیت اللہ کا ہم نام ہونے کیوجہ سے اُمید ہے کہ انشاءاللہ دلوں کے لئے کشش اور گرویدگی کا موجب ثابت ہوگا۔ بالخصوص جبکہ قاضی صاحب ممدوح جو علاوہ عالم وفاضل ہونے کے ادیب بھی ہیں اور لغت ولسان کے سلسلے میں آپکی تصانیف قبول عام حاصل کر چکی ہیں اوسے اپنے فاضلانہ مقالات سے مزین فرماتے رہیں گے تو الحرم کی اسمی عظمت کے ساتھ اوسکی معنوی عظمت کو اور بھی چار چاند لگ جائینگے۔ اور الحرم کے ساتھ اہل الحرم کی طرف بھی قلوب کی کشش دوچند ہو جائے گی۔

اُمید ہے کہ رسالہ الحرم اپنی سابقہ حیثیت سے زیادہ بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کی فکری اور عملی قوتوں کو بیدار کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا۔ اور اہل علم وخیر کی بصیرتوں میں غیر مختتم اضافہ کا سامان مہیا کرتا رہیگا۔ میں ان الفاظ کے ساتھ اس اصلاحی پرچہ کے ذمہ داروں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ رسالہ یومًا فیومًا ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ آمین

(حضرت مولانا قاری) محمد طیب (صاحب) ۲ — ۲ — ۹۸

نعت شریف

صلی اللہ علیہ وسلم

از مولانا جوہر قاسمی

نام لیا اور درد ہوا کم
دیکھ لیا اور بھول گئے غم
صلی اللہ علیہ وسلم

عرش تک ان کو یاد رہے ہم
صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم

سب کی زبانیں تیغ و سناں کی
آپ کے لب پر اسلم، تسلّم
صلی اللہ علیہ وسلم

بول رسیلے بات نرالی
سر سے قدم تک رحمت عالم
صلی اللہ علیہ وسلم

کون ہمارا غم جھیلے گا ؟
غنچہ و گل بھی یوں اٹھے بہم
صلی اللہ علیہ وسلم

عظمت انساں خاک بسر تھی
آپ نے بخشا حسن دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم

حسن بھی یکتا، عشق بھی کامل
دیدہ و دل اسرار کا سنگم
صلی اللہ علیہ وسلم

بت بھی خدائی چھوڑ کے آئے
صل علیٰ انوار کا عالم
صلی اللہ علیہ وسلم

حشر میں ہو گی نفسی نفسی
لہرائے گا آپ کا پرچم
صلی اللہ علیہ وسلم

سجدے تھے تسکین دل و جاں
آنسو جیسے پھول پہ شبنم
صلی اللہ علیہ وسلم

ان کے نقش قدم سے جوہر
کتنی جبینیں نور مجسم
صلی اللہ علیہ وسلم

جواہر الحدیث

از مدیر

عدل

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۲۶)

(لوگو تم عدل اور انصاف اختیار کرو یہ بات پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے)

"عدل" کے معنی ہیں میانہ روی اختیار کرنا اور ہر معاملہ میں زیادتی اور کمی سے بچنا۔ عدل پر دنیا کا نظام قائم ہے۔ اس کا تعلق انسان کے عقیدہ، عمل، اخلاق اور معاملات سب ہی سے ہے اسلام نے عدل پر بہت زور دیا ہے، خصوصًا معاملات میں۔ البتہ "احسان" یعنی نیک سلوک کرنے کا درجہ عدل سے بلند ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ع ۱۳) اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے انصاف کرنے کا اور (اس سے آگے بڑھ کر) بھلا سلوک کرنے کا۔

"عدل" کے درجہ سے گرنا ظلم کہلائے گا اور اس سے اوپر جانا احسان کہلائے گا۔ مثلاً کسی نے تمہارے ساتھ ایک نیکی کی اور تم نے بھی اس کے ساتھ ایک ہی نیکی کی تو یہ عدل کہلائے گا اور اگر تم نے اس کے ساتھ دو نیکیاں کیں تو یہ "احسان" ہوگا۔ لیکن اگر تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی تو اسے ظلم کہا جائے گا۔

احسان کا طریقہ ذاتی معاملات میں پسندیدہ ہے مگر اس شخص کو جو دوسروں کے معاملات کا تصفیہ کرے، عدل و انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ حاکم اگر ایک فریق کے ساتھ احسان کرے گا تو دوسرے فریق کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اسلام نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اور اسے پرہیزگاری کی بات بتایا ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ع ۲) تم کو کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ ناانصافی کرو۔ تم ہر حال میں انصاف کرو، کیونکہ یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب بات ہے)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات عدل و انصاف کا بہترین نمونہ تھی۔ یہی وجہ تھی

یہودی بھی جو مسلمانوں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن تھے، آپ کے پاس اپنے مقدمات لیکر آتے تھے اور آپ کے فیصلہ پر مطمئن ہو کر واپس ہوتے تھے۔

اب چند حدیثیں سنئے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَةٌ لَا تُرَدُّ دَعْوَتُهُمُ الصَّائِمُ حِيْنَ يُفْطِرُ وَالْاِمَامُ الْعَادِلُ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ فَوْقَ الْغَمَامِ وَتُفْتَحُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَيَقُوْلُ الرَّبُّ وَعِزَّتِيْ لَاَنْصُرَنَّكَ وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ مَثَلًا (رواه الترمذی۔ مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخص ہیں کہ جن کی دعا (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے) واپس نہیں کی جاتی۔ روزہ دار کی جب وہ روزہ افطار کرتا ہے۔ انصاف کرنے والے حاکم کی اور اس شخص کی بددعا جس پر ظلم کیا گیا ہو۔ اس بددعا کو تو اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر لے جاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے قسم ہے میری عزت کی (اے مظلوم) میں تیری مدد ضرور کروں گا، خواہ وہ کچھ مدت بعد ہی ہو (دنیا ہی میں۔ ورنہ قیامت کے دن) ترمذی۔ مشکوٰۃ۔

سات شخص جو قیامت کے روز رحمت خداوندی کے سایہ میں ہوں گے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ اِمَامٌ عَادِلٌ وَّشَابٌّ نَشَاَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ اِلَيْهِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَاَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ۔ (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ۔ باب المساجد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات شخص ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس روز اپنے سایہ میں رکھے گا جس روز اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ انصاف کرنے والا حاکم اور وہ جوان جو اپنے پروردگار کی عبادت میں پلا بڑھا ہو اور وہ شخص جس کا دل مسجد سے نکل کر بھی مسجد سے اٹکا رہتا ہو یہاں تک کہ وہ مسجد میں واپس آجائے۔ اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کیلیے

اید دوسرے سے محبت کریں۔ اسی حالت میں ایک دوسرے سے ملیں اور اسی حالت میں ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ اور وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کا ذکر کرے اور اس کی دونوں آنکھیں بہ نکلیں۔ اور وہ شخص جسے کوئی عورت جو مرتبہ اور حسن والی ہو بلائے اور وہ یہ کہہ (کر اس کی خواہش کو ٹھکرا دے) کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ شخص جو کچھ صدقہ دے اور اسے دوسروں سے چھپائے یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو کہ دایاں ہاتھ کیا دے رہا ہے۔ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلٰثَةٌ ذُوْ سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ وَرَجُلٌ رَحِيْمٌ رَقِيْقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِيْ قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ وَعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُوْ عِيَالٍ (رواہ مسلم۔ التاج الجامع)

حضرت عیاض بن حمار (مجاشعیؓ) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ میں فرمایا کہ جنت والے تین ہیں، وہ صاحب اقتدار شخص جو انصاف کرنے والا ہو، احسان کرنے والا ہو اللہ نے اسے توفیق خیر دی ہو اور وہ شخص جو بڑا مہربان ہو اور نرم دل ہو، رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لئے۔ اور وہ شخص جو پاکدامن ہو اور سوال سے بہت بچنے والا ہو (حالانکہ) کنبہ والا ہو (اور ضرورتمند ہو) (مسلم۔ التاج الجامع ج ۵)

تشریح:۔ مذکورہ بالا تینوں حدیثوں میں حاکم عادل کو خدا کے نیک بندوں میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے دنیا میں امن و امان قائم ہوتا ہے اور خدا کے بندے اطمینان کے ساتھ دین اور دنیا کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ اگر حاکم انصاف نہ کرے تو دنیا میں فساد پھیل جائے۔ بد معاش نیک، اور کمزور لوگوں کی زندگی تلخ کر دیں۔ نہ عبادت گاہوں میں کوئی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکے اور نہ کوئی امن کے ساتھ اپنی معاشی ضرورتیں پوری کر سکے۔ اسی وجہ سے نظام اسلامی میں حاکم عادل کو خلیفۃ اللہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا نائب بنکر کارخانۂ عالم کے نظام کو قائم رکھتا ہے

عادل حاکم کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ مَعَ الْقَاضِيْ مَا لَمْ يَجُرْ فَإِذَا جَارَ تَخَلّٰى عَنْهُ وَلَزِمَهُ الشَّيْطَانُ (رواہ الترمذی ـــ مشکوٰۃ باب العمل والقضاء)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حاکم کے ساتھ رہتا ہے (اور اس کی مدد کرتا ہے) جب تک کہ وہ ظلم نہ کرے، لیکن جب وہ ظلم کرتا ہے تو اس سے جدا ہو جاتا ہے (اور اس کی مدد چھوڑ دیتا ہے) اور شیطان اسے تھام لیتا ہے (ترمذی۔ مشکوٰۃ)

عَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى الْقَاضِي الْعَدْلِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَتَمَنّٰى اَنَّهُ لَمْ يَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ فِي تَمْرَةٍ قَطُّ۔
(رواہ احمد ۔ مشکوٰۃ باب العمل والقضاء)

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عادل حاکم کے لئے بھی قیامت کے دن وہ وقت آئے گا جب وہ تمنا کرے گا کہ کاش اس نے دو شخصوں کے درمیان ایک پھل کے مقدمہ میں بھی کبھی فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ (مسند احمد۔ مشکوٰۃ)

تشریح:- اس حدیث میں عدالتی فرائض اور حکومتی ذمہ داریوں کی اہمیت اور نزاکت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ منصف حاکم بھی اس دن ڈر رہا ہوگا کہ کہیں اس سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائگی میں چوک نہ ہو گئی ہو، اور آرزو کرے گا کہ کاش اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا ہوتا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاَبْغَضَ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ وَاَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ جَائِرٌ۔ (رواہ الترمذی - التاج)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کا سب سے زیادہ محبوب اور اس سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والا منصف بادشاہ ہوگا۔ اور اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اور اس سے سب سے زیادہ دور بیٹھنے والا ظالم سردار ہوگا (ترمذی۔ التاج۔ الجامع)

تشریح:- منصف بادشاہ چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کے فرائض عمدگی کے ساتھ انجام دیتا ہے اس لئے وہ آخرت میں اس کا محبوب اور اس کی رحمت سے قریب ہوگا۔ اس کے برخلاف ظالم بادشاہ نے چونکہ دنیا میں اس فرض کی ادائگی میں کوتاہی کی اس لئے آخرت میں بھی وہ اس کی محبت سے محروم اور اس کی رحمت سے دور ہوگا۔

٭ ٭ ٭

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح

قاضی زین العابدین سجاد

ولادت ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں خاندان ولی اللّٰہی کے آخری چشم و چراغ، حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی کے دہلی سے مکہ معظمہ ہجرت فرمانے کے بعد گلستان ولی اللّٰہی کی بہاروں کو جن بزرگوں نے دیوبند اور سہارنپور کے چمنستانوں میں منتقل کیا ان میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے ۸۴ سال کی طویل عمر پائی۔ اسی لئے آپ کا سلسلۂ فیض بلا واسطہ حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے لیکر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تک جاری رہا اور علم و معرفت کی یہ شراب دو آتشہ عرب و عجم کے پیاسوں کو سیراب کرتی رہی آخری دور کے بزرگوں میں شاید ہی اس قدر فیض کسی سے پہنچا ہو۔

حضرت حاجی صاحب نسباً فاروقی تھے، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ محمد امین تھا قاضی القضاۃ کا منصب اسی خاندان میں تھا۔ اس لئے دینی اور دنیوی عظمتیں دونوں اس خاندان کو حاصل تھیں۔ تھانہ بھون کے ممتاز عالم حضرت شیخ محمد تھانوی، شاگرد حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلوی، آپ کے ہم جد تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کی صاحبزادی تھیں جو حضرت مولانا محمد قاسم کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ اپنی ننھیال نانوتہ میں دوشنبہ کے دن ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے، والد ماجد نے امداد حسین نام رکھا، مگر جب آپ بعد میں حضرت شاہ محمد اسحٰق رح کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے نام بدل کر امداد اللہ رکھا یا اور یہی نام مقبول خاص و عام ہوا

تعلیم و تربیت اگرچہ آپ کے تین بھائی اور ایک بہن اور تھیں۔ مگر والدہ ماجدہ کو آپ سے ہی سب سے زیادہ محبت تھی۔ ابھی آپ سات ہی سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ

اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انھوں نے مرتے وقت وصیت کی کہ اس بچہ کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بس وصیت کی تعمیل کی گئی اور آپ کا بچپن کھیل کود میں زیادہ گذرا۔ قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔

جب عمر سولہ سال کی ہوئی اور سن شعور کو پہنچے تو تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور اپنے عزیز دوست حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں فارسی کی درسیات اور عربی صرف و نحو کی کتب میں مختلف استادوں سے پڑھیں۔ پھر کچھ حصہ مشکوٰۃ شریف کا مولانا محمد قلندر جلال آبادی سے پڑھا۔ اور حصن حصین اور فقہ اکبر مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے پڑھیں۔ یہ دونوں بزرگوار حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے شاگرد تھے اور حضرت مفتی صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے۔ مثنوی مولانا روم آپ نے حضرت شیخ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی جو حضرت مفتی صاحب کے ایک واسطہ سے شاگرد تھے۔ مثنوی مولانا روم سے آپ کو اپنے درویشانہ مزاج کی وجہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی اور ساری عمر اس کا درس دیتے رہے (شمائم امدادیہ)

آپ کی تعلیم سے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ علم و معرفت کے لئے کھول دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشاہیر علماء نے آپ سے باطنی فیض حاصل کیا جو تعلیم کی روح ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حضرت حاجی صاحب عالم تھے؟ تو حضرت نانوتوی نے کیا خوب جواب دیا۔ "عالم کیا وہ تو عالم گر تھے"۔

بقول مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ "گو ظاہری علم شریعت میں علامۂ دوراں اور مشہور زمانہ مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامۂ عنبر شمامہ سے آراستہ اور نور عرفان و ایقان کے زیورات سے سراپا پیراستہ (تذکرۃ الرشید ج ۱)

بیعت و خلافت

آپ کے دہلی پہنچنے سے دو سال قبل، حضرت سید احمد شہید جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ مگر دہلی جو اس تحریک کا انتظامی مرکز تھا وہاں اس آگ کے شعلے سرد نہیں ہو گئے تھے۔ خاندان ولی اللہی کے سربراہ شاہ محمد اسحٰق نے جو تحریک جہاد کے دہلی میں منتظم تھے، اپنے رفقاء کو جمع کر کے تحریک کی نئی تنظیم کی۔ ایک نمائندہ اجتماع میں شاہ محمد اسحٰق کے داماد مولوی سید نصیر الدین نئے امیر لشکر منتخب ہوئے اور نئے جوش و خروش کے ساتھ مجاہدین کے سرحد پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ انھیں انتظامات کے سلسلہ میں مولوی نصیر الدین صاحب نے میرٹھ، امروہہ، رام پور اور اجمیر و ٹونک وغیرہ شہروں کا دورہ بھی کیا

پھر ڈیرہ غازی خاں میں، مزاریوں کے علاقہ میں پہنچکر جو اس زمانہ میں سکھوں سے برسرِ پیکار تھے شریک جنگ ہوئے اور کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ مگر سرداروں کی اپنے حریفوں سے مصالحت کر لینے کی وجہ سے یہ مہم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر مولوی صاحب نے شاہ شجاع والی کابل کے مقابلہ میں جو انگریزوں اور سکھوں کا دوست تھا۔ امیر دوست محمد خاں کی مدد کا فیصلہ کیا اور غزنی کے معرکہ میں شریک ہوئے۔ مگر یہاں بھی دوست محمد خاں کے ایک عزیز کے انگریزوں سے مل جانے کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی اور بہت سے مجاہدین قلعہ غزنی کی سرنگ اڑنے میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی صاحب ستھانہ پہنچے جو مجاہدین سرحد کا نیا مرکز تھا۔ اور تحریک کی تنظیم نو میں مصروف ہو گئے۔ مگر آپ کا وقت آچکا تھا یہیں آپ نے سنہ ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

حضرت حاجی صاحب جب دہلی پہنچے تو مولوی سید نصیر الدین صاحب تحریک جہاد کی تنظیم جدید میں مصروف تھے۔ حضرت حاجی صاحب کو ان سے عقیدت ہو گئی اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ پھر کچھ مدت ان کی خدمت میں حاضر رہ کر اجازت اور خرقہ حاصل کیا۔

مولوی نصیر الدین رح کی وفات کے بعد، آپ نے شیخ نور محمد جھنجھانویؒ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ بیعت تو چاروں سلسلوں میں ہوئی مگر تکمیل سلوک طریقہ چشتیہ صابریہ میں کی اس بیعت کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے۔ آپ حضور کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں مگر رعب نبوت سے قدم نہیں اٹھتا۔ یکایک آپ کے جد امجد حضرت شاہ بلاقی تشریف لائے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر خدمت اقدس میں پہنچا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا ہاتھ حضرت میانجی نور محمد کے ہاتھ میں دے دیا۔

حضرت جھنجھانوی براہ راست حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھے۔ جب حضرت سید صاحب نے جہاد کی تیاری کے سلسلہ میں مغربی یو۔پی کا دورہ کیا اور اپنے رفیقان خاص مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحئیؒ کے ساتھ سہارنپور پہنچے تو حضرت نور محمد جھنجھانوی کے پیر حضرت شاہ عبد الرحیم ولائتی خود بھی حضرت سید صاحب سے بیعت ہوئے اور اپنے مرید خاص حضرت جھنجھانوی کو بھی جھنجھانے سے بلا کر بیعت کرایا۔ ان ہی دونوں بزرگوں کا فیضان تھا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا جذبۂ جہاد آپ کی رگ و پے میں جاری و ساری ہو گیا۔

سفرِ حج — [illegible] میں آپ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو حجاز میں طلب فرمار ہے ہیں۔ تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا اور بغیر کسی تیاری کے روانہ ہوگئے۔ بعد میں آپ کے بھائیوں نے سفر کے مصارف بھجوائے۔ حج سے فراغت کے بعد آپ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہوکر دو سال قبل ہجرت فرماکر مکہ معظمہ میں مقیم ہوچکے تھے۔ حضرت شاہ صاحب سے آپ نے فیوض و برکات حاصل کئے اور خاندانِ ولی اللہی کے معمولات کی اجازت لی۔ پھر مدینہ منورہ پہنچکر روضۂ اقدس پر حاضری دی اور کچھ مدت وہاں قیام کیا اور انوار نبوت سے اپنے سینے کے آئینہ کو جلا دی۔ پھر واپسی میں مکہ معظمہ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ہندوستان میں خدمتِ دین وملت کے لئے خصوصی ہدایات حاصل کیں۔ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں آپ وطن لوٹے اور سلسلۂ فیض جاری کیا۔ ہندوستان کے ممتاز دینی علماء حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری، حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

جہادِ آزادی میں شرکت — اٹھارویں صدی کا نصف آخر ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا دورِ زوال تھا۔ اورنگ زیب کی عالمگیری کا دور ختم ہوچکا تھا اور اس کے نااہل جانشین شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کے مشغلوں میں مصروف تھے۔ عوام نے اسلام کی زندگی بخش تعلیم کو چھوڑ کر اوہام و خرافات کو مذہب کی جگہ دیدی تھی۔ شرفاء کو زندگی کی جد و جہد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شعر و شاعری، موسیقی اور رقص و سرود کو لازمۂ شرافت سمجھتے تھے۔ علماء نے کتاب و سنت کی بجائے فلسفہ و منطق اور بحث و مناظرہ کو ہی کمال سمجھ رکھا تھا۔ پیروں اور درویشوں نے اصلاحِ اعمال و اخلاق کی بجائے تعویذوں اور گنڈوں کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس افسوسناک صورت حالات کا تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم طاقتیں ہر طرف سر اٹھا رہی تھیں۔ جاٹ، سکھ اور مرہٹے سرِ بازار جب چاہتے لال قلعہ پر دھاوا بول دیتے۔ چالاک اور عیار انگریز تاجروں کی کمپنی بڑے فہم و تدبر کے ساتھ منڈیوں کو چھوڑ کر قلعوں پر قبضہ کرنے کے لئے قدم بہ قدم بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا

شاہ عالم اور اس کے جانشین شطرنج کے بادشاہ بن کر رہ گئے۔ حکومت پر قبضہ کے بعد اس کو دائمی بنانے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہندوستان کے لاٹ پادری آرچ بشپ HEBER نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک طویل سفر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو رپورٹ دی کہ ہندوستان میں ہمارا اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ پورے ملک کو عیسائی بنا لیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں مشن اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ عیسائی لٹریچر کی اشاعت اور مناظروں کا سلسلہ زور شور سے شروع کر دیا گیا۔ انہوں نے کھلم کھلا اپنے ساتھیوں کو کرسچین بننے کی ترغیب دینے لگے۔

چنانچہ جب حالات حد سے زیادہ ابتر ہو گئے اور عیسائی مذہب قبول کرانے کے لئے جبر کے طریقے اختیار کئے جانے لگے تو دلوں کا یہ لاوا پھوٹ پڑا اور ۱۸۵۷ء میں پہلے میرٹھ میں ہندوستانی فوجیوں نے اعلان آزادی کیا۔ پھر وہ دہلی پہنچے اور بہادر شاہ کو اپنا سردار بنا کر انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی جنگ آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ چنانچہ کانپور، لکھنؤ، مراد آباد، بجنور، سہارنپور وغیرہ میں ہندو مسلمان سربکف ہو کر انگریزوں کے مقابلہ میں میدانِ جنگ میں اتر آئے۔

ضلع سہارنپور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا وطن تھانہ بھون تحریک آزادی کا اہم مرکز تھا۔ یہاں کے رئیس قاضی عنایت علی صاحب کے بھائی قاضی عبد الرحیم صاحب کسی ضرورت سے سہارنپور گئے تھے۔ ان کے کسی دشمن نے کلکٹر ضلع کو مخبری کی کہ وہ جہاد کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آئے ہوئے ہیں۔ کلکٹر نے ان کو برسرِ عام پھانسی دیدی۔ یہ خبر تھانہ بھون پہنچی تو سارے قصبہ میں آگ لگ گئی۔ باشندگان قصبہ سربکف ہو کر میدان میں آ گئے۔ انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا گیا۔ حضرت حاجی صاحب کو امیر مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو سپہ سالار اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔ حضرت حافظ محمد ضامن تھانوی اور حضرت مولانا منیر نانوتوی میمنہ اور میسرہ کے افسر مقرر کئے گئے۔ ان بزرگوں کے اثرات سے آس پاس کے ہزارہا مجاہدین اس لشکر میں شریک ہو گئے۔ پہلے ایک انگریزی فوجی دستہ پر حملہ کیا گیا جو توپ خانہ لے کر سہارنپور سے شاملی جا رہا تھا۔ اس دستہ سے توپ خانہ چھین لیا گیا اور اسے بھگا دیا گیا۔ پھر شاملی کی طرف پیش قدمی کر کے اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ انگریزی فوج اور

پولس مغلوب ہوگئی. مگر حضرت حافظ محمد ضامن صاحب جو حضرت حاجی صاحب کے پیر بھائی تھے اس معرکہ میں شہید ہوگئے (علماء ہند کا شاندار ماضی) افسوس ہے کہ پنجابی ریاستوں کی مدد سے جلد ہی انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کرلیا. پھر ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی ان کا تسلط قائم ہوگیا اور ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ آزادی ناکام ہوئی.

ہجرت جب انگریزی نظم ونسق دوبارہ قائم ہوا تو مولانا رشید احمد تو گرفتار ہوئے مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بھی وارنٹ جاری ہوا مگر ہاتھ نہ آسکے اور حضرت حاجی صاحب چھپتے چھپاتے ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں ہجرت کے ارادہ سے ہندوستان سے نکل کر مکہ معظمہ پہونچ گئے اور بقیہ زندگی جوار حرم ہی میں گزار دی.

تھانہ بھون سے نکل کر حضرت حاجی صاحب نے تقریباً ڈیڑھ سال ضلع مظفر نگر، سہارنپور اور انبالہ کے دیہات میں چکر لگاتے گذارا. جہاں جاتے پولس تعاقب کرتی مگر اللہ تعالیٰ محافظ ونگہبان تھا. محض امداد غیبی سے حکام کے ہاتھوں سے نکل جاتے. مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ لکھا جاتا ہے.

حضرت حاجی صاحب ایک گاؤں میں وہاں کے زمیندار کے ہاں جو حضرت کا خادم تھا مقیم تھے یکایک رات کے وقت پولس فورس پہونچ گئی. پولس پہلے زنانہ مکان کی طرف بڑھی. زمیندار بھی اسکے ساتھ زنانہ مکان میں گئے. حضرت حاجی صاحب ایک چارپائی پر دراز مکان میں لیٹے ہوئے کھانس رہے تھے. پولس افسر نے ان کی طرف توجہ نہ کی، زمیندار نے جاتے ہوئے چلا کر نوکروں سے کہا اس بڈھے نے کھانس کھانس کر بلغم سے سارا مکان گندا کردیا ہے اسے یہاں سے نکالو اور اس کی چارپائی کھیت پر ڈال آؤ. چنانچہ پولس اندر کسی مسہری وغیرہ پر حضرت کو تلاش کرتی رہی اور ادھر باہر والوں نے حضرت حاجی صاحب کی چارپائی ایسی جگہ پہنچادی جہاں پولس نہ پہونچ سکی (شاندار ماضی)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہندوستان سے ہجرت فرماکر ۱۴ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے وہاں حضرت کے شب وروز، خدا کی یاد اور مخلوق خدا کی تربیت وارشاد میں صرف ہوتے. اسی کے ساتھ درس اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہتا. آپ کو مثنوی مولانا روم سے بڑا شغف تھا. اس کا درس بڑے ذوق وشوق کے ساتھ دیتے اور ایسے ایسے حقائق ومعارف بیان فرماتے کہ بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے. یہ سلسلہ انتہائی ضعف کے زمانہ میں بھی بڑی قوت کے ساتھ جاری رہتا بلکہ اسی سے بدن میں ایسی قوت آجاتی کہ تکیہ ہٹا کر سیدھے بیٹھ جاتے اور اسرار ومعارف کا دریا جاری ہوجاتا.

ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے ایک بڑے شیخ مولانا اسعد آفندی، جو مولانا روم کے خاندان سے بزرگ اور مثنوی شریف کے بڑے عالم تھے، ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت آپ مثنوی شریف پڑھا رہے تھے۔ ایک خادم مولوی نیاز احمد حیدرآبادی نے عرض کیا کہ اگر شیخ اسعد اردو سمجھتے تو بہت محظوظ ہوتے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا حظ و لطف حاصل کرنے کے لئے زبان جاننا ضروری نہیں۔ پھر مثنوی شریف کے چند اشعار ایک خاص انداز سے ایسے پر تاثیر لہجہ میں پڑھے کہ شیخ روم وجد کرنے لگے، جب اپنے ہوش میں آئے تو حضرت سے کچھ اشغال کی اجازت لی اور اپنی قبا اتار کر حضرت سے عرض کیا کہ اسے پہن کر مجھے بطور تبرک عطا فرما دیجئے (کمالات امدادیہ)

حضرت حاجی صاحب اگرچہ باقاعدہ عالم نہ تھے جیسا کہ بیان ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ نورِ بصیرت عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے علما الجھے ہوئے مسائل آپ کے سامنے پیش کر کے آپ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

ایک مرتبہ دو فریق بحث کر رہے تھے، ایک فریق کہہ رہا تھا کہ نماز بغیر حضور قلب کے درست نہیں ہوتی۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُورِ الْقَلْب (نماز حضور قلب کے بغیر نہیں ہوتی)، دوسرا فریق کہتا تھا کہ نہیں، بلکہ ہو جاتی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اِنِّی اُجَهِّزُ الْجَیْشَ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃ (میں لشکر کا سامان کرتا ہوں جبکہ میں نماز میں ہوتا ہوں) آخر حضرت حاجی صاحب سے فیصلہ چاہا گیا۔ آپ نے فرمایا، ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ مقربوں کی جب بادشاہ کی حضوری ہوتی ہے اور لاحقہ (پیش آمدہ) عرض کرتے ہیں اور استمزاج (طلب رائے) چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کوشش کرتے ہیں۔ پس یہ عین حضوری ہے نہ منافی حضوری —
مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا نمازی حالت میں مجاہدین کے لشکر کے انتظام کی فکر کرنا دراصل جہاد کے معاملات میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہوتا تھا کہ نمازی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ سے معروف راز و نیاز ہوتا ہے۔ لہذا اسے اللہ تعالیٰ سے غفلت نہیں بلکہ اس سے تعلق اور مشغولیت کہا جائے گا۔

حضرت حاجی صاحب کی زندگی مکہ معظمہ میں گوشہ نشینی اور توکل کی تھی۔ درس و ارشاد کے اوقات کے علاوہ، گوشۂ خلوت کو پسند فرماتے تھے۔ البتہ جو لوگ اللہ کا نام سیکھنے کے لئے آتے ان سے بڑی محبت سے پیش آتے، اگر مریدوں سے فرما دیتے "بھائی میرے پاس کچھ نہیں، ہاں خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم لوگوں کے وسیلہ سے میری بھی نجات ہو جائے گی۔

امراء اور ارباب حکومت سے ملنے سے خاص طور پر پرہیز کرتے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی بانیٔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، آپ کے پرانے دوست تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد یہ بھی ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے آئے تھے۔ سلطان عبدالعزیز خلیفۂ ترکی کو مولانا سے بڑی عقیدت ہوگئی تھی، کیونکہ پادری فنڈر جب ۱۸۵۳ء میں آگرہ کے مناظرہ میں مولانا سے شکست کھاکر ہندوستان سے فرار ہوا تو پھرتا پھرتا قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا اور وہاں کے علمائے اسلام کو اس نے چیلنج دیا تھا۔ سلطان نے شریف مکہ کو جو ان کا ماتحت تھا لکھا کہ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں کوئی بڑا عالم ہو جو پادری سے مناظرہ کرسکے تو اسے بھیج دو۔ شریف مکہ نے مولانا سے درخواست کی اور آپ قسطنطنیہ تشریف لے گئے۔ پادری کو جیسے ہی مولانا رحمت اللہ کی تشریف آوری کی خبر لگی سر پر پاؤں رکھ کر قسطنطنیہ سے فرار ہوگیا۔ اس واقعہ سے سلطان روم مولانا کا بڑا گرویدہ ہوگیا تھا

بہرحال مولانا رحمت اللہ جب ترکی سے حجاز واپس ہوئے تو حضرت حاجی صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں سلطان کی دینداری کا ذکر کرکے فرمایا، اگر آپ اجازت دیں تو سلطان المعظم سے آپ کا تذکرہ کردوں۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا۔ اس کا فائدہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ سلطان میرے معتقد ہوجائیں گے۔ پھر سلطان کے معتقد ہوجانے سے آپ کو ہی کیا فائدہ ہوا، یہی تو ہوا کہ بیت اللہ شریف سے دوری ہوگئی۔ ہاں چونکہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ سلطان بڑے عادل ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس لئے آپ ان سے میرے لئے دعا کرادیجئے، مگر بادشاہ سے کسی فقیر کے واسطے دعا کے لئے کہنا بھی آداب سلطنت کے خلاف ہے۔ اس لئے میں آپ کو اس کا بھی طریقہ بتلائے دیتا ہوں۔ آپ ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچادیں، وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور فرمائیں گے۔ بس میرے لئے دعا ہوجائے گی۔

آپ کے اس تقوی، پرہیزگاری اور دنیا سے بے نیازی کی وجہ سے حجاز شریف میں مقیم مختلف سلسلوں کے مشائخ اور دور دراز ملکوں کے علماء سب آپ سے معتقد ہوگئے تھے اور سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر باطنی فیوض اور روحانی برکات سے مستفید ہوتے تھے۔

مسلک میں اعتدال

حضرت حاجی صاحب کے مسلک میں بڑا اعتدال اور توسع تھا۔ فروعی اختلافات کو جن کا اس زمانہ میں بھی ہندوستان میں خاصا زور تھا اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ ان اختلافات کو ختم کرنے، اور کم از کم مجادلات اور نزاعات کو دور کرنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے۔

آپ رسالہ وحدت مسلک میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ امر مسلمات سے ہے کہ باہمی اتفاق باعث برکات دینی و دنیوی اور نا اتفاقی موجب مضرت دینی و دنیوی ہے۔ اور آجکل بعض مسائل نزاعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہوا ہے جس سے خواص کا وقت اور عوام کا دین ضائع ہو رہا ہے حالانکہ اکثر امور میں محض نزاع لفظی ہے اور مقصود متحد۔"

اس کا نتیجہ تھا کہ دیوبندی اور غیر دیوبندی دونوں مسلکوں کے اکابر آپ سے ارادت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا احمد حسن کانپوری، حضرت مولانا محمد حسین الہ آبادی اور حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی بھی آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل تھے۔ تاہم آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے ان کی جلالت علمی اور عظیم خدمات دینی کی وجہ سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب کے آخر میں لکھا ہے :۔

"ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت دارد مولوی رشید احمد و مولوی محمد قاسم را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے فقیر بلکہ بمدارج فوق از من شمارند۔"

دارالعلوم دیوبند چونکہ ان دونوں بزرگوں کی علمی و دینی سرگرمیوں کا مرکز تھا اس کے متعلق حضرت حاجی امداد اللہ رح ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"بعد حمد وصلوٰۃ کے فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ ان کی خدمت میں جو صاحب اس فقیر سے علاقہ محبت وارادت اور قرابت رکھتے ہیں، خواہ قرابت حسبی ہو یا نسبی، عرض گزار ہے کہ مدرسہ عربیہ دیوبند جو اس وقت اپنی خوبی سے نہایت رونق اور شہرت پر ہے، فقیر کو اس سے علاقۂ خاص ہے، بلکہ یہ مدرسہ اپنا ہی مدرسہ سمجھتا ہے۔ اس جہت سے سب صاحب اس مدرسہ کو اپنا ہی مدرسہ سمجھیں اور جو کچھ اعانت اس مدرسہ کی اپنی ذات سے ہو سکے یا سعی اور سفارش سے ممکن ہو اسمیں ہمیشہ ساعی رہیں اور نگرانی اس مدرسہ کی اپنے ذمہ ضروری سمجھیں" الخ

حضرت حاجی صاحب کا یہ گرامی نامہ دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے اور حال ہی میں تاریخ دارالعلوم دیوبند (مرتبہ مولوی سید محبوب رضوی) میں اس کا فوٹو شائع ہو گیا ہے) دراصل خاندان ولی اللہی کی تحریک کے دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مذہب، تمدن ومعاشرت اور ان کے علوم کو انگریزی تسلط کے نتائج بد سے محفوظ رکھا جائے

پہلے مقصد کے لئے اس خاندان اور اس کے متوسلین نے دو معرکوں (معرکۂ بالاکوٹ و معرکۂ ۱۸۵۷ء) میں اپنی جانی قربانیاں پیش کیں۔ مگر تقدیر الٰہی غالب آئی اور کامیابی نہ ہوسکی مگر دوسرے مقصد کے لئے جد و جہد کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند دراصل اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا۔ خود اس کے قیام میں حضرت حاجی صاحب اور خاندان ولی اللہی کے دوسرے بزرگوں کی رہنمائی اور تمنائیں اور دعائیں شامل تھیں۔ اسی لئے انھوں نے اسکی بقا و ترقی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ آج وہ ایشیا کا سب سے عظیم دینی دارالعلوم ہے۔

تصنیفات وافادات :-

حضرت حاجی امداد اللہ رح کی اردو فارسی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) مثنوی مولانائے روم :- (بزبان فارسی)

(۲) غذائے روح :- یہ کتاب اردو نظم میں ہے اور حکایات و قصص سے سلوک و معرفت کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۳) جہاد اکبر :- ایک فارسی منظوم رسالہ کا اردو نظم میں ترجمہ جو اصلاح نفس کے مضامین پر مشتمل ہے۔

(۴) مثنوی تحفۃ العشاق :- اردو نظم میں ہے اور عشق و محبت خداوندی کا بیان ہے

(۵) دردنامہ غمناک :- نظم میں عشق حقیقی اور جذبۂ بے خودی کی ترجمانی کی ہے۔

(۶) ارشاد مرشد :- وظائف و اوراد و مراقبات کا بیان۔ آخر میں سلاسل اربعہ کے شجرے

(۷) ضیاء القلوب :- بزبان فارسی معرفت و سلوک کے مضامین اور وظائف و اوراد کا بہترین مجموعہ ہے۔

(۸) رسالہ وحدۃ الوجود :- فارسی زبان میں اس موضوع پر ایک طویل مکتوب۔

(۹) فیصلہ ہفت مسئلہ :- اس میں میلاد و فاتحہ و عرس و سماع وغیرہ مسائل مختلف فیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور رفع نزاع کی کوشش فرمائی گئی ہے۔

(۱۰) گلزار معرفت :- حضرت کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ جو حمد و نعت و عشق حقیقی کے مضامین پر مشتمل ہے۔

(۱۱) مرقومات امدادیہ مکتوبات امدادیہ :- حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت حاجی عابد حسین دیوبندی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم کے نام ایک سو گیارہ خطوط فارسی و اردو میں سلوک و معرفت کے مضامین پر مشتمل۔

کرامات :-

حضرت حاجی صاحب صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کے سوانح نگاروں اور متوسلین نے بہت سے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں۔ مگر آپکی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ کا قلب مبارک عشق و محبت خداوندی کا جوالامکھی تھا۔ جسے بھی آپ کا قرب نصیب ہوا اس کا سینہ اس آگ سے دہک اٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کے بہترین اصحاب علم و فضل فیوض باطنی حاصل کرنے کے لئے آپ سے تعلق و وابستگی کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اپنی دستار فضیلت کو آپکے قدموں میں بچھا دینے کو سبب عزت خیال کرتے تھے۔ اس کے بعد کسی کرامت کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ یوں بھی حضرت حاجی صاحب دانستہ اظہار کرامت کو پسند نہیں فرماتے تھے

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے بہت سے مہمان آگئے۔ کھانا کم تھا منتظمین کو پریشانی محسوس ہوئی۔ حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیجدیا کہ اسے کھانے پر ڈھانک دیا جائے۔ اس عمل سے کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھا لیا اور بچ رہا۔ حضرت ضامن شہیدؒ کو جو آپ کے پیر بھائی تھے خبر ہوئی تو حاجی صاحب سے فرمایا "حضرت آپ کا رومال سلامت چاہئے۔ اب کیوں قحط پڑے گا"۔ حضرت حاجی صاحب شرمندہ ہو گئے اور فرمایا "واقعی خطا ہو گئی توبہ کرتا ہوں اب ایسا نہ ہو گا" اس کے بعد اخفاء میں اور سختی فرمانے لگے۔

سفرِ آخرت :-

آخر محبوب حقیقی سے ملنے کا وقت آگیا۔ ۱۳ جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء کو چہارشنبہ کے دن فجر کی اذان کے وقت چوراسی سال کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ مکہ معظمہ میں جنت المعلیٰ میں دفن کئے گئے۔ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی نے تاریخ وفات نکالی :-

حَیٌّ دَخَلَ الْخُلْدَ

رحمہ اللہ واسعۃ کاملۃ

یوسفِ گم گشتہ

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

مولانا انظر شاہ مسعودی کشمیری
استاذ دارالعلوم دیوبند

تناہی کو علم ہے کہ مقبول علم کی کیا کیا علامات و آثار ہیں۔ بیان کرنے والوں نے جس حد تک بیان کیا وہ تجربات و مشاہدات پر مبنی ایک حقیقت ہوگی اس بے بضاعت کی حقیقت ہی کیا، کہ اس کی کوئی بات قابل قبول ہو تاہم کہنے کا حق تو کسی سے چھینا نہیں جا سکتا۔ بہر حال مدت سے ایک خام خیال یہ بھی چلا آتا ہے کہ کسی نامور استاذ کو ایسے تلامذہ کا میسر آجانا جو اس کے فضل و کمال اور دین و دانش کی اشاعت میں خصوصی حصہ لیں۔ استاذ کے علم کے مقبول ہونیکی علامت ہے۔ خانقاہی [illegible] نظام کو تو جانے دیجئے کہ وہاں ٹھوک بجا کر کردار سازی سب سے بڑا مقصد ہے۔ لیکن درسگاہی نظام میں صوفیاء کے انداز میں کسی خاص الخاص نوع کی تربیت پیش نظر نہیں رہتی۔ دونوں طریقہ کار میں حدِ فاصل کے باوجود اگر درسگاہ میں کوئی تعمیری شخصیت مہیا ہوتی ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ معلم کے مقبول عند اللہ ہونے کی کھلی علامت ہے کہ خدا تعالیٰ اس راہ سے اس کے علوم و کمالات کو جاوید بنانا چاہتا ہے۔ معلوم ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ اپنی تمام علمی رفعتوں کے باوجود اور ان شاہکار تصانیف کے باوصف جو ان کے علم ریز قلم سے نکلیں پھر بھی ان کی علمی شوکت جو دماغوں پر چھائی ہوئی ہے اس میں بڑا دخل انہی کے محرر وزگار شاگرد حافظ ابن قیمؒ کا ہے۔ یا دش بخیر حافظ ابن حجر عسقلانی جاننے والے جانتے ہیں کہ حافظ سخاوی کی قلمی کاوشوں نے حافظ الدنیا کے علم و کمال کو آباد اور زندہ پائندہ بنا دیا۔ ٹھیک اسی انداز میں حافظ ابن ہمام اور ان کے با اختصاص شاگرد قاسم ابن قطلوبغا کا معاملہ ہے اس تمہید کے بعد آئیے اور ہندوستان کے ایک جلیل القدر محدث جن کی عبقریت و جامعیت

سب ہی ثنا خواں ہیں یعنی حضرت مولانا انور شاہ الکشمیریؒ۔ ان کے سیکڑوں ممتاز و معروف تلامذہ ہیں۔ منفرد شخصیت اسی ذات گرامی کی ہے جو حال ہی میں اس دنیائے دوں سے اٹھ کر جاودانی و باقی عالم میں سکونت پذیر ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل حضرت مولانا محمد یوسف البنوریؒ اعلی اللہ مقامہ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ اس حقیقت کا کون انکار کر سکتا ہے کہ مرحوم نے اپنے جلیل استاذ کے نوادرات علمی کو عالم آشکارا کرنے میں کیا کچھ کارنامے انجام دیے۔ ہند و پاکستان کیا بلاد عرب اور یورپین ممالک تک مرحوم کی وساطت سے استاذ کے افکار و نظریات و علوم و معارف نے رسائی پائی۔ پھر صرف یہی نہیں کہ بات مجلسی تذکروں ہی تک محدود ہو، دین و دانش کے جو اسفار ان کا قلم تیار کرتا رہا وہ تعارف کے خطوط کو وسیع تر کرنے کے ساتھ اسے جاوید بنانے کی ایک مفید اور مستحکم کوشش ہے۔ اور بلاشبہ وہ اپنی سعی بلیغ کے نتیجے میں مستقبل میں دین و دانش کی تیار ہونے والی تاریخ میں انھیں سعید و اسعد تلامذہ کی صف میں جلوہ افروز ہوں گے جو ابن قیمؒ، سخاوی اور قطلوبغا کے لئے مخصوص ہے۔

مرحوم پر مقالے کی تیاری کی فرمائش راقم السطور کے لئے کس درجہ تشویش انگیز ہے، کاش کہ اسے بتانے اور سمجھانے کی زبان میسر ہوتی۔ غالباً ایک مہینہ جو اس تیز رفتار دنیا کا اچھا خاصا وقت ہے، گزر نے کو گزر گیا لیکن قلوب کو ہلانے والے اس حادثے کی یاد دل و دماغ پر اپنے بھیانک و مدہش اثرات کے ساتھ آج بھی قائم ہے۔ پچاس سالہ مختصر زندگی میں وہ دن ہمیشہ یادر ہے گا کہ ایک بے مایۂ علم و عمل اس کشمیر کے لئے پابہ رکاب ہے جو مرحوم کے استاذ کا آبائی وطن اور جہاں ان کی وفات کے چالیس سال بعد انہی کی ذات و کمالات پر علمی مذاکرہ کا اہتمام ہے، اسی میں شرکت کے لئے سفر کی تیاریاں بھرپور انداز میں جاری ہیں۔ دن ڈھل رہا ہے شام اپنے ستاروں کے ساتھ تیزی سے آرہی ہے۔ سفر کے آغاز میں چند ہی گھنٹوں کی مسافت حائل ہے کہ اچانک اس غیر متوقع حادثہ کی اطلاع ریڈیو پاکستان کی وساطت سے مملکتین کے درمیان طول و طویل فاصلوں کو پھلانگتی ہوئی پہونچ گئی جس کو کان سننے کے لئے تیار نہ تھے اور قبول کرنے کے لئے قلب آمادہ نہ تھا۔ بارہا یہ منظر دیکھا کہ سورج ٹکٹکی پر ہے اس کا اجالا اس دنیا کو مہتن منور بنائے ہوئے ہے، بادل اٹھے اور جمع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آتشیں کرہ پر چھا گئے۔ پھر کیا ہوا، وہی جو ہونا چاہئے تھا یعنی جیتی جاگتی روشنیوں سے بھرپور اجالوں سے لبریز دنیا اچانک اندھیروں اور تاریکی میں ڈوب جاتی ہے، بلا شائبہ مبالغہ اور

ـیا لئے ۔ ۔ ۔ ۔ کی ضرورت بھی کیا ـــ آفتاب علم و دانش کے یکایک غروب ہونے کی
ـوز تیرہ دلوں کے آفتاب کے لئے گھٹا ٹوپ اندھیری تھی۔ اس حادثۂ فاجعہ کا اثر آشنا حلقے پر
ـہونا تھا وہ تو ہوا ہی، حیرت تو یہ ہے کہ مرحوم کے نہ دیکھنے والے بلکہ صرف ان کی تصانیف
ـمتعارف حلقے پر بھی غم و الم کی گھٹائیں چھا گئیں۔

ازہرالہند دارالعلوم کے دائرۂ اہتمام میں ایک ہنگامی تعزیتی میٹنگ میں راقم الحروف
ـشریک ہے۔ چہرے افسردہ، قلوب پژمردہ، زبان و بیان فسردہ۔ اسی ماحول میں
ـیتی تجویز منظور ہوئی اور آنے والا دن جانے والے کے لئے ایصال ثواب کا ٹھیرا۔ حسرت
ـباکی رہ گئی اور ہمیشہ ہی رہے گی کہ علالت کی اطلاع آئی نہ دعائے صحت کی سعادت میسر ہوئی
ـن جب پہنچی تو صفحۂ زندگی کے لپٹ جانے اور ایک مرد مومن کی رحلت و ارتحال کی۔ کشمیر کا سفر
ـروع ہو چکا۔ رات کے سناٹے کو دبوچ کر انجن چیرتا پھاڑتا آگے بڑھ رہا ہے۔ سلیپر کوچ پر
ـمسافر مصروف استراحت، لیکن اپنی سیٹ پر دراز، یہاں ایک اور مسافر ہے جو اضطراب سے
ـوٹیں بدل رہا ہے۔ اس کے روبرو چالیس سال کی بیتی ہوئی کہانی کا ایک ایک منظر ہے
ـں میں مولانا یوسف بنوری چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، بولتے، سنتے نظر آرہے ہیں۔ جموں اسٹیشن
ـوہ صبح بھلائی نہیں جا سکتی جب اسٹیشن پر غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے مسافر نے مرحوم کے
ـاجہ تاشی و انیس خلوت و جلوت مولانا احمد رضا بجنوری کو کھڑے کھڑے یہ وحشت انگیز خبر
ـسنائی۔ نتیجہ غیر متوقع نہ تھا۔ سننے کے ساتھ ہی ہر مملوک کے لئے مالک حقیقی کی جانب لوٹنے
ـمعترفانہ کلمات بار بار زبان پر آرہے تھے۔

یہ ایک ٹیکسی ہے جس میں پانچ افراد کا مختصر قافلہ سر بفلک پہاڑوں کے نشیب و فراز کو
ـزی سے قطع کر رہا ہے۔ سوچنے والا سوچ رہا ہے کہ انہی پہاڑوں، انہی وادیوں، ان ہی
ـہساروں میں مولانا یوسف بنوری نے بھی اپنے جلیل القدر استاذ کے ساتھ نصف صدی
ـلے اسی خطۂ بے نظیر کا یادگار سفر کیا تھا۔

اور پھر خود حیات طیبہ کے نشیب و فراز کو ستر سالہ زندگی میں بسرعت طے کرتے ہوئے وہ
ـفردوس میں انشاء اللہ پہونچ چکے ہیں جس کا ہلکا پھلکا نمونہ دنیا کا یہ شاداب مرغزار کشمیر ہے
ـں یہ خیال بھی آتا کہ مرحوم کی ہر چیز میں جلدی تھی۔ گفتار عاجلانہ، رفتار مستعجلانہ، تو پھر ہونا بھی
ـہی چاہئے تھا کہ وہ اس دنیا سے اُس دنیا تک کے فاصلے بسرعت ہی طے کریں۔ غرضیکہ

چالیس سال کے یادگار نقوش دل و دماغ کے صفحات پر انمٹ بنے ہوئے ہیں بلکہ یادوں کی ایک دنیا سامنے موجود ہے۔ سرِ شام سری نگر کے حدود میں ٹیکسی جارہی، اور اس میں موجود کارواں اتر رہا ہے مگر جس کے دل و دماغ پر یوسف محیط ہے وہ زلیخائی اضطراب میں بدستور گرفتار ہے۔ سامنے وہ پُرشکوہ عمارت ہے جسے کشمیری حکومت نے اسمبلی کے اراکین کے لئے بصرف کثیر تیار کیا ہے۔ یہاں ہندوستان کا دل و دماغ کھنچ کر چلا آیا اور ان میں سے ہر ایک علامہ انور شاہ سیمنار میں شرکت کے لئے مدعو ہے۔ پہنچنے والا سمجھ رہا تھا کہ وہی غم انگیز حادثہ سے ملول و غمگین ہے۔ لیکن ہر ایک زبان پر یوسف پاکستانی کی موت کا تذکرہ اور ہر کوئی اس الم خیز سانحہ پر گریاں و بریاں۔ حیرت بھی غلط تھی۔ کنعان کے یوسف اول پر ایک زلیخا کہاں بہت سی زلیخائیں دل و جاں نثار کرتی تھیں تو اس یوسف ثانی پر بھی بہت سی آنکھیں اشکبار اور بہت سے قلوب زار و نزار ہیں۔ بھلا ایک ایسے زبوں ہمت سے جو آج تک پیش آنے والے حادثہ کی سنگینی سے خود کو رہا نہ کرا سکا۔ لکھنے کی فرمائش انصاف ہے یا زیادتی احسان ہے یا تعدی۔ تاہم اس تجربہ کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم کو ہلکا کرنے کے لئے یہ بھی ایک تدبیر ہے کہ کچھ کہہ کہا کر، سن سنا کر بوجھل طبیعت کو ہلکی بنا لیا جائے۔

جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے حادثہ پر متعلقین کی غم ناک ودہ سے لبریز صداؤں پر فاروقی جلال بروئے کار آیا تو مصطفائی حلم و حکمت نے اسی مقصد کے لئے گلے بندھے رنج و غم کے اظہار کی اجازت دی تھی کہ پس ماندگان کی طبیعتیں کچھ ہلکی ہو جائیں۔ پس آنے والی سطور نہ مرحوم کے علم و کمال کا مرقع، نہ ان کے فضل و دانش کا تمثال، نہ کارناموں کی تاریخ، نہ شاہکار مظاہروں کی داستان بلکہ راقم السطور کے بوجھل قلب کو ہلکا کرنے کی ایک سوچی سمجھی تدبیر ہے۔ ان ہی تصریحات کی روشنی میں جو کچھ الٹا سیدھا لکھا جا رہا ہے اسے با دلِ ناخواستہ ہی پڑھ لیجئے۔ اور شاید یہ درخواست بھی بے معنی نہ ہو۔

جو لکھے بے دل کرو دل سے قبول

حافظہ پر زور دینے کے باوجود یہ یاد نہیں آتا کہ مرحوم سے کہاں اور کب پہلی ملاقات ہوئی یا ان کے علم و فن اور دین و دانش کے چرچے کب سننے میں آئے۔ جہاں تک وثوق سے کچھ کہنے کا تعلق ہے یہ ۱۹۴۳ء ہے۔ ایک بے بضاعت پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور اردو کے امتحانات دینے کے لئے اس اورنٹیل کالج کا طالب علم ہے جو مسجد فتحپوری دہلی کے

گوشہ میں موجود تھا. شوال کے اوائل کی بات ہے کہ مرحوم ڈابھیل کے لئے مسافرت کے دوران دہلی اتر گئے اور حسن اتفاق کہ میرے رہائشی کمرہ میں رخت سفر کھول دیا. اسی زمانہ میں دہلی میں کسی کام سے برادر بزرگوار قیصر صاحب اور مولانا عبدالحق میاں سملکی بھی میرے پاس مقیم تھے. مولانا محمد یوسف بنوری کے سامانِ سفر میں خشک میوے بڑی مقدار میں موجود تھے. مولانا رات کو پڑ کر سو گئے. تو ان کے اس سوغات پر بے تکلف یلغار کی گئی. اندیشہ یہ بھی تھا کہ شاید یہ نازیبا حرکت مرحوم کے تکدر کا موجب ہو لیکن صبح کو چائے کی مجلس میں جب اپنے مال رسد میں کافی کمی پائی اور متجسسانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا تو بہت جلد وہ صورتِ حال کو بھانپ گئے اور مہذب چوروں کے گروہ کے تعین میں انھیں دشواری پیش نہیں آئی اور بجائے مکدر ہونے کے اس بے تکلفی کی داد دیے بغیر وہ خود بھی نہ رہ سکے - یہ مولانا کے شباب کا دور تھا. ان کا سرخ سپید چہرہ، کشادہ پیشانی، بادامی آنکھیں، سیاہ داڑھی، سر پر پشاوری دستار، طویل و عریض شلوار، سفید پیرہن، آنکھوں پر چشمہ متوسط قامت اور متوازن جثہ. بلاشبہ انھیں حسینوں کی صف میں شریک کرنے کی سفارش کرتا. شبابی قوتیں اچھل کود رہی تھیں، اور علم و دانش کا چشمہ رواں دواں تھا. اس مختصر ملاقات کے بعد مولانا اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے.

سفر پاکستان اور طویل میزبانی

غالباً ۱۹۶۵ء میں احقر نے پاکستان کا سفر کیا، یہ وہ وقت ہے جب دیوبند سے احقر ہی کی ادارت میں "نقش" نامی مجلہ شائع ہوتا. حلقۂ معاونین کی توسیع کے لئے یہ دور دراز کا سفر کیا گیا تھا. لاہور، لائلپور کے بعد تیسری منزل کراچی تھی. لائلپور سے ٹیلیگرام کے ذریعہ اپنی حاضری کی اطلاع دی گئی. علی الصبح گاڑی کراچی اسٹیشن پر رکی تو مجھے اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ مرحوم اس کم مایہ و تہی دامن کی عزت افزائی کے لئے ایک اچھی خاصی جماعت کے ساتھ پذیرائی فرمائیں گے. درحقیقت ان کی بلند پایہ نمود فطرت اور شرف حسبی اور نسبی کے تقاضے تھے کہ وہ ایک ذرّۂ بے مقدار کو بھی اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمانے میں کسی بخل سے کام نہیں لے رہے تھے.

مدرسہ اسلامیہ عربیہ نیوٹاؤن کی عمارتیں بن رہی تھیں اور خود وہاں کی موجودہ

رفیع الشان مسجد کی بھی تکمیل نہیں ہو سکی تھی بلکہ مرحوم کے فلذ اکبد مولوی محمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ عن الشرور بچپن ہی کے حدود سے آگے بڑھنے نہیں پائے تھے۔ ایک عشرہ کے قریب مرحوم کے وسیع دسترخوان سے جو وسعت حوصلگی کا نمونہ اور متنوع خصوصیات کا مظہر تھا، زلہ ربائی کی سعادت نصیب حقیر تھی۔ یہیں مولانا کی زبان سے ان کے قلمی نسخے معارف السنن کے بہت سے صفحات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ یہ دور ان کی شخصیت کے وسیع تعارف کی تمہید تھی۔ کراچی کے اعلیٰ غیر سرکاری علمی حلقوں میں وہ متعارف ہو چکے تھے۔ میں دیکھتا کہ علماء، فضلاء، انشاء پرداز، امیر، غریب، مسائل میں رجوع کرنے والے، مسئلے پوچھنے والے۔ غرضیکہ ہجوم ان کے ارد گرد جمع رہتا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس زمانہ میں سید جمیل صاحب اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کسی خاص اسکیم میں ان سے بار بار مشورہ کے لئے آئے۔ بلکہ موصوف نے اپنی عظیم کوٹھی پر ایک ضیافت میں بمعیت مولانا مجھے مدعو بھی کیا تھا۔ بے تکلف عرض ہے کہ مولانا کے طفیل میں شاید ہی کوئی دن کسی پُرتکلف ضیافت سے خالی جاتا۔ باوانی صاحب کی دعوت تو ہمیشہ یاد رہے گی جس میں الوان و اقسام کے کھانوں کا تعدد حیرت انگیز تھا۔ اس وقت پاکستان سیاسی ہچکولے لے رہا تھا اور اشیاء کی یہاں بڑی نایابی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک صاحب نے لیپچو چائے جو ہندوستان میں بکثرت و ارزاں تھی اتنی نادر تحفہ کی حیثیت میں مولانا کو یہ کہہ کر پیش کی تھی کہ آپ اپنے ان عزیز مہمانوں کو ضرور پلائیے۔

سادگی

ذہین طبقہ مولانا کی اس سادگی کو پا گیا تھا کہ وہ چند کلمات تعریف سنکر مسلسل بولتے رہتے ہیں اس لئے پوچھنے والے آتے اور کہتے۔ دیکھئے مولانا آپ کے سوا کون حل کر سکتا ہے۔ علمی مشکلات کا تشفی بخش جواب تو بس آپ کے یہاں ملتا ہے" مولانا سنبھل کر بیٹھ جاتے اور ان کے وفور علم کا بحر ذخار طغیانی میں آجاتا۔ یہ منظر صبح سے تا دوپہر، دوپہر سے شام تک بلکہ رات کے سناٹے میں بھی مسلسل دیکھنے میں آتا۔ وہ تھک جاتے اور کبھی کبھی بے قابو ہو کر گردن پیچھے ڈال دیتے۔ تعب کو دیکھ کر ایک روز میں نے عرض کیا

آپ اس قدر تعجب کیوں اٹھاتے ہیں ؟ اور آپ نے یہ کیوں ضروری قرار دے لیا کہ ہر سوال کا جواب اس تفصیل سے عنایت فرمائیں گے ۔ مگر ان کا جواب ان کی سادہ مزاجی کی آئینہ دار ہے ۔ فرمایا کہ یہ میری تعریف اکثر کرتے ہیں اور میں مسرت ہو کر آمادۂ بیان ہو جاتا ہوں ۔ ظاہر ہے کہ اس جواب لا جواب کا میرے پاس کیا جواب تھا ۔ اس ذیل کا ایک لطیفہ اور سننے کے قابل ہے ۔

ایک دن کہیں مولانا کی رفاقت میں دعوت کا پروگرام تھا ۔ مولانا نے چلنے کی تیاری کی دستار جو ہمیشہ کلاہ پر مزین رہتی تھی اسے زیب سر کیا ، عبا کو زیب بدن ۔ چھڑی ہاتھ میں اتنے میں ان کے صاحبزادے محمد اندر سے نمودار ہوئے اور مولانا کی عبا کو پکڑ کر اصرار کیا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا ۔ مولانا انھیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مقابلہ کسی معقولیت سے جیتا نہیں جا سکتا تھا ۔ افہام و تفہیم بلکہ بہکانے پھسلانے کی ساری ہی کوششیں بیکار گئیں ۔ مولانا نے چپکے سے فرمایا :-

کہ محمد مجھ سے بھی زیادہ تعریف پسند واقع ہوا ہے ۔ دیکھئے اب میں اسے کس تدبیر سے علاحدہ کرتا ہوں " ۔

یہ کہہ کر مولانا نے محمد کی تعریف میں ایک طویل قصیدہ پڑھا جس کا اختتام اس مصرع پر ہوتا کہ ۔ مصرع

" ان خصوصیات کے مالک کیا بن بلائے دعوت میں شرکت کرتے ہیں "

واقعی تیر نشانے پر بیٹھا ۔ پڑھا ہے کہ رودکی شاعر کی ایک رباعی مدتوں سے غائب اس بادشاہ کو دار السلطنت واپس لانے کے لئے مہمیز کا کام کر گئی تھی جو طویل عرصہ سے راجدھانی سے غائب تھا اور پھر وہ اس شان سے بھاگا کہ پاؤں میں جوتا پہننے کی تاخیر اس کے لئے گوارا نہیں تھی ۔ مولانا کے بھی اس قصیدۂ در مدح محمد کے بعض بند واقعی محمد کے قدم بند کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ اور میں حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ محمد اپنی تعریف سنکر گھر میں داخل ہو گئے ۔ مرحوم نے فاتحانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنے خاص لہجہ میں فرمایا کہ :-

" جی ہاں ! دیکھ لیجئے کہ میں اس کے مرض کی صحیح تشخیص کے بعد کامیاب علاج پر کس قدر قادر ہوں " ۔

پاکستان میں مولانا کے درس بخاری میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ۔ وہاں کا منظر عجیب و غریب تھا ۔ مولانا تحقیقات کا انبار لگا رہے تھے ۔ حوالوں پہ حوالے ۔ نکتہ آفرینیوں کا موج

کہ اچانک ایک طالب علم نے کوئی اشکال پیش کر دیا۔ مرحوم کی شعلہ طبیعت بھڑک اٹھی۔ پھر جو برسے ہیں تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مولانا اس کا کام تمام نہ کر دیں۔ استغفر اللہ، استغفر اللہ کے نعرے ان کی زبان پر تھے اور اہمال سے سے کر ہلکے وسخت سبھی الفاظ جو ان کے غیظ وغضب کی قاموس میں موجود تھے اس غریب کے لئے استعمال کر ڈالے اور پھر اس سے زیادہ تعجب انگیز یہ کہ چند ہی منٹ میں منھ کا مزہ بھی بدل گیا اور چہرے کے آثار بھی۔ اب اسی طالب علم سے مترنم تبسم و شکر ہو رہے تھے۔

حجاز کے سفر میں عصر سے تا عشاء میں مرحوم کے ساتھ حرم میں بیٹھتا۔ وہ مجھے بار بار تنبیہ کرتے کہ کچھ پڑھو یا صرف حرم کو دیکھتے رہو۔ لیکن اس انتباہ کی خلاف ورزی ہمیشہ ان کی ہی جانب سے ہوئی، میں چپ سادھ لیتا تو وہ خود بولتے، میں نہ بولتا تو دوسروں کو مصروف گفتگو کر لیتے۔ ایک روز ایک ممبئی سروں سے پھلانگتا ہوا بیت اللہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مولانا اس کی نازیبا حرکت پر اسقدر برافروختہ ہوئے کہ حرم ہی میں اس کی تادیب فرمائی۔ یہ تادیب زبانی ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ہاتھوں سے بھی کام لیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ دیر تک کے لئے مکدر ہو گئے۔ لیکن ابھی چند سکنڈ بھی نہیں گذرے تھے کہ ایک دوسرا منظر سامنے تھا۔ مرحوم ممبئی کو منا رہے ہیں اس کے پیر پکڑ رہے ہیں۔ اسے کچھ نقد دیکر معافی دینے پر آمادہ کر رہے ہیں اور اس مہم میں کامیاب ہو کر اپنی جگہ پر مراجعت فرما ہوئے تو مجھے یہ سنا رہے ہیں کہ

"جی ہاں! فلا رفث ولا فسوق ولا جدال کا حکم ہے"۔

غرضیکہ اس طرح ان کی سیمابی طبیعت کے متضاد مناظر خوب سامنے آئے۔

عجلت پسندی

موصوف بولنے، چلنے، اٹھنے اور بیٹھنے میں بڑے عجلت پسند واقع ہوئے تھے۔ وہی سبق جس کا ذکر گذرا اور جس میں شرکت کی سعادت میرے مفاخر میں ہے، دیکھا کہ مولانا آخر میں بار بار فرماتے ہیں اور جس قدر تقریر تیز ہوتی ہے اتنا ہی اس کلمہ کا ورد بڑھ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا کا تکیہ کلام ہے۔ درس میں شریک طالب علم نے خدا جانے صحیح یا غلط بتایا تھا کہ یہ (آیا خیال مبارک میں) کا اختصار ہے، جس کا مرحوم کی سیماب وار طبیعت نے مثلہ کر دیا تھا پھر ایک معتبر ذریعہ سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ ختم نبوت کے سلسلہ میں کوئی وفد لیکر ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر اعظم پاکستان کے یہاں پہنچے۔ گفتگو نرمی و ملاطفت کے حدود سے

سے نکل کر گرمی و جیادلت کی سرحدوں میں داخل ہو گئی۔ دروغ برگردن راوی بعضوں نے ایک موقع پر کہا "تو کیا میں پیر استعفا دیدوں" مولانا نے تمام آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے عاجلانہ انداز میں فرمایا کہ

"جی ہاں! دیجئے فوراً دیجئے" !!

وفور علم

کراچی کی وہ شام ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ مجھے ساتھ لیکر سمندر کی تفریح کر رہے ہیں کشتی پر وہ ہیں، میں ہوں اور رفیق سفر۔ آج مولانا کی طبیعت بڑے موڈ پر تھی، کوئی بات شروع ہوتی تو اس کے مناسب عربی شعر پڑھتے اسے مبالغہ نہ سمجھے کہ انھوں نے ایک ہی مضمون پر دس دس تک اشعار پڑھ ڈالے۔ لغات کا تذکرہ چلا تو کسی ایک لفظ کے مترادفات کی طویل فہرست سنادی۔ بعض احادیث اور آیات قرآنی کا نیا ہی محل پیش فرمایا۔ میں ان کے وفور علم کا تو پہلے ہی سے معتقد تھا اب تبحر اور علم میں گہرائی اور گیرائی کا نیا ہی منظر سامنے تھا۔ خدا کے تعم کے انعام و افضال کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ دو سفر حج ان کی معیت میں مجھے نصیب ہوئے جس میں ان کی باغ و بہار طبیعت، زود رنج مزاج، چڑھاؤ اور اسی تیزی سے اتار کے دلچسپ اور حیرت انگیز منظر کھل کر سامنے آئے۔ انھوں نے کمال شفقت و بزرگانہ عنایت سے مجھے اپنے ساتھ ملحق کر لیا تھا اور یہ حسن) جواب تھا حضرت والد مرحوم مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کے حسن الحاق کا جس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے :-

"میں اپنے وطن سے حضرت شاہ صاحب کے وفور علم کے چرچے سنکر اس شوق و تمنا میں دیوبند پہنچا کہ حضرت ہی سے حدیث پڑھوں گا۔ لیکن جب دیوبند پہنچا تو حضرت دارالعلوم سے مستعفی ہو کر خانہ نشیں ہو گئے تھے۔ میں نے بطرز علامہ حریری عربی ادب میں ایک بلیغ تحریر لکھی جس میں اپنے بصد شوق حاضری اور دیوبند کے موجودہ حالات پر اپنی یاس و حسرت کا اظہار تھا۔ یہ تحریر حبیب محلہ خانقاہ میں حضرت شاہ صاحب کے رہائشی مکان پر جا پہنچا۔ حسن اتفاق اس وقت وہ تنہا تشریف فرما تھے۔ پہلی ہی زیارت میں شیخ کا عشق میرے رگ و ریشہ میں رچ گیا سلام و کلام کے بعد میں نے وہ تحریر جیب سے نکال کر پیش کی تو حضرت نے بغور

مطالعہ فرما کر خاص نظر سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور فرمایا مولوی صاحب آپ بہت دیر میں آئے۔ اب عاجز ہو چکا ہوں۔ قویٰ میں طاقت نہیں رہی۔ خیر آپ کو اپنے سے ملحق کئے لیتا ہوں"

یہی واقعہ سنا کر حجاز میں مرحوم نے مجھے اپنے ساتھ ملحق فرمالیا۔ مزدلفہ کی وہ رات بھلائی نہیں جا سکتی جب میں نے ان سے اچانک چائے کی فرمائش کی۔ وہ یہ فرمائش سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ تکلف برطرف۔ فرمایا

"تم نے مجھے عاجز کر دیا، میں اب تمہارے لئے چائے کہاں سے لاؤں، نہ میرے پاس چائے کا سامان نہ یہاں کوئی دوکان۔ خدا کے بندے کسی چیز کی فرمائش سوچ سمجھ کر کرنی چاہئے"۔

وہ کہتے جاتے تھے اور اپنے خاص انداز میں غضب ناک ہو رہے تھے اور مجھے بے اختیار ہنسی آرہی تھی چونکہ اس مختصر رفاقت ہی میں ان کے مزاجی مد و جزر سے خوب واقف ہو چکا تھا اس لئے ان کے جوش و خروش سے نہ میں مرعوب ہوتا تھا ورنہ میری فرمائشیں ششدر ہوتیں، بلکہ میں نے عرض کیا کہ الحاق کوئی آسان کام ہے، کیا سمجھ کر آپ نے ملحق کیا تھا۔ اور کیا ہے تو پھر ناز و نخرے برداشت کرنے ہوں گے۔ یہ معروضہ ان کے بڑھتے ہوئے غضب کے لئے شبنم بن گیا۔ وہ اٹھے اور ادھر ادھر پھرنے لگے۔ قریب میں انھیں کچھ بدوی قہوہ پیتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے دیکھا مولانا ان میں شریک ہو گئے اور گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میرے پاس آئے اور فرمایا کہ چلئے چائے پی لیجئے۔ اب میں عربوں کے ساتھ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا اور مرحوم خالص بدوی لب و لہجہ میں انکے ساتھ مصروف گفتگو۔ بدویوں کیلئے یہ شخصیت حیرت انگیز بنی ہوئی تھی کہ پاکستانی ہونے کے باوجود اور دیہاتی عربی میں اس طراری سے مصروف گفتگو۔ مولانا وہاں سے اٹھے تو حسب دستور فاتحانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے فرما رہے تھے۔

"جی ہاں! دیکھئے بدویوں سے میں کیسا گھل مل گیا اور ان کے لب و لہجہ میں میں نے کس بے باکی سے گفتگو کی ہے"۔

اس طرح چائے نصیب ہوئی اور ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں مولانا کا خاص طور سے ممنون ہوا اور انھیں خوب خوب داد دی۔ وہ اپنے استاذ جلیل سے سعادتمندانہ تعلق ہی نہیں بلکہ والہانہ عشق رکھتے تھے ــــ بہت سی باتیں اور کہانیاں حافظہ میں تیل رہی ہیں لیکن انکا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس یوسف ثانی کو کبھی دنیا ایک مدت تک نہ بھلا سکیگی اور قدر شناس حلقوں میں ان کے علمی کارناموں کا چرچا ہوتا رہے گا ۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

خلقِ عظیم

دربار اقدس میں صحابہ کرامؓ کا ہر وقت جمگھٹا رہتا۔ ستارے تھے کہ گرد ماہ جمع رہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ کرامؓ خاموشی سے سنتے اور قطع کلام کی ہرگز جرأت نہ کرتے۔ حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں کمال عجلت سے کام لیتے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی سے ملتے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے السلام علیک کہنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ احباب سے ملاقات کے وقت اُجلا لباس پہننے کا اہتمام بھی فرماتے تھے جاں نثاروں کے حالات سے ہر لحظہ باخبر رہتے۔ اگر کوئی علیل ہوتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی سفر میں گیا ہوتا تو اس کے لئے دعائے خیر فرماتے۔ انتقال کر جانے والوں کے حق میں انا للہ کہتے اور مغفرت کی دعا فرماتے۔

آزردہ دلوں کی دل جوئی کرتے، دلاسا دیتے، احباب کے باغات میں تشریف لے جاتے اور ان کی ضیافتوں میں شریک ہوتے۔

علما کی قدر فرماتے۔

سب سے بخندہ پیشانی ملتے، عذر خواہ کا عذر قبول کر لیتے۔

توانا اور ناتواں سے یکساں عدل فرماتے۔

پاس ادب کی نیت سے عقب میں چلنے والوں کو اپنے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے کہتے۔ ہنگام سفر اگر خود سوار ہوتے تو ہمراہی کو بھی سوار کر لیتے اور پیدل نہ چلنے دیتے۔ اگر وہ سوار ہونے کا تامل کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ میری رفاقت ترک کر اور تجھے جہاں جانا ہے چلا جا۔

اپنے خادموں سے مروت کا سلوک فرماتے۔ غلاموں کے لباس اور خوراک میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز روا نہ رکھتے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک سفر و حضر میں آنحضرتؐ کی خدمت گزاری کی

لیکن میری خدمت کے مقابلہ میں آنحضرت کی شفقت بدرجہا زیادہ ہوتی تھی۔ اس تمام عرصہ میں اُف کا نا خوش کلمہ آنحضرتؐ کی زبان سے کبھی نہیں نکلا۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر باز پرس نہیں کی ——!

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں فرمایا کہ "آپ کا خلق قرآن کی تفسیر تھا"۔

آپ کی خوشی اور غصہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے تھا۔ اپنی ذات کے لئے ناراض نہ ہوتے اور نہ کبھی کسی کو سرزنش کرتے۔ لیکن احکام باری تعالیٰ سے نافرمانی کرنے والوں سے ضرور باز پرس کرتے اور جب کبھی ایسا ہوتا تو آپ کے غصہ کی تاب کوئی نہ لا سکتا تھا۔

آنحضرت شجاع ترین۔ بے حد سخی اور کریم انسان تھے۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے کوئی چیز مانگی ہو اور آپ نے دینے سے انکار کر دیا ہو۔ درہم و دینار گھر میں نہ رہنے دیتے تھے —— اگر بفرض محال رہ جاتا تو جب تک مستحق لوگوں کو دے کر بری الذمہ نہ ہو جاتے گھر میں تشریف نہ لاتے۔

بیت المال سے اپنے اور اہل بیت کی ایک سالہ ضروریات کے لئے ارزاں ترین جنس یعنی کھجور اور جو وغیرہ لے لیا کرتے۔ پھر اس میں سے بھی اتنی خیرات فرماتے کہ سال گزرنے سے پیشتر ہی یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا۔

آنحضرتؐ کی گفتگو سراسر صدق و صفا کا آئینہ ہوتی تھی۔ ایفائے وعدہ کا ہر حالت میں خیال رکھتے۔ بزرگان خدا کو نیکی کا درس دیتے۔ بیگانوں اور یگانوں سے نرمی برتتے۔ حلم اور بردباری آپؐ کی طبیعت کے خاص اوصاف تھے۔

نظر ہمیشہ سوئے زمین رکھتے تھے۔ آسمان کی طرف کم دیکھتے تھے۔ اکثر آپ کا دیکھنا گوشۂ چشم سے ہوا کرتا تھا۔

متواضع اس قدر تھے کہ امیر و غریب، غلام و آزاد کسی کی دعوت رد نہ فرماتے۔ مخلوق خدا پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ بلی کو دودھ پلاتے ہوئے اس کے سیر ہو جانے تک برتن اس کے آگے بڑھائے رکھتے۔

آپ کی ذات اس قدر پاکیزہ تھی کہ لذات دنیویہ کبھی آپ کو مغلوب نہ کر سکیں۔

اپنے احباب کی عزت کرتے، مجلس میں پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے۔ خدمت میں آنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی اور جگہ تنگ ہو جاتی تو اپنے پاؤں سمیٹ کر جگہ فراخ فرما دیا کرتے۔ آنحضرتؐ کا زانو اہل دربار کے

کسی فرد کے بالو سے آگے نکلا ہوا ہوتا۔

اگر کوئی حضرت کو ناگاہ دیکھ پاتا تو ہیبت زدہ ہوجاتا لیکن دربار رسالت میں محبت کی فراوانی حیرت ناک طور پر محسوس کرتا۔

ایک سفر کا واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو گوشت پکوانے کا حکم دیا۔ ایک صحابی بولے کہ بکرے کو ذبح میں کروں گا۔ دوسرے نے بکرے کی کھال اتارنے کا ذمہ لیا۔ تیسرے نے پکانے کی اجازت چاہی آنحضرتؐ نے فرمایا "جنگل سے لکڑیاں ہم لائیں گے"۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہم سب انتظام خود کرلیں گے۔ آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تم پر اپنی تو فوقیت جتاؤں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ خصلت بہت مکروہ ہے۔ چنانچہ آپ اسی وقت تشریف لے گئے اور جنگل سے لکڑیاں جمع کر لائے۔

ایک اور سفر کے دوران میں آنحضرتؐ اونٹ پر سوار تھے۔ نماز کا وقت آیا، اونٹ سے اترے اور نماز پڑھی۔ جب پھر سوار ہونے لگے تو صحابہ کرامؓ آپ کو سوار کرنے میں مدد دینے کے لئے آگے بڑھے۔ فرمایا: ۔ "رہنے دو دوسروں کی ضرورت نہیں۔ تم میں سے کسی کو کبھی دوسرے سے ہرگز مدد طلب نہ کرنی چاہئے خواہ وہ مسواک کے ٹکڑے کا سوال ہی کیوں نہ ہو۔

آنحضرتؐ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ مجلس میں جہاں جگہ ملتی تشریف فرما ہو جاتے۔ اور صدر نشینی کا خیال بھی دل میں نہ لاتے اور تمام مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی ہدایت فرماتے۔ ہر صحابیؓ سے کچھ اس طرح پیش آتے کہ وہ سمجھتا کہ بس حضورؐ کی نظر میں وہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وجہ یہ تھی کہ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ جب تک کوئی شخص خود بخود اٹھ کر نہ چلا جاتا، آنحضرتؐ بھی بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی ضرورت پیش آجاتی تو معذرت فرما کر تشریف لیجاتے۔ آپ نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں فرمائی۔ اگر نادانستہ طور پر کسی سے کوئی بے ادبی ہوجاتی تو آپ معاف فرما دیتے اور درگزر کرتے۔ بیماروں کی عیادت فرماتے، فقیروں کو دوست رکھتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے کو پسند فرماتے۔ کوئی نادار مسلمان انتقال کرجاتا تو اس کے جنازے میں شریک ہوتے۔ کسی فقیر کو اس کی مسکینی کے باعث حقیر نہ گردانتے اور نہ کسی بادشاہ کی امارت و شوکت سے مرعوب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گراں بہا سمجھتے۔ کسی خوراک سے نفرت نہ کرتے۔ اگر رغبت ہوتی کھالیتے ورنہ ترک کر دیتے۔ پڑوسیوں کا خیال رکھتے۔ مہمانوں کی تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ چہرۂ اقدس ہر وقت متبسم اور شگفتہ رہتا۔ جوتوں اور کپڑوں کو خود ہی پیوند لگالیا کرتے۔ سواری کیلئے گھوڑے، اونٹ اور دراز گوش پسند فرماتے۔ چادر کے گوشہ کو پانی میں بھگو کر خود ہی گھوڑے کے جسم کو صاف کرتے۔ آنحضرتؐ فال لینا بھی پسند کرتے تھے۔ فال لینے سے مراد ہے کہ جب آپ کسی کام میں مشغول ہوں تو کوئی نیک کلمہ کہ جس کے سننے سے خوشی محسوس ہو، اس کے کان میں پڑے۔

(مشل یں)

ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

حضرت راس المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز رح متوفی ۱۲۳۹ھ کی ذات با برکات علمی حلقوں
یں محتاج تعارف نہیں۔ آپ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزند ارجمند
ور ان کے جانشین تھے۔ آپ نے ساٹھ سال تک مدرسہ رحیمیہ دہلی میں حدیث شریف کا
رس دیا اور اس شان سے کہ برصغیر ہندوستان قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نغموں
سے گونج اٹھا۔ آج بھی ہندوستان و پاکستان و بنگلہ دیش کے اکثر محدثین کا سلسلۂ
سندِ حدیث آپ ہی پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔

حدیث رسول اللہ تو آپ کا مخصوص فن تھا۔ اس کے علاوہ ہر علم و فن میں آپ کو یدِ طولیٰ
حاصل تھا۔ آپ کے بقول ایک سو پچاس علوم و فنون آپ نے حاصل کئے تھے جن میں سے
نصف امت محمدیہ کی ایجاد تھے اور نصف دوسری قوموں اور ملتوں کے۔ دائرہ ارشاد و
ہدایت بھی بے حد وسیع تھا۔ طالبین سلوک و معرفت ہندوستان کے کونہ کونہ سے آتے
تھے اور اپنی باطنی پیاس بجھاتے تھے۔

والد محترم حضرت مولانا قاضی محمد بشیر الدین مرحوم و مغفور کو حضرت شاہ صاحب کے
علوم و فنون سے بڑا شغف تھا۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ وہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج
مرادآبادی کے متوسلین میں سے تھے اور حضرتؒ سے ان کو اجازتِ حدیث حاصل تھی۔ اور
جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں حضرت گنج مرادآبادی ہندوستان میں حضرت شاہ صاحب کے
بالواسطہ شاگرد تھے۔ اسی شغف کی بنیاد پر وہ حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات و افادات
کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ کہیں سے ان کو حضرتؒ کے ملفوظات کا ایک پرانا نسخہ ہاتھ
لگ گیا اور اسے ۱۳۱۴ھ میں اپنے مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع کرا کر شائع کر دیا
یہ نسخہ فارسی زبان میں تھا اور دریدہ و بوسیدہ بھی تھا۔ والد مرحوم نے

بنظرِ احتیاط جیسا کہ مقدمہ کتاب میں لکھا ہے اس میں تصرف کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے جوں کا توں شائع کر دیا۔ اس لئے اگرچہ اس میں جا بجا اغلاط ہیں، تاہم گراں بہا معلومات کا خزانہ ہے۔ اس زمانہ میں اس کا ایک ترجمہ بھی مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا۔ یہ بھی اغلاط سے پُر ہے۔

خاکسار مدیر، ناظرین کرام کے لئے سلسلہ وار اصل ملفوظات اور اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ ترجمہ میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ بامحاورہ بھی ہو اور اصل عبارت سے اس کا تعلق بھی قائم رہے۔ کہیں کہیں تشریحی نوٹ بھی دیدیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کی توفیق دے۔

افسوس ہے کہ جامع ملفوظات کے نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ ملفوظات ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے (جیسا کہ حضرت والد مرحوم نے لکھا ہے) کہ وہ حضرت شاہ صاحب کے اخص الخواص مسترشدین میں سے تھے جن کی جدائی سے حضرت شاہ صاحب کو بے حد صدمہ ہوا اور ایک جگہ ان کو سلوک و معرفت میں اپنے خلیفۂ خاص حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ کے مماثل بھی فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اما بعد۔ فقیر چون بار دیگر ۱۲۳۳ھ سیزدہم ماہ رجب روز دوشنبہ بشرف ملازمت زبدۃ المفسرین خلاصۃ المحققین جامع علوم ظاہری واقف فنون باطنی سیدنا ومرشدنا وہادینا حضرت مولانا مولوی شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی قدس اللہ اسرارہم مشرف گشت وبعد چہار روز استجازت کتابت بعضے از فوائد قولے وفعلے آنحضرت کہ احصائے جمیع آں دشوار است کرد یافت واز روز جمعہ شروع نمود وباللہ التوفیق۔

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد۔ فقیر جب دوسری مرتبہ ۱۳ رجب ۱۲۳۳ھ کو پیر کے دن زبدۃ المفسرین خلاصۃ المحققین جامع علوم ظاہری واقف فنون باطنی سیدنا ومرشدنا وہادینا حضرت مولانا مولوی شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت میں حاضری کی عزت سے مشرف ہوا، اور چار روز کے بعد حضرت سے کے بعض ارشادات وحالات کو لکھنے کی جس کا مکمل طور پر احاطہ کرنا دشوار تھا۔ اجازت مانگی اور (حضرت کی عنایت سے) مل بھی گئی

تو ۱۸ رجب کو جمعہ کے دن سے لکھنا شروع کر دیا)
و باللہ التوفیق۔

روز دوشنبہ بعد عصر در اثنائے مشی کہ معمول حضرت است شرف قدمبوسی حاصل کرد بعد استفسار خیر و عافیت جسمانی روحانی و اہلی و مالی از کسب اشتغال وغیرہ پرسیدند عرض داشتم کہ انشاء اللہ العزیز عرض خواہم داشت و در روز علی الاکثر پیغام و سلام علماء و مشائخ و اشتیاق قدمبوسی و بیعت احبائے خود مثل مولوی عسکری و غلام انبیا خانصاحب وغیرہ و محبت و جاں نثاری اکثر عقیدتمندان صوبجات بنسبت بحضرت و مریدان خصوصاً منشی نعیم الدین خانصاحب و محبی و عزیزی شیخ لطف علی و شیخ مبارک اللہ وغیرہ آنچہ بیاد می آمد مجملاً و مفصلاً گذارش ساختم و در تجویز مکان سکونت و آوردن اسباب و صاف نمودن گذشت۔

پیر کے روز عصر کے بعد ٹہلنے کے دوران جو حضرت کا معمول ہے، قدمبوسی کی عزت حاصل ہوئی۔ خیر و عافیت جسمانی و روحانی و خاندانی و مالی کے دریافت فرمانے کے بعد اشغال و اوراد کی مصروفیت کے متعلق سوال فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ العزیز کسی اور وقت عرض کرونگا اور دو روز تک اکثر اوقات علماء و مشائخ کے پیغام سلام اور اپنے احباب مثل مولوی عسکری و غلام انبیاء خانصاحب کا اشتیاق قدم بوسی و بیعت اور مختلف صوبجات کے عقیدتمندوں اور مریدوں خصوصاً منشی نعیم الدین خانصاحب اور محبی و عزیزی شیخ لطف علی اور شیخ مبارک اللہ وغیرہ کی محبت و جاں نثاری کا ذکر، مختصر اور مفصل جیسے جیسے یاد آتا رہا۔ حضرت کی خدمت میں کرتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ دن رہنے کے لئے مکان کی تجویز اور سامان فراہم کرنے اور اسے صاف کرنے میں گذر گئے۔ اس دوران میں

ارشاد شد۔ باعتبار سورہ آخر سورۃ اذا جاء کہ آں را سورہ نصر و فتح می گویند است خبر پیغام اجل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشتمل بود در جہت آنکہ چوں انواع نصرت بحضرت رسید و نتیجہ مطلب از بعثت بود بحصول انجامید حالا بیا۔

ارشاد فرمایا:- قرآن شریف کی سورتوں کے نزول کی ترتیب کے اعتبار سے آخری سورہ اذا جاء ہے جسے سورۂ نصر اور سورۂ فتح کہتے ہیں یہ سورہ اشارۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا پیغام آنے کی خبر تھی اس لحاظ سے کہ

ارشاد شد۔ کہ آنحضرت مصداق خبر

خلافت حضرت آدم و ختم آن از چہار نوع بود۔ مریدے عرض داشت کہ سوائے تفسیر ظاہر از آیات و احادیث و اقوال بزرگان نکات و لطائف کہ ارشاد می شود و بزرگان سلف فرمودہ اند مقصود گویندہ ہم بودہ باشد یا از قبیل فہمید عشاق از اقوال و احوال مختلف شعراء مثل خسرو و سعدی و حافظ حالت فنا و بقا و راز دنیا خود خواست۔ ارشاد شد مطلب قرآن کہ علم الٰہی است حاوی جمیع معلومات ازلی و ابدی است او تعالیٰ بے شبہ میدانست کہ فلاں ایں مطلب خواہد فہمید۔ آنچہ ہمہ می فہمند خواہد بود باقی بخیر.

جب ہر طرح کی رائے اللہ تعالیٰ کی مراد آپ کو حاصل ہو چکی اور جو مقصد آپ کی بعثت کا تھا (یعنی اشاعت اسلام) وہ حاصل ہو چکا تو فرمایا گیا۔ اسے پیغمبر اب ہمارے پاس آجائیے (یہ مضمون احادیث سے بھی ثابت ہے) ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلافت الٰہی کی اس خبر کے جو حضرت آدم علیہ السلام کو دی گئی۔ صحیح مصداق اور اس کے مقاصد کی تکمیل کرنیوالے چار اعتبار سے تھے عہ۵۔ ایک مرید نے عرض کیا کہ آیات و احادیث و اقوال بزرگاں سے جو تفسیر قرآن کی سمجھ میں آتی ہے اس کے علاوہ جو نکتے اور لطیفے آپ ارشاد فرماتے ہیں اور پچھلے بزرگوں نے بھی بیان کئے ہیں کہنے والے (اللہ تعالیٰ) کا مقصد وہی ہوتا ہے یا جس طرح مختلف شعراء جیسے خسرو، سعدی اور حافظ کے مختلف اقوال و احوال سے عاشق مزاج لوگ (اپنے اپنے ذوق کے مطابق) فنا و بقا اور راز دنیا کے حالات مراد لیتے ہیں، ایسے ہی یہ بھی ہوتے ہیں.

ارشاد فرمایا: قرآن شریف کا مطلب جو علم الٰہی ہے تمام ازلی و ابدی معلومات کو حاوی ہے اور بے شبہ اللہ تعالیٰ یہ بھی جانتا تھا کہ فلاں شخص یہ مطلب سمجھے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ (جو مطلب صاف طور پر سمجھا جاتا ہو اور سب اہل علم سمجھ سکیں معتبر وہی ہوگا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح.

عہ۵ یوں تو انسان ان اوصاف و کمالات کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، مگر یہ خلافت عامہ ہے خلافت خاصہ انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام تشریعی نافذ کرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کو بحیثیت نبی یہ منصب عطا فرمایا گیا تھا مگر خلافت خاصہ کے بھی مدارج ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کو اس کا درجہ اعلیٰ حاصل ہے اور وہ مقام خلافت الٰہیہ کے صحیح مصداق اور اس کے شرائط و مقاصد کے بدرجۂ کمال پورا کرنے والے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کی چار وجہیں بیان فرمائیں جو ناقل ملفوظات تحریر نہ کر سکے۔

قاضی زین العابدین سجّاد

کشمیر کا علمی سیمنار

مشاہدات و تاثّرات

(۱)

خطۂ کشمیر جنت نظیر کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح ظاہری حسن وجمال سے نوازا ہے باطنی عظمت وکمال سے بھی اسے سرفراز فرمایا ہے۔ اس صدی میں اس کے دو درخشاں نمونے رئیس المحدثین حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ اور ترجمان حقیقت علامہ محمد اقبال کشمیری کی صورت میں افق علم وادب پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ گزشتہ اکتوبر میں کشمیر کے ان دونوں قابل فخر فرزندوں کے علوم ومعارف پر حکومت کشمیر نے دو سیمینار منعقد کئے۔ ایک مسلم اوقاف ٹرسٹ جموں وکشمیر کے زیر اہتمام تھا اور دوسرا کشمیر یونیورسٹی کے زیر انتظام۔ حضرت استاذ علامہ سید انور شاہ کشمیری سے متعلق سیمنار میں یہ خاکسار بھی مدعو تھا اور خدا کا شکر ہے بعض وقتی موانع کے باوجود مجھے اس میں شرکت کا موقع ملا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو تقریباً ایک بجے میرٹھ سے روانہ ہوا۔ ۲½ بجے کے قریب دہلی جمعیۃ علماء ہند کے دفتر مسجد عبدالنبی پہنچا۔ نماز ظہر ادا کی۔ مولانا اسرار الحق ناظم جمعیۃ کے ساتھ چائے پی اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پالم ایرپورٹ روانہ ہوگیا۔ عزیز زین الراشدین سلمہٗ مجھے پہنچانے ہوائی اڈہ تک گئے تھے ہوائی اڈہ پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم سے نیاز حاصل ہوا۔ موصوف بھی اسی جہاز سے سری نگر تشریف لے جارہے تھے۔ اس اتفاقی رفاقت سفر سے بڑی خوشی ہوئی اور اطمینان بھی

عصر کی نماز میں نے ہوائی جہاز ہی میں ادا کی اور قصر ادا کی، حالانکہ اس کے لئے مجھے جگہ حاصل کرنے میں قدرے دشواری پیش آئی۔ جہاز میں ہندوستانی چند ہی تھے، بیشتر تعداد یورپین اور امریکن مردوں عورتوں کی تھی۔ ہر نوجوان مرد کے ساتھ ایک نوجوان عورت تھی جس کی ٹانگیں رانوں تک اور ہاتھ کاندھوں تک برہنہ تھے اور ہر ایک ہاتھ میں ایک بڑا طنبورہ تھا۔ جہاز فضا میں تیر رہا تھا، نیچے پہاڑی سلسلہ تھا۔ سرسبز درختوں کے بیچ میں سفید چشمے جاری تھے۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ سبز مخمل کے فرش پر جواہرات بکھرے ہوئے ہوں۔ منظر بڑا دل کش تھا، مگر دہشت ناک بھی۔ جب یہ خیال آتا تھا کہ ذرا سی انجن کی خرابی بادلوں کے اوپر سے زمین کی تہ میں پہنچا سکتی ہے تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ مگر جہاز کے یورپی مسافر اپنے بے خدا دنیا سے عشرت میں غرق سرمستی و بیخودی تھے۔ میں نے ان کو چڑانے کے لئے جہاز کے پچھلے حصہ میں اپنی چادر بچھا دی اور سر نیاز بارگاہ رب العزت میں جھکا دیا۔

جہاز تقریباً ۵ ½ بجے سری نگر کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ وہاں کشمیر کے ممتاز عالم اور لیڈر مولانا محمد سعید مسعودی اور کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی مولانا عبدالغنی ازہری اور بعض دوسرے اعیان استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان دونوں بزرگوں سے میری ملاقات پہلے سے تھی۔

کار کے ذریعہ تقریباً نصف گھنٹہ میں ایم۔ ایل۔ ایز ہوسٹل پہونچ گئے جہاں شرکاء سیمنار کے قیام کا انتظام تھا۔ پہلے نماز مغرب ادا کی۔ پھر چائے پی اس کے بعد مجھے میرے متعینہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

ہوسٹل جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کشمیر اسمبلی کے ممبران کی رہائش گاہ ہے۔ جس زمانہ میں اسمبلی کے جلسے نہیں ہوتے دوسرے لوگ بھی مقررہ کرایہ ادا کر کے اس میں ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ شہر کے پر فضا حصہ میں، شیخ محمد عبداللہ کی اپنی ذاتی کوٹھی کے بالکل سامنے ہے۔ کمرے وسیع اور صاف جدید لوازم تمدن سے آراستہ ہیں۔ میرا قیام تیسری منزل پر تھا۔ اس زمانہ میں میرٹھ میں رات کو ہلکی سی اونی چادر کافی ہوتی تھی۔ یہاں کمرہ ہیٹر سے گرم رہتا تھا۔ پھر بھی مجھے دو کمبل اوڑھنے پڑتے تھے۔ ایک کمبل مسہری کے گدے پر بھی بچھا لیا کرتا تھا۔ ایک رات اس پر بھی سردی معلوم ہوئی۔ صبح کو کمرہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک کھڑکی ذرا سی کھلی رہ گئی تھی۔

میں اپنے کمرہ میں تنہا ہی تھا، حالانکہ اس میں مسہریاں دو تھیں۔ دوسرے روز میری درخواست پر پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) میرے کمرے میں تشریف لے آئے۔ فاروقی صاحب مشہور صاحب قلم عالم اور ہمارے مخلص دوست مولانا نسیم احمد فریدی امروہی کے بھانجے ہیں۔ بڑا ستھرا تاریخی و علمی ذوق رکھتے ہیں۔ خاندان کے دوسرے اصحاب علم کی طرح، اردو کے چوٹی کے مجلات میں تاریخ و تصوف کے موضوعات پر گراں قدر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا اس سیمنار میں بھی موضوع بحث "حضرت شاہ صاحب کا مسلک طریقت" تھا۔ قدیم دینی اداروں کے علماء کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اکثر پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے برخلاف ان پر طنز و تعریض تو کجا،

کسی سے ان کے خلاف کوئی غیر مناسب لفظ سن لیتے ہیں زیر بہم ہو جاتے ہیں۔ تین چار روز ان کی رفاقت میں بہت لطف کے ساتھ گزارے۔

ہوسٹل میں سیمینار کے جو مندوبین مقیم تھے ان میں حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے علاوہ حسب ذیل اصحاب کے نام یاد ہیں:۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ مولانا سید انظر شاہ کشمیری۔ مولانا حامد الانصاری غازی۔ مولانا محمد عثمان ایم۔ ایل۔ اے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن (مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) مولوی سید ازہر شاہ قیصر مدیر رسالہ دارالعلوم۔ مولوی قاری عبداللہ سلیم۔ مولوی عبدالحق مولوی بدرالحسن ایڈیٹر الداعی دیوبند۔ ناشتہ اور کھانے پر سب ڈائننگ ہال میں جمع ہو جاتے تھے اور مختلف موضوعات پر دلچسپ مذاکرات رہتے تھے۔

سیمنار کا افتتاحی جلسہ ۱۰ر اکتوبر کو صبح دس بجے، کالج فار ایجوکیشن کے لان میں وسیع اور خوبصورت شامیانوں کے نیچے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں شروع ہوا۔ افتتاحی فاضلانہ خطبہ وزیر اعلیٰ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے پڑھا۔ آپ نے پہلے سرزمین کشمیر کی علمی و دینی تاریخ پر روشنی ڈالی، پھر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے فضائل و کمالات علمی و عملی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر کی گراں قدر تعلیمی سیاسی ملی وملکی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ خطبہ کے اختتام پر آپ نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اللہ اکبر اور علامہ انور شاہ کشمیری زندہ باد کے نعرے لگائے۔ شیخ صاحب کے خطبۂ افتتاحیہ کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی پراثر اور جامع تقریر فرمائی۔ سیمنار کے اعلانات چونکہ ریڈیو، اخبارات اور اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ بہت وسیع پیمانے پر ہوئے تھے، اور آج خود شیر کشمیر اس کا افتتاح کرنے والے تھے۔ اس لئے عوام وخواص بہت بڑی مقدار میں شریک تھے۔ بیرونی مندوبین کے علاوہ ڈائس پر علماء کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی، میر واعظ مولانا محمد فاروق۔ مفتی جلال الدین مفتی بشیر الدین وغیرہم اور حکومت کشمیر کے وزراء اور افسران تشریف فرما تھے۔ نیچے لان میں ہزارہا کی تعداد میں سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ اس کے بعد ۱۲ر اکتوبر کی صبح تک دونوں وقت کالج کے ہال میں جلسے ہوتے رہے۔

جن میں مذکورالصدر علماء و فضلاء اور کشمیری اصحاب علم وفضل نے اپنے اپنے مقالات پڑھے، اور حضرت علامہ کشمیری کے کمالات علمی وعملی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مقالات سب ہی بڑے پُرمغز، محققانہ اور معلومات افزا تھے۔ سری نگر ریڈیو اور کشمیر کے اردو روزناموں آفتاب، سری نگر ٹائمز، آئینہ اور نوائے صبح میں سیمنار کی مفصل کارروائی اور مقالات کے خلاصے شائع ہوتے رہے۔

میرے مقالے کا عنوان تھا "حضرت علامہ کشمیری کا ذوقِ تفسیری" حضرت شاہ صاحب کا علوم حدیث میں منفرد مقام تھا اس کا تو علماء عرب وعجم سب ہی نے اعتراف کیا ہے، مگر علوم تفسیر میں ان کو جو ید علیا حاصل تھا اس کا نسبتاً کم لوگوں کو علم ہے۔ میں نے ان کے کمالات کے اس پہلو کو اس مقالہ کے لئے انتخاب کیا۔ چنانچہ قرآن کریم کے چند عجیب اور معرکۃ الآرا مباحث کو انتخاب کر کے پہلے قدیم وجدید مفسروں کی رائیں بیان کیں، پھر حضرت شاہ صاحب کی رائے عالی کو پیش کیا، جس سے حضرت موصوف کی انفرادیت وعبقریت واضح ہو جاتی ہے۔ مقالہ پیش کرنے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ ان چند واقعات کا ذکر کر دوں جو خود میرے ساتھ پیش آئے یا جو میری نظر سے گذرے، تاکہ وہ صحیح طور پر ریکارڈ ہو جائیں۔ اس کی ضرورت اس لئے اور بھی محسوس ہوئی کہ مسیح الملک اجمل خاں کی وفات پر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے زمانے میں، میں نے جو عربی مرثیہ لکھا تھا اور مجمع عام میں مصروف گفتگو ہوتے ہوئے حضرت الاستاذ نے قلم برداشتہ اس پر جو اصلاح دی تھی اور اس اصلاح میں مصرعے کے مصرعے بدل دیے تھے اس کا ذکر مختلف طور پر کئی مقالہ نگاروں نے کیا تھا، اور ان میں جزوی اختلاف بھی تھا۔ مجھے پون گھنٹہ دیا گیا تھا۔ وقت کا تقریباً نصف حصہ ان واقعات کے تذکرہ میں صرف ہو گیا، بقیہ نصف میں میں مقالہ کا ایک حصہ پڑھ سکا۔ مکمل مقالہ منتظم جلسہ مولانا عبدالغنی الشاشی الازہری نے لے لیا۔ انشاء اللہ دوسرے مقالوں کے ساتھ وہ بھی چھپ جائے گا۔

۲۱ اکتوبر کی صبح کی نشست پر سیمنار ختم ہو گیا۔ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اختتامی تقریر اور دعا فرمائی۔

یہ جمعہ کا دن تھا اور نماز جمعہ کا پروگرام یہاں کی مقدس اور حسین وجمیل زیارت گاہ حضرت بل میں رکھا گیا تھا۔ حضرت بل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک محفوظ ہے

جسے تاریخی استناد حاصل ہے۔ زیارت گاہ کے برابر میں سنگ مرمر کی ایک شاندار اور خوبصورت مسجد زیر تعمیر ہے۔ یہ مقدس عمارت محل وقوع کے لحاظ سے بڑی نظر افروز ہے۔ اس کے قدموں کو کشمیر کی مشہور جھیل چومتی ہوئی گذر رہی ہے، اور جھیل کے پار بلند و بالا پہاڑ اس کے سامنے اپنی گردن خم کئے ہوئے نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

نماز حضرت مہتمم صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد جلسہ کا انتظام تھا۔ جلسہ زیر اعلیٰ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں تھا۔ پہلے شیخ صاحب نے کشمیری زبان میں صدارتی تقریر فرمائی۔ پھر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے مختصر اور مولانا محمد طیب صاحب نے مفصل تقریر فرمائی جیسے ہی جلسہ ختم ہوا کشمیری مرد، عورتیں اور بچے شیخ صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے دیکھا کہ بعض عورتیں بچوں کو گود میں لئے ہوئے شیخ صاحب کا ہاتھ ان کے سروں پر پھروا رہی تھیں۔

میں شیخ صاحب کے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے شیخ صاحب کو اس عظمت و احترام کا مقام اپنی قوم میں حاصل ہونے پر انہیں مبارکباد دی۔ شیخ صاحب نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا "یہ ان لوگوں کا حسن ظن ہے میں تو کچھ بھی نہیں"۔

شنیدہ ہے ؎ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

(باقی)

ضروری گذارش

الحرم کا یہ شمارہ الحرم کے پرانے خریداروں اور ان اصحاب کرم کی خدمت میں جو علمی و دینی ذوق اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا جذبہ رکھتے ہیں بطور نمونہ ارسال کیا جا رہا ہے۔

ایسے زمانہ میں جبکہ باطل اپنی تمام قوتوں کے ساتھ حق کے مقابلہ پر صف آرا ہے، اگر ہماری اس ناچیز کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو از راہ کرم اس کی خریداری منظور فرمائیں اور چندہ سالانہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر شکر گذار فرمائیں کیونکہ وی پی کی صورت میں دو روپے زائد خرچ ہوں گے لیکن اگر فی الحال یہ ممکن نہیں ہے تو از راہ کرم ایک کارڈ کے ذریعہ اطلاع دیں۔ ہم اس عنایت کے بھی شکر گذار ہوں گے

منیجر الحرم ۔ ۲۱۱۷، قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ورقِ خواتین

منیبہ خاتون۔ قاضیہ
ایم۔ اے (پریویس)

اسلام میں پہلی شہید خاتون

حضرت سمیہ رضؓ

کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا' یہ غلط ہے' بلکہ اسلام تلوار کے سایہ میں پھیلا ہے۔ جب سرزمین عرب سے توحید کی صدا بلند ہوئی تو اس پکار پر لبیک کہنے والے مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی تھیں۔ ان عورتوں نے راہ خدا میں جس طرح تکلیفیں اٹھائیں اور جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا وہ ہر دور میں خواتین اسلام کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

ابتدا میں اسلام لانا جس قدر مشکل تھا آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو عورتیں اور مرد اسلام قبول کرتے ان کے لئے اس کا اظہار بہت مشکل ہوتا لیکن کفار کے حد درجہ ظلم و ستم کے باوجود صحابہؓ کے ساتھ ساتھ صحابیاتؓ بھی نہایت جرأت و بیباکی کے ساتھ اپنے اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کے پرچم تلے لوگوں کو جمع کرنے کے لئے پکارا تو بہت کم ایسے لوگ تھے جنھوں نے لبیک کہا' اور عظیم اکثریت شدید مخالف ہوگئی' لبیک کہنے والوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ تھیں' پھر اعلان اسلام کرنے والوں میں جہاں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت بلالؓ حضرت صہیبؓ تھے حضرت عمارؓ کی والدۂ محترم حضرت سمیہؓ کا ساتواں نمبر تھا۔

آئیے آج اس خاتون کی سیرت کے چند پہلوؤں کا مطالعہ کریں جس نے حق کی خاطر دنیا کا ہر ممکن ظلم برداشت کیا' مگر کوئی ظلم اس مومنہ کے پائے استقامت کو نہ ڈگمگا سکا اسے سربازار رسوا کیا گیا' مگر اسلام کی عزت کو ذاتی عزت و توقیر پر کبھی آنچ نہ پڑھنے دیا۔ آج کتنے مرد اور خواتین ہیں جو اسلام کی عزت پر دھبہ نہ آتے دیکھ سکتے ہوں۔

حضرت سمیہؓ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کو کفار نے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔

ان کو تپتی ہوئی ریت پر عرب گرمی میں لوہے کی زرہ پہنا کر لٹا دیا جاتا، مگر ان کے صبر وثبات میں کوئی فرق نہ آتا۔

ان کے اسلام لانے کا حال جب ابوجہل کو معلوم ہوا تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے ان پر وہ ظلم ڈھائے کہ جن کے تصور ہی سے بدن کانپ جاتا ہے۔ اس ظالم بدبخت نے ان کے گھر کو نذر آتش کر دیا، ان کو بالوں سے پکڑ کر بازاروں میں گھسیٹا۔ آپ کے بیٹے حضرت عمار اور آپ کے شوہر حضرت یاسرؓ کو بھی خوب تکلیفیں دی جاتیں۔ ان کو ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹتے پھر خنجروں سے کچوکے لگاتے، جب ان کا جسم لہولہان ہو جاتا تو ٹھٹھے بر علائے جاتے دشمن بھی آپ کے صبر وضبط کا اعتراف کرتے۔

حارث اپنے بھائی عکرمہ سے کہتا کہ "تم نے سمیہ کو نہیں دیکھا جب اسے کوڑوں سے پیٹا جا رہا تھا، اس کا جسم دوہرا ہو جاتا تھا مگر اس کی زبان سے نہ درد وکرب کا اظہار ہوا اور نہ اس نے زیادہ فغاں کی"۔

ایک دن جب ان کو اس قسم کی اذیت ناک تکلیفیں دی جا رہی تھیں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپ کو دیکھ کر وہ پکارنے لگیں "میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا صبر کرو اے آلِ یاسر اس تکلیف کے بدلے تمہیں جنت عطا ہوگی۔

حضرت سمیہؓ نے مسلسل یہ دکھ سہے۔ ایک روز گھر آ رہی تھیں کہ ابوجہل حسب معمول گالیاں دینے لگا اور اسلام ترک کرنے کا مطالبہ کیا۔ حق پرست، سمیہؓ نے ظلم وتشدد کے مجسمے کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہا:۔

"خدا تیرا اور تیرے جھوٹے خداؤں کا برا کرے"

جواب سنتے ہی نابکار نے مشتعل ہو کر برچھی سے حملہ کیا جس سے آپ جاں بحق ہو گئیں آپ راہِ حق کی پہلی مجاہدہ تھیں جن کو شہید کیا گیا۔

آپ نے مسلمان عورتوں کے لئے ایسی مثال قائم کر دی جس پر چل کر وہ اسلام کو غالب کر سکتی ہیں۔ صبر واستقلال کا پیکر۔ سراپا اسلام محبتِ رسولؐ میں غرق، دین کی خاطر مصائب پر صابرہ۔ کیا کیا صفات تھیں جن کا تذکرہ کیا جائے۔ رحمۃ اللہ علیہا۔

❖ ❖ ❖

تہذیب اسلامی!

عفو و درگذر

مخالف کی بات صبر و تحمل سے سننا اور طاقت ہوتے ہوئے بھی انتقام نہ لینا انسانیت کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح سے آشنا ہو جائے تو اس کے اندر یہ اعلیٰ اخلاقی وصف لازمی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی دوستی اور دشمنی کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں ہوتی بلکہ خالصتاً اللہ کے لئے ہوتی ہے اس ضمن میں اسلامی تاریخ کے واقعات ملاحظہ فرمائیے

اسلام اور کفر کے مابین فیصلہ کن معرکہ ہو رہا تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق آمنے سامنے کی اس جنگ میں شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک مشرک پہلوان کے ساتھ مصروف جہاد تھے۔ کافی دیر جدوجہد فرمانے کے بعد آپ نے اپنے حریف کو زمین پر گرا لیا اور اسے بے بس کر کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے یہ ایک موقع تھا کہ سرکش سے سرکش شخص پر بھی ہیبت طاری ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن خدا جانے عرب کی آب و ہوا میں کیا تاثیر تھی کہ مغلوب دشمن ایسے نازک موقع پر بھی بے حوصلہ نہ ہوا۔ اس نے اور کچھ چارہ کار نہ دیکھا تو حضرت علیؓ کے چہرۂ مبارک پر اپنے منہ کا گندہ لعاب پھینک دیا۔ یہ اس کی آخری منتقمانہ کوشش تھی اور اس کے بعد وہ یہی توقع کر سکتا تھا کہ تیز دھار والا خنجر اس کی گردن پر رواں ہوا اور زندگی کے رشتے کو جلد از جلد منقطع کر دے۔ لیکن جب اس نے یہ ذلیل حرکت کی تو حضرت شیر خداؓ فوراً اس کے سینے سے الگ ہو گئے۔

مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کافر کے لئے حضرت علیؓ کا یہ رویہ حیران کن تھا۔ اس نے تعجب کے ساتھ سوال کیا۔ اے علی یہ کیا؟ میں نے تو یہ حرکت اس خیال سے کی تھی کہ آپ کو غصہ آئے گا اور میں موت کی آغوش میں جا کر ذلت کی ذلت سے

جلد از جلد نجات حاصل کروں گا۔
اپنے مخالف کی یہ بات سن کر حضرت شیرِ خدا نے فرمایا۔ پہلے تیری اور میری لڑائی صرف خدا کے لئے تھی، لیکن جب تو نے یہ حرکت کی تو مجھے تیرے اوپر غصہ آگیا۔ اب اگر ایسی صورت میں میں تجھے قتل کرتا تو یہ فعل میری ذات کی تسکین کے لئے ہوتا۔ بس اسی خیال سے میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ جا اب تو آزاد ہے۔
اصول پرستی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، تمام مستند مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ بڑے بڑے سرکش اور جابر آپ کے سامنے آتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ لیکن انھیں حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے:۔
آپ کی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو خوش حالی نصیب ہوئی تو ایک رجحان یہ پیدا ہوا کہ شادی کے وقت لڑکیوں کا حق مہر زیادہ سے زیادہ مقرر کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے ذاتی طور پر اس رجحان کو ایک بڑی معاشرتی خرابی خیال فرمایا اور اسی مطلب کا ایک حکم جاری کر دیا کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کے مہر زیادہ مقرر نہ کرائیں۔
ایسے با اصول اور اپنے احکام پر سختی کے ساتھ عمل کرانے والے خلیفہ کا فرمان صادر ہونے کے بعد کس کی مجال تھی کہ سرتابی کرتا۔ لیکن ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک ضعیف العمر خاتون نے آپ کا راستہ روک لیا اور درشت لہجہ میں گویا ہوئی۔ اے عمرؓ جب اللہ اور اس کے رسولؐ نے عورتوں کے حق مہر کے بارے میں کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی تو اس سلسلے میں تجھے یہ حق کس طرح پہنچتا ہے؟
حاکم اعلیٰ کے وقار اور حکومت کی مصلحت پر نظر کی جائے تو اس خاتون کی یہ جسارت ایک قسم کی گستاخی تصور کی جانی چاہئے تھی لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی بات کو نہایت تحمل سے سنا اور اس کی دلیل سے قائل ہو کر اسی وقت اپنا حکم واپس لے لیا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے چند معزز مہمانوں کے ہمراہ کھانا تناول فرما رہے تھے غلام شوربا کا پیالہ لئے کر آیا تو کچھ ایسا ہوا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سارا شوربہ حضرت امامؓ کے اوپر گرا اور آپ کا لباس خراب ہو گیا۔
عرب معاشرے میں غلام کی حیثیت ایک پالتو جانور سے بھی کم تھی معمولی معمولی خطاؤں پر

انھیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ غلام لرزکر رہ گیا اور اضطراب کی حالت میں قرآن حکیم کی وہ آیت پڑھی جس کا مطلب ہے اللہ پاک درگذر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غلام کی یہ بات سن کر حضرت امام رضؓ مسکرا پڑے، اور فرمایا جا ہم نے تیری یہ خطا معاف کی۔

غلام کے حواس بجا ہوئے تو مومن کی پاک طینت سے اور فائدہ حاصل کرنے کا خیال آیا۔ قرآن حکیم کی دوسری آیت تلاوت کی جس کا مطلب ہے اللہ پاک احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور حضرت امامؓ نے اسے اب بھی مایوس نہ کیا، فرمایا:- جا ہم نے تجھے آزادی بھی بخشی۔ (ایشیا۔ لاہور)

بیانُ اللّسان

مکمل و مستند عربی اردو ڈکشنری

از: قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھی

یہ لغت اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اسکی بے نظیر خصوصیات نے اسے مقبولِ خاص و عام کر دیا ہے۔ علماء، طلباء اور عام شائقین سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں۔

خصوصیات: (۱) تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات محاورات کا جامع ذخیرہ (۲) قرآن کریم کے تمام لغات و اصطلاحات کا مجموعہ (۳) مصر و شام وغیرہ میں مستعمل جدید الفاظ کی تشریح (۴) ہر لفظ کی مادّہ سے قطع نظر اپنی اصلی صورت میں انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر ترتیب (۵) ہر عربی لفظ باعراب (۶) ہر لغت سے متعلق ضروری امور و عبارت و جمعیت، تذکیر و تانیث، باب و صلہ وغیرہ کی توضیح (۷) بنظر اختصار اشارات و رموز کا استعمال (۸) زبان سادہ و شگفتہ (۹) شروع میں قواعد عربی پر مشتمل ایک جامع رسالہ (۱۰) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے قلم سے محققانہ مبسوط مقدمہ۔

چند رائیں: — شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند فی الحقیقت یہ کتاب اپنی خوبیوں اور محاسن میں اس کی محتاج نہیں ہے کہ اسکی مدح سرائی میں قلم اور زبان کو کام میں لایا جائے "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" ● مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلویؒ صدر جمعیۃ علماء ہند: — اس کتاب کی ترتیب اور تہذیب اور حل لغات کا طرز اسقدر سہل ہے کہ ادنیٰ استعداد والے بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب انشاء اللہ تعالیٰ اہل علم اصحاب فن کے نزدیک ایک جدید مفید اور جامع کتاب سمجھی جائیگی ● حضرت مولانا عبدالماجد مدیر صدق جدید لکھنؤ: — تحقیق و تفصیل کے لحاظ سے قدیم عربی لغات کے نقش قدم پر، خوش ترتیبی اور سہولتوں کے لحاظ سے جدید انگریزی ڈکشنریوں کا نمونہ طبع جدید۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ کاغذ [illegible]

قیمت مجلد [illegible]

قاموس القرآن

قرآنِ کریم کی مختصر انسائیکلوپیڈیا

تالیف :- قاضی زین العابدین سجاد - میرٹھی

پہلی مستند مکمل و مدلل جامع قرآنی لغت جس نے اردو زبان کے ایک اہم خلاء کو پر کر دیا ہے

خصوصیات کتاب :- (۱) الحمد سے الناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی لکھنے کے بعد ان کی مکمل لغوی، صرفی و نحوی تشریح درج کی گئی ہے۔

(۲) تمام اہم الفاظ قرآنی پر سلف صالحین کی مستند تفاسیر و متاخرین محققین کی معتبر تشریحات کی روشنی میں سادہ و شیریں زبان میں جامع و مفصل نوٹ لکھے گئے ہیں۔

(۳) عصر حاضر کے بہت سے اقتصادی، تمدنی و معاشرتی مسائل بھی جا بجا زیر بحث آگئے ہیں۔

(۴) ہر جگہ ماخذ کے حوالے بقید صفحات دیئے گئے ہیں اور حوالوں کی اصل عبارت مع ترجمہ درج کی گئی ہے

(۵) زبان شستہ و شیریں اور انداز بیان شگفتہ و دلنشیں اختیار کیا گیا ہے۔

چند رائیں :- حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند: اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض لغات قرآنی کا حل نہیں ہے بلکہ بہت سے مضامین قرآنی کا بھی ایک قابل قدر ذخیرہ ہے ● حضرت مولانا محمد شفیع مفتی اعظم کراچی :- اردو زبان میں جتنے لغات قرآنی میری نظر سے گذرے ہیں بلا مبالغہ قاضی صاحب موصوف کا قاموس القرآن ان میں بے نظیر ہے ● حضرت مولانا ابو الحسن علی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ :- جہاں تک نظر پڑی آپ نے بڑا کارآمد مواد جمع کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے اساتذہ نے خاص طور پر پسند کیا اور داد دی ● حضرت مولانا محمد شاہد فاخری خانقاہ اجملی الٰہ آباد :- قاموس القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ماشاء اللہ بہت نفیس کتاب ہے۔

طبع سوم - کتابت و طباعت اعلیٰ - کاغذ چکنا سفید - سر ورق نظر افروز

صفحات آٹھ سو قیمت مجلد پندرہ روپے

منیجر مکتبہ علمیہ، قاضی منزل، قاضی اسٹریٹ میرٹھ

FEB 1978 ALHARUM' DELHI REGD No D(D) 70
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWS PAPER
R. N. No. 28987/77

مجلس معارف اسلامیہ دہلی

سیرتِ طیبہ

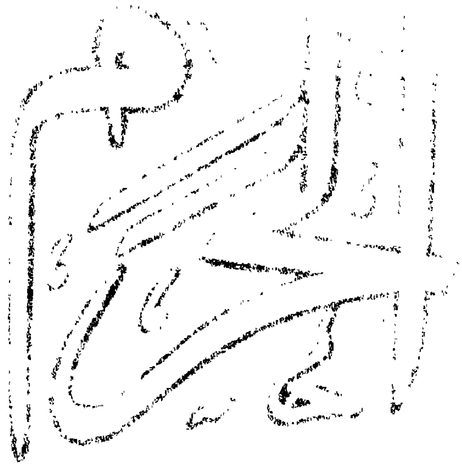
محبوبِ خدا محمد مصطفیٰ

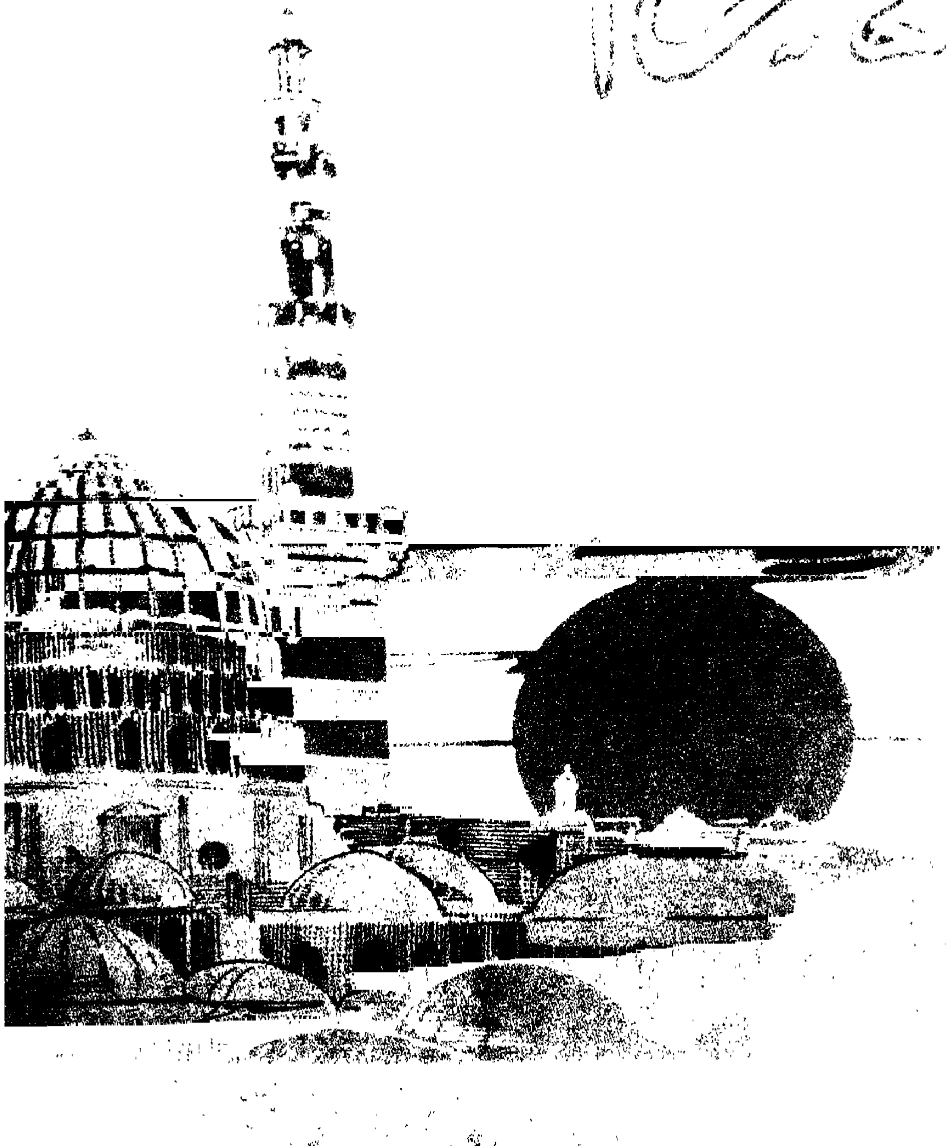
صلی اللہ علیہ وسلم

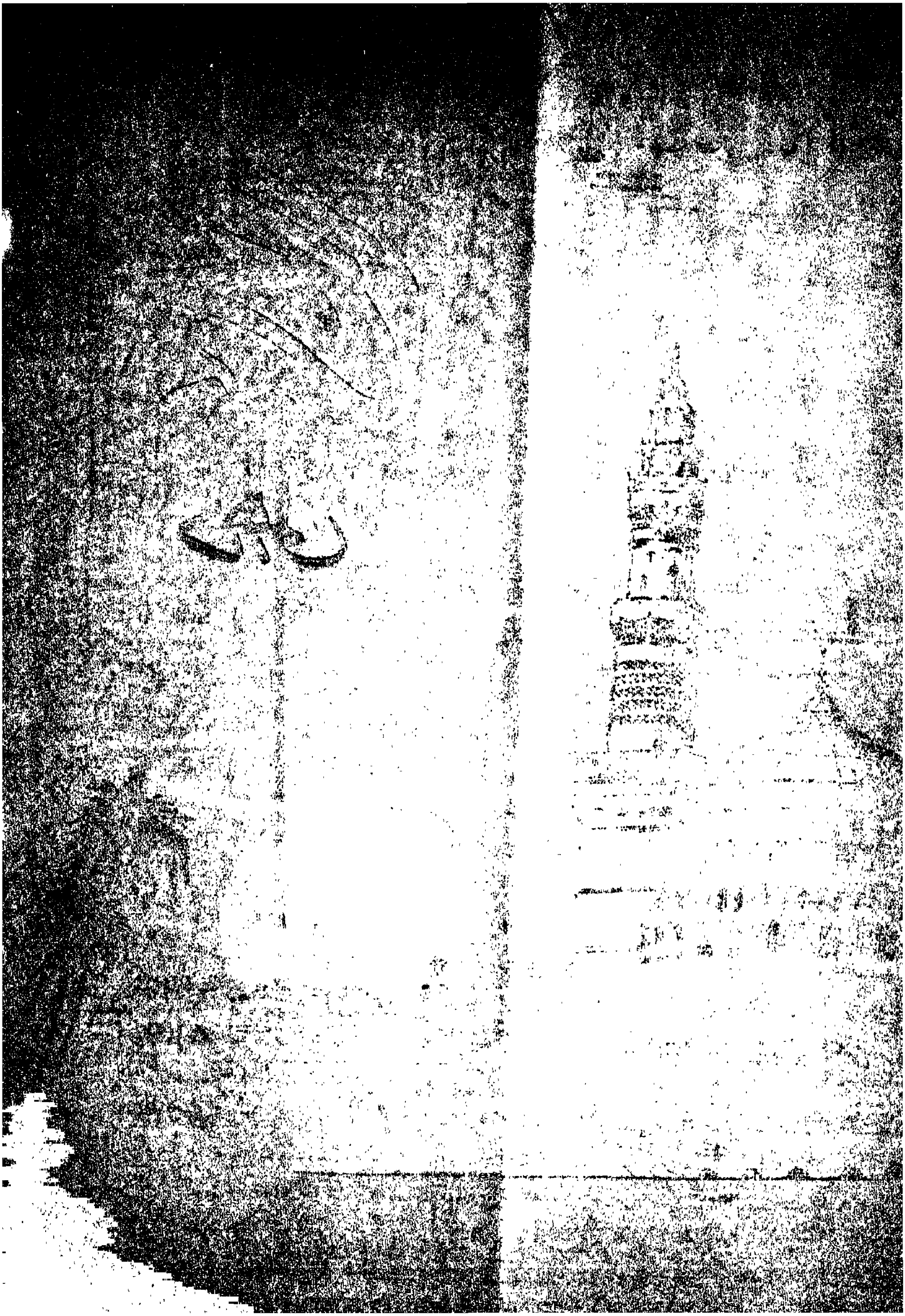
قرآن کریم، حدیث شریف، اور مستند کتبِ سیرت کی بنیاد پر
شیریں زبان اور دل کش اندازِ بیان میں واقعاتِ سیرت
اور اُن پر بصیرت افروز تبصرے

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
استاذ تفسیر و تاریخ اسلام جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

Price Rs. 7/50







علمی دینی و تبلیغی ماہنامہ

الرحیم

دہلی

مدیر اعلیٰ

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

مدیران

ظہیر ہاشمی - بی اے علیگ

[illegible] عبدالمعز صدیقی (فاضل دیوبند)

ایم اے، پی، ایچ، ڈی

چندہ سالانہ

ہندوستان سے بارہ [illegible]

پاکستان سے بیس [illegible]

بنگلہ دیش [illegible]

چندہ ششماہی (ہندوستان) [illegible]

فی پرچہ [illegible]

[illegible]

[illegible] قاضی زین الراشدین [illegible]

بیت الحکمت ۲۱۱۷ قاسم جان اسٹریٹ - دہلی ۶

شعبہ فرنش - قاضی منزل - قاضی اسٹریٹ - میرٹھ ۲

[illegible]

ماہ محرم الحرام

بسمہ تعالیٰ

مین

مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ تسلیم کیا جائیگا؟

[illegible]
...کے مسائل میں، مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے [illegible]
...رسول کے خوابوں کی تعبیر ہے۔
...اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی گئی، اور ایک ایسے جھگڑے کو بہانہ بنا کر جو جماعتوں اور تحریکوں کی زندگی میں ...
...ار کو ختم کر دیا گیا، بالفاظ صحیح تر اس کی جان نکال لی گئی مسلمانوں کی ایک جماعت اپنی بے دانشی یا سادہ ...
...یورٹ میں لے گئی تاکہ اقلیتی ادارہ ہونے کی حیثیت سے۔ دفعہ کے تحت حکومت کی مداخلت سے اسے ...
...تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور وہ عاملہ اور آگے بڑھ گیا۔
...ہی جگہ بجا و صحیح مگر تاریخ کے اوراق کاٹ کر نہیں پھینکے جا سکتے اور حقائق نہیں جھٹلائے جا سکتے کہ ...
...م نے اس ادارہ کے مقاصد کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا ... [illegible]
...ا سرگنہ
...ریسلم نے، ۱۹۲۱ء میں بیس لاکھ روپے (جو آج کل کے دو کروڑ روپے کے برابر ہیں) جمع کر کے انگریزی حکومت کی ...
...ر کیا تھا۔
...کے نام کا جزو قرار دیا گیا ہے۔
...سلامی ملکوں کے سربراہوں اور معزز مہمانوں نے اس عظیم ادارے کا تعارف اسلامی ادارہ ہی کی حیثیت سے ...
...سماجیات کی اس خبر سے قدرے اطمینان ہوا کہ جنتا حکومت نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو ...
...ہو سکتے اور اگر اس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ رکاوٹ ہے تو اس رکاوٹ کو دور ہونا ہے ...
...یک اسپیشل کمیٹی اس غرض سے قائم کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے جمہوری طور پر نام کرنے ... [illegible]
...مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر پی۔ سی۔ چندر، مسٹر سکندر بخت اور ... [illegible]
...ہے جو سابقہ حکومت نے پروفیسر نور الحسن وزیر تعلیم کے دور وزارت میں ... [illegible]
...البتہ کس حد تک پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ قرار ... [illegible]
...دشواریوں کو دور کرنے کے لئے آئین میں ترمیم کرنی ہوگی۔
...توقعات پوری ہوں اور مسلمانوں کے دل کا یہ کانٹا نکل جائے

[illegible] ہمدردی [illegible] حیثیت تعلیمی اداروں کے [illegible]

[illegible]

[illegible] وغیرہ۔

گزشتہ تیس سال میں ہندوستان میں اقلیتیں ظلم، بے انصافی، حق تلفی، تعصب اور تنگ نظری کا [illegible] سب سے زیادہ پریشان مسلمان ہی رہے ہیں جنہیں اپنی عظیم عددی حیثیت کی بنا پر سب سے بڑی اقلیت کی [illegible] اقلیت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

مسلسل فرقہ وارانہ فسادات، مسجدوں، قبرستانوں اور اوقاف پر ناجائز قبضے، اردو کے خلاف متعصبانہ طرز عمل، قومی تعلیمی اداروں کے نصاب میں فرقہ وارانہ ذہنیت کی آمیزش، اسلامی تعلیمی اداروں کو ختم کرنے کی کوشش، مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی [illegible] پرسنل لاء میں مداخلت یہ سب وہ شکایتیں ہیں جن کے خلاف تیس سال سے مسلم جماعتیں اور اخبارات [illegible] حکومت برسوں میں سیسہ پگھلائے بیٹھی رہی۔

یہ مسلمانوں کے غم و غصہ کی آگ تھی جس نے گزشتہ پارلیمانی الیکشن میں، آنکھوں دیکھتے دیکھتے، کانگریس حکومت کا تیس سالہ قصر عظمت بھسم کر ڈالا۔

جنتا پارٹی نے اس موقعہ پر مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے، دوسرے وعدوں کے ساتھ اقلیتی کمیشن مقرر کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ جہاں تک کمیشن مقرر کرنے کا تعلق ہے یہ وعدہ پورا کر دیا گیا ہے، مگر ہمیں شک ہے کہ یہ مسلمانوں کے [illegible] ہو سکے گا یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں اور سب سے زیادہ شکایتیں بھی [illegible] کمیشن کا چیرمین، اگر واقعی جنتا حکومت مسلمانوں کی شکایات دور کرنا چاہتی تھی، کسی ایسے مسلمان کو بنانا چاہیے تھا [illegible] کو اعتماد ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی خواہش بلکہ ان کے مطالبہ کو نظر انداز کر کے ایک [illegible] چیرمین بنا دیا گیا ہے جو ہندوستان کی سب سے چھوٹی اقلیت ہوتے ہوئے بھی سب سے زیادہ خوش حال [illegible]

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

دوسری بات کمیشن کی عدالتی حیثیت سے متعلق ہے۔ اعلان میں کہا گیا ہے کہ کمیشن صدر جمہوریہ کو سالانہ رپورٹ پیش کرے گا جس میں اس کی تحریکات اور سفارشات کی تفصیل درج ہوگی [illegible]

[illegible] ذمہ داری [illegible] کا کام ہے۔

امام حرم محترم ہندوستان میں

[illegible] امام حرم محترم، الشیخ [illegible] عبد [illegible] وطن [illegible] ہوئے [illegible] تشریف لے گئے، پھر لکھنؤ سے کلکتہ ہوتے ہوئے بنگلہ دیش تشریف لے گئے۔

دہلی میں تو عام مسلمان ان کی زیارت سے محروم ہی رہے، صرف چند مخصوص حضرات ہی ان کی زیارت سے [illegible] جن ان کے ساتھ کھانا کھایا اور جو الیسی چھوٹی چھوٹی مجلس کا ہونا ہی ان کا خیر مقدم کیا گیا جس کے منتظمین ان حضرات سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاتھوں میں ان کا پروگرام تھا۔ ندوہ مدرسہ عالیہ پوری جا سکے۔ نہ مدرسہ امینیہ اور نہ جامع [illegible] ہندوستان عظیم ترین دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند بھی، کچھ دور نہ تھی مگر لکھنؤ میں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا، اخباری اطلاعات کے مطابق، جیسے ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی آمد کی اطلاع پہنچی، ندوۃ العلماء کے کارکنوں نے لکھنؤ شہر کے [illegible] اور مختلف دینی تعلیمی سماجی تنظیموں کے ذمہ داروں اور عہدہ داروں کی مشاورت نشست طلب کی، باہم مشورہ سے پروگرام بنایا گیا، [illegible] کی برکت تھی کہ لکھنؤ میں امام حرم مکی اور ان کے معزز رفقاء کا ایسا زبردست استقبال ہوا اور ایسے عظیم اجتماعات منعقد ہوئے جن کی مثال لکھنؤ کی تاریخ میں شاید ہی ملے۔ لاکھوں انسانوں کے ہجوم نے نظم و ضبط کا جو مظاہرہ کیا اس سے [illegible] اور حکومت کے ذمہ دار انگشت بدنداں تھے۔"

بہرحال، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء کے تدبر اور حسن انتظام سے لکھنؤ میں دہلی کی غلطی کا اعادہ نہیں [illegible] اسی طرح کلکتہ میں بھی امام حرم کا شایان شان استقبال ہوا اور لاکھوں شمع حرم کے پروانوں نے ان کے لئے دیدہ و دل [illegible]

امام حرم محترم حرم شریف کی اپنی بلند نسبت کی وجہ سے عالم اسلام کے قلب و نگاہ کا محور ہیں اور ہر طبقہ اور فرقہ کے مسلمان ان [illegible] عقیدت و محبت کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، یہ سطور اسی جذبہ اور تعلق کی بنا پر ہم سپرد قلم کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ [illegible] اور [illegible] اسلامی ملکوں کے سفارت خانے اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے اور عالم اسلام کی بلند پایہ [illegible] کسی خاص جماعت یا فرقہ کے لئے مخصوص نہ ہونے دیں گے۔

امام حرم کا پیغام

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے وسیع کمپاؤنڈ میں، ندوۃ العلماء سامعین کو خطاب کرتے ہوئے امام حرم محترم نے فرمایا ——

ہمارے اور آپ کے درمیان اسلام کا رشتہ ہے اور یہ تعلق دنیا کے تمام تعلقات سے زیادہ قوی ہے، ہم صرف اسی رشتہ اخوت کے باعث اپنی دعوت پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ یاد رکھیے اسلام دنیا کے تمام مذاہب میں اس حیثیت سے منفرد ہے کہ وہ ایک مکمل نظام حیات کا حامل ہے اور صرف یہی نظام دنیا کو تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے اسی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ آفتاب اسلام کے طلوع کے بعد دنیا میں کسی دوسرے مذہب کی گنجائش نہیں ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ اور جو کوئی شخص اس کے سوا کوئی مذہب اختیار کرتا ہے وہ مسلسل خسارہ میں ہے۔ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ [illegible] اسلام کی [illegible]

[illegible] زندگیوں میں جاکر ہی ہم نوع انسان کی کوئی خدمت کر سکتے ہیں۔

[illegible] اتحاد و اتفاق کا سبب ہے۔ وہ اختلاف و نزاع باہمی سے روکتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ اپنے تمام جزوی اختلافات پس پشت ڈال کر دین کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیجئے۔"

ماہنامہ الحرم کا یہ پیغام [illegible] الحرم کا پیغام ہے۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

مدارس اسلامیہ کنونشن:- مدارس اسلامیہ کی اہمیت و افادیت ارباب دانش پر مخفی نہیں۔ برصغیر [illegible] اس کی مثال دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں ان [illegible] نقصان پہنچا ہے۔ نیز طالبین دین کی نئی پود میں اسلام کے لئے مرمٹنے کا وہ جذبہ بھی کم ہو گیا ہے جو ان کے اسلاف [illegible] امتیاز تھا۔ ضرورت ہے کہ اس کے اسباب پر غور کیا جائے۔ ان کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ اور نصاب تعلیم اور طریق تعلیم میں ضروری اصلاح کر کے ان کو مفید سے مفید تر بنایا جائے۔

اسی مقصد سے حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار نے "مدارس اسلامیہ عربیہ بہار و اڑیسہ و بنگال" کا ایک کنونشن بلایا ہے .... کنونشن جامعہ رحمانیہ مونگیر میں ۳۱ مارچ ۲ اپریل ۱۹۷۸ء تک ہوگا جس میں مذکورہ صوبوں کے علماء و ارباب مدارس کے تنظیمی کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز اصحاب علم و فضل بھی شریک ہوں گے۔

چونکہ مرکزی دینی تعلیمی بورڈ دہلی بھی (جس کا یہ خاکسار صدر ہے) ابتدائی مدارس و مکاتب دینیہ کی تنظیم و احیاء کے سلسلہ میں کافی سال سے بھی خدمات انجام دے رہا ہے اس لئے ہم مقصدی وحدت کے پیش نظر اس کنونشن کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں حضرت مولانا [illegible] کے اصرار پر خاکسار مدیر الحرم نے بھی اس کنونشن میں شرکت کا ارادہ کر لیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ حاضری ہوگی۔ اس کے بعد بعض دوستوں کے تقاضہ پر پٹنہ اور دربھنگہ بھی جانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کنونشن کو کامیاب فرمائے اور ہم سب کو [illegible] خدمت دین و علم کی توفیق بخشے۔

گاندھی جی کی موت کا مقام:- مسٹر ایم او متھائی پنڈت نہرو کے سابق پی۔ اے۔ کی ایک کتاب حال ہی میں شائع ہوئی [illegible] اخبارات میں اس کے اقتباسات شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں مہاتما گاندھی کے قتل کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ

گاندھی جی کے قتل کے بعد ایک دن کچھ لوگ مسز سروجنی نائیڈو کے سامنے گاندھی کے غم میں رونے لگے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے کہا ان کے لئے ایسی ہی موت مناسب تھی۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ بدہضمی میں مبتلا ہو کر مرتے؟"

مسز سروجنی نائیڈو، کانگریس کی پرانی لیڈر تھیں۔ ریاست حیدرآباد کی رہنے والی اور انگریزی زبان کی جادو بیان شاعرہ [illegible] [illegible] ہے اور کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے قربانی پیش کرنے کے اسلامی نظریہ سے کس قدر مطابق! قرآن کریم [illegible] [illegible] قرار دیتا ہے وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ "اور جو لوگ [illegible] راہ میں قتل کئے جائیں ان کی زندگی کی حقیقت کیا ہے اس کو تو اللہ ہی جان سکتا ہے کیونکہ وہ ہمارے شعور [illegible] [illegible] یہ سب جانتے ہیں کہ [illegible] تاریخ کا جزو بن کر [illegible] دنیا تک باقی رہتی ہے [illegible] [illegible] [illegible] کو ہم [illegible] قرآن بھلا بیٹھے ہیں۔ راہ خدا میں جان دینا بڑی بات ہے [illegible] [illegible] ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

مصیبت و ذلت کا سبب بن جائے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ... دوسرے گروہ کے لوگ جن کی نظر دین و دنیا دونوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ سے دونوں جہان کی بھلائی کی
مانگتے ہیں ... کو آخرت میں ان کی نیک کمائی کا حصہ ملے گا۔ باقی پچھلے گروہ کے لوگ جو طلب آخرت سے ہی محروم ہیں تو ان
لئے وہاں محرومی و ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (اور ان کے لئے آخرت میں
کا حصہ نہیں)

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے کہ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا فرمایا کر یہاں یہ واضح فرما دیا گیا کہ اس دوسرے گروہ کو جو کچھ ملے گا وہ ان کے اعمال کی
توں اور کوششوں کا نتیجہ ہی ہوگا کیونکہ سچی دعا وہی ہے جو زبان و دل کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ جو کچھ بندہ اللہ تعالیٰ سے طلب کرنے
تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو کام میں لاکر خود بھی اس کی طلب و جستجو کے لئے تیار ہو اور اس کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے محض
ن سے دعا مانگنا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا نہ اسلام کی تعلیم ہے نہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے
میں فرمایا ... اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے قیامت جلد آنے والی ہے اور ایک حدیث کے مضمون کے مطابق ہر شخص کی
رادی قیامت تو اس کی موت کے ساتھ آ ہی جاتی ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ ہر دم اللہ تعالیٰ سے دونوں جہانوں کی خیر و خوبی
ب کرتا رہے اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بھی ان کے حصول میں صرف کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو حسن عمل کی توفیق عطا
اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

نعت

(حفیظ میرٹھی)

وہ ہادیؐ جس نے دنیا دین کے سانچے میں ڈھالی ہے ✽ اُسی سے نوعِ انساں بہرِ ہدایت کی سوالی ہے

غلامانِ محمدؐ کی ادا سب سے نرالی ہے ✽ کسی قیصر کسی کسریٰ کو خاطر میں نہیں لاتے

کہ میں نے شمعِ ایماں خانۂ دل میں جلالی ہے ✽ اندھیرے خود پریشاں ہیں یہ میرا کیا بگاڑیں گے

مری آنکھیں تو تر ہیں کیا ہوا گر ہاتھ خالی ہے ✽ ادب سے میں یہ موتی آپؐ کے قدموں میں بچھا دونگا

نظر سوئے فلک ہے ہاتھ میں روضے کی جالی ہے ✽ اُمید و بیم کی تصویر بن کر رہ گیا ہوں میں

نکلنے کی ہماری حسرتوں نے راہ پالی ہے ✽ حفیظ اب ہم نبی کے ہجر میں آنسو بہائیں گے

(خاص الحرم کے لئے)

جواہر الحدیث

اخلاقِ نبویؐ

از :- مدیر

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۴)

(اے محمد) بے شبہ آپ کے اخلاق بہت بلند ہیں ۔

انسان کی باطنی خصلتوں اور عادتوں کو "اخلاق" کہتے ہیں ۔ جس طرح انسان کی ظاہری شکل و صورت کا حسین ہونا خوبی اور جمال سمجھا جاتا ہے ۔ اسی طرح اس کے اخلاق کا عمدہ ہونا اس کا کمال خیال کیا جاتا ہے ۔ پھر جس طرح کسی کے ظاہری حسن کے لئے صرف چہرہ مہرہ کا خوبصورت ہونا کافی نہیں ۔ بلکہ ضروری ہے کہ آنکھ ، ناک ، لب و رخسار اور جسم کے تمام عضو خوبصورت بھی ہوں اور ان میں تناسب اور موزونیت بھی پائی جائے ۔ اسی طرح انسان کے باطنی حسن کے لئے ضروری ہے کہ نیک دلی ، نرم مزاجی ، حیا و شرم ، کرم و رحم ، ہمت و شجاعت سب اوصاف اعتدال کے ساتھ پائے جاتے ہوں ۔

انسان کے حسن ظاہری کا فائدہ دوسروں کو بہت کم پہنچتا ہے مگر حسن باطنی کے فائدہ کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ یگانہ و بیگانہ ، اپنے اور غیر ، دوست اور دشمن ، چھوٹے اور بڑے سب ہی کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے اور وہ خود بھی ان سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ اس لئے ظاہری حسن کے مقابلہ میں باطنی خوبیوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے ۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر حسن اخلاق کا پیغام لے کر دنیا میں آئے اور انھوں نے اپنی امتوں کو تعمیر سیرت کے طریقے بتائے ۔ مگر خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حسن اخلاق کا پیکر بن کر دنیا میں تشریف لائے ۔ آپ نے اپنی زبان سے بھی اخلاق حسنہ کی دعوت دی اور اپنی پوری زندگی کو بھی اخلاق عالیہ کا نمونہ بنا کر پیش کیا ۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (اے محمد بے شبہ آپ کے اخلاق بہت بلند ہیں) پھر سب انسانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ آپ کے نقش قدم پر چلیں اور آپ کی روشن زندگی کو رہنما بنائیں ۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے)

آئیے اب حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں اخلاق حسنہ کے نمونے دیکھیں :-

---

عَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (رَوَاهُ فِي الْمُؤَطَّا وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ مشکوٰۃ

حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبی کو انتہا تک پہنچاؤں (مؤطا ۔ مشکوٰۃ ۔ باب الرفق)

تشریح: یعنی یوں تو اخلاق حسنہ کی تعلیم خدا کے سب ہی پیغمبروں نے دی مگر خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مقصد ہی یہ تھا ۔ یہ آپ کی تعلیم ہی تھی جس نے اخلاق انسانی کو معراج کمال تک پہنچایا اور یہ آپ کے اخلاق ہی تھے جس نے عرب کے وحشیوں کے دل اسلام کے لئے فتح کئے ۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤُدَ مشکوٰۃ باب الرفق)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں ۔ (ابو داؤد ۔ مشکوٰۃ ۔ باب الرفق)

تشریح: یعنی ایمان کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اخلاقی خوبیاں پیدا کرے ۔ بد اخلاق چاہے کتنی ہی عبادت کرلے مومن کامل نہیں ہو سکتا ۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا (متفق علیہ مشکوٰۃ باب الرفق)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک تم میں سے وہ لوگ سب سے بہتر ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں (بخاری و مسلم)

اچھے اخلاق والے رسول اللہؐ کے محبوب ہیں

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا ۔ (رواہ البخاری ۔ مشکوٰۃ باب الرفق)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بے شک تم میں سے وہ لوگ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں جن کے اخلاق سب سے بہتر ہیں (بخاری)

تشریح: اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کسی بندہ سے محض اس کے اعمال کی بنیاد پر ہے چونکہ کسی مومن کا سب سے بہتر عمل اس کے اچھے اخلاق ہیں، اس لئے اچھے اخلاق والے اللہ کے رسول کے محبوب اور چہیتے ہیں ۔

عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَثْقَلَ شَيْءٍ يُوْضَعُ

حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے وزنی چیز

إِنَّ مِيزَانَ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَإِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ۔ مشکوٰۃ باب الرفق)

جو قیامت کے دن مومن کی عمل تولنے والی ترازو میں رکھی جائے گی وہ اچھے اخلاق ہوں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ بدزبان اور بد خلق آدمی کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

تشریح:۔ یعنی جب میزان عمل میں اچھے اور برے عمل تولے جائیں گے تو ایمان والے بندے کے سب سے زیادہ وزنی عمل جو نیکیوں کے پلڑے کو جھکا دیں گے۔ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے اور سب سے زیادہ ہلکے عمل برے اخلاق۔ کیونکہ اچھے اخلاق اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور برے اخلاق ناپسند۔

خوش اخلاقی عبادت ہے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُد)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ مومن اپنے اچھے اخلاق سے اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ساری رات نمازیں پڑھے اور سارے دن روزہ رکھے (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ باب الرفق)

تشریح:۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوش اخلاقی بھی اسلامی نقطۂ نظر سے عبادت ہے۔

عَنْ رَجُلٍ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا خَيْرُ مَا أُعْطِيَ الْإِنْسَانُ قَالَ الْخُلُقُ الْحَسَنُ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ۔ مشکوٰۃ۔ باب الرفق)

قبیلہ مزینہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ انسان کے لئے (اللہ تعالیٰ کا) سب سے بہتر عطیہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا اچھے اخلاق (بیہقی۔ باب الرفق)

تشریح:۔ یعنی ایمان اور فرائض دین کی ادائیگی کی توفیق کے بعد ایک انسان کے لئے سب سے بہتر نعمت اچھے اخلاق ہیں۔

بیوی سے نرم برتاؤ ایمان کی تکمیل کا ذریعہ ہے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ بِأَهْلِهِ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ۔ جمع الفوائد باب حسن الخلق)

حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور اپنی بیوی کے ساتھ برتاؤ میں سب سے زیادہ نرم ہے (ترمذی۔ جمع الفوائد۔ باب حسن الخلق)

تشریح:۔ چونکہ میاں بیوی کا تعلق ہر وقت کا ہے اور گھریلو معاملات میں اختلاف کا امکان بھی زیادہ

ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں خوش اخلاقی کی اہمیت زیادہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُ مَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (رواہ الترمذی التاج الجامع کتاب الاخلاق)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، تم ہر موقع پر (تنہائی میں اور مجمع میں، آرام میں اور تکلیف میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور (اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو) گناہ کے بعد فوراً ہی کوئی نیکی کر لیا کرو وہ اس کا اثر دور کر دیگی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیا کرو۔ (ترمذی ج ۲ ص ۵۷۔ کتاب الاخلاق)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَکْثَرِ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّۃَ فَقَالَ تَقْوَی اللّٰہِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَسُئِلَ عَنْ اَکْثَرِ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ فَقَالَ الْفَمُ وَالْفَرْجُ۔ (رواہ الترمذی۔ التاج الجامع کتاب الاخلاق)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا وہ باتیں کونسی ہیں جو اکثر لوگوں کے جنت میں داخل ہونے کا سبب بنتی ہیں آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرنا (اور انسانوں سے) خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا۔ پھر پوچھا گیا، وہ چیزیں کونسی ہیں جو اکثر لوگوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بنتی ہیں آپ نے جواب دیا منہ اور شرمگاہ (حوالہ سابق)

تشریح:- منہ سے آدمی جھوٹ، فریب، بہتان، گالم گلوچ جیسے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور شرمگاہ سے زنا جیسا گناہ سادر ہوتا ہے اور یہ گناہ عام بھی ہیں۔

حضورؐ کی آخری وصیت

عَنْ مُعَاذٍ قَالَ کَانَ آخِرَ مَا وَصَّانِیْ بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ وَضَعْتُ رِجْلِیْ فِی الْغَرْزِ اَنْ قَالَ یَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ۔ (رواہ مالک فی الموطا۔ مشکوٰۃ باب حسن الخلق)

حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ جب میں نے (یمن کے سفر کیلئے) رکاب میں پاؤں ڈالا (اور سواری پر سوار ہونے لگا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری وصیت مجھے فرمائی یہ تھی کہ اے معاذ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرنا (موطا۔ مشکوٰۃ۔ باب حسن الخلق)

تشریح:- یمن کی فتح کے بعد سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو وہاں کا حاکم بنا کر بھیجا تو چلتے وقت آپ نے ان کو بہت سی نصیحتیں اور وصیتیں فرمائیں۔ یہ وصیتیں کچھ ایسے انداز سے کی جا رہی تھیں کہ جیسے آپ ان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت معاذ کو حضورؐ کا دیدار نصیب نہ ہو سکا۔ ان وصیتوں میں آخری وصیت یہ تھی۔ اگرچہ حاکم کا فرض ہے کہ وہ مجرموں کو سزا دے۔ اسکے بغیر حکومت کا نظام چل نہیں سکتا۔ حضرت معاذ کو بھی یہ فرض انجام دینا تھا۔ تاہم ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی

مولانا امین احسن اصلاحی

ایک شخص کی گھر کی زندگی اس کی سیرت و کردار کا آئینہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے باہر کی زندگی میں ظاہرداری کی چادر اوڑھ کر نکلتا ہو۔ اور جو کچھ وہ حقیقت میں ہے اس سے بالکل مختلف شکل و صورت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہو۔ لیکن گھر کی زندگی میں وہ اپنے اوپر اس قسم کا کوئی پردہ ڈالے رکھنے میں زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کسی شخص کو جانچنے کے لئے بہترین کسوٹی اس کی گھر کی زندگی ہے وہاں اس کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی سیرت کیا ہے؟ جس خداترسی اور تقوے کا درس وہ باہر دے رہا ہے اس پر وہ اپنے گھر کے اندر کتنا عامل ہے۔ جس اتباع کتاب و سنت کا وعظ وہ دوسروں کو سنا رہا ہے اس پر وہ خود کس قدر عمل کرتا ہے اور اپنے بیوی بچوں سے کس قدر ان پر عمل کراتا ہے؟ جس دین کی اقامت کے لئے وہ خدائی فوجدار بنا ہوا سارے جہان سے لڑ رہا ہے، اس دین کو وہ اپنے گھر کے اندر کس حد تک قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ جس سادگی جس ایثار جس قناعت، جس صبر اور جس اخلاص و دیانت کا وہ دوسروں سے مطالبہ کر رہا ہے۔ اس کا جمال خود اس کی گھریلو زندگی میں کتنا جھلک رہا ہے اگر فی الواقعہ کوئی شخص اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو بلاشبہ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پورے اترنے والے کی اخلاقی عظمت کا اور اس کی سچائی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسے شخص کے اصولوں اور نظریات سے تو آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس کو محض ایک مصنوعی یا ایک بے کردار آدمی نہیں قرار دے سکتے!

آئیے اسی کسوٹی پر ہم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں۔ اور یہ دیکھیں کہ آپ کی باہر کی دعوت اور گھر کی زندگی میں کس حد تک مطابقت ہے۔ خوش قسمتی سے صرف آپ ہی کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے کہ جس کا ہر حصہ دنیا کے سامنے ہے۔ ہم نہایت مستند معلومات کی بنا پر جس طرح یہ جانتے ہیں کہ آپ مسجد نبوی کے اندر صحابہ کی موجودگی میں کیا کچھ فرماتے تھے اور کیا کچھ کرتے تھے۔ اسی طرح ہم نہایت مستند معلومات کی روشنی میں یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنی بیوی بچوں کے اندر

مصروف رہتے تھے ۔

اہل بیت کا مسئلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ کے اہل بیت کا رات دن کا مشغلہ بھی وہی تھا جو خود حضورؐ کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ یہ صورت نہیں تھی کہ آپ خود تو لوگوں کو سادگی زہد اور اطاعت الٰہی کا [illegible] اور آپ کے اہل بیت دنیا کی دلچسپیوں اور مادی زندگی کی لذتوں میں منہمک [illegible] کو زہد و قناعت کی تعلیم اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کی تلقین فرماتے ہوں اور گھر میں آکر اس تلقین کو بھول کر دلچسپیوں اور راحتوں میں کھو جاتے ہوں۔ بلکہ آپ کا جو مشن باہر تھا آپ اس مشن کو لیکر گھر میں داخل ہوتے تھے۔ اور جس مبارک شغل میں خود اپنا وقت صرف فرماتے تھے اسی مبارک شغل میں آپکے گھر والے بھی اپنا وقت بسر کرتے تھے۔!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک مشن سورۂ جمعہ میں یہ بیان ہوا ہے :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔

وہی ہے جس نے بھیجا اُمّیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو اُن کو سناتا ہے اللہ کی
آیتیں، اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت !

یہی اسی مشن کی یاد دہانی اللہ تعالیٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اس وقت فرمائی ہے جبکہ منافقین اور منافقات اس غرض کے لئے رات دن ایک کئے ہوئے تھے کہ کسی طرح آپ کی ازواج مطہرات کو اس اعلیٰ نصب العین سے ہٹا کر دنیوی زخارف اور مادی زندگی کی لذتوں کی طرف مائل کر دیں چنانچہ منافقوں کی بیویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے کانوں میں یہ پھونکنا شروع کیا کہ آپ معزز اور امیر گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگوں کی پرورش سرداروں کے گھروں میں عیش و آرام سے ہوا روں میں ہوئی تھی لیکن اس شخص نے آپ کو غربت و افلاس کی زندگی میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اگر آپ ان کی قید سے آزاد ہوتیں تو بڑے بڑے سرداران قبائل آپ کو نکاح کے پیغام دیتے اور آپ کی زندگیاں عیش و آرام سے گزرتیں۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اس سے بالاتر تھیں کہ اس قسم کے شیطانی پروپیگنڈے سے متاثر ہوں۔ تاہم طبائع انسانی کی عام کمزوری کو سامنے رکھ کر اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم منصب پر سرفراز ہیں۔ اسی منصب کی ذمہ داریوں کے لئے اللہ نے ان کو چنا ہے اور اس دنیا کی کوئی عزت و شوکت بھی اس منصب کی عزت و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ فرمایا :-

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ [illegible]

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا (احزاب ۳۲-۳۴)

"اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ پس تم اپنے لہجہ میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔ اور گذرے ہوئے زمانۂ جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم سے ریا کی آلائشیں دور رکھے۔ اے نبی کے گھر والو! اور تم کو اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو۔ اللہ لطیف و خبیر ہے۔"

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سنوارنے اور سدھارنے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا۔ اسی طرح آپؐ کے گھر والوں کو بھی اس لئے چنا تھا کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں آپ کا ہاتھ بٹائیں۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے اونچا بنایا تا کہ سب لوگ ہادی و مرشد اور پیغمبر و امام کی حیثیت سے آپؐ کی پیروی کریں۔ اسی طرح آپ کی ازواج کا درجہ بھی تمام امت کے مردوں اور عورتوں کے لئے امہات کا رکھا۔ تا کہ سب لوگ ان کو اپنے لئے نمونہ بنا کر ان سے زندگی کے وہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی صلعم سے معلوم ہوئے ہیں۔

محبت، اعتماد اور خودداری کی فضا

لیکن کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہل بیت نے دنیا کی جگہ آخرت، ثروت، امارت کی جگہ فقر اور خدمتِ نفس کی جگہ خدمتِ انسانیت کے اس نصب العین کو اپنے لئے پسند فرمایا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کی گھریلو زندگی میں کوئی رونق و کیفیت، کوئی چہل پہل اور سرگرمی اور اتار چڑھاؤ کی کوئی نرمی و گرمی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہموار زندگی تھی۔ ہر قسم کے نشیب و فراز سے خالی۔ ایک پرسکون ماحول تھا۔ ہر قسم کے جذبات کی مداخلت سے پاک اور محفوظ ایک بہتا ہوا دریا تھا ہر قسم کے تلاطم اور تموج سے یکسر نا آشنا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق جن لوگوں کا تصور یہ ہے، ان کا تصور نہایت غلط ہے۔ آپؐ کی باہر کی زندگی کی طرح آپؐ کی گھر کی زندگی بھی ان تمام کیفیات سے معمور اور پر رونق تھی جن سے انسانی زندگی کو معمور اور پر رونق ہونا چاہیے۔ البتہ اس میں افراط و تفریط کی بے اعتدالیاں عیش دنیا کی خود فراموشیاں نہیں تھیں۔ آپؐ سوتے بھی تھے۔ جاگتے بھی تھے۔ آپؐ کھاتے بھی تھے اور بھوکے بھی رہتے تھے۔ آپؐ خوش بھی ہوتے تھے اور ناخوش بھی ہوتے تھے۔ آپؐ پیار بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی فرماتے تھے۔ زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں آپؐ کی گھریلو زندگی میں وہ سارے پہلو پائے جاتے تھے۔ بس دوسروں کی زندگی سے

کوئی فرق تھا تو جیسا کہ عرض کیا گیا۔ یہ فرق تھا کہ یہ زندگی ایک نبی کی زندگی تھی۔ اس وجہ سے اس میں کوئی شے دائرہ طبعی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اگر کوئی چیز ذرا بھی آگے پیچھے ہوتی تو فوراً عالم الغیب کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی۔

آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپؐ ان کی دلداری کے خیال سے کوئی ایسی چیز کھانی چھوڑ دیتے جو خود آپؐ کو تو مرغوب ہوتی لیکن آپؐ کی ازواج میں سے کسی کے مذاق کے خلاف ہوتی۔ آپؐ کی شفقت و دلداری کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے آگاہ فرما دیا کہ یہ چیز اس حد تک نہیں بڑھنی چاہئے کہ اس کے سبب کوئی جائز چیز ناجائز بن جائے۔ آپؐ اپنی ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے تھے۔ اس لئے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر بیویوں کی طرف سے ان رازوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی ہوتی تو اس پر آپؐ ان کو سرزنش بھی فرماتے۔ کیونکہ جس طرح شوہر کے لئے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اعتماد کرے۔ اسی طرح بیوی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امین بنے اور اس میں کوئی خیانت نہ کرے۔

آپؐ اپنے بیوی بچوں کو سرزنش بھی فرماتے تھے لیکن سرزنش کرنے کے معاملہ میں بھی حضورؐ کا ایک خاص انداز تھا۔ آپؐ اگر کسی بات پر سرزنش فرماتے تو اس طرح نہیں کہ جس کو سرزنش کی اس کے لتے لے ڈالے۔ بلکہ اس طرح کہ مخاطب بات سمجھ بھی جائے اور اس پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ آپؐ کی ازواج کے باہمی تعلقات (معمولی فطری نسوانی جذبات رقابت کے وقتی ظہور کے سوا) نہایت خوشگوار رہتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے راز کی باتیں بھی ایک دوسرے پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں۔ اس چیز پر بھی حضورؐ نگاہ رکھتے تھے کہ نہ تو غیر معمولی اعتماد کسی بے راہ روی میں مبتلا کرے اور نہ بلا وجہ کی بے اعتمادی کسی خرابی کا باعث بنے۔ حضورؐ کی ازواج کبھی کبھی خود حضورؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور حضورؐ اس کو پسند بھی فرماتے تھے بشرطیکہ یہ (اپنی) جائز حدود سے آگے نہ بڑھے۔

زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز جو حضورؐ کی گھریلو زندگی میں موجود تھے۔ ایک ایسی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کو انسانی زندگی کا بہترین مظہر کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں قرآن مجید کی چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن میں آپؐ کی گھریلو زندگی کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کی تہ میں اتر کر غور کریں گے تو وہ ساری جھلکیاں آپ خود دیکھیں گے جو اوپر کی سطروں میں نمایاں ہوئی ہیں۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ
وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ. وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا
فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ
فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ
اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ
هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

عزیز حکیم (تحریم ۱-۴)

"(اے نبی جو چیز اللہ نے تمہارے لئے جائز ٹھیرائی ہے اس کو اپنی بیویوں کی دلداری کے خیال سے اپنے لئے حرام کیوں ٹھیراتے ہو؟ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری خلاف شرع قسموں کا توڑنا فرض ٹھیرایا ہے اور اللہ ہی تمہارا آقا و مولا ہے اور وہ حکمت والا ہے اور جب کہ پیغمبر نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کہی۔ تو جب ان بیوی نے وہ بات دوسری بیوی کو بتادی اور اللہ نے اس امر سے آپؐ کو آگاہ کردیا تو کچھ حصہ کا آپ نے ذکر کیا اور کچھ حصہ کو حذف کر دیا۔ تو جب آپؐ نے ان بیوی پر ظاہر کیا تو وہ بولیں کہ آپ کو اس چیز سے کس نے آگاہ کیا؟ آپؐ نے کہا کہ مجھے خدائے علیم و خبیر نے آگاہ کیا۔ اگر تم دونوں بیویاں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے شایان شان ہے۔ کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی اللہ کی طرف مائل ہیں اور اگر تم پیغمبر کے خلاف ایکا کروگی تو یاد رکھو کہ اللہ اس کا مالک ہے۔ اور جبریل اور تمام نیک مسلمان اور ملائکہ اس کے ساتھی ہیں"۔

ان آیات میں جس چیز کی طرف اشارہ ہے ان کے درپے ہونے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے ... رکھیں ان کی کھوج کرید کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج کے درمیان کے ... کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا تو ہمارے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ان آیات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ... زندگی کے جو پہلو بالکل نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ انھیں ہمیں ضرور سمجھنا چاہئے۔ اُن سے اس ... ثبوت فراہم ہوگا کہ حضورؐ کی گھر کی زندگی کوئی بے رنگ۔ سپاٹ اور بے نشیب و فراز زندگی نہیں تھی بلکہ ان ... صورت جن پاکیزہ تقاضوں اور جن خوبصورت داعیات سے مرکب ہے۔ ان کی دھوپ چھاؤں یہاں بھی ... ہے۔ مثلاً ان آیات کے عمق میں اتر کر غور کیجئے تو مندرجہ ذیل باتیں نہایت واضح طور پر آپ کے سامنے ... ہوں گی:۔

) ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جائز حدود کے اندر اپنی ازواج کی دلداری فرماتے تھے۔ ان کے مذاق کا لحاظ ... ۔ اور ان کے جو شوق بے ضرر ہوتے حتی الامکان وہ پورے کر دیتے۔

) دوسری یہ کہ آپؐ کی بیویاں آپؐ کی شریک رنج و راحت تھیں۔ آپؐ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ان کو اپنے رازوں کا امین بھی بنا لیتے تھے۔

) تیسری یہ کہ آپؐ کی بیویوں کے آپس کے تعلقات نہایت محبت اور اخلاص کے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی بتقاضائے فطرت انسانی ان میں سوکنوں کے سے جذبات بھی اُبھر آتے تھے۔ لیکن یہ عام حالت نہیں تھی۔ عام حالت اس قدر اعتماد و محبت کی تھی کہ ایک دوسرے کو شوہر کے راز سے بھی آگاہ کر دیتی تھیں۔ حالانکہ سوکنوں میں ... بہت کم پایا جاتا ہے۔

... چوتھی یہ کہ آپؐ کی ازواج کو اپنے گھروں میں جائز حد تک اپنی خودداری کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل ... یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا بھی کر لیتی تھیں۔ چونکہ یہ چیز محض بربنائے محبت ...

ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کو ہمیشہ حضورؐ نے گوارا فرمایا۔ صرف اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا جب پنے فطری حدود سے بڑھتی نظر آئی۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کی یہ جھلکیاں ہمیں قرآن مجید میں نظر آتی ہیں۔ اگر اس کو ہم سیرت کی کتابوں میں دیکھیں تو ہر پہلو سے متعلق ہمیں پوری تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ ہم صرف زاد المعاد کی مندرجہ ذیل چند سطروں پر قناعت کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:-

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے حضرت عائشہؓ کے پاس انصار لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان کے ساتھ کھیلنے کیلئے چھوڑ دیتے۔ اگر کبھی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپ ان کی خواہش پوری کر دیتے۔ وہ جس برتن سے پانی پیتیں آپ بھی اس برتن سے ان کے منہ لگانے کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں اس ہڈی کو آپ بھی لے کر چوستے"۔

ایک مرتبہ اہل حبشہ مسجد نبوی میں اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ آپ نے حضرت عائشہؓ کے لئے اس کا موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپ کے کندھے کی اوٹ سے ان کے کرتب دیکھ لیں۔ دو مرتبہ آپؐ سفر کے موقع پر ان کے ساتھ دوڑے بھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔

نماز عصر پڑھ کر آپؐ کا معمول تھا کہ آپ تمام ازواج کے پاس تشریف لیجاتے اور ان کی خیر خیریت دریافت فرماتے۔ پھر شب میں جس کی باری ہوتی ان کے یہاں قیام فرماتے۔ (زاد المعاد جلد ۱ ص۳۵)

محاسبہ

لیکن اس تمام اعتماد و محبت کے باوجود حضورؐ اپنے اہل بیت کے محاسبہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے ـــ طرف شفقت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ۔۔ اللہ علیہ وسلم کی دس سال مسلسل خدمت کی (دوسری روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں) لیکن حضورؐ نے میری کسی ـــت پر اف تک نہیں کہا۔ اگر میں نے کوئی کام کر ڈالا تو یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا؟ اور اگر کوئی کام میں نے نہیں تو یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہیں کیا؟ لیکن دوسری طرف محاسبہ کا یہ اہتمام تھا کہ دینی معاملات میں اگر ادنیٰ ـــاہی کبھی کسی سے صادر ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ آپ کی گرفت سے بچ سکے۔ امہات المومنین کی یہ شہادت ہے کہ آپ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے کبھی کوئی باز پرس نہیں فرماتے تھے لیکن خدا اور دین کے معاملہ میں کوتاہی پر ضرور باز پرس فرماتے اور اس احتساب سے کوئی محبوب سے محبوب شخصیت بھی نہیں بچ سکتی تھی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے زیادہ آپ کو اور کون محبوب ہو سکتا تھا؟ ایک مرتبہ ان کی زبان سے حضرت صفیہ کے بارے میں یہ الفاظ نکل گئے "حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا" (صفیہؓ میں یہ عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے) یہ بات ان کی زبان سے نکلی تھی کہ آپؐ نے فوراً ان کو تنبیہ فرمائی اور جن الفاظ میں فرمائی ان کے تیور ملاحظہ ہوں: ارشاد ہوا :-

لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ

عائشہ تم نے ایک ایسی بات زبان سے نکالی ہے کہ اگر وہ سمندر میں بھی ملا دی جائے تو اسکی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھدے۔

حضورؐ کا یہ محاسبہ بھی درحقیقت آپؐ کی محبت ہی کا ایک پہلو تھا جو لوگ اپنے گھر والوں سے محض مادی قسم کی محبت رکھتے ہیں وہ اپنے ذاتی عیش و آرام سے تعلق رکھنے والی باتوں میں تو بڑے سخت گیر اور تنک مزاج ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی کوتاہی کبھی کسی سے صادر ہو جائے اور وہ اس کو نظر انداز کر جائیں۔ لیکن خدا اور شریعت کے معاملات میں وہ بڑے روادار اور متحمل ہوتے ہیں۔ بیوی بچوں میں سے جس کا جی چاہے اپنی آخرت کی بربادی کے لئے جو چاہے کر گزرے۔ انھیں کبھی ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ حالانکہ حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو تو نظر انداز کریں جو ان کی اپنی ذات کے معاملہ میں ہوں اور ان باتوں پر گرفت کریں جن کا تعلق خود ان کی اپنی آخرت سے ہو۔ حضورؐ کا طریقہ یہی تھا۔ آپؐ اپنے ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لئے فکرمند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا۔ اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بھاری تھیں۔ دوسروں کے مقابل میں ان کا اجر بھی دگنا تھا اور اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی سزا بھی دگنی تھی۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ .... مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا۔ (احزاب - ۳۰ - ۳۱)

"اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کو دُہری سزا دی جائے گی۔ اور یہ اللہ کے لئے سہل بات ہے اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہیگی اور بھلے کام کرتی رہیں گی۔ ہم ان کو انکا اجر بھی دہرا دینگے اور ان کے لئے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے"۔

حضورؐ اپنے اہل بیت کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گرانبار رہتے اور ہر وقت ان کو دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابیوں کے لئے ابھارتے رہتے۔ آپؐ جب شب کی نمازوں کے لئے اٹھتے تو آپؐ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ کی بیویاں بھی اس سعادت میں حصہ لیں اور بسا اوقات آپ اس کے لئے نہایت نرمی اور محبت سے ان کو شوق بھی دلاتے۔ دروازے پر کوئی سائل آتا تو گھر والوں کو اس کے حقوق یاد دلاتے۔ کوئی مہمان آتا تو اس کی خدمت پر سب کو ابھارتے۔ اور کبھی کبھی سب کو جمع کر کے نام لے لے کر مخاطب فرماتے اور بتاتے کہ اپنی آخرت کے لئے کچھ کر سکتی ہو کر لو۔ میں وہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ

افکار کا تیسرا شمارہ اپنی مخصوص رعنائیوں کے ساتھ آپ کے سامنے ہے اس کی پہلی دو اشاعتوں ذرا بالبنے ق کی توجہ کو نہایت کامیابی کے ساتھ جذب کیا ہے اور اب افکار کی شعاعیں بالکل اسی طرح سرزمین ہند پر پھیلتی جا رہی ہیں، جس طرح آفتاب صبح کی زرتار کرنیں سنہری روشنی لیکر دنیا پر چھا جاتی ہیں، اس حقیقت کا اظہار فخر اور غرور کے کسی جذبہ کا مرہون منت نہیں بلکہ ان مشاہیر اہل قلم کی زندگی بخش کوششوں کے صحیح اعتراف کا نتیجہ ہے جو افکار کے صفحات حقیقی ادب کی روشنی سے مصنوعی اور بیمار ادب کی تاریکیوں پر غالب آتی رہی ہیں اور جو سماج کی ان اندھیری رگوں کو ٹٹولتی رہی ہیں جن میں زندگی نہایت بیکسی کے ساتھ دم توڑتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ہمارا ادب ایک انقلابی دور سے گذر رہا ہے سماج کے گھناؤنے اور سڑے اعضا پر عمل جراحی کرنا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ افکار کا شمارہ بھی ایسے ہی تیز نشتروں میں کہا جاسکتا ہے جو ماحول کے پکے ہوئے پھوڑوں کو ناسور بننے سے پہلے کھول دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ زندہ افراد نے ہندستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی پذیرائی کی ہے۔

زیر نظر شمارہ میں تین افسانے شامل ہیں۔ "کاش!" تسنیم سلیم چھتاری کا نہایت کامیاب افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک دوشیزہ کی نفسیاتی کشمکش کا فنکارانہ چابک دستی اور حسین فطری سادگی سے نقشہ کھینچا ہے، زبان سادہ اور عورتوں کے معصوم جذبات کا اظہار کرنے کے لئے نہایت موزوں ہے، افسانہ کا نقطۂ عروج شدید تاثرات کا حامل ہے۔

"یہ زندگی" اختصار کے باوجود زندگی کے گہرے اور مختلف نقوش پیش کرتا ہے اور سرمایہ داری کے خلاف ہلکا سا جہاد ہے

"سلاسل"! بھوپال کے نوجوان داستان نویس قمر جمالی کی تخلیق ہے، کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادب کا محور عورت ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ رجعت پسندوں کے یہاں بھی عورت زندگی کے ضروری عناصر میں شمار ہوتی ہے، جنت کی بہاروں سے لیکر جہنم کے شعلوں تک عورت ہی کا تبسم اور اسی کا غصہ کارفرما ہے، سلاسل کی آخری جھنکار میں بھی عورت ہی بول رہی ہے، مگر ایک حساس ادیب کے کانوں میں یہ جھنکار کیا اثر پیدا کرتی ہے؟ ——— اس کا جواب سلاسل میں ڈھونڈیئے۔

جائزے کی علاوہ تین یا تلخیاں دو مقالوں کے گرد گھوم رہی ہیں۔ "جھوٹ سچ" حضرت شوکت تھانوی کی شوخیٔ قلم کا فریادی ہے، جس میں انھوں نے جھوٹ اور سچ کی طاقتوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، یہ فیصلہ دشوار ہے کہ اس میں دلچسپی کا پہلو غالب ہے یا سبق آموزی کا۔

"رفتار ادب" کے عنوان سے .... رشدی نے ہندستانی ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے اور اپنی تیز نگاہی سے اردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی اور دوسری ملکی زبانوں کے سرمایۂ ادب کا ہلکا سا جائزہ لیا ہے عنوان کافی پھیلاؤ چاہتا ہے، لیکن اختصار کے ساتھ ایک مقالہ میں جو کچھ آسکتا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی پیش کر دیا گیا ہے۔

صفحاتِ نظم پر ملک کے اکثر "آفتاب" اپنی پوری گرمی اور تابانی سے ہی نہیں بلکہ التہاب آفرینی کے ساتھ

چھکتے ہوئے نظر آئیں گے۔

احمد ندیم قاسمی کی فن کارانہ بلکہ سحر کارانہ خصوصیت ہے کہ افسانہ لکھتے وقت وہ اچھے افسانہ نگار اور شعر کہتے وقت نہایت اچھے شاعر بنجاتے ہیں۔ "دن ڈھلے" ندیم کی رفعت تخیل کا نہایت گہرا نقش دماغ پر قائم کرتی ہو عشق پوری نیاز مندیوں کے ساتھ بارگاہ حسن میں محو سجود ہے، حسن بدل چکا ہے عشق اپنی فطرت سے نہیں ہٹتا۔ اور اس کا یہ استقلال "حسن مرحوم" یا "حسن فسردہ" کی تمام پہلی فردوس نگاہیوں کو "جبین سجدہ" میں سموئی ہوئی ہے۔

صہبا لکھنوی .... کے منہ سے ایک نازک، شیریں اور پیارا نغمہ الفاظ بن کر نکل رہا ہے، پڑھنے والے محسوس کر رہے ہیں کہ منہ پر پھوار پڑ رہی ہے اور کچھ خاموش لہریں کانوں کو گدگدا رہی ہیں ——— انھیں لہروں کو تار و پود کہیے!

"نشان راہ" میں زندگی کے نشیب و فراز نمایاں ہیں، پڑھنے والا جب اس مصرعہ پر پہنچتا ہے:-

موجزن ہوتا ہے اک اک رگ میں جب خون شباب!

تو مشار روح میں چنگاریاں سی چھٹکنے لگتی ہیں اور احساس میں آگ سی جل اٹھتی ہے، دماغ پستی سے ابھر کر کسی نامعلوم اور عرش بدوش بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ اختر ہوشیارپوری کی یہ نظم ایک کامیاب تخلیق ہے۔

"شکوہ کیسا؟" منظر سلیم کا ایک معصوم اور مرتعش سا ترانہ ہے جس کی ہر تان اپنی نزاکت اور حلاوت کے باوجود قلب کی گہرائیوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دنیا کی ہر چیز بیتاب اور محروم سکون ہے۔ یہی بیتابی اور بے سکونی زندگی ہے حقیقی اور عملی زندگی، مگر افسر سیمابی نے بعض سکون پرور چیزوں میں بھی بیتابی کے اجزا دریافت کرلئے ہیں اور اس کا یہ مطلب ہو کہ زندگی کی کوئی کروٹ بھی بیتابی سے خالی نہیں۔

"الوداع" مجیب خیرآبادی کی دلچسپ، کامیاب اور صد درجہ جرأت آموز نظم ہے وہ انسانیت کے مقدس فرائض کی خاطر حسن کی جنت رعنائی سے نکل کر مصائب و آلام کے خارزار میں الجھ رہے ہیں، محبت اور فرض کا یہ مرحلہ ہمیشہ شیشہ و سنگ کے تصادم کا یہی مہیب منظر پیش کیا کرتا ہے۔

"دردانے" کے عنوان سے سائل ایٹھوی اور مشہور اہل قلم خاتون محترمہ سیدہ اختر نے مختلف حقائق و نکات نہایت دلپذیر انداز میں بیان کئے ہیں

غزلیات کے ذیل میں ہندستان کے مشہور، کہنہ مشق اور نغز گو شعراء کی ترنم ریزیاں ذوق سماعت بن رہی ہیں۔ مولانا راز چاندپوری، روش صدیقی، علی اشرف، عمران انصاری، شاعر لکھنوی، وحشت ایٹھوی جس بزم شعر و سخن میں حصہ لیں اس کی کامیابی محتاج نہیں ہوسکتی۔

غرض افکار کے ہر گوشۂ زندگی میں اہل قلم حضرات ہی کی بخشی ہوئی روح مصروف عمل ہے، جس کا ہم نہایت فخر کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔

(ادارہ)

قدو نظر

وزارتی وفد!

برطانوی وزارتی وفد کو ہندستان آئے کافی عرصہ ہو چکا ہے، یہ وفد اپنی آمد کے بعد سے ہی ہندستانی سیاسی لیڈروں سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کر چکا ہے، قریب قریب ہر جماعت اور طبقہ کے نمائندوں سے، ارکان وفد نے حالات حاضرہ کی روشنی میں بات چیت کی ہے، جہاں تک ہمیں اندازہ ہو سکا ہے وفد کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ دو بڑی جماعتوں ——— کانگرس اور مسلم لیگ میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت ہو جائے مگر قرائن بتا رہے ہیں ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا ہے۔ وفد کو یہ امید تھی کہ وہ کشمیر میں چند روز چھٹیاں گذارنے کے بعد جب واپس دہلی آئیگا تو دونوں بڑی جماعتوں کے اختلافات بڑی حد تک دور ہو چکے ہونگے وزارتی وفد کشمیر جنت نظیر کی فرحت بخش فضا میں "لمحات فرصت" گذارنے کے بعد واپس آگیا ہے، اور ہندستانی لیڈروں سے اس نے از سر نو گفتگو کا آغاز کر دیا ہے، کانگرس اور لیگ جہاں پہلے تھیں اب بھی وہیں ہیں اور کسی طرف سے بھی تبدیلی کا کوئی اظہار نہیں ہوا ہے۔ پچھلے دنوں مولانا آزاد نے جو فارمولا پیش کیا تھا اور مفاہمت کی جو بنیاد بتائی تھی لیگ نے اسے اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ اگر کانگرس اور لیگ میں مفاہمت نہیں ہوئی تو برطانوی مشن ملک کے سامنے پاکستان اور ہندستان کے ایک آزاد کنفیڈریشن کی اسکیم پیش کریگا۔ وفد کا رجحان مرکز میں ایک ایسی عارضی حکومت کی تشکیل کی طرف بھی ہے جس میں ان جماعتوں کو شامل کیا جائیگا جو اس پر آمادہ ہونگی۔

اس سلسلے میں یہ بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وفد اگر واقعی ہندستان کو آزاد کرنے آیا ہے تو وہ ہندستان کی کسی بھی نمائندہ جماعت کو اختیارات تفویض کر دے، رہے اندرونی معاملات تو وہ آپس کے صلاح ومشورہ کے بعد خود ہی آسانی سے طے کر لئے جائینگے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود برطانوی وفد حالات کا جائزہ لینے کے بعد کیا فیصلہ کرتا ہے، اور کس طرح ان تمام پیچیدگیوں کو دور کر کے توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، حالات اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ان کے سلجھانے میں غالباً مئی کا پورا مہینہ بھی گذر جائے تو تعجب نہیں۔ اس وقت ایک بات صاف نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ تمام ہندستان میں لوگ انقلاب برپا کرنے پہ آمادہ ہو گئے ہیں، اگر ہندستان کو اس موقع پر بھی آزادی نہیں ملتی ہے تو بلا شبہ ملک میں ایک ایسی خطرناک اور نازک صورت حال پیدا ہو جائیگی جس کے اثرات بہت ہی دور رس ہونگے برطانیہ کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ فی الفور ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جو شکوک اور شبہات رونما ہو گئے ہیں وہ رفع ہو جائیں۔ باشندگان ہند کو چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کو چھوڑ کر بڑے مسائل کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اب ہندستان کی جدوجہد آزادی کے ڈرامہ کا منظر سامنے آنیوالا ہے اس کے لئے ہمیں پہلے سے تیار رہنا چاہئے، ۴۰ کروڑ ہندستانیوں کی قسمت کا فیصلہ ہونیوالا ہے، ہندستان کے آزاد ہوتے ہی ہمیں ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑیگا جو بیحد نازک اور اہم ہیں، ہمیں ہندستانی عوام کے نکبت وافلاس کا جلد از جلد خاتمہ کرنا ہے۔ ایک ہولناک قحط کا اژدہا اپنا بھیانک منھ کھولے لاکھوں ہندستانیوں کو ہڑپ کر جانے کی کوشش کر رہا ہے، ان سب خرابیوں کا واحد علاج آزادی ہے جس کے لئے آج ہر ہندستانی تڑپ رہا ہے ——— برطانوی وزارتی وفد کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے!

(ادارہ)

آبگینے

دن ڈھلے	غزل
تار و پود	غزل
نشانِ راہ	غزل
شکوہ کیسا	غزل
حدیثِ اضطراب	غزل
الوداع	دردانے
غزل	پس منظر

حقیقی شعر کائنات کی
حسین ترین تفسیر ہے

دن ڈھلے!

اور کس دُھن میں محبت کا ترانہ چھیڑوں؟

وہی پلٹے، وہی تانیں، وہی زیر و بم ہیں
جن کو ماضی کے مزاروں سے اُٹھا لایا ہوں
وہی بجتے ہوئے الفاظ، کھنکتے ہوئے بول
جن کو یادوں کے دُھندلکوں سے بلا لایا ہوں

وہی آغاز — ترے بال، ترے لب، ترے ہونٹ
وہی انجام — ترا سحر، ترا مَس، ترا رس
مری آواز وہی ہے، مرا انداز وہی
ایک نغمہ ہے سراپا مری رگ رگ نس نس

گیت بدلا ہے نہ گت بدلی ہے میں نے لیکن
تجھکو ایام کی گردش نے بدل ڈالا ہے
اب نہ وہ رنگ ہیں گالوں میں نہ رَو بالوں میں
اب فقط میرا تصوّر ترا رکھوالا ہے

انقلابات سے آزاد رہی فطرتِ عشق
حسن بدلا، مگر احساس سے محروم رہا
اس تغیّر کا ہدف ایک تری ذات نہیں
زہرہ فاموں کا ازل سے یہی مقسوم رہا

عشق کا ساز شکستہ نہیں ہونے پاتا
اس کے ہر تار سے صرف ایک صدا آتی ہے
یہ صدا - زمزمۂ زنِ عرش کے دل کی دھڑکن
جس کی عصمت کی، مشیّت بھی قسم کھاتی ہے

اور کس دُھن میں محبت کا ترانہ چھیڑوں؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

جوانی ہی غزلخوانی کے دن ہیں تمناؤں کی نادانی کے دن ہیں
نگاہوں میں جھجک ہے، دل میں دھڑکن محبت کی نگہبانی کے دن ہیں
بہت معصوم ہے اک ایک لغزش غرور پاکدامانی کے دن ہیں
ہزاروں میکدے ہوں جسمیں شامل کچھ ایسی تشنہ سامانی کے دن ہیں
نسیم شوق ہے اور نکہت ناز عجب رنگین پریشانی کے دن ہیں
ہیں بیتاب نظر حور و ملائک فروغ حسن انسانی کے دن ہیں
یہ حسن بت شکن اللہ اکبر صنم خانونکی ویرانی کے دن ہیں

روش یہ دولت سرمد مبارک
غم دل کی فراوانی کے دن ہیں

روش صدیقی

تار و پود

اب تو اِن آنکھوں میں آنسو بھی نہیں لہراتے!!

کتنی بے نور ہے، بے رنگ ہے، بے آب ہے زیست! کتنی افسردہ ہے، پژمردہ ہے، بےخواب ہے زیست

کتنے انجان ہیں سینے کے مچلتے ہوئے راز! کتنے پُرپیچ ہیں منزل کے نشیب اور فراز!

کتنے شعلے ابھی بھڑکے نہیں، بھڑکے ہی نہیں! کتنے طوفاں ابھی مچلے نہیں، مچلے ہی نہیں

جیسے تاریک اُفق، جیسے جوانی کے مزار! جیسے درماندۂ و مجبور فضاؤں کی پکار!

صحبتیں لمحۂ نایاب بنی جاتی ہیں !!

گردشیں، وقت کی مضراب بنی جاتی ہیں!!

ہم نفس نغمۂ بے ساز کہاں سے لاؤں ؟! خود بہک جانے کا انداز کہاں سے لاؤں؟!

اب تو خوابوں کے محلکوں کے سوا، کچھ بھی نہیں! اب تو ماضی کے دھندلکوں کے سوا، کچھ بھی نہیں!

اب تو اِن آنکھوں میں آنسو بھی نہیں لہراتے!!

صہبا لکھنوی

غزل

کرتا ہوں عام دعوتِ صہبائے ناب کو
بدلوں گا میں نظامِ جہانِ خراب کو

دینی ہے داد لطف و کرم انقلاب کو
گردش میں لا رہا ہوں مہ و آفتاب کو

یہ انقلاب کیا ہی تقاضے کا وقت ہے
روکے جو روک سکتا ہو اب انقلاب کو

واقف ہوں میں رموزِ عروج و زوال سے
دیکھا ہے میں نے دورِ مہ و آفتاب کو

افکارِ روزگار سے دل سرد ہو نہ جائے
دہرا رہا ہوں قصۂ عہدِ شباب کو

در پردہ اک پیام ہے پیغامِ لطفِ خاص
پہچانتا ہوں اُن کی نگاہِ عتاب کو

تم اور شوقِ دید، حریفانِ خوش نظر
اہلِ نگاہ دیکھتے ہیں آفتاب کو

کھل جائیگی حقیقتِ عشق و ہوس ابھی
تکلیف دیجئے تو نگاہِ عتاب کو

واقف نہیں جو رازِ عذاب و ثواب سے
وہ دیکھتے ہیں دفترِ عیب و ثواب کو

یہ وقت اور فکرِ جزا و سزا، غلط
دیکھیں گے ہم تو آج رخِ بے نقاب کو

کمبخت، نامراد، بڑا خود شناس ہے
میں جانتا ہوں رازِ فضیلت مآب کو

راز مانند

نشانِ راہ

زلف کی گرمی سے جب پگھلتی ہے دل کی کائنات
نقرئی بانہوں کا لیتی ہے سہارا جب حیات
ڈول جاتا ہے دل کی دھڑکنوں کو جب ثبات
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

بے بسی جب عشق سے لیتی ہے ہنس ہنس کر خراج
ہر قدم پر جب ہزاروں جال بنتا ہے سماج
اور تا حدِ نظر ہوتا ہے کوئی کل نہ آج
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

مفلسی خودداریوں کا توڑتی ہے جب غرور
خاک میں ملتا ہے جب انساں کا احساس و شعور
خود بخود جھکتا ہے سر لاکھوں خداؤں کے حضور
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

اپنی رفعت کے لئے جب بھینٹ دیتی ہے حیات
نامساعد دور سے ٹکر بھی لیتی ہے حیات
خشکیوں میں ساحلوں کی ناؤ کھیتی ہے حیات
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

موجزن ہوتا ہے اک اک رگ میں جب خونی شباب
گیت گاتا ہے بغاوت کے برنگِ اضطراب
اور کہتا ہے جہاں میں انقلاب اے انقلاب
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

تیغ کے سائے میں جب دل جام و مینا توڑ کر
جھومتا ہے وقت کی سنگیں کلائی موڑ کر
اور بڑھتا ہے قدم شیشوں سے پتھر پھوڑ کر
زندگی کی راہ میں ایسا بھی آتا ہے مقام

اختر ہوشیارپوری

غزل

یہ تبسم ترا تقدیرِ گلستاں تو نہیں
نو بہارِ چمن عالمِ امکاں تو نہیں

خونِ دل آج بھی اشکوں سے نمایاں تو نہیں
غمِ جاناں کا میرے حال پہ احساں تو نہیں

اسکے دل میں بھی خلش سلسلہ جنباں تو نہیں
میں پشیماں ہوں کہیں وہ بھی پشیماں تو نہیں

اِک تجلّی جو نظر آتی ہے تاروں میں مجھے
چونکی چونکی وہ تری چشمکِ پنہاں تو نہیں

بڑھتی جاتی ہے فضا میں جو پھولوں کی مہک
نکہت افشاں وہ کہیں زلفِ پریشاں تو نہیں

ہلکی ہلکی سی جو ساغر میں ہیں لہریں ساقی
کارفرما نفسِ بادہ پرستاں تو نہیں

میں بھی واقف ہوں کچھ اندازِ شکیبائی سے
تیرے پہلو میں ترستے ہوئے ارماں تو نہیں

جانتا ہوں کہ تری رسمِ جفا مشکل ہے
اور مرا عزمِ وفا بھی کوئی آساں تو نہیں

تمکو منظور جو ہو ترکِ محبت بھی کروں
اس میں کچھ شائبۂ حسرتِ پنہاں تو نہیں

اِک ترے غم کے سہارے پہ جئے جاتا ہوں
ہوں میں برباد مگر بے سر و ساماں تو نہیں

جلوہ آرا جو نظر آتی ہے نغموں کی بہار
دیکھنا اشرفِ سرشار غزلخواں تو نہیں

علی اشرف

وہ کیسا

یہی ہونا تھا بہرحال، یہی ہو کے رہا
مقبرے میں کوئی کے روز چراغاں کرتا
مجھکو معلوم تھا۔ پہلے ہی سے میں جانتا تھا
پھول سے ہاتھ یہ دیوار نہ ڈھا پائیں گے
نیم خوابیدہ نگاہوں کے یہ شرمیلے چراغ
اس اندھیرے میں بُری طرح سے تھرائینگے
چوڑیاں۔ سازِ خموشی پہ نہ گا پائیں گی
اپنی آواز سے خود آپ ہی گھبرائیں گی
مجھکو معلوم تھا، پہلے ہی سے میں جانتا تھا
پھر بھی میں چُپ تھا کہ فردوسِ جوانی کے قریب
میرے باعث کسی معصوم کا دل کیوں ٹوٹے
آج جب مرمریں ہاتھوں کا سہارا نہ رہا
مرمریں بانہوں کے ہٹ جانے کا شکوہ کیسا
یہی ہونا تھا بہرحال یہی ہو کے رہا

منظر سلیم

غزل

یہ تبسم تیرا تقدیرِ گلستاں تو نہیں — نو بہارِ چمنِ عالمِ امکاں تو نہیں
خونِ دل آج بھی اشکوں سے نمایاں تو نہیں — غمِ جاناں کا مرے حال پہ احساں تو نہیں
اسکے دل میں بھی خلش سلسلہ جنباں تو نہیں — میں پشیماں ہوں کہیں وہ بھی پشیماں تو نہیں
اک تجلی جو نظر آتی ہے تاروں میں مجھے — چونکی چونکی وہ تری چشمکِ پنہاں تو نہیں
بڑھتی جاتی ہے فضاؤں میں جو پھولوں کی مہک — نکہت افشاں کہیں وہ زلفِ پریشاں تو نہیں
ہلکی ہلکی سی جو ساغر میں ہیں لہریں ساقی — کارفرما نفسِ بادہ پرستاں تو نہیں
میں بھی واقف ہوں کچھ اندازِ شکیبائی سے — تیرے پہلو میں ترستے ہوئے ارماں تو نہیں
جانتا ہوں کہ تری رسمِ جفا مشکل ہے — اور مرا عزمِ وفا بھی کوئی آساں تو نہیں
تم کو منظور جو ہو ترکِ محبت بھی کر دوں — اس میں کچھ شائبۂ حسرتِ پنہاں تو نہیں
اک ترے غم کے سہارے پہ جئے جاتا ہوں — ہوں میں برباد مگر بے سر و ساماں تو نہیں

جلوہ آرا جو نظر آتی ہے نغموں کی بہار
دیکھنا اشرفِ سرشار غزل خواں تو نہیں

علی اشرف

...ہ کیسا

یہی ہونا تھا بہر حال، یہی ہو کے رہا
مقبرے میں کوئی کے روز چراغاں کرتا
مجھکو معلوم تھا۔ پہلے ہی سے میں جانتا تھا
پھول سے ہاتھ یہ دیوار نہ ڈھا پائیں گے
نیم خوابیدہ نگاہوں کے یہ شرمیلے چراغ
اس اندھیرے میں بری طرح سے تھرائینگے
چوڑیاں۔ سازِ خموشی پہ نہ گا پائیں گی
اپنی آواز سے خود آپ ہی گھبرائیں گی
مجھکو معلوم تھا، پہلے ہی سے میں جانتا تھا
پھر بھی میں چپ تھا کہ فردوسِ جوانی کو قریب
میرے باعث کسی معصوم کا دل کیوں ٹوٹے
آج جب مرمریں ہاتھوں کا سہارا نہ رہا
مرمریں باہوں کے ہٹ جانے کا شکوہ کیسا
یہی ہونا تھا بہر حال یہی ہو کے رہا

منظر سلیم

احساس و طلب

ہزار سجدے بسے ہوئے تھے بنائے ہر آستاں سے پہلے
مرا مذاقِ عبودیت ہے قیامِ کون و مکاں سے پہلے

جہاں بھی دیکھا کہیں بھی دیکھا، کچھ اور دیکھا کچھ اور پایا
کچھ اور ہی عالمِ نظر تھا، نظارۂ رائیگاں سے پہلے

نظر کے ملتے ہی دل کے ہاتھوں وفا کا پابند ہو گیا ہوں
میں امتحاں اپنا دے رہا ہوں مگر ترے امتحاں سے پہلے

ہزار کوشش سے ساتھ دیتا ہوں میں زمانہ کا پر کروں کیا؟
ہوا یہی بیخودی میں اکثر پہنچ گیا کارواں سے پہلے

عمل کے جذبات سے ہوں آگے اثر کی امید ہے الٰہی
یہ چاہتا ہوں کہ بڑھ کے پہنچوں میں گردشِ آسماں سے پہلے

نصیب ہو دو جہاں کی توفیق لمحہ لمحہ بہ لحظہ لحظہ
رہوں یہاں اِس جہاں سے آگے اُسی قدر اُس جہاں سے پہلے

یہ مردم آزاد ستیوں کے تمام تیروں کو پھونک ڈالوں
کماں کا اُن کے رخ بدل دوں کہ کاٹ دوں درمیاں سے پہلے

مجھے فراغت کے حوصلے دے مجھے اِمارت شکار کر دے
میں اہلِ دولت پہ ایک بھرپور وار کر دوں اماں سے پہلے

بیان وہ کیا کہ دل کی دل میں رہے نہ ہو آشکار مطلب
وہ بات جب ہے کہ جھوم کر لب پہ آ ہی جائے زباں سے پہلے

میں اپنے اللہ سے بس عمرانؔ علمِ عرفاں چاہتا ہوں
خیال پہنچا کرے ہمیشہ مرا ہر اک نکتہ داں سے پہلے

عمران انصاری

یث اضطراب

بیت خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

بزمِ جہاں میں سکوں نہیں ملتا — کہ بیقرار ہے بت ساز، بت شکن بیتاب
لمحہ ورودِ خزاں کا اندیشہ — تمام اہلِ چمن مضطرب، چمن بیتاب
شکارِ تغافل ہے ساقیِ گلفام — صراحیوں میں اِدھر بادۂ کہن بیتاب
ہے حرف و حکایت کی گرم بازاری — اِدھر سکوت میں ہے "محشرِ سخن" بیتاب
ہے عطر فشاں کاکلِ شکن پرور — اِدھر یہ حال کہ ہر ایک موئے تن بیتاب
ہے اوس کی بوندوں پہ موتیوں کا گماں — اِدھر یقین کہ سورج کی ہر کرن بیتاب
گلاب کی نخوت سے بلبلیں بے چین — اِدھر نسیم کی شورش سے یاسمن بیتاب
ہے شیخ چراغِ حرم سے شعلہ بپا — اِدھر بتوں کی خموشی سے برہمن بیتاب
ہے پہلوئے خسرو میں نوحہ گر شیریں — اِدھر ہے فرقتِ شیریں میں کوہکن بیتاب
ہے وحشتِ عصیاں سے پر غضب یزداں — اِدھر جلالِ تقدس سے اہرمن بیتاب

نگارِ مہر جنوں ریز صبح سے تا شام
تمام رات ستاروں کی انجمن بیتاب

افسر سیمابی

کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا دھواں
کتنے مدفن ہیں تبسم کے مزار! آہ یہ قلبِ انساں
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کا یہ مدفن یہ جہاں

میری نظروں پہ غمِ دہر عیاں ہے اے ناز
آہ! افسانۂ بیچارگیٔ شوق نہ پوچھ!!

میں نے دیکھا تو ہے لٹتا ہوا، دوشیزہ سہاگ
میرے نغموں میں مچلتے ہیں غمِ دہر کے راگ
میرے اشعار ہیں اک گرم دہکتی ہوئی آگ

سوزِ آفاق یہاں شعلہ فشاں ہے اے ناز
آہ! افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!!

اور آزار بھی ہیں دردِ محبت کے سوا۔
فرض کچھ اور بھی ہیں عشرت و راحت کے سوا
اور افسانے بھی ہیں تیری حقیقت کے سوا

زندگی دردِ محبت ہی کہاں ہے اے ناز
آہ! افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!!

جرأتِ شوق کو بے باک بنانے کے لئے
جذبۂ عزمِ بغاوت کو جگانے کے لئے
مجھے جانا ہے! بہت دور نہ آنے کے لئے

منظرِ کشمکشِ دور جہاں ہے اے ناز
آہ! افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!!

رخصت، اے ناز کہ منزل نے پکارا ہے مجھے
رخصت، اے ناز ترا غم بھی گوارا ہے مجھے
اور طوفانِ حوادث کا سہارا ہے مجھے

عزمِ محکم پہ مرے اب بھی گماں ہے اے ناز
آہ! افسانۂ بیچارگیٔ شوق نہ پوچھ!!

مجیب خیرآبادی

دُرِدانے!

مجھ کو میرا الم نہیں نہ سہی
مجھ پہ تیرا کرم نہیں! نہ سہی
دولتِ غم تو مجھکو حاصل ہے
حاصلِ ضبطِ غم نہیں! نہ سہی

روز گلشن میں دیکھتا ہوں میں
پھول ہنستے ہیں اوس روتی ہے
دیکھ کر یہ اصول "فطرت" کا
روح کو بیکلی سی ہوتی ہے

بیخودی کمسنی کی اچھی تھی
ہوش میں آکے ہوش کھو بیٹھا
ٹھنڈی آہیں لیں محبت میں
جب جوانی کا ہوش کھو بیٹھا

چیر کر دل انہیں دکھا نہ سکا
قصۂ ضبطِ غم سنا نہ سکا
گو کہ سائلِ ہزار کوشش کی
بات بگڑی ہوئی بنا نہ سکا

سائل انبہٹوی

منجم کے نام

احساس کو تاروں کی بجانے والے!
اے اپنے سوا آنکھ اٹھانے والے!
خود کو بھی سمجھنے کی کبھی کی کوشش
تقدیر کے اسرار بتانے والے!

ایک حکم

تو اپنی نغمہ سرائی پہ خوش سہی اے مطرب!
مگر یہ کیا؟ کہ مجھے کچھ مزا نہیں ملتا
اٹھا کے پھینک دے چنگ رباب کو اپنے!
کہ تیری لے میں سرورِ خدا نہیں ملتا

موحد اعظم

عابد ہی نہیں، مومن زاہد ٹھہرا
مسجودِ کعبۂ عشق کا ساجد ٹھہرا
سجدہ جو نہیں تیرے سوا کوئی روا
شیطان بڑا سب سے موحد ٹھہرا

ملحدِ وقت سے!

خورشید کے جلووں سے ہی انکار یہ کیا؟
کیوں اصلِ حقیقت سے ہی بیزاری یہ کیا؟
نادیدہ خدا کی بھی طرف ایک نظر
اے دیدہ خداؤں کے پرستار! یہ کیا؟

سیدہ اختر

غزل

معصوم نظر سے جو پیہم جذبات اُبھارے جاتے ہیں
وہ تاروں کی نازک چھاؤں میں اشکوں سے سنوارے جاتے ہیں

یوں حسن کی برہم زلفوں کو پھر آج سنوارے جاتے ہیں
ہم عشق کی جیتی بازی بھی لو صریحاً ہارے جاتے ہیں

وہ حُسن کے جلوے معاذاللہ جن جلووں میں دنیا کھوئی ہے
ناچیز زباں کا ذکر ہی کیا واں ہوش بھی مارے جاتے ہیں

اے ناصح ناداں پلکوں پر جو نازک موتی آتے ہیں
اوراقِ محبت پر وہ ہی دن رات سنوارے جاتے ہیں

دنیائے محبت میں وحشتؔ ان اشکوں کی قیمت کیا کہیئے
جو حسن کے نازک ہاتھوں سے دامن پہ سنواری جاتی ہیں

وحشتؔ امیٹھوی

پس منظر

جب غریبوں [illegible] میں — دل کا عالم خراب ہوتا ہے
[illegible] اہلِ ثروت کو — فطرتاً اجتناب ہوتا ہے
جن کی [illegible] داستانوں کا — ایک تبسم جواب ہوتا ہے
ہاں انھیں کے سیاہ خانوں میں — ایک نہ ایک آفتاب ہوتا ہے

آبشار

کاش

یہ زندگی

سلاسل

ہر حقیقت

ایک خاموش افسانہ ہے

اور

ہر افسانہ

ایک بے حجاب حقیقت

تسنیم سلیم چھتاری

کاہش

جتنی نئی لڑکیاں بڑھتیں اتنی ہی ان کی نئی نئی حرکتیں بڑھنے لگتیں اور اسی مناسبت سے اس کے نت نئے نام رکھے جاتے۔ سب اپنے اپنے تجربہ کے مطابق مختلف ناموں سے پکارتیں

شیلا کہتی ۔ ڈھیٹ

تو..... سرلا کہتی " ضدی "

صفیہ کہتی " بدتمیز "

تو...... رضیہ کہتی " خبطی "

اسی طرح بہت سے نام "بے شرم" "آوارہ" "سنگدل" اور تو اور آپا بھی تو اسے "ہرجائی" کہتی تھی.......

اور میرا.... میرا دل بھی چاہتا کہ میں اسے کچھ کہکر پکاروں، کوئی ایسی بات جو بالکل ہی چپک جائے۔ مثلاً گرگٹ..........

یہ میرا ذاتی تجربہ نہیں لیکن نہ تو وہ شروع سے آخر تک یکساں ہی رہا، مگر یوں کہیئے رنگ یہ تھا، پلک موندتے کچھ کا کچھ ہوجاتا جیسے کہ سچ مچ کا گرگٹ!

وہ ایک طرف سے لیکے سب سے ہی محبت کرتا تھا، بس اگر نفرت تھی تو میرے دم سے! نفرت ہی سمجھو جب ہنس کے بولنا تو درکنار، مجھ سے بات کرنا ہی گوارا نہ تھا..... ممکن ہے اس کی یہ وجہ ہو کہ میں سب سے چھوٹی تھی! کم از کم اس سے تو بہت ہی چھوٹی تھی..... شاید اسی لئے میں اپنی مرضی کے مطابق اسے گرگٹ کہکر نہ پکار سکی...... ورنہ مجھے اسکا بہت دکھ تھا

اس کا اصل نام زیدی تھا...... اس کے نوکر نے مجھے یہ نام بتایا ورنہ یہاں تو سب اپنا اپنا راگ الاپتی تھیں... بلا سے اس کے اماں باوا نے کچھ نام رکھا ہو۔ میں پہلے کی بات نہیں کہہ سکتی، البتہ جب سے یہاں آئی تھی اس کو اسطرح پریوں کے بیچ میں راجہ اندر بنے دیکھا..... سب اس کے اشارے پر ناچتی تھیں، سارے ناچ..... وہ بھی جو پریاں سات برقع اوڑھ کر ناچتی ہیں اور وہ بھی جن میں کپڑوں کی بندش ہی نہیں لگائی جاتی....

ہمارے فلیٹ کے برابر جو لالہ جی رہتے تھے ان کی دو بیویاں تھیں اور صبح شام ہی نہیں ساری ساری رات وہاں شہنائیاں بجتیں اور پکے راگ، سرتال کی پوری واقفیت کے ساتھ گلے جاتے..... جب دونوں لالائنوں میں سے کوئی ایک گنگری لیتی تو " جھنن بچھوا باجے " یا " جاؤں میں توسے نا بولوں " کے بجائے کچھ ایسے جملے کانوں میں پڑتے کہ میرے خیال میں وہ زبان ہندوستان کی حدود میں تو ہرگز رائج نہیں ہے۔ اماں کانوں پر ہاتھ دھر کر کہتیں " اسے خدا کی پھٹکار رہو..... کیسی کیسی گالیاں بکتی ہیں، کیڑے پڑیں انکی زبان میں!"

اور میں ہمہ تن گوش ہو جاتی کہ پوری نہ سہی کوئی آدھی یا ڈگالی ہی میری سمجھ میں آجائے۔ مجھے پتہ تو چلے کہ ان گالیوں کی کیا نوعیت ہوتی ہے جن کو سن کر اماں کانوں میں انگلیاں ٹھونستی ہیں اور ابّا تو یہ استغفار کرنے لگتے ہیں..... اور آپا..... آپا منہ موڑ کر مزے سے مسکراتی جیسے اس نے ایک ایک گالی کو وضاحت کے ساتھ سن اور سمجھ لیا ہو۔

گالیاں مجھے بھی بہت سی یاد تھیں حالانکہ استعمال کا کبھی موقع نہ ملا مگر صرف حسن سے بھی واقف تھی نانی اماں کے یہاں جا کر نہیں گزرا۔ آس پاس کے گھروں میں پڑوسنیں لڑتی رہتی تھیں اور خود نانی اماں کی دونوں نوکرانیاں دن رات جھگڑتی رہتیں! میں مولوی صاحب کا دیا ہوا سبق کم اور یہ گالیاں زیادہ حفظ کر لیتی تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جو گالیاں مرد بکتے ہیں۔ وہ بالکل مختلف ہوتی ہیں اور بسا اوقات جب ایک ایک فقرے میں کئی کئی گالیاں جوڑ دی جائیں تو لڑائی منظوم ہو جاتی ہے! وہ بھی کوئی گالیاں ہوئیں جو مجھے بالکل ایسی لگیں جیسے کہ حالی کی نظم پڑھی جا رہی ہو۔

اے ماؤ بہنو بیٹیو ....

دیر تک سوچتی کہ آپس کے جھگڑے سے ماں بیٹی اور بہن کا کیا تعلق! اور ایسا کہ جہاں تذکرہ آیا مخالف کی آنکھوں میں خون اترا... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ نانی اماں کے پاس رہ کر جب مجھے گالیوں پر مجبور ہونا پڑا وہ ایک حد تک عام فہم تھیں ان میں خصم یار اور دھگڑے کا ذکر آتا مگر باپ بھائی اور بیٹے کا نہیں یہاں آنے کے بعد جب لالہ جی کی دونوں دیویاں لڑتیں اور میں سنتی تو بس سنتی ہی رہ جاتی.... کیا مجال جو بات کی تہ تک پہنچنا ایک طرف سطح پر ہی قدم پڑا ہو۔

ایک دن آپا سے پوچھا کہ "آخر یہ دونوں عورتیں ہر وقت کیوں لڑتی رہتی ہیں؟"

وہ بولی "دونوں سوکنیں ہیں نا!"

میں نے کہا "تو پھر اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے؟"

جولی پاس بیٹھی تھی بولی "جب ایک مرد کی دو عورتیں ہونگی تو کیسے نہ لڑینگی"

اس دن سے میں سوچنے لگی یہ جو یہاں ایک مرد کی سات عورتیں ہیں، یہ آپس میں کیوں نہیں لڑتیں... لالہ جی کے گھر تو یہ کیفیت تھی کہ انھوں نے ایک بیوی کو نظر اٹھا کر دیکھا تو دوسری نے اپنا سر پیٹ لیا، سر کے بال کھسوٹ لئے، اور غدر مچ گیا، خدا جانے یہاں وہ گرگٹ سب کے سامنے کسی ایک پہ واری قربان ہونے لگتا تو باقی بچھ مزے سے مسکراتی رہتیں آپس میں زیدی کا ذکر کرکے ایک دوسرے کو چھیڑتیں میں ہر دم جلتی رہتی، کسی اور پہ تو بس نہ تھا، مگر جی چاہتا کہ آپا کی شکایت تو ضرور ہی اماں اور ابا سے کر دوں اور بتا دوں کہ صفیہ کے گھر کاڑھنا، بننا سیکھنے نہیں جاتی بلکہ سب ملکر زیدی کے پچھواڑے جو باغ ہے اس میں طرح طرح کے ناٹک کھیلتی ہیں، اور مجھ سے کہہ دیتی ہیں کہ "تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش..... ایک طرف جا کے بیٹھ"

میری چودہ برس کی عمر تو گھٹ کر آٹھ دن رہ گئی اور یہ سب جوان کہلائی جاتی ہیں تو کچھ نہیں..... آخر کیوں؟۔

جولی سے مجھے اس معاملہ میں شکوہ نہ تھا، وہ مجھے کیا خود کو بھی بچہ ہی سمجھتی تھی..... کیسی ٹھنک ٹھنک کر بات کرتی اور مٹک مٹک چلتی تھی، توبہ!

زیدی یہاں کئی سال سے رہتا ہے، مجھے آئے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا اور سب بھی پہلے سے موجود تھیں اس لئے شروع میں مجھے اپنے اجنبی ہونے کی زیادہ تکلیف نہ ہوئی، مگر مجھ سے دو چار مہینے بعد نکہت کے ابا ہی آکر رہنے لگے تو میں نے دیکھا کہ نکہت بہت جلدی مقبول ہو گئی اور سب کی جوڑ دار بن بیٹھی۔ میں سوچتی کہ شاید میری بھی کچھ پوچھ گچھ ہو، بلا سے اپنے ساتھ بیڈمنٹن نہ کھلائیں، محض "شٹل کوک" اٹھانے کا کام ہی سپرد کر دیں، مجھ سے بات نہ کریں، باتیں سننے سے تو نہ روکیں۔ پر ایک نہ چلی، میں یوں ہی کڑھتی رہ گئی اور جولی پہنچی تو اس نے سب کا رنگ پھیکا کر دیا.....

ہائے رے جولی، مر کر ستر جنم لوں تو بھی اس آفت کی پرکالہ کو نہ بھولوں! کہیں ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی، نکہت کے

مرھوں جیسے کٹے ہوئے بال تھے جنھیں ہیئے میں ایک دفعہ ہیئر ڈریسر کے یہاں جاکر کنگھا سے کرالاتی، تو قسم ہے خدا کی دو سے بیڑا کا بچہ لگتی تھی...... ہنستی تو ایسے لگتا جیسے سوڈے کی متعدد بوتلیں ایک ساتھ کھلیں اور گیس نکل پڑے، بعینہٖ یہی آواز ہوتی تھی...... نیلے نیلے ہونٹوں پر لپسٹک تھوپ لیتی تو سرخ کے بجائے عنابی رنگ چڑھتا تھا...... پھر اس کا باس!! مہنگائی کے زمانہ میں بھی اس کو دقت نہ تھی۔ اجاڑ مارا فروک، جو مختصر ہوتے ہوتے بلاؤز، جیسا باقی رہ گیا تھا بس رانوں سے چار انگل نیچا ہوگا...... آستینوں کا جھگڑا ہی مٹ گیا تھا، مونڈھوں میں رنگ برنگی لیس لگی ہوتی اور گلا اتنا کھلا ہوا کہ...... بیساختہ میرا جی گالیاں دیدینے کو چاہتا...... پھر اس کی بلا کو، شرم نہیں...... زیدی پر اپنا ایسا حق سمجھتی جیسے وہ گرگٹ اس کی پیٹ سے نکلی اولاد ہے۔

" آوارہ کہیں کا...... میں نے کہا تھا کہ آج شام کو سینما چلیں گے پر...... ہونہہ...... ہونہہ جائیں نہیں لولی...... آوارہ ہے نا آخر...... کہدیا تھا کہ تجھ پر سیدھی مانگ نہیں کھلتی، مگر پھر نکالی...... اور دیکھو دیکھو...... اسے آوارہ...... میں کہتی ہوں اب یہ پیلی ٹائی باندھی تو اچھا نہ ہوگا......

جیسے اٹھلا اٹھلا کر وہ بات کرتی تھی ایک آگ لگ جاتی اور گرگٹ بے شرم کو دیکھو کہ وہ سب کی بات پر راضی، سب سے بے تکلف...... خیر میں چھوٹی تھی اس لئے میری پوچھ گچھ نہ ہوئی، مگر میں نے چھوٹوں سے شرماتے کسی کو نہ سنا تھا......

زیدی کی یہ حالت کہ میں ڈھیٹ بن کر پہنچ جاؤں تو بس سرخ ہو جائیگا، سنبھل بیٹھے گا اور جو کوئی غیر ضروری طریقے پر پاس بیٹھی ہوتی اسے دھکا مار کر الگ بٹھا دیتا......

...... اور...... بس قیامت آجاتی " پھر آئی تو یہاں...... چل یہاں سے...... اور کوئی کام نہیں...... جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا...... اب چلتی ہو کہ......

میری مداخلت پر آپا سمیت سب آگ بگولا ہو جاتیں اور مجھے فوراً نکالدیا جاتا۔ گاؤں میں نانی اماں کا گھر خوب کھلا ہوا تھا دھما چوکڑی مچانے کو بڑے بڑے آنگن اور کچے پھل توڑنے کو تناور درخت! شروع سے وہاں رہ کر میری ٹانگیں نکل آئیں اور جب سے کلکتہ آئی تو ہر دم ایسا لگتا جیسے کوئی چھاتی پر چڑھ کے دم گھونٹ رہا ہو۔ چھوٹے چھوٹے کمروں اور خطرناک سیڑھیوں والی یہ عظیم الشان بلڈنگ مجھے کھانے کو دوڑتی تھی...... چپ چاپ بیٹھکر من مانے کھیل کھیلنے کا ذرا بھی موقعہ نہ تھا۔ تین کمرے اور ان میں یہ کیفیت کہ اماں بیک وقت ہمہ جا موجود! اول تو ایک کمرے میں آپا کا راج تھا، جہاں سینکڑوں قسم کے پاؤڈر اور کریم بکھرے رہتے تھے اور انھوں نے کہدیا تھا کہ " اگر میرے کمرے میں قدم رکھا تو اللہ قسم ٹانگیں توڑ دونگی اور کھال ادھیڑ ڈالوں گی " باقی دو کمروں میں اماں چین نہ لینے دیتیں " یہ کام کرو، وہ کام کرو...... پان بنا دے، قمیص میں بٹن ٹانک دے " یہ نہیں تو ایک اور خواہ مخواہ کی بات " اری نصیبوں جلی دوپٹہ کہاں پھینک دیا...... غضب خدا کا جوان ہونے آئی مگر اپنا ہوش نہیں...... پٹہ مارکے اوڑھ کمبخت...... بیحیا...... بے شرم " اماں تو مجھے عورت سمجھنے میں پس و پیش نہ کرتیں اور آپا کو لڑکی سمجھنا بھی ناگوار تھا، بچہ ہوں بالکل...... اور ستم یہ کہ اماں کے سامنے وہ بھی اکٹنگ کرتیں! محض مجھے برا بھلا کہنے کی خاطر......

" دو چٹے تو اس کا دم نکلتا ہے...... پھانسی کا پھندا پڑ جاتا ہے...... جب دیکھو سانڈ کی طرح منہ اٹھائے پھرتی ہے...... رتی بھر لحاظ نہیں...... "

یا اللہ آسمان کس کے سہارے قائم ہے......

دن تو جوں توں ان نصیحتوں میں گزر جاتا تھا، بس جہاں شام ہوئی، میری شامت آگئی۔ آپا تو بن سنور کر سیکھنے گھر ٹاپا

چلدیتی اور ابا دفتر سے آ کے ساری تھکن مجھ پر اتارتے .... اگلدان اور پاندان کے علاوہ حقہ بھی کسی طرح کی آوازیں نکالتا .... میری جان پہ بن جاتی .... بالکنی میں جا کر کھڑی ہوتی تو علحدہ سر چکرا جاتا، ٹریم کی گھڑگھڑاہٹ، موٹروں کے ہارن ..... لیجیو، چلیو، پکڑیو کی قیامت خیز آوازیں .... امریکن فوجی اور ریلی ہوئی عورتیں ...... کچھ دن تو میرا جی خوب لگ گیا تھا، دن بھر کھڑی ساڑیوں کے رنگ، فروکس کی کاٹ اور قمیصوں کی تراش دیکھتی رہتی اور پھر ایسی اکتائی کہ یہ مناظر زہر ہو گئے ...... کانوں میں آپ سے آپ ڈھولک سی بجتی رہتی اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی تیتریاں ناچتیں .... سانس رکنے لگتا اور آنسو نکل پڑتے ...... کیسی بے کل زندگی ہے ۔

سب سے بڑھ کر ذلت کا یہ احساس گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا کہ جب زیدی سب سے ہوتا ہے تو مجھ میں کیا عیب ہے جو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں ...... ہونہہ ..... جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، جیسے واقعی ...... اور یہی بات ہوتی تو صبر بھی تھا۔ کپڑوں میں لپٹی ننھی گڑیا کی طرح پلنگ پر پڑی رہتی، نہ کوئی حکم چلتا اور نہ ڈانٹ پلاتا، بس وقت پر دودھ پی لیا اور اطمینان سے نرم نرم لحاف اور گدوں میں لیٹے رہے۔ سارے گھر کا لاڈ دلار علحدہ ...... اب خدا کا ایسا قہر ہے کہ بچی بن کر ذرا اٹھلا جاؤں تو لعنتوں کا طوق جانے کہاں سے گلے میں آ پڑتا ہے ۔

" تیرا جنازہ نکلے منحوس، تجھ پر بجلیاں ٹوٹیں .... تو نے تو فرنگنوں کو بھی مات کر دیا ...... گریبان کھلا ہوا اور دوپٹہ ندارد .... ہائے اس جوان جہان کو اپنے آپ کا ہوش نہیں، اس موت آجائے تو اچھا ہے ...... "

اور میری بھی سب سے بڑی یہی خواہش ہوتی کہ اللہ کسی کی آتی مجھے دیدے، میرا اس مصیبت سے چھٹکارا ہو ...... اماں کو میرا تو اکیلے میں بھی دوپٹہ اتار کے بیٹھنا گوارا نہیں اور ابا کے سامنے سر کھل جائے تو بھی دنیا بھر کے گالی کوسنے دے ڈالتی ہیں پھر آپا کی ذرا فکر نہیں کرتیں، ان کے یہ ٹھاٹ ہیں کہ وہاں اس مردوئے زیدی کے سامنے سب ملکر آنکھ مچولی اور دنیا بھر کے کھیل کھیلتی ہیں تو شلوار گھٹنوں تک چڑھ جاتی ہے اور دوپٹے پھر پھر ٹنگ جاتے ہیں ۔

ہائے کیسا اندر ہی اندر دل تڑپتا کہ ایک دن اماں کا ہاتھ پکڑ کے سب کے گھر پھلانگتی ہوئی لیجاؤں اور دور سے دکھا دوں کہ یہاں کیسی کیسی گلکاریاں ہو رہی ہیں مگر کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا ۔ اب یہاں سے کہیے کہ خاندان بھر کی ناک میں کاٹوں گی یا آپا نے جڑ سے ہی صاف کر کے رکھدی ہے ......

مگر انجام سے دل ڈرتا، کہیں میں ایسی حرکت کروں تو شرط ہے کہ آپا مجھے زہر ہی نہ کھلا دیں ...... اور بدلہ لینے کی خاطر چپ چاپ ہی بالکنی سے دھکا دیکر ساری عمر کا حصہ چکا دیں ...... پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر ...... اور ایسی جگہ کہ جہاں روپیہ پیسہ کیا، ہنڈیا ڈوئی بھی آپا کے اختیار میں ہے ...... کوڑی کوڑی سے ترسانا معمولی بات ہے کیا عجب جو بھوکا ہی مار دیں ...... اور زہر کے خیال سے تو بہت ہی کلیجہ کانپتا، ادھر کسی چیز میں ڈالکر کھلا دیا، ادھر چٹ پٹ ختم! آپا پہ تو کوئی حشر تک شبہ نہ کرے گا اور ہماری جان یونہی صدقے خیرات میں جائیگی ...... اب تو سنا ہے ایسے زہر چل نکلے ہیں کہ پوسٹ مارٹم میں بھی پتہ نہیں لگتا، کیا پتہ ان کے پاس ایسا ہی زہر ہو! ہے تو ضرور .... اس دن جولی کہہ رہی تھی ...... جانے کس بات پہ .... میں نے تو بس اتنا ہی سنا ہے کہ " ہم زہر کھا کے مر جائیں گے ...... ہم سے یہ ستم برداشت نہ ہوگا "

تو ان کے نزدیک زہر کا استعمال کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا ..... نا بابا جیسی گزر رہی ہے بھلی ہے میں کیوں جان جوکھم میں ڈالوں، کبھی تو اللہ چپ کی داد دیگا ......

اپنے دل کو ہزار طرح کی تسلیاں دیتی مگر آپا کی بے انصافی کا داغ نہ مٹتا، ان کا کیا بگڑتا ہے اگر مجھ کو بھی

اسپتال شریک کیا کریں۔ میں کونسا ان کی قسمت کا کھاتی ہوں جو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے، سرلا اور شیلا بھی
بہنیں ہیں، صفیہ اور رضیہ بھی ماں جائی ہیں مگر کیسی ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ہر بات میں ایک ہی صلاح مشورہ ہماری
بڑی بہن ہیں کہ مجھ کو پھوٹی آنکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ اللہ نے مقدر ہی خراب بنایا ہے۔ زیدی بھی تو سایہ سے جلتا ہے،
میری صورت دیکھی اور کھیل کو دچھوڑ سگرٹ کے بڑے بڑے کش لگانے لگا اور ذرا دیر سب کی دھمکیوں کے باوجود کھڑی رہوں
تو وہ خود بھی وہاں سے اٹھ کر چلا جائیگا " اب نہیں کھیلتے .... سر میں درد ہے "۔ خدائے پاک میری شکل
کیسی بنائی ہے کہ نظر پڑتے ہی زیدی کے سر میں درد ہو جاتا ہے .... میں گھنٹوں ٹوٹے ہوئے شیشہ میں
اپنی صورت تکتی رہتی ...... مجھے تو کوئی عیب نہیں لگتا، ہزار میں اچھی ہوں ...... بہت کچھ آپا کی جھلک مارتی ہر
پلکیں انہیں کی طرح سے مڑی مڑی ہیں، رنگ ان سے کچھ پھیکا ہے، مگر نانی کہتی تھیں کہ تجھ میں نمک بہت ہے اور
اور ہونٹ کیسے اچھے ہیں بھرے بھرے ...... کاش میں لپسٹک لگا سکتی .... میرے بالوں میں گھونگر
نہیں، مگر میں دوکان پر جاکر ڈلوا سکتی ہوں، جولی سے تو لاکھ درجہ اچھی لگونگی، بس جیسے نکہت کے بال ہیں جب کنگھی کر کے
کھلے بال چھوڑ دیتی ہے تو ایسی سیڑھیاں سی بنجاتی ہیں، اونچی نیچی چمکدار اور ماتھے پر چھلے چھلے ست .... جیسے
شروع تاریخوں کے چاند۔ صفیہ کے منھ پر چیچک کے داغ ہیں اور میرا منھ بالکل صاف ہے پھر بھی میں صفیہ کے مقابلہ
میں نہیں بیٹھ سکتی، جولی تو میری جوتی کے برابر بھی نہیں، کہاں اس کی سرکنڈا جیسی بانہیں اور کہاں میرے سڈول بازو
...... اگر آپا مجھے ایک دن پاؤڈر، لپسٹک اور طرح طرح کی کریمیں لگانے دیں، پھر میں دکھادوں کہ کون میرے
سامنے بچ سکتا ہے ...... خیر بناؤ سنگار کے بغیر بھی ایسی صورت تو ہرگز نہیں کہ دیکھتے ہی سر میں درد ہو جائے۔

کاش مجھے ایک دن تنہائی میں زیدی سے بات کرنے کا موقعہ ملجائے تو میں اس سے پوچھوں کہ آخر تم مجھ کو
نفرت کیوں کرتے ہو، مگر تنہائی کیا۔ مجھے تو سب کے سامنے سلام تک کرنے کی توفیق نہ تھی۔ اس کمبخت کی نظروں ہی
زمین میں گڑ جاتیں۔

ایک دن ایسے ہی کسی بات پر اماں اور ابا میں جھک جھک ہوگئی۔ ابا اٹھ کر کسی دوست کے یہاں چلدیئے اور
اماں نے بگڑ کر آپ ہی آپ کہنا شروع کیا کہ " بس اب یہاں میرا گذارہ نہیں ہوگا، میرے اماں باوا جیتے ہیں، وہیں
چلکے رہونگی اور مزدوری کر کے اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ پالوں گی "

پھر مجھ سے کہنے لگیں کہ " جا زہرہ کو بلا کے لا ...... اپنا سامان باندھیں " اور میں ایک ایک قدم میں چار
چار سیڑھیاں پھلانگتی خوشی خوشی بھاگی کہ اس کلکتہ کی مصیبت سے پیچھا چھوٹے گا، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری،
یہاں سے گئے تو سمجھ لیجئے سارے دکھ چھوٹے، ممکن ہے کہ آپا بھی سچ مچ کی آپا بنجائیں۔

مجھے معلوم تھا کہ آپا اس وقت کہاں ہونگی لہذا سیدھی پچھواڑے کی گلی سے گزر کے اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی دیوار
پھلانگ کے باغ میں کودی مگر وہاں تو خاک اڑ رہی تھی اور کسی کا بھی پتہ نہ تھا، میں حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی
" یا اللہ آج سب کے سب کہاں مرگئے ...... کیا آج زیدی دفتر سے لوٹ کر ہی نہیں آیا اور آپا سچ مچ ہی صفیہ
کے یہاں سوئی دھاگہ لئے بیٹھی ہے ...... میں نے مزید اطمینان کے لئے ایک ایک پیڑ کے پیچھے اور ایک ایک جھاڑی
کی اوٹ میں تلاشی لی مگر کسی کا پتہ نہ ملا، آخر میں تھک کر پھر دیوار کے پاس کھڑی ہوگئی .... یہاں پہنچکر عمارت کا
سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ زیدی کا کوارٹر سب سے آخری تھا اور اکلوتا، اوپر کی منزل خالی پڑی تھی اس لئے ان کو یہاں
خوب آزادی مل گئی تھی اور فی الحال کسی کے دخل کا امکان نہ تھا، اس لئے کہ اوپر کی منزل شکستہ ہوگئی تھی اور مالک مکان نے

گرانی کے باعث اس پر چھت ڈلوانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے کی طرف زیدی کے کمرے کی ایک کھڑکی میں ایک دروازہ کھلتا تھا، میں نے خواہ مخواہ بے خیالی میں دیوار کا ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور کھڑکی کا نشانہ لگایا...... شیشہ تو بچ گیا، مگر کھٹکا کا زوردار تھا......

"کون ہے سالا .... بدمعاش ...."

میں جلدی سے ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گئی اور زیدی نے چق اٹھا کر برآمدے میں قدم رکھا

"شیشہ ہی ٹوٹ گیا ہوتا......... سالے، کمینے، سور کے بچے، کمبخت ....

وہ رومال سے اپنے ہونٹوں اور گالوں پر پھیلی ہوئی لپسٹک کو رگڑ رگڑ کر چھڑاتے ہوئے بڑبڑایا.........

اور جب کمرے میں لوٹ گیا تو میں نے متعدد قہقہوں کی آواز سنی ......

"اچھا تو اس کمرے میں میٹنگ ہو رہی ہے" میں دیوار سے واپس پھلانگی تو مارے غصہ کے برا حال تھا، اب بھی اماں سے جا کر نہ کہدوں تو میرا نام بدل دینا بلکہ میں بلا کر لاؤنگی اور اُن کو اپنی آنکھوں سے صاحبزادی کے ڈھنگ دکھادونگی"

شکایت کرنے کا پورا تہیہ کرکے میں اپنے فلیٹ میں واپس پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بجائے کسی دوست کے یہاں جانے کے ادھر اُدھر سے گھوم گھام کر لوٹ آئے ہیں اور بیٹھے ہوئے اماں کی خوشامد کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب کچھ کہنے سننے کا موقعہ نہ تھا، خون کے گھونٹ پی کر بالکنی میں لٹک گئی جہاں "رس گلہ" جیسے متعدد بنگالی اِدھر سے اُدھر لڑھک رہے تھے اور برابر کے گھر سے للائن اپنے مخصوص انداز میں لالہ جی کے مرنے کی دھمکی دیتی سنائی دے رہی تھی۔

میں سوچنے لگی کہ آپا اتنی بڑی ہو گئی ہے، کم سے کم بیس سال کی! پھر بھی ابا اُس کی شادی نہیں کر دیتے یہ بھی نہیں پڑھتی لکھتی ہو، بس صبح سے لیکر چار بجے شام تک میری جان کو روتی ہے اور چار بجے سے لیکر آٹھ بجے تک .... سات بجے تک تو ضرور ہی کبڈیاں کھیلتی ہے .... نانی اماں کہتی تھیں کہ جہاں لڑکی پندرہ سولہ سال کی ہو جائے اُسے پرائی کر دو، پھر گھر پر بٹھانا حرام ہے........ اور جن لڑکیوں کی زیادہ عمر میں شادی ہوتی ہے ان کے منہ پر ذرا نور نہیں آتا اور پہنتی اوڑھتی بری لگتی ہیں، نانی اماں سنا رہی تھیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تو بارھواں سال لگا تھا اور بیس سال کی عمر میں پانچ بچوں کی ماں ہو گئی تھیں۔ اور یہاں آپا! بچے تو کیا بیاہ بھی نہیں ... .منگنی بھی نہیں .... کیا بڑھاپے میں دلہن بنیگی۔ وہاں گاؤں میں ایک دن نانی اماں بتول کی دادی سے کہہ رہی تھیں کہ "جہاں عورت بیسی سو گھیسی" یعنی جہاں عورت بیس سال کی ہوئی بس پھر جوانی ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے، پھر اس پر نہ مہندی چڑھتی ہے، نہ مسی کھلتی ہے، یہ سب تو اُٹھتی عمر کی باتیں ہیں۔ اب آجکل دیکھو کتنی عمر میں لڑکیوں کا بیاہ کرتے ہیں، چار دن بیاہ کو ہوئے اور ساس کی بھی ساس لگنے لگیں، نہ وہ کپڑوں کی پھبن نہ وہ چہرے پہ چھپا پن ..."

نانی اماں کا کہنا ٹھیک ہے تو آپا کیا خاک بیاہ کے وقت اچھی لگیگی، زیور کپڑا کچھ نہیں بچے گا .... صاف بات یہ کہ آپا کو اس کا ارمان بھی نہ ہوگا، اس نے بیاہ سے پہلے ہی سب طرح کا اوڑھ پہن لیا اور دل کے حوصلے نکال لئے، ورنہ کہیں کنواریاں عطر لگاتی ہیں۔ خیر پاؤڈر، کریم کو تو نانی اماں جانتی بھی نہیں مگر یہ عالم ہے کہ کیا مجال جوان کے سامنے محلہ کی کوئی بن بیاہی لڑکی کانوں میں پھول پہن لے یا پاؤں میں مہندی لگا لے، عطر تو خیر عطر ہے خوشبو کا تیل لگانا بھی عیب سمجھتی ہیں۔ ہائے! وہ آپا کو دیکھیں تو سر پیٹ کے رہ جائیں۔ ہم کو تو عید، بقر عید پان کھانے کی اجازت ملتی تھی اور آپا کو میں نے زیدی کے ساتھ سگریٹ پیتے دیکھا ہے۔

خیر مجھے ان کے طرزِ عمل کا سدھار انہیں کرنا، وہ چاہے جو کریں اور چاہے جس طرح رہیں مگر مجھے حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتی ہیں۔ وہ شکلاً اچھی ہیں تو میں بھی بُری نہیں۔ وہ جوان ہیں تو میں جوان ہوتی جا رہی ہوں وہ ارجدید فیشن کی پرستار ہیں تو میں نے اُن سے چھ سال بعد جنم لیا ہے لہذا ان سے زیادہ فیشن ہی ہنا مجھی زیب دیتا ہے اِن انگریزی مجھ کو نہیں آتی تو آپا نے ہی کونسا بی۔ اے کا امتحان دیا ہے، چار سال کلکتہ میں رہ کر تھوڑی بہت سیکھ گئی ہیں، سو تھوڑے دن بعد مجھ کو بھی آجائیگی ...... اگر تنہا وہی زیدی کی دوست ہوتیں اور زیدی محض اُن پہ کرم فرما ہوتا تو مجھے شکوہ نہ رہتا، مگر جب یہاں کا دستور یہی ہے کہ ڈربے کی ساری مُرغیوں کا سُہاگ ایک ہی مُرغ کے دم سے قائم رہے تو میں کہاں کی اچھوت ہوں! سات میں ایک کا اضافہ کرکے آٹھ سہی۔ بس مجھے تسلی رہیگی کہ ہاں میں بھی انسانوں میں شمار ہوں ایمانداری سے دیکھا جائے تو کسی کو دکی عمر میری ہے نہ کہ ان سب کی! خیر مجھے تو اپنی اتنی ہتک بھی گوارہ ہے کہ ہاں صاحب ان کے برابر نہیں بھاگ سکتی مجھے آنکھ مچولی میں شریک نہ کریں بس اتنی شرکت رہے کہ چور کی آنکھیں میچا کردں ۔ ۔ ۔ ۔

سچ سچ ۔ ۔ ۔ کاش کہیں ایسی اجازت ہی ملجائے تو جب زیدی چور بنے اور میں اُس کی آنکھیں میچوں تو دونوں انگلیاں ٹھونس کر اس کے دیدے ہی پھوڑ دوں، کمبخت میری صورت سے گھِن کھاتا ہے اور اس نے سب کو میکر نکلوا دیا، اگر مجھ کو دیکھ کر اس کی جان پر بن آیا کرے تو کاہے کو مجھے وہاں سے نکالا جائے۔

مجھے یہاں کوئی سہیلی نصیب نہیں جس سے بیٹھ کر دل کی بات کہوں، کوئی ایسا کھیل نہیں جس سے جی بہلاؤں گاؤں سے بہت سی گڑیاں ساتھ لائی تھی تو اس دن ذرا سی زبان چلانے پر آپا نے سب کی سب بیکے چولہے میں جھونک دیں۔ بس بیٹھی پان بنایا کروں یا بٹن ٹانکا کروں۔ اماں کا یہی ظلم کم نہ تھا، اکثر پڑوسنوں سے ہولے ہولے باتیں کرتی ہوتیں جس میں بیاہ شادی اور بچے پیدا ہونے سبھی کا ذکر ہوتا۔ اور میں ہی کسی کونے میں منہ دیئے پڑی ہوتی تو گویاں شروع ہوجاتیں " اے اللہ بچائے، اولاد ہے یا منکر نکیر، کیا مجال جو گھڑی بھر کو پلہ چھوڑ دیں ...... سب طرح کی باتیں سنتی ہیں، ابھی سے کانوں میں رس پڑیگا ...... بھلا پوچھو چنتے، مرنے کی باتوں سے تمہیں کیا، کسی وقت علیحدہ بھی ہو بیٹھو ...... اس سے وہ بیچاری زہرہ بھلی، اپنی ساتھ کی لڑکیوں میں بیٹھی رہتی ہے ...... پھر اس کو تو ابھی سے نانی دادی بننے کا چاؤ ہے، اگر تو بھی زہرہ کے پاس جا بیٹھے گی تو کیا بجلی گر جائیگی!"

" اب ان سے کون کہے کہ میرا وہاں دخل دینا یا مسجد میں کتے کا گھسنا یکساں ہے، خیر حکمِ حاکم بندہ مجبور، اوّل صفیہ کے گھر جاتی تو انکی اماں کہتیں۔

" تمہاری آپا اور صفیہ، رضیہ دونوں سرلا کے گھر ہیں " سرلا کے گھر جاتی تو ان کی ماتا جی کہتیں " تینوں آئی تھیں، پھر سرلا اور شیلا کو لیکے نکہت کے یہاں چلی گئی ہیں " اور نکہت کی امّی بتاتی " سب کی سب جولی کے پاس بیٹھی ہونگی "

جولی کے بعد معاملہ صاف تھا ...... زیدی کا پچھواڑہ یا راجہ اندر کا اکھاڑہ!

میں بھی ضد کرکے سیدھی وہیں پہنچتی اور پہنچتے ہی لے دے شروع ہوجاتی۔

" خیر تو ہے تم کیسے آئیں " آپا پوچھتیں۔

" ویسے ہی " میں ڈھیٹ سے کہدیتی۔

" تو یہ بھی ایک ہی رہی، کوئی کام نہیں ہے اور؟ " بھلا جولی کو اس سوال کا کیا حق تھا۔

"اماں نے بھیجا ہے" میرے پاس بہانہ موجود تھا۔

"کیوں جارہی ، تالیق بنا کے ؟" جب تمہت ایسا سوال کرتی تو اس کے گھنگھریالے بال نگ سے زہر یلے دعمہ نفرت خیز لگتے ....

"مجھے کیا معلوم کیوں بھیجا ہے" میں اٹک کے رہ جاتی۔

"نہیں معلوم تو واپس جاؤ ...."

"کیوں زبردستی ہے ؟" میں بیٹھ جاتی تو زیدی اٹھ کھڑا ہوتا۔

"خیر چھوڑو .... اب کل سہی .... میرا سر بھی آج بھاری ہے"

اس کے بعد جو مجھ پر گزرتی وہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

تو ایسا ہی کوئی دن تھا جو اماں نے مجھے دھتکار دیا اور میں سب گھروں کے چکر لگا کے باغ میں پہنچی تو عجیب منظر دیکھا ....

سب کی سب زیدی پر لدی پڑی تھیں اور جیسے بِلک بِلک کر رو رہی ہوں ، واللہ اعلم رو رہی تھیں یا یہ کوئی نئی طرز کا کھیل تھا ، میں تو حیران کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

زیدی بیچ میں گھرا ہوا تھا ، اس نے بمشکل سر نکالا تو مجھے دیکھ لیا اور جھٹ سے سب کو جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اب اوروں نے بھی پلٹ کر مجھے دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو واقعی ساری کی ساری رو رہی تھیں .... لال لال آنکھیں اور پھولی پھولی ناکیں . . . میں دیکھ کے گھبرا گئی۔

"کیا ہوا آپا . . . یہ کیا کر رہی ہو ؟"

"تمہارا کفن سی رہی ہوں"

لو یہ ہمدردی کا اچھا نتیجہ نکلا میں جل کے خاک ہی تو ہو گئی۔

"کیوں بولو کیا کام ہے ؟"

"آپکو اماں بلا رہی ہیں . . . میں تو ڈھونڈتی ڈھونڈتی چلی آئی" ، میں نے ڈر کر جھوٹ بولا ،

"تم چلو میں آتی ہوں"

اور میں وہاں سے لوٹی تو اس جھوٹ کا انجام سوچنا شروع کیا ایک تو یونہی جانے کس بات پر آپا آنسو بہا رہی تھیں اور اب اس دھوکے کی بات پر تو مار ہی ڈالینگی۔ اوّل سوچا کہ اماں سے مدد لوں اور ان سے کہہ دوں کہ میں آپا کو آپکے نام سے بلا لائی ہوں آپ کوئی کام بتا دیجیئے گا مگر اس میں . . . بگل دیگر شگفت ، کا اندیشہ تھا اماں نے تو ڈانٹ کر مجھکو دفع کیا تھا اب کہینگی کہ مُردار خود بھی لوٹی اور زہرہ کو بھی اٹھا لائی کھڑی بھلا سوچ ہی رہی تھی کہ آپا کے پیروں کی آہٹ سنائی دی اور میں لپک کر اپنے کمرہ میں گھس گئی وہ باہر اماں سے طلبی کی وجہ پوچھ رہی تھیں . . .

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پکارتی ہوئی ادھر ہی آ رہی ہیں ! آؤ دیکھا نا تاؤ جلدی سے پلنگ کے نیچے لیٹ گئی کہ تھوڑی دیر کو جان بچ جائیگی .

آپا آکر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئیں . . . . . .

"ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے اللہ کرے . . . . ."

میں سمجھ گئی کہ یہ قصیدہ میری شان میں ہے، مگر جواب کا موقعہ نہ تھا، دس پندرہ منٹ مجھے سانس روکے پلنگ کے نیچے گذر گئے پھر کھٹ پٹ کی آواز آئی اور میں نے تھوڑی دیر بعد ایک سوکھی ہوئی سانولی پنڈلیاں اور اونچی ایڑی کی جوتے جاتے دیکھے۔

"صبر کرو میری جان" خدا جانے جولی نے آپا جان کو صبر کی تلقین کیوں کی۔

"اور کیا کر سکتے ہیں" آپا جان نے سرد آہ بھری۔

پھر تھوڑی دیر بعد آپا جان نے کہا "وہ ارادہ ہے نا جولی، تو ایک گروپ ٹھیک رہیگا یا سب کی علیحدہ علیحدہ؟"

جولی نے کہا "نہیں بھئی، گروپ نہیں سب کی علیحدہ ہو تو بات ہے .... جس کا جو پوز زیدی کو پسند ہے اس طرح ...... مثلاً میرا اس کو غصہ کرنیکا انداز بہت پسند ہے تو میں اس طرح ...... اور تم ...... تمہیں کس طرح پسند کرتا ہے؟"

"میرا ...... میرا سر جھکا کر مسکرانا ...." آپا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"تو بس تم سر جھکا کر مسکرانا"

"مگر جولی اس طرح پیسے بہت خرچ آئیں گے"

"اونہہ تم پیسوں کی پروا کرتی ہو ..... گھر کا سارا خرچ تمھارے پاس رہتا ہے، آخر پندرہ بیس روپیہ خرچ کرنے سے کسی کو کیا پتہ چلیگا ...... میرے پاس بھی پچھلے مہینے کی تنخواہ میں سے روپئے بچے پڑے ہیں، اسطرح سب نکال لیں گے ..... غریب کو آخری تحفہ دینا ہے .... پھر وہ کہاں، ہم کہاں ....." جولی کی آواز بھرّا گئی۔

"اُف زیدی چلا جائیگا تو ہماری کیا حالت ہوگی؟"

"بے موت مر جائیں گے" جولی نے جواب دیا۔

"کیا اچانک مصیبت آئی" آپا نے سسکی لی۔

"اسے خود بھی ایکا ایکی تبدیلی ہو جانیکا گمان نہ تھا" جولی نے کراہ کر کہا۔

اب میں سمجھی کہ سارا غم اس بات کا ہے، زیدی کا تبادلہ ہوگیا اور وہ منحوس یہاں سے جا رہا ہے ..... اور پیسوں کا کیا قصہ ہے .... کہیں ان لوگوں نے چپ چاپ تصویریں کھچوانے کا ارادہ تو نہیں کر لیا ...... تو اچھا ہے یہاں چھپے تو ایک راز معلوم کر لیا، اب آپا جان مجھ پہ رعب جمالیں تو جانوں، اُلٹا اُن کو دھمکاؤں گی۔

"اچھا تو پھر کل صبح .... میری سالگرہ کی دعوت کے بہانہ سے"

"پھر دیکھو جولی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو" آپا نے سرگوشی کی۔

"کیسے پتہ چلیگا ...... میرے یہاں کا نام لیکر آؤگی نا" جولی نے کہا۔

"پھر بھی کہیں ثریا کہہ بیٹھے امی کے سامنے کہ ہم بھی جولی کے یہاں جائیں گے"

"تو ایسے موقعہ پر عقلمندی سے کام لینا .... تم ہر دم ثریا کو دباتی رہتی ہو، اگر اسے شبہہ ہو جائے اور وہ بات کھول دے ......"

"تو بہ قیامت آجائیگی" آپا نے لرزتی آواز میں کہا۔

"تو ایسے موقعہ پر غصہ کے بجائے خوشامد سے کام لینا ...... سمجھیں"

"ظاہر ہے معاملہ ہی ایسا ہے" آپا نے جواب دیا اور میرا دل چاہا کہ فوراً ہی پلنگ کے نیچے سے نکل پڑوں اور کہدوں کہ میں نے ساری باتیں سن لی ہیں مگر ...... جولی چلی گئی تو آپا بھی اماں کی آواز پہ کمرے سے نکلیں اور کچھ دیر بعد میں بھی اطمینان اور شان سے باہر نکل آئی، جب آپا سے تنہائی میں مقابلہ ہوا تو اس سے قبل کہ وہ شام والی حرکت پہ کچھ کہیں، میں نے سوال کیا۔

"آپا کل آپ تصویر کھنچوانے جائیے گا؟"

"ایں ...... نہیں تو ...... تم سے کس نے کہا؟" آپا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے خود سنا ...... جب آپ جولی سے باتیں کر رہی تھیں"

"جب میں جولی سے باتیں کر رہی تھی ...... مگر تم نے کیسے سن لیا؟"

"میں برابر کے کمرے میں بیٹھی تھی ...... آپ دونوں کی آواز آ رہی تھی!"

"اوہ ...... مگر دیکھو ثریا ...... ابا یا اماں نہ سن لیں ...... میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں"

"اطمینان رکھئے، میں کسی سے نہ کہونگی ...... مگر ایک شرط ہے"

"وہ کیا" آپا نے چونک کر پوچھا۔

"میری تصویر بھی کھنچوائیے ......" مجھے اس سے بہتر موقعہ کیا ملتا۔

"کیوں؟ تم کیا کرو گی ...... دگنے پیسے خرچ ہونگے"

"رہنے دیجئے ہم ابا سے کہکر کھنچوائیں گے"

"نہیں، نہیں تم ابا سے کچھ نہ کہنا ...... کل تمہاری تصویر بھی کھنچوا دونگی"

اور دوسرے دن جب وہ جولی کے یہاں کا نام لیکر چلیں تو با دلِ ناخواستہ مجھے بھی ساتھ لے لیا ...... فوٹوگرافر کے یہاں جاکر سب نے عجیب عجیب سے منھ بنا کے تصویر اتروائی، سب سے آخر میں میرا نمبر آیا ...... جب چلنے لگے تو جولی نے فوٹوگرافر سے پوچھا کہ "کب تک تصاویر دوگے" اس نے کہا "پرسوں پروف دکھاؤنگا"

جولی کہنے لگی "واہ پرسوں شام کو تو ہمیں اصل کاپی چاہئے"

اس نے صاف کہدیا کہ "اتنی جلدی تیار نہیں کر دوں گا"

آخر میں طے ہوا کہ پروف دکھانے کی ضرورت نہیں، بس جیسی بھی آئیں پرسوں ملجانی چاہئیں، تیسرے دن جولی جاکر تصویریں لے آئی، آپا نے چھپانے کی تاکید کرتے ہوئے میری تصویر میرے [illegible] جو خاصی اچھی آئی تھی، بہت ہی غمزدہ سا چہرہ یہی میں چاہتی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ سب کی تصویریں زیدی کی نذر ہونگی ...... اور دفعتاً میرے دماغ میں ایک [illegible] آیا ...... میں بھی اپنی تصویر زیدی کو دونگی ...... اگر وہ ایسی لڑکیوں کی تصویر رکھ سکتا ہے جن سے [illegible] محبت کی تو ایک ایسی لڑکی کی تصویر بھی سہی جس سے وہ بلا وجہ نفرت کرتا تھا ...... شدید نفرت ...... ہرچند کہ اس کی بلا سبب نفرت میرے لئے ہمیشہ دکھ کا باعث رہی اور کبھی کبھی میں نے بھی اپنے دل [illegible] بے تعلقی اور بیگانگی کا جذبہ پایا مگر آج ...... میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کے جانے کا رنج ہے جیسے میری زندگی میں بھی کوئی خلا پیدا ہو جائیگا اور میری نگاہیں بھی اسے ڈھونڈتی رہجائیں گی ......

میں اسے یہ تصویر بھی دوں گی اور اس سے پوچھونگی کہ آخر تم مجھے کیوں ناپسند کرتے ہو ......

تو وہ چلا ہی جائیگا ....

تصویریں تو بی آپا نے اپنی تصویر پہ جلتی جلتی سی قلم سے کچھ لکھا اور پھر جولی کے ساتھ چلی گئی .... میں دیر تک سوچتی رہی کہ اپنی تصویر پہ کچھ لکھوں یا نہ لکھوں .... پھر ایک شعر یاد آیا جو آپا جان کی البم میں ان کے کسی دوست نے لکھا ہوا تھا میں نے جلدی جلدی شعر کو تصویر پہ نقل کیا ؎

نقش نفرت کی مصور تیری ہاتھوں کے نثار　　یاس کی سب رنگینیں بھر دیں میری تصویر میں

پھر سوچنے لگی کہ کب وہاں سے آپا وغیرہ واپس ہوں اور کب میں جاؤں - جولی نے تو نوکری سے مہینہ بھر کی چھٹی لی تھی اسی ٹرین سے گھر جا رہی تھی، جس سے زیدی کو جانا تھا - جب آپا واپس آئیں تو میں چپ چاپ اپنی تصویر لے کر جلدی اور طویل راستہ طے کر کے آہستگی سے زیدی کے کمرے میں قدم رکھا .... وہ میز پر پھیلی ہوئی تصویروں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا .... آہٹ پا کر بغیر گردن موڑے ہوئے کہا

"کون ہے ؟"

"میں ہوں" میری آواز کانپ گئی

"کون ثریا ؟" وہ چونک کر پلٹا "کیوں خیر تو ہے ؟"

"ہاں" میں نے ہمت کر کے آگے بڑھتے ہوئے کہا "آپ کل جا رہے ہیں نا"

"ہاں، ہاں تو پھر .... ؟" اس نے حیرت سے میرا سراپا جائزہ لیا -

"تو پھر .... یہ .... یہ ...." میں نے تصویر آگے بڑھائی

"یہ کیا .... تمھاری تصویر .... اسے کیوں لائی ہو ؟"

"آپ کو دینے"

"مجھے دینے ! ؟ .... نہیں نہیں ثریا، میں یہ تصویر نہیں لونگا"

"آپ مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں ؟" میرا دل بھر آیا -

"میں تم سے نفرت ؟ .... خدا کے لئے ایسی بات نہ کہو ...."

"پھر آپ میری تصویر کیوں نہیں لیتے .... حالانکہ آپ نے سب کی تصویریں ...."

"ہاں اس لئے کہ میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں، میری نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں ..... اور تم ..... تم سے محبت کرتا ہوں، ثریا میں تمھاری عزت کرتا ہوں ..... اسی لئے میں نے تمھیں آجتک اپنا کھیل نہیں بتایا سمجھیں ؟" "آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں" مجھ پر دیوانگی طاری ہونے لگی -

"ہاں ثریا محبت انتہائی محبت .... تم سے اور صرف تم سے .... اسی لئے تو میں نے آجتک ... اچھا اب تم یہاں سے جاؤ .... جاؤ ثریا ...."

میرا سانس آپ سے آپ چڑھنے لگا اور اس نے مجھے زبردستی باہر دھکیل کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ..... تصویر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی اور میں نے دیوار کا سہارا لے کر سوچا .... کاش اسے مجھ سے بھی نفرت ہوتی .... کاش ....

انجم سلمانی

یہ زندگی

اور یہ سڑک ——— ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ اسکول سے آتے جاتے وقت یہ اس دو میل لمبے راستے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سائیکل کی رفتار کے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی بھاگ رہی ہے، مگر میں تین سال سے اس سڑک کو دیکھتے دیکھتے اس سے مانوس ہوگیا ہوں لیکن میری زندگی! ——— زندگی ابھی تک اس سے نفرت کرتی ہے، مجھ سے، اسکول سے، اسکول کے بچوں سے اور اس سڑک سے! ——— یہ سڑک جو ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ ایک مست شرابی کی طرح مدہوش اور لاپروا ہے اس پر چھکڑے دوڑیں یا امریکن موٹریں اپنے خوبصورت خرام ناز سے اسے حسین بنائیں، مویشی بھاگیں یا انسان خراماں خراماں اس پر تفریح کریں۔ اسکو کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اور یہ سب کو اپنی چھاتی سے لگاتی ہے اور اپنے سینے پر سے لئے انہیں گھر تک پہنچا دیتی ہے۔ ان لوگوں کو بھی جنکی بیویاں اپنے پتلے پتلے ہونٹوں میں تمام جہان کی فردوسی مسکراہٹیں سمیٹے ہوئے انکی منتظر ہوتی ہیں اور یہ انہیں بھی نہیں روکتی جو دن بھر کی محنت کے بعد شل ہو جاتے ہیں، مگر گھر پہنچنے کے بعد اپنی اور بیوی بچوں کی روٹیوں کا سوال ان کے لئے سوہان روح بنجاتا ہے ——— اور پھر یہ ہمیشہ سے دوسروں کے لئے اپنی چھاتی کشادہ کئے رہتی ہے۔ پہلے اس پر اکا دکا آدمی چلتے تھے اور اب پچھلے چھ سات برس سے ہزاروں آدمی روزانہ اس پر سے گذرتے ہیں۔ اور موٹریں بھی! ——— جو اس بدنما اور بھدی سڑک پر آکر ایسی بے تحاشا دوڑتی ہیں جیسے اس میں بیٹھنے والے کوئی جرم کرکے بھاگے جا رہے ہیں ——— مگر مجھے اس بے ڈھنگی اور پتھریلی سڑک سے محبت ہے اور اسی لئے کبھی کبھی بہت صبح سے میں ادھر تفریح کے لئے بھی آجاتا ہوں، میں ان پھٹے پرانے کپڑوں میں چھپی ہوئی چلتی پھرتی لاشوں سے مانوس ہوگیا ہوں ——— اور مل کی چمنی کو نظریں جما کر دیکھنے والی عورتیں! ——— یہ عورتیں بوڑھیاں، بچیاں اور جوان!! ——— آہستہ آہستہ، تیز تیز، اور بھاگتی ہوئی، میرے پژمردہ دل میں اس زندگی ——— اس سنسان بھاگتی ہوئی زندگی میں رنگینیاں بکھیرنے کی آرزو پیدا کرتی ہیں اور بے اختیار میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس بھیڑ میں شریک ہو جاؤں، اور کسی مزدور کا سہارا لئے ہوئے اسی طرح بھاگوں اور بجلی ہونے سے پہلے مل کے دروازہ پر پہنچ جاؤں۔ اس جگہ جہاں پہنچکر یہ غریب مزدور اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔ اور دن بھر کام کرنے کے لئے اپنی ہمت کو نئے سرے سے تازہ کرتے ہیں ——— اور پھر میں شام کو ان لوگوں کے ساتھ ہنستا، بولتا، اور گپیں ہانکتا ہوا گھر لوٹوں۔ میں چاہتا ہوں ——— میں سچ سچ اپنی زندگی میں ایک ایسا ہی تغیر چاہتا ہوں، مگر زندگی!! ——— میری زندگی ان میلے کچیلے مزدوروں اور ان مسکراتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہے، اسے اس ماحول سے تنفر ہے۔ وہ نفرت کرتی ہے۔

اور اسی طرح وہ ایک دال چنے والی کی دکان ہے، گول سا چہرہ، بھرا ہوا جسم، بس ہمیشہ وہ ہنستی رہتی ہے اس کا شوہر ایک عجب احمق سا انسان ہے، مگر ان دونوں میاں بیوی کے لئے جیسے جنت اتر آئی ہے اور اس جنت میں وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"ایک دن میں اس دوکان کے سامنے سائیکل سے اتر پڑا کیونکہ ڈھیلی ہونے کی وجہ سے میری سائیکل کی ...گئی تھی۔

"کیوں جی، تم نے میرا کنٹھا کیا کر دیا؟"

اس کا شوہر مصنوعی غصہ ظاہر کرتے ہوئے بولا "چل دوسرا بنجائیگا، گھبراتی کیوں ہے؟"

وہ ہنسنے لگی اور اس نے ٹوکری میں کوئی چیز رکھتے ہوئے کہا "میں نے سوچا تھا کہ اسے بیچ کے جیجی کی لڑکی کے بیچ میں کچھ پان پھول کر دونگی ـ اب کیا ہوگا؟"

اس کے شوہر نے کچھ متفکر ہو کر کہا "دیکھا جائیگا ــــــ بڑی آئی پان پھول کرنے والی!"

وہ اس کی طرف دیکھ کر پاگلوں کی طرح اور زور زور سے ہنسنے لگی ــــــ

ــــــ کچھ دیر خاموش رہی، پھر وہ بولی۔

"ایک بات کہوں؟"

"کیا؟"

"میرے بالی بچے بیچ کے کچھ کپڑا لا دو!"

ہندستان میں ایسا ہی ہوتا ہے، میں آگے بڑھ گیا ــــــ یہ ایک چوڑی والے کی دوکان ہے۔ اسی کے ...ے ایک بوڑھے حزانشی کی دوکان ــــــ سنا ہے دو لاکھ روپیہ کی جائداد کا مالک ہے: ور چالیس ہزار روپیہ ...دے ہے مگر میلی پھٹی ہوئی دھوتی، برسوں کی روئی کی صدری پہنے ہوئے میل کی وجہ سے جس کا اصلی رنگ شناخت کرنا ...ہے، کپڑے کی گول ٹوپی لگائے ہوئے، لکھ پتی ہوتے ہوئے بھی وہ ایک کنگال بھکاری کی طرح بیٹھا رہتا ہے ...بیوی اور دو تین بچے ہیں، مگر بیوی ہمیشہ بیمار رہتی ہے، جیسے ہی میں دوکان کے پاس آیا، ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ...بھائی کی بیوی نے کہا۔

"دادا جی! جاڑا کیسا پڑ رہا ہے، ایک صدری بنوا دو"

خرچ کا نام سنکر بوڑھے کو ایک پھریری آئی اور اس نے گلے پر ہاتھ رکھکر دو ایک مرتبہ کھنکارا اور پھر بلغم تھوک کر ...یا "مری کیوں جاتی ہے بہو! روپیہ تو آنے دے"

بہو نے کراہتے ہوئے کہا "میری تو چھاتی میں درد ہوتا ہے"

"پھر میں کیا کروں؟ رات کو سینک لیا کر!"

یہ دنیا ہے اور دنیا میں سب ہی طرح کے لوگ رہتے ہیں، پھر کیوں شکایت کیجائے کہ دنیا میں سب اچھے آدمی نہیں ...ہاں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہو رہا ہے اور یہی ہوتا رہیگا، پیغمبر آئے، مصلح پیدا ہوئے۔ بھگوان نے اوتار لیا ...ے بڑے رشیوں نے لوگوں کو نیکی کی تلقین کر کے دینی و دنیوی عزت و عظمت کے طریقے بتائے اور گناہ سے بچنے کا ...ایا، مگر کوئی بھی گناہ اور برائیوں کو دنیا سے ناپید نہیں کر سکا۔ بلکہ اکثر دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں نے شدت ...ہ بدکاریاں کیں اور اس کے ساتھ ساتھ دنیوی عزت و عظمت بھی حاصل کی اور بیچارے نیک اور پاکباز بندے ...ہ گئے، اور خدا! ــــــ خدا تو سب کا ہے اور اکثر گنہگار نیک لوگوں سے زیادہ خدا پر ...ھتے ہیں۔ پھر دوسروں کی آنکھ کے تنکے کے بجائے اپنی آنکھ کے شہتیر کو کیوں نہ دیکھا جائے اور ــــــ اور ...خیالات کے پٹ ایکدم بند ہو گئے!" ــــــ

وہ اُستانی ہے اور بالکل میری ہی طرح دو سال سے اس کی زندگی بھی اس سُرخ پتھریلی سڑک کی چھاتی پر چلتے ہوئے گذر رہی ہے، مگر میرے لئے اس میں کوئی کشش نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسکول، سائیکل اور سڑک ——— ان ہی دیکھتے دیکھتے میرا دل مردہ ہو چکا ہے۔ تین سال سے مسلسل روزانہ سینکڑوں مناظر دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں تھک چکی ہیں اور اس دنیا اور اس کی بوقلمونیوں کے متعلق سوچتے سوچتے میرا دماغ بوجھل ہو گیا ہے۔ مگر وہ جوان ——— نہیں نہیں ایک نوجوان بیوہ ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس کی ساحرانہ چال میں پریاں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ کیونکہ دنیا میں بہت سی باتیں صحیح ہیں گو کہ ہم انھیں نہیں مانتے، مگر پھر بھی وہ غلط نہیں، مگر یہ استانی ———!!

"ایک دن جبکہ وہ اور میں دونوں اپنے اپنے اسکولوں سے مزدوری کر کے واپس لوٹ رہے تھے، چوراہے سے مڑتے ہوئے ہمارا سامنا ایک مجمع سے ہوا، وہ ٹھٹک کر دور جا کھڑی ہوئی اور میں نے اپنی سائیکل ایک طرف کر لی، ایک بڑا لال جھنڈا بیچ میں تھا اور سیکڑوں مزدور اس کو گھیرے ہوئے اکڑتے اینڈتے اور سینہ نکالے ہوئے گا رہے تھے :-

سارا سنسار ہمارا ہے، سارا سنسار ہمارا ہے

مزدوروں نے ملکوں ملکوں، اب جھنڈا لال اُٹھایا ہے

روکے تو کوئی ہمکو۔ سارا سنسار ہمارا ہے

سارا سنسار ———!

جلوس گذر گیا اور یہاں تک کہ گانے کی آواز بھی دور جا کر فضا میں معدوم ہو گئی، البتہ اس نے ایک نیا خیال مجھے سوچنے کے لئے دیدیا اور مجھے محسوس ہوا کہ کاش! ——— میں بھی اس طرح لال جھنڈا اٹھاؤں اور زندگی کے محور پر گھومنے والوں کو ساتھ لیکر بغاوت کر دوں، میں بھی اسی طرح گاؤں، نعرے لگاؤں اور اس ذلیل اور فرسودہ زندگی کے خلاف سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دوں اور پھر ——— پھر اچانک چونکتے ہی اس سے میری نگاہیں چار ہوئیں اور پھر فوراً ہی ہم دونوں سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ آہ! ——— عمر کی منزلوں میں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوتے ہوئے بھی ہم دونوں کے خیالات میں کتنی یکسانیت تھی، کیسا اتحاد تھا اور کس قدر ہم آہنگی تھی، مگر ہمارے مفلس اور ننگے بھوکے خیالات اپاہج تھے، مجبور و معذور تھے اور ان کے پاس کوئی لال جھنڈا نہیں تھا جس کا خونی رنگ دیکھ کر ان میں استقلال پیدا ہوتا، وہ پانی کی ایک لہر جو کچھ دور تک دائرہ بنانے کے بعد پھر پانی میں مل گئی اور ہم دونوں کسی خیال کے ماتحت جلدی جلدی چلنے لگے، اونچے اونچے مکانات، دوکانیں اور دکانوں پر بیٹھنے والے سب ہمیں بھاگتے ہوئے معلوم ہونے لگے، اور یہ زندگی ——— زندگی ہمیں منہ چڑا رہی تھی، اور سڑک! ———

——— یہ پتھریلی سڑک!!"

ـمر جمالی

سلاسل

اچانک وہ میرے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ——— "فلسفی کے لئے عورت کے پیٹ سے
ہو کر منکر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ———" میں نے اور سید نے ایک ساتھ پلٹ کر دیکھا ——— وہ ہنس رہا تھا
ہی گھناؤنی ہنسی، خدا جانے اس کی ہنسی میں گھناؤنا پن درحقیقت تھا یا نہیں ——— لیکن مجھے تو اس کی ہنسی ہمیشہ ہی
ہی محسوس ہوئی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ایسی دلچسپ بحث کو چھیڑ کر ان گنت لمحوں تک اس کی صورت تکتا رہا اور مسلسل
——— دھیرے دھیرے میرے ذہن کی نچلی سطح سے چپکے ہوئے ماضی کے ایک ابدی سلسلے نے حرکت کی، خیالات
ے ——— جمع ہوئے، پھر ایک دوسرے سے ٹکرا کر بکھر گئے ———

دفعتاً مجھے محسوس ہوا میری شریانوں میں آتش و آہن کا امتزاج، دماغ کی گہرائیوں میں ہلاکت آفریں بجلیاں، اور
کی لامحدود وسعتوں پر زہریلے ابخرات کا بے پناہ رنگ چھا گیا ——— مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں اس کے لئے
، نفرت ہی نہیں بلکہ حقارت کا پُر شدت جذبہ بھی ہے جو آج تک تشنۂ کام اظہار تھا ——— حالانکہ جانتا تھا کہ
اس سے حقارت تو درکنار، معمولی گریز کا بھی کوئی سبب نہیں، لیکن بس ہو گئی مجھے نفرت اور ساتھ میں حقارت بھی،
، بلاوجہ ——— درانحالیکہ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ مجھ سے کہیں زیادہ وجیہہ، تندرست اور توانا
ن تھا، بہت ممکن ہے اس پر لڑکیاں مرتی بھی ہوں، بڑی بڑی خوبصورت کھوئی کھوئی سی آنکھیں، لانبی ناک
ہونٹ، سرخ سپید رنگت، کشادہ پیشانی پر بکھری ہوئی کالے کالے گھونگریالے بالوں کی لٹیں، لانبا قد، دُبلا
——— پھر طرز تکلم کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر شائستہ انداز خود نمائی کی رو سے ایک بلند ذوق اور عام
ں کی سطح سے اونچا دکھائی دیتا تھا، نظر فریب اس قدر کہ دیکھنے سے نظر لگے ——— میں نے اس ناگہانی
ـا رت کے ساتھ پرانی نفرت کا جواز ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر نتیجہ میں کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا، حتّٰی کہ اجتناب
ۓ کوئی بہانہ بھی نہ مل سکا ——— مگر پھر بھی میری نگاہیں حسب معمول اس کی صورت کو دیکھ کر بجائے آسودہ حال
ے کے گھبرا کر چیخ پڑیں ——— میرے ذہنی ایوانوں میں ہمیشہ کی طرح آج بھی کہرام سا مچ گیا، وہی ایک عالمگیر
ہ، چیخ پکار، مار دھاڑ ——— اس وقت مجھے اس سے ہی نہیں بلکہ خود سے ——— اس دنیا سے
کے ہنگاموں سے، دنیا والوں سے وحشت سی ہونے لگی، مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا، حسب معمول
ے احساس نے آج پھر مجھے ننگا پایا، بالکل برہنہ مادرزاد یعنی جیسے میرے جسم پر ستر پوشی تک کے لئے کسی بوسیدہ
ے کا ایک معمولی سا چیتھڑا بھی نہیں تھا اور آنکھوں کے نرم و نازک پردوں میں میرے پتھریلے جسم پر آگے ہوئے
ا ور کمان کی طرح بل کھائے ہوئے سیاہ بال نوکیلے زہر آلود کانٹوں کی طرح چبھنے لگے، میں نے اس وقت بھی گھبرا کر
اچاہا ——— مگر کہاں ——— ؟ کدھر ——— ؟؟ آج بھی میرے ہر چہار جانب وہی لوگ تھے، وہی تاج محل
ناعی کا دم بھرنے والے اور اسکے خالق شاہجہاں کی زندہ جاوید محبت کا راگ الاپنے والے، جس نے دولت و ثروت
لـ سے زمین کی چھاتی کو جھلس کر اس پر ایک مرمریں آبلہ ڈال دیا ہے، وہ آبلہ جو شاید تا ابد اسی طرح کھڑا ہنستا رہیگا

ہم پر، ہماری محبتوں پر، ہمارے نا آشنائے تعبیر خوابوں پر جن میں محبت کرنے والے دو انسانی ہاتھوں کی تمنائیں چیخ چیخ کر دم توڑ دیتی ہیں مگر ——— ہائے دولت کا اقتدار ——— جس نے ایک ماں کے دو بیٹوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے، آخر ان لوگوں سے بچ کر جاؤں تو کدھر ——— ؟ ہر طرف وہی افراتفری پھیلی ہوئی ہے کوئی کسی کی ٹھنڈے دل سے سننے کو تیار نہیں ——— کوئی مسلم لیگ کو گالیاں دے رہا ہے تو کوئی کانگریس کو ——— کوئی جناح کی ستائش میں گن گا رہا ہے تو کوئی جواہر لال نہرو اور گاندھی کی چار چار پیسے سے لیکر ہزاروں روپیہ کی قیمتی تصویریں خرید کر ان کی پوجا کر رہا ہے، کوئی مولانا ابوالکلام آزاد معروف بہ راشٹرپتی کی تعریف و توصیف میں اپنے ذہن کے تمام حسین الفاظ کا ذخیرہ بے دریغ لٹا رہا ہے تو کوئی علامہ مشرقی کے حکم کا منتظر کھڑا ہے، کوئی کمیونسٹوں پر حملہ کرنے کی ترکیبوں اور بہانوں پر غور کر رہا ہے، کوئی آہنی تجوریوں میں ہاتھی گھوڑے چھاپ، ہرے پیلے نوٹوں کی سرسراہٹوں کو مقفل کر رہا ہے اور ایک جمِ غفیر اپنی آنکھوں میں ٹھکرائے ہوئے کتوں کا سا احساس چھپائے، چہروں پر افلاس، پستی اور زبوں حالی کے واضح نقوش ثبت کئے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح مجھ سے، میری نگاہوں سے، میرے ذہن اور میرے تصور سے ناگہاں ٹکرانے کے لئے والہانہ طور پر بڑھ رہا ہے اور میں ہزار بھاگنے کی کوشش کے باوجود نہیں بھاگ پاتا، میرے پیر جیسے زمین سے چپک گئے ہیں، اف ....

اف .... پروردگار ....

میں نے ایک بار پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا، اور دیکھتا رہا ایک غیر معین وقفہ تک .... وہ نہایت شان بے نیازی سے بیٹھا چاء پی رہا تھا، مزے لے لے کر، اور ایک عجیب ہی کامران مگر مضمحل مسکراہٹ اسکے چہرے کے مدوجذر میں پھیلی ہوئی تھی، جیسے وہ مجھ پر چوٹ کر کے مسرور تو تھا مگر مبہم طور پر ——— جانے کیوں ——— میں نے دیکھا اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں وہی جھلک تھی، وہی پرانی جیسے فرار ہونے کے لئے پر تول رہا ہو جن کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا شاید اس کی زندگی میں کوئی کشش نہیں، کوئی مسرت نہیں، نہ کوئی دلچسپی ہے، نہ جذبہ ——— اور امنگیں تو گویا اس کے دل کی گہرائیوں تک سے کھرچ لی گئی ہیں، تمناؤں کا ہجوم اس کے سینے کی چہار دیواری میں سر ٹکرا ٹکرا کر ہمیشہ کے لئے دم توڑ چکا ہے جس کی بے گور و کفن لاش پر بیٹھا وہ آنسو بہا رہا ہے ——— یہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں المناک سیاہیاں اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ وہ مجبور ہے، محصور ہے، لاچار ہے معذور ہے ——— وہ زندگی کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں آگے تا حدِ نگاہ موت کی پُر ہول ظلمتوں کا بپھرا طوفان پھنکار رہا ہے اور پیچھے وہی خاردار آڑی ترچھی، اونچی نیچی پگڈنڈیوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے، جن پر چلتے چلتے اس کے پیروں کی انگلیاں، تلوے اور ایڑیاں لہو لہان ہو چکی ہیں۔ شدّتِ تکلیف سے اب اس میں نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی ہمت ہے، نہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کی سکت ——— اور موت کی نوکیلی سیاہیاں تیز و تند بگولوں کی طرح بل کھاتی ہوئی ہوئی، وحشی اور خونخوار چیخیں مارتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہیں، رواں دواں ——— اور کوئی دم میں ——— وہ ——— وہ ——— نڈھال پڑا سانسوں کے سہارے پر ان لپکتی ہوئی ظلمتوں کو دیکھ رہا ہے، بھاگنا چاہتے ہوئے بھی بھاگ نہیں سکتا، اور فرار ہونے کا تمام احساس، سارا عزم اس کے دل کی گہرائیوں، ذہن کی وسعتوں اور دماغ کے میدانوں سے چپ چاپ نکل کر صرف آنکھوں کے جھروکوں میں جمع ہو گیا ہے ——— ابا اللہ آج سے پہلے میں اس کی آنکھوں میں اس طرح احساسِ فرار کی جھلکیاں پا کر صرف یہی سوچتا تھا کہ بس غریب کلرک ہو کر رہ گیا ہے یعنی اچھی خاصی صلاحیتوں کے باوجود سوسائٹی نے اس کی قدر نہیں کی ——— یا یہ کہ وہ خاطر خواہ تعلیم حاصل کر سکا

دوسروں کی طرح وہ بھی محض میٹرک کرکے رہ گیا اور شاید اس کے باپ کی جیب میں اتنے پیسے نہیں ہوں گے، جو بی اے ایسے بھاری کورس کے ذوقِ تعلیم کی تکمیل میں اس کی امداد کر سکتے، نتیجہ میں کلرکی کے علاوہ اس کے سامنے اور تھا ہی کیا ـــــــ دل سے یا بادلِ ناخواستہ اسے نوکر شاہی مشین کا پرزہ بنتا ہی پڑا اور رہوتے ہوتے وہ عام پرزوں کی طرح زنگ آلود بھی ہو گیا، یعنی جھڑکیوں، گالیوں، پستیوں اور ذلتوں کی آمیزش سے بےحسی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک مجسمہ ـــــــ

میں اس کو روزانہ دیکھتا تھا کبھی بازار میں، کبھی سینما کے پارک میں کبھی گرین لائٹ روڈ پر مگر زیادہ تر وہ اسی ریسٹورانٹ میں ملتا، کبھی تو وہ میرے سامنے ہی آتا، کبھی پہلے سے بیٹھا ہوا ملتا، مگر جب بھی وہ مجھے ملتا، جانے کیوں مجھے اپنا حلق کڑوا کڑوا سا محسوس ہوتا ـــــــ میں سوچتا ـــــــ ہو سکتا ہے وہ بےحس نہ ہو ـــــــ مگر میں پھر سوچتا آخر بےحسی نہیں تو کیا ہے، اس کے سامنے ہر قسم کی مٹھائیاں، بسکٹ، کیک، پیسٹریاں رکھی ہوتی ہیں مگر وہ کبھی ان کی نظر فریبی سے متاثر نہیں ہوتا ـــــــ آخر کیوں ـــــــ؟ میں نے آج تک جب سے کہ اس ریسٹورانٹ میں آنا شروع کیا تھا کبھی اس کو ساڑھے سات آنے سے زیادہ صرف کرتے نہیں دیکھا، وہی ایک کباب، ایک بسکٹ اور وہ بھی چار پیسے والا گھٹیا ـــــــ ایک کپ چائے، اور ایک پان، ایک سگریٹ ـــــــ اس کے علاوہ گویا پورے ریسٹورانٹ بھر میں کوئی چیز ایسی تھی ہی نہیں جس کو وہ استعمال کر سکتا ـــــــ حتیٰ کہ اس کے اس معمول سے ریسٹورانٹ کے بیرے تک اس قدر مانوس اور عادی ہو گئے تھے کہ جہاں اس نے قدم رکھا اور انھوں نے اسٹال پر اس کے مرغوب ترین ناشتے کا آرڈر بک کیا، حد ہے کہ وہ بھی چپ چاپ، میز کے سامنے جا کر بیٹھ جاتا اور نہایت سکون و اطمینان سے ناشتہ کرکے تقریباً پانچ یا دس منٹ سکوت کے عالم میں بیٹھا کچھ سوچا کرتا، پھر نہایت بدتمیزی سے پان کی دو پیسے والی گلوری کو بکرے کی طرح چباتا ہوا، انگلیوں میں پاسنگ شو کا سگریٹ دبائے کاؤنٹر کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا بالکل ہونقوں کی طرح ـــــــ گویا وہ انسان نہیں کسی مشین کا پرزہ ہے کہ حسبِ معمول گردش کر رہا ہے ـــــــ اس کے پاس نہ سماعت ہے، نہ بصارت ہے، نہ احساس ہے، نہ ذہن ہے ـــــــ یعنی جب تک ریسٹورانٹ کا کیشیر گھنٹی کا سوئچ نہیں دباتا یا یہ کہ بوائے پیسوں کی آواز نہیں دیتا وہ بیوقوفوں کی طرح اس کے سامنے کھڑا آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا رہتا ـــــــ حتیٰ کہ سگریٹ کا بل کھاتا ہوا دھواں اس کے سرخ سپید رخساروں کے نشیب و فراز سے گذر کر کاؤنٹر کے چھت سے ٹکرانے لگتا مگر وہ اپنی جیب سے اس وقت تک پیسے نہیں نکالتا جب تک وہ تین یا چار مرتبہ سن نہیں لیتا کہ واقعی ساڑھے سات آنے کا بل ہوا ہے ـــــــ اور کبھی کبھی تو وہ بوائے کو بلا کر پوچھتا ـــــــ صاحب بتاؤ ـــــــ آخر اسے بےحسی نہیں تو کیا سمجھا جائے ـــــــ بتائیے ـــــــ؟ یہاں تک کہ سیٹھ بھی اس کو عجیب آمیز نظروں سے دیکھ کر گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتا اور ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ کو روکتے ہوئے زور سے گھنٹی کا بٹن دبا دیتا ـــــــ اور دوبارہ بھی وہی ساڑھے سات آنے سن کر تو ان کی باچھوں کے نیچے ایک گریزاں مسکراہٹ مچل ہی جاتی ـــــــ میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا کہ حضور آپ تو بس پیسے دیکر چلے جایا کیجئے، مجھے معلوم ہے کہ ساڑھے سات آنے سے زیادہ ایک دھیلا صرف نہیں کرتے مگر ـــــــ

جواب میں وہ مسکرا دیتا ـــــــ غلطی ہو گئی سرکار ـــــــ آئندہ احتیاط ـــــــ حتیٰ کہ ایک روز سیٹھ نے اس سے تعارف بھی کرا دیا مگر پھر بھی وہ نفرت کا احساس میرے دل سے نہیں نکلا ـــــــ بلکہ وہ اور مستحکم ہو گیا۔

آپ ہیں مسٹر جمیل اختر —— اس نے میری طرف اشارہ کیا —— بہترین شاعر —— آپ نے انکی نظمیں وغیرہ پڑھی ہونگی، اکثر آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوتی رہتی ہیں۔

خوب —— خوب —— اس نے اس طرح کہا گویا ڈکار رہا ہوں جانے کیوں مجھے ابکائی آگئی ——

"مجھے آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی —— اس نے اپنے برف کے مانند سرد ہاتھ میں میرے گرم گرم ہاتھ کو بیدردی سے بھینچا، پھر ایک جھٹکے سے گرم جوشی کے ساتھ اظہار مسرت کرنے کی کوشش کی۔

اور آپ ہیں —— مسٹر عبدالودود —— بہترین ——

کلرک —— سید آگے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ چیخ پڑا —— گویا کلرک ہونا کوئی بڑی بات ہے۔ اور جیسے کہ دست سے میرے دماغ پر شیشے کا کوئی موٹا سا گلاس پھوٹ کر کرچے کرچے ہوگیا، میرے دماغ کی دکھتی ہوئی رگیں جھنجھنا اٹھیں —— کلرک —— کلرک —— کلرک !!! —— مگر وہ سید اور میں سب کے سب مسکرا رہے تھے۔

اس کے جانے کے بعد سید حسب معمول مسکرایا، وہی زہر آلود مسکراہٹ مضحکہ خیز —— اور مسکراتا رہا، بہت دیر تک —— مگر اس روز اس کی مسکراہٹ میں تضحیک سے زیادہ معنی آفرینی تھی —— گویا وہ ودود کے ماضی —— حال —— اور مستقبل سے پوری طرح واقف ہے،

میں نے کہا —— کیوں —— ؟

"کچھ نہیں" —— اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پان والے کی دوکان میں انگلی پھینکتے ہوئے بولا

"دو پان" —— یہ پان کھانے کی اس کو ایسی بری لت تھی کہ الاماں الحفیظ، چھٹائے نہیں چھوٹتی تھی، بس دن بھر بکروں کی طرح پان چبانا اس کا ایسا محبوب مشغلہ تھا کہ علی الحساب پان کھا کر تھوک دیتا —— اور نہ کوئی تنہا میں ہی تھوڑی کھاتا ہوں —— یہ جو سارا بھوپال کھاتا ہے اس بری طرح —— جہاں ان کے دانت خراب ہوں گے وہاں میرے دانتوں میں کونسے سرخاب کا پر لگا ہے —— میں اس لئے اس پر اور زور نہیں ڈالتا کہ یہی پان تو ہماری دوستی کا باعث بنا تھا —— ایک روز میں اسی ریسٹورانٹ میں بیٹھا چاء پی رہا تھا کہ وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر میرے پاس آگیا —— کیوں صاحب —— آپ ہی کا نام ہے جمیل اختر ——

—— جی —— فرمایئے —— میں نے چاء کی خالی پیالی کو پرچ میں رکھتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں —— وہ بات یہ ہے کہ —— کہ —— لڑکے —— اس نے بوائے کو آواز دیکر دو پان اور سگرٹوں کا آرڈر دیا —— ہاں تو —— میں آپ سے ملنے کا ایک عرصہ سے مشتاق تھا —— کیسی عجیب سی بات ہے —— دیکھئے ایک جگہ رہ کر ایک دوسرے کو نہیں جانتے ——"

میں نے کہا —— جی ہاں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے —— ایک گھر میں رہکر بھائی بھائی کو نہیں جانتا، باپ بیٹے کو نہیں جانتا، ماں بیٹی کو نہیں جانتی، تو پھر ہم دونوں تو ایک دوسرے سے بہت دور تھے —— خیر بوائے نے پان سگریٹ کی تھالی رکھتے ہوئے کہا —— پانی لاؤں صاحب —— اسنے کہا —— ہوں کھایئے پان کھایئے —— اور تھالی میرے سامنے بڑھا دی ——

جی ہاں —— مجبوراً مجھے پوچھنا پڑا —— میرے لائق کوئی خدمت —— ؟

وہ ہنس دیا —— جی نہیں —— دراصل مجھے آپ کی نظمیں بہت پسند ہیں —— خصوصاً "ردعمل" تو بہت زیادہ —— دوسرے یہ کہ اپنے ملک کے نوجوان فنکاروں سے ملکر مجھے بڑی روحانی مسرت ہوتی ہے"

اس کے بعد میری اور اس کی دوستی ہوگئی ـــ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں، بہت پہلے سے ـــ گویا میرے تخیل کے نگارخانہ میں، اس کی تصویر تھی مگر پردوں سے ڈھکی ہوئی ـــــ اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی شریر آنکھیں جو ٹمٹمارہیں ڈوبی ہوئی ـــ نکھری نکھری سانولی رنگت، جامنی ہونٹ اور اکہرا بدن، غیر معمولی طور پر چھوٹا قد ـــــ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں گویا میں اس کی ہر ایک ندرت، تنوع اور خصوصیت سے پوری طرح واقف تھا ـــــ جانے کیوں وہ کچھ غیر فطری طور پر مجسم خلوص، مکمل پیار، اور سر سے پا تک تسلیم ورضا ثابت ہوا - ایک ہی دن کی ملاقات نے مجھے اس سے دوبارہ ملنے پر مجبور کر دیا ـــــ اس کی اس مقناطیسی کشش سے کھنچکر میں اس کے اس قدر قریب ہوگیا کہ میرے فرصت کے تمام اوقات اسی کے ساتھ گذرنے لگے - میں سمجھتا ہوں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوسکتا ہے جن سے ایک مرتبہ ملنے کے بعد دوسری مرتبہ ملنے کی خواہش آپ ہی آپ لاشعور کی گہرائیوں سے نکلکر شعور کی انجذابی بلند سطح سے اس طرح چپک جاتی ہے جیسے پریس سے جمادی گئی ہو - اس کے حلقۂ احباب کی وسعت کو دیکھ کر اچھے اچھے خلیق مزاج بات بار اور وسیع دسترخوان والے لوگ بھی ہیچ دکھائی دیتے ـــ اس پر مزہ یہ کہ تعلیم کی محدودیت، تربیت کی غیر ذمہ داری اور ریسٹورانٹ کے گھٹے ہوئے اور مسموم ماحول میں پورے بارہ گھنٹے گذارنے کے باوجود وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے، ایک مضبوط اور سر بلند چٹان کی طرح ٹھوس - گلاب کی طرح شگفتہ اور خوبصورت، نرگس کی طرح دھلا ہوا اور خوشبودار، بلبل کی طرح بذلہ سنج ـــ اور حیران کن حد تک اس کے مشاہدے کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور بیان کی قوت ـــــ آخر وہ ہے کیا ـــــ ؟ چوں چوں کا مربہ ـــ ! مجھے اس کے متعلق خیال قائم کرنا پڑتا ـــ موسیقی سے اسے ایسا والہانہ لگاؤ تھا کہ چوبیس گھنٹے گنگناہٹوں میں ڈوبا ہوا - مزاحیہ جملوں کی اختراع میں اسے اس قدر دسترس کہ نت نئے اور ہر مذاق کے جملے بے لیجئے عبارت کے معاملہ میں اتنا تیز کہ اچھے اچھوں کے کان کاٹنا گویا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور ہر جگہ وہ پوری پوری فنکارانہ قوتوں سے کام لیتا ہے ـــ مگر شہرت سے بظاہر وہ اس طرح کتیاتا جیسے اس کے پس منظر میں تخریب کی تمام جابر قوتیں پوشیدہ ہوں جو اس کو ایک ہی جھپٹ میں فنا کر ڈالیں گی، نام ونمود سے اس قدر خائف کہ ان کا نام سنکر اس کا دم نکلنے لگتا ہے ـــــ مگر پھر بھی اس کی دوستی کا جال لامحدود ہے، جیسے یہاں آکر وہ مجبور ہو ـــــ ہوسکتا ہے اس کے جواز میں اس کا احساس کمتری کارفرما ہو ـــــ لیکن اس کا قول ہے، ملو سب سے، مگر دوستی کرو ایک یا دو سے ـــــ باقی ہوس ـــــ اب خدا جانے وہ اس کے پیش نظر کسے کسے اپنا دوست سمجھتا ہے ـــ اور آیا میں بھی اس کے زمرۂ دوستی میں آتا ہوں یا کہ نہیں ـــ لیکن جہاں تک میری خوش فہمی کا تعلق ہے وہ مجھے ضرور اپنے ان دو ایک دوستوں میں ہی شمار کرتا ہے ـــــ گو اس نے آجتک نہیں کہا کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے، مگر ایک روز میں خاموش بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا اور وہ نہایت انہماک کے ساتھ ریڈیو سن رہا تھا، دفعتاً اس نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا ـــــ جمیل

"ہوں" ـــــ میں چونک پڑا ـــــ

یار میں بلا کا بدقسمت ہوں ـــــ

"خوب" ـــــ میں نے طنزاً کہا ـــــ "وہ کس طرح" ؟

"وہ اس طرح کہ...... میری تجھ سے ایسے وقت میں ملاقات ہوئی جبکہ میں مجبور ہوں ـــ انتہائی مجبور"

تو پھر ـــ توڑ ڈالو نا ان مجبوریوں کو ـــــ میں سمجھا آج پھر اس پر اس گھٹے ہوئے ماحول سے اکتاہٹ کا بھوت سوار ہوا ـــــ وہ کہا کرتا تھا کہ بار طبعیت چاہتی ہے کہ بھاگ جاؤں اس ریسٹورانٹ کی دنیا کو

—— جہاں ترقی کے رستے بکھرے پڑے ہوں، مگر چند گھنٹوں بعد ہی سید ہوتا اور وہی فرفر انگلیاں....
کیونکہ اس کا امکان ہی نہیں —— اب تو میرے خاندان میں کوئی ایک لڑکی بھی ایسی نہیں جس سے
میری شادی ہو سکے —— اس نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ——

" مثلاً —— ؟ " میں نے سگریٹ کا دھواں جھٹ نگلتے ہوئے کہا ——

مثلاً —— یقین کر کیسی کیسی طبیعت چاہتی ہے کہ ہم دونوں باضابطہ طور پر اس قدر قریب ہو جائیں کہ ایک دفعہ تو روٹھ بھی جائے تو میں مجبور ہوں تجھے منانے کے لئے " میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور دنگ رہ گیا، اس لئے نہیں کہ وہ عام ہندوستانیوں کے اخلاقی احتساب سے ہٹ کر بات کر رہا تھا بلکہ اس لئے کہ اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب سی پیار چمک تھی، جیسے تاسف کی سیاہیوں کو چیر کر سچائی خلوص اور صداقت کا نور تمام عالم کو روشن کر دینا چاہتا ہے مگر مجبور ہے، اپنی بساط سے —— میں نے اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا —— وہ کیسے —— ؟

" محض بدقسمتی سے —— " اور یقین کیجئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سید زمین پر بسنے والوں میں سے نہیں ہے —— ہو سکتا ہے یہ میری خوش فہمی ہو، مگر جہاں تک یہ میرے یقین کی استواری کا تعلق ہے، میں نے اس کو اپنے اس قدر قریب پایا کہ نس نس میں رچا ہوا —— حالانکہ مجھے بہکانے کے لئے اس کا یہ قول ایک حد تک کافی طاقتور تھا کہ —— اچھے لباس —— شائستہ گفتگو —— حسین الفاظ اور نفسیاتی دباؤ سے دنیا کو بہت جلد بیوقوف بنایا جا سکتا ہے —— جہاں تم کو اس فن پر عبور حاصل ہوا اور تم بے نیاز ہوئے فکر فردا سے —— " مگر میں تھا کہ بے اختیار سمجھ رہا تھا، یہ محض زبان کی گردش، آواز کی تشکیل نہیں بلکہ بازگشت ہے دل کی گہرائیوں میں گونجتے ہوئے خلوص کی —— لیکن جب اس نے عورتوں کی گفتگو کرنا شروع کی تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی سید ہے وہی جس کے اخلاق کا عالمگیر خلوص سارے جہان کے دلوں کو آناً فاناً موہ لیتا ہے، جس کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں، جس کی صداقت پر فرشتوں کو رشک کرنا چاہئے —— اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشیانہ چمک تھی ناک کے نتھنوں میں مبہم سا ارتعاش تھا، کانوں کی لولکیاں سرخ ہو رہی تھیں آوازمیں شعلے لپک رہے تھے —— وہ عورت کو زندگی کا نصف بہتر کہتا ہے، اس کو وہ عورت پسند ہے جو خود پہل کرے، آگے بڑھ کر اسے پیار کرے، ایک مشفق ماں کی طرح تھپک تھپک کر اپنے بازوؤں پر سلائے —— جس کے ہونٹ رس بھرے ہوں، جس کی آنکھوں میں خمار ہو اور اعضا میں تناؤ، گدراہٹ، خواہ وہ بڑھی ہی کیوں نہ ہو —— اور بوڑھی عورت سے گویا اسے ایک طرح کا خاص لگاؤ ہے —— اس کا کہنا ہے —— وہ عام لڑکیوں کی طرح اناڑی نہیں ہوتی —— حظ نفس کے تمام نشیب و فراز اور صحیح معنوں میں لذت کے گروں سے واقف ہوتی ہے درحقیقت اگر عورت کو اپنے اصلی روپ میں دیکھنا ہو تو کسی بوڑھی عورت سے عشق کرو، جس کے گال پچکے ہوئے ہوں چہرے پر جھریاں پڑی ہوں —— وہ ہمیشہ لوگوں کو یہی مشورہ دیتا ہے —— اب یہ کہ عورت کے بارے میں اس قدر پست خیالات کا حامل کیوں ہے، اور اتنی بڑی کمزوری کا کیا سبب ہے کہ سڑی سے سڑی عورت چاہے تو اسے غلاظت تک کھلا سکتی ہے —— کیوں؟ یعنی اتنا بلند انسان یہاں آ کر کیوں اس قدر ذلیل ہو جاتا ہے —— یہ مسئلہ ایک عرصۂ دراز سے میرے ذہن میں اضطراری الجھن بن کر گھوم رہا ہے —— مگر جواز نہیں ملتا —— ہو سکتا ہے کہ عورت کے بارے میں اس کی یہ المناک لاچاری اور قابل رحم مجبوری رد عمل ہو اس کی

محبت میں ناکامی کا ——— گو آج تک اس نے کبھی اظہار نہیں کیا کہ اسے فلاں عورت سے محبت تھی یا ہے مگر جہاں تک لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے وہ واقعی وہ کسی اپنے سے کمتر لڑکی سے محبت تھی ——— مگر سماج ذی چھوٹے بڑے اور نسلی تفریق کی تخریب کے ڈر سے ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دیا اور لانبی ناکوں، بڑی ڈاڑھیوں، اور اونچے پیٹ والوں کے آہنی شکنجوں نے اس کو اس بے دردی سے اپنی گرفت میں جکڑا کہ مستقبل ماضی کے سینے کو بیدردی سے چیرتا ہوا حال پر خندہ زن گذر گیا اور رواں دواں ——— وہ منھ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ——— لڑکی کی جبراً شادی کر دی گئی، دونوں میں سے کوئی ایک بھی احتجاجاً ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ کہہ سکا ——— ہوسکتا ہے یہی صدمۂ عظیم اس کے لئے اس المناک انقلاب کا باعث بنا ہو جس نے سب سے پہلے اسے شاعر بنایا، پھر ادیب اور اخیر میں جمہوریت کا دلدادہ ——— یعنی ایک سچا ترقی پسند انسان ——— جہاں وہ مسلم لیگ کے ——— "حق خود اختیاری" کا حامی ہے اور پاکستان کو مسلمانوں کا جائز مطالبہ قرار دیتا ہے، وہاں گاندھی کی "اہنسا" کے لئے بھی اس کے دل میں کچھ کم عقیدت نہیں ——— مگر تا بکے ———؟ وہ حصولِ آزادی کے لئے انارکسٹ بھی بنجانا پسند کرتا ہے ——— وہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے واسطے جمہوری نظام کو نوعِ انسانیت کی بقا اور ارتقا کا ایک ایسا نشاط انگیز اور سکون پرور دور سمجھتا ہے جہاں نہ رنج ہوگا، نہ دکھ، نہ آنسو ہونگے نہ آہیں ——— نہ غریب ہونگے نہ چھوٹے، نہ بڑے ہونگے نہ امیر ——— سب ایک ہونگے، ایک ——— صرف انسان، فرق ہوگا تو ذاتی صفات اور اعتقاد کا ——— مگر اس کے باوجود اسے خدا اور اس کے رسول پر پورا پورا اعتقاد ہے، وہ اپنی ہر تحریر کے شروع میں واقعی (منٹو کی طرح نہیں) "۷۸۶" لکھتا ہے، اکثر نماز بھی پڑھتا ہے، خیرات کرنا بھی اس کا مسلک ہے ——— مگر پھر بھی وہ خدا اور اسلام کے نام پر مسلم لیگ کے لئے چندہ جمع کرنے والوں کو گالیاں دیتا ہے اور موٹی موٹی ——— بات پر بلا وجہ الحمد للہ ——— ماشاءاللہ ——— جزاک اللہ ——— کہنے والوں کو وہ دشمنِ اسلام سمجھتا ہے۔ ان کے لئے ہر دم اس کی زبان پر گالیوں کا ایک لامتناہی تسلسل گردش کرتا رہتا ہے اور نت نئی ——— گالیوں کے بارے میں بھی وہ اس قدر ماہر ہے کہ وہ ہر گالی کے مزاج، اثر اور اس کی ماہیت کو جانتا ہے، ہر موسم کی گالیوں کا اسٹاک اس کے پاس ہر وقت رہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ اسے اس کی ایک بہت بڑی اخلاقی کمزوری قرار دیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ اس کی ایک بہت بڑی خوبی ہے یہ تسلیم کہ ہمارے اخلاقی احتساب کی رو سے گالی بکنا معیوب ہے، لیکن گالی بذاتِ خود ایسی بری چیز نہیں جیسا کہ اسے سمجھ لیا گیا ہے ——— کیونکہ عام طور پر گالی بکی جاتی ہے، محض بکنے کے لئے، لیکن وہ اپنے اندر کبھی کوئی مفہوم نہیں رکھتی، دوسرے درحقیقت گالی بکنے کے جواز میں ایک طرح کی اپیل ہوتی ہے، حصول شگفتگی اور ترو تازگی، انسان گالی بک کر اپنے آپ کو قطعی ہلکا پھلکا اور ترو تازہ سا محسوس کرتا ہے، اب خواہ گالی پر دلتاری ہو یا پورژوائی بہرحال اپنے اندر وثامن کوئی ضرور رکھتی ہے، سوچئے تو ——— جب جذبات کا جام ابل پڑے اور پینے والا کوئی نہ ہو تو اسے لازمی طور پر چھلکنا ہی ہے یوں بھی تو وہ اپنے آپ کو گالیوں کا سرمایہ دار سمجھتا ہے، اس کا کہنا ہے ——— آخر تم لوگ اس قدر بزدل کیوں ہو چھین کیوں نہیں لیتے مجھ سے مار مار کر یہ حیاتین ——— لیکن جہاں وہ گالیوں تک اس قدر ماہر ہے وہاں اس کی بد تمیزیاں بھی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہیں، ماحول شناسی پہ اسے پوری طرح عبور ہے۔ [illegible] تبدیل کر لیتا ہے جیسے کوئی ماہر فن ادا کار ہو یا کوئی بہت بڑا آرٹسٹ ہو، شاعروں میں شاعر [illegible] ناقدوں میں ناقد، جاہلوں میں جاہل، تاجروں میں تاجر، نوکروں میں نوکر ہو جاتا اور ہر ایکٹ کو حیران کن حد تک

بخوبی ادا کرتا، اس کے لئے گویا ایک معمولی بات ہے، وہ خود کے "موڈ" پر بھی اس قدر عادی ہے کہ جہاں ہے اس کی
طبیعت کے خلاف اس کا ذہن کچھ اور تو سوچ لے گو اس کی یہ ہمہ صفتی حاصل ہونے کے ساتھ اس کے لئے
وبال بھی ثابت ہوتی ہے، مگر وہ ہر دلعزیزی کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور ہر دلعزیزی جیسی کارآمد چیز تجارت
کے لئے جس قدر سود مند ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے، یہی وجہ ہے کہ ریسٹورانٹ کا مالک اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کو
تیار نہیں مگر اس ماحول سے بیزار ہونے کے باوجود جانے کیا سوچ کر خاموش ہے اور نہیں چاہتا کہ نئی آل
ریسٹورانٹ کی منیجری کو چھوڑ دے، لیکن جب اقتصادی الجھنیں اسے پریشان کرتی ہیں تو اکثر اس کی آوازیں رقت
آنکھوں میں بیکسی کا احساس عود کر آتا ہے اس کے باوجود اس کے اخلاق کا لامحدود پھیلاؤ اسے کبھی برداشت نہیں کرتا
کہ اس کے دوست خواہ رسمی ہی کیوں نہ ہوں اس سے ملنے آئیں، یا محض اپنی ضرورت سے ریسٹورانٹ میں داخل ہوں
اور وہ ان کو بغیر خاطر و مدارات کئے واپس لوٹ جانے دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا فلاں دوست اس سے
کیوں ملتا ہے، اس سے اور اس کے اشعار کی تعریف و توصیف، اس کے خلوص کی مدح سرائی کے پس پردہ
کونسی خواہشیں کارفرما ہیں۔ اور کون اس سے بے لاگ طور پر ملتا ہے، یعنی وہ حلق اور دل سے نکلی ہوئی باتوں
کے تعارف کو بھی خوب سمجھتا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور ہے، جانتا ہے کہ اس کے کمزور بازوؤں
پر چھ سات افراد کی کفالت کا بوجھ ہے، لیکن اپنی تنخواہ کا کم از کم نصف حصہ ضرور ان رسمی اور اصطلاحی دوستوں پر
صرف کر ڈالتا ہے اور بیدریغ ——— اس کی شخصیت شہر کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک
نعمت ہے اور اکثر کے لئے تو جینے کا سہارا بھی ہے ——— مگر جہاں وہ اتنی بہت سی خوبیوں کا مالک
وہاں اس میں برائیاں بھی اتنی ہیں کہ پھر اسے نہیں چھوٹتیں، مثلاً اس کی تلون مزاجی، یعنی کبھی وہ کسی ایک
خیال، ایک مرکز، ایک جذبہ پر قانع نہیں رہتا وہ گردشوں کا نام زندگی سمجھتا ہے۔ الغرض علاوہ چند اصول
وہ اصولوں کی بے اصولی کا ایسا دلچسپ اور نایاب مجموعہ ہے کہ بس دیکھئے اور مسکرائیے ——— ممکن
ہیں اب بھی اس کی فطرت سے کما حقہٗ واقف نہ ہوا ہوں ——— لیکن جہاں تک میری اپنی ذاتی رائے
وہ ایک سربلند عزم ہے جس کے تصور کی وسعتیں، خیالوں کی رفعتوں اور جذبات کی گہرائیوں کی تھاہ
اچھے اچھے ماہرین نفسیات کے بس کی بات نہیں ——— وہ ہمیشہ جب بھی دیکھو اپنے ذہن کے
لق و دق میدانوں میں، دل کے مرغزاروں میں، دماغ کے گلستانوں میں مستقبل کی خاطر ایسے ایسے نظر
نگیں محل تعمیر کرنے کا عادی ہے کہ جہاں ہمارے تصور کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ پاتا — بیٹھے بیٹھے
بس وہ سوچتا ہی رہتا ہے، گالیاں بک رہا ہے مگر سوچ رہا ہے، باتیں کر رہا ہے اور سوچ رہا
خاموش ہے سوچ رہا ہے اور عجیب عجیب سی باتیں، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ادبی
اور جس وقت وہ سوچتا ہے اس وقت اس کی [illegible] جانے کہاں، کونسی خلاؤں میں [illegible]
کھوئی سی ...... آج بھی [illegible] ...... اس کو دیکھا تو حیران رہ گیا [illegible]
ان دیکھی خلاؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں [illegible] میں دھوئیں کے بادل [illegible]
تھا — ہاتھ چل رہے تھے [illegible]
سوچ رہا تھا جانے کیا ——— [illegible]
کیوں کیا سوچ رہے ہو ———
پھر [illegible] ——— اگر دنیا میں عورت نہ آتی تو کیا ہوتا ———

نہ
دیکھا
———
اس قد
———
جا سکتا
کہ بے
خلوص کی
وہی جس
ہیں جس کی
ناک کے نتھنو
وہ عورت کو
پیار کرے
ہوں جس کی آ
بوڑھی عورت
اناڑی نہیں ہوتی
درحقیقت اگر عورت
چہرے پر جھریاں
اس قدر پست خیا
تو اسے غلاظت
——— یہ مسئلہ
ملتا ——— ہو سکتا

ہوتا کیا ——— میں نے برجستہ کہا ——— ہوتا یہ کہ نہ مرد جنت سے نکالا جاتا ——— نہ مرد کا فن زندگی کی تجربہ کاری میں، موسم کی دلکشی میں، پھولوں کی خوشبو میں، رنگوں کے امتیاز میں، تہذیب و تمدن کی فسوں کاری میں مصروف ہوتا ——— نہ دنیا والے قتل و خون اور غارتگری کے المناک تصور سے روشناس ہوتے ———

کیا مطلب ———

" مطلب یہ کہ عورت ہماری کمزوریوں کا دوسرا نام ہے ——— "

کیا خوب! لیکن سمجھتا ہوں، عورت ہمارے لئے جینے کا ایک سہارا ہے، جسے آج کے ماحول نے آج کے سماج اور سوسائٹی کی ضرورتوں نے محض چار کی(؟) رنگی سی پیالی سمجھ لیا ہے ——— "

خیال ہے تمہارا ——— ورنہ آج تو عورت وہاں ہے، جہاں وہ مرد کو سب سے پہلی مرتبہ بہکا تے وقت بھی نہیں تھی ——— اگر اب بھی ہم عورت کو بیکس و مجبور و لاچار سمجھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہم آزادی کی فکر سے بھی معذور کر دیئے جائیں گے ——— "

" عجیب سی بات ہے ——— " اس نے حسب معمول پان والے کو پانوں کے لئے انگلی دیتے ہوئے کہا ——— دنیا میں، ترقی کے اسباب کا وجود محض عورت کے دم سے ظہور میں آیا اور تم کہتے ہو عورت کے وجود سے انکار کر دو ——— یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس کا تو صاف طور پر یہ مطلب ہوا کہ دنیا کا تصور مٹا دو ——— "

نہیں ——— نہیں ——— میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ——— " مجبوراً مجھے مسئلہ کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کو دیکھکر لہجہ کو نرم کرنا پڑا ——— " یہ صحیح ہے ——— مگر سید تم سوچو تو ——— دنیا میں ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقام ہوتا ہے، جس میں ذرا سی تبدیلی بھی نظام کائنات کی برہمی کا باعث بن سکتی ہے ——— دراصل ہم نے عورت کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے، جو اس کی حیثیت سے کہیں بلند تر ہے ——— اگر عورت ماں نہ ہوتی تو ......

تو ......؟ اس نے فوراً لقمہ دیا اور میرے خیالات کا سلاسل جھنجھنا کر ٹوٹ گیا ——— ابھی میں اس کو جوڑنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک وہ دوسری پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ——— فلسفی کے لئے عورت کے پیٹ سے پیدا ہوکر منکر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ——— " اور ہنس دیا، عجیب ہی مضحکہ خیز اور شیطانی ہنسی ——— مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے میرے منہ پر تھوک دیا ......

* * * * * *

دفعتہ میرے خیالات کا پھیلاؤ پھر سکڑ گیا، میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے خیالات کے سلاسل کو از سر نو جوڑنے کی کوشش میں کہا ——— میں نے مانا کہ عورت کا براہ راست ہماری انفرادی زندگی میں کافی دخل ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم اس کو اپنے سے اس قدر بلند کر دیں کہ وہ ہمارے سر پر چڑھ بیٹھے ———

" غلط ——— " سید بھی تلملایا ——— " اگر عورت کی اس زبردستی کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کس قدر غیر منطقی ہے کہ وہ مرد کے وجود سے منکر ہو جائے ——— اس کا زیر اور مرد کا زبر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مرد کے اقتدار کو کبھی باطل نہیں کر سکتی ——— پھر آپ ہی آپ وہ اپنے لہجہ کی سختی کو کم کر کے شاعری پر اتر آیا ——— ارے میاں عورت تو ایک لطیف شے ہے، ہوا سے بھی زیادہ لطیف پانی سے زیادہ خنک، مکمل کیفیت ——— مجسم لذت ———

اور جب میں اس کے پاس سے رات کے دس بجے اٹھا تو میرے ذہن میں اس کے یہ الفاظ برابر رقص کر رہے تھے ۔ ۔۔۔۔۔ مکمل کیفیت ۔۔۔۔۔ مجسم لذت ۔۔۔۔۔ باہر کی فضا میں نقرئی قہقہوں کا امتزاج بھانت بھانت کی آوازیں، بجلی کے قمقموں کی روشنیاں ۔۔۔۔۔ رات کے ابخرات بنکر پھیل رہی تھیں ۔۔۔۔۔ میں نے سامنے "اڈے" پر کھڑے ہوئے تانگہ کے پائدان میں قدم رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ چلو ۔۔۔۔۔

کہاں ساب ۔۔۔۔۔ تھوڑی دور چلکر سڑک کے نکڑ پر تانگے والے نے پوچھا

"جہاں من میں آئے ۔۔۔۔۔" جانے کیوں اس وقت میں ایک طرح کے شدید ذہنی انتشار میں مبتلا تھا ۔۔۔۔۔ کیا واقعی عورت اسی قدر لطیف ہوتی ہے، ہوا سے بھی زیادہ ۔۔۔ پانی سے زیادہ خنک ۔۔۔۔۔ مجسم لذت ۔۔۔۔۔ مکمل کیفیت ۔۔۔۔۔

"تو ساب (صاحب) ۔۔۔۔۔ تانگہ والے نے ذرا رازدارانہ لہجہ میں کہا ۔۔۔۔۔ تفریح کریئے گا ۔۔۔۔۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا کیسی تفریح ۔۔۔۔۔ ؟

بہت بڑھیا مال ہے ساب ۔۔۔۔۔ آپ دیکھکر پھڑک نہ اٹھیں تو میرا ذمہ ۔۔۔ اپٹوڈیٹ ۔۔۔۔۔ فیشن ایبل ۔۔۔۔۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں، یہی کوئی بیس بائیس کے لگ بھگ ہوگی ۔۔۔۔۔ ۔

"ہوں" ۔۔۔۔۔ جانے کیوں میری آنکھیں چمک اٹھیں، میرے اعضا میں ارتعاش پیدا ہوگیا، اور دل میں گدگدی، ۔۔۔۔۔ کانوں میں رنگ برنگے نغموں کے ریکارڈ بجنے لگے ۔۔۔۔۔

تو چلوں ساب ۔۔۔۔۔ اس نے گھوڑے کو چابک لگایا ۔۔۔۔۔

اچھا ۔۔۔۔۔ میں نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں گونجتی ہوئی آواز کو وقتی طور سے دبانا چاہا ۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔ مگر پہلے سینما چلو ۔۔۔ پھر اسٹیشن ۔۔۔۔۔ بعد میں جہاں تم چاہو ۔۔۔۔۔"

جب تانگہ قبرستان کے پاس والی سڑک پر پہنچا تو اس وقت ٹھیک رات کے بارہ بجے تھے، سڑک سنسان پڑی تھی۔ قبرستان سے موت کی نوکیلی ظلمتیں پھوٹ کر، لحد میں بسنے والوں کا پُر ہول تصور فضا میں پھیلا رہی تھیں ۔۔۔۔۔ وقت کی دھڑکن گویا رکی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔ جھینگروں کی پیہم چیخ پکار کے باوجود ماحول میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوچکا تھا ۔۔۔۔۔ صرف ابھری ہوئی سنگین گیٹوں پر گھومتے ہوئے پہیے اس لامتناہی اور المناک سکوت کو توڑنیکی مسلسل کوشش کر رہے تھے ۔۔۔۔۔

یکایک ایک گورکن کے مکان کے سامنے تانگہ رک گیا ۔۔۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔۔۔ ذرا ٹھہریئے ۔۔۔۔۔ میں ابھی آیا ۔۔۔۔۔ ذرا دیکھ آؤں ۔۔۔۔۔" اور سڑک کے دوسری طرف گلی کے نکڑ میں غائب ہوگیا ۔۔۔۔۔ تقریباً دس منٹ کے جانگسل انتظار کے بعد وہ آیا ۔۔۔۔۔ چلئے ساب ۔۔۔۔۔ اور اس نے تانگے کے پائدان میں سے گھاس نکالکر گھوڑے کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا ۔۔۔۔۔ کب تک ٹھہریئے گا ۔۔۔۔۔ وقت بتا دیجئے ۔۔۔۔۔ میں ٹھہروں یا جاؤں ۔۔۔۔۔ ؟

۔۔۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔۔۔ ٹھہرو ۔۔۔۔۔ ذرا دیکھ آؤں ۔۔۔۔۔

اتنے میں گلی کے منہ سے ایک سایہ نمودار ہوا اور تیزی سے ہمارے قریب ہونے لگا ۔۔۔۔۔ لیجئے ۔۔۔۔۔ وہ خود ہی آگئے ۔۔۔۔۔ بات کر لیجئے ۔۔۔۔۔ یہ کہکر وہ سڑک کی دوسری طرف بیٹھکر پیشاب کرنے لگا ۔۔۔۔۔ *Well! do you want a lady* ۔۔۔۔۔ سائے نے ہمارے قریب آکر

تدرے توقف کے بعد کہا ———

"میں نے کہا دعوت ——— " لیکن سنی سنائی آواز سنکر جانے کیوں مجھے کھٹکا ہوا ——— اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ انسان کے تصوراتی نقوش کے سوائے واضح طور پر کسی مخصوص شخصیت کا یقین کرنا قطعی محال تھا ———

تو آیئے ——— ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے پر پیچ و خمیدہ گلی کو طے کرکے جب ایک دومنزلہ کے سامنے پہنچے تو اس نے کہا:

"ذرا ٹھہریئے" اور اندر گھس گیا ——— اور میں اس سوچ میں پڑ گیا، میں نے یہ آواز کہیں سنی ہے اور ضرور سنی ہے ——— کوئی تین منٹ کے اندر اندر جانے کیوں میری اس قدر طبیعت گھبرائی کہ خواہ مخواہ جی چاہا کہ بھاگ جاؤں، مگر بس کھڑا رہا بے اختیار ——— ایک نامعلوم سے جذبہ انکشاف کے تحت ———!

آخر خدا خدا کرکے پانچ منٹ بعد دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک باریک سی آواز نے کہا ———

"آیئے ——— تشریف لے آیئے ———"

جب میں اندر پہنچا تو میرا دل خلاف معمول بُری طرح دھڑک رہا تھا، کمرہ بجلی کی سبز سبز روشنی سے جگمگا رہا تھا ——— دیواروں پر قدرتی مناظر کے فریم قرینے سے آویزاں تھے۔ ایک طرف میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک شیلف اور ساتھ ہی کپڑوں کی الماری ——— میں نے اس کو بغور دیکھا، وہ سبز سوٹ میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی، ایک جل پری کی طرح، چہرے پر مسکراہٹیں، آنکھوں میں چمک، گالوں میں دمک اور لبوں پر لپ اسٹک کی ایک باریک سی تہہ ——— اور اس قدر بے نیاز گویا میں نامحرم تو درکنار مرد ہی نہیں تھا ——— بلکہ پتھر کا مجسمہ تھا، یا مٹی کا کوئی بے جان تودہ، جس میں نہ احساس ہو، نہ کشش، نہ حرارت ——— حد ہے کہ اس کی نگاہوں میں میرے لئے ذرا بھی تاثر نہیں تھا، ہلکا سا اجتناب بھی نہیں جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہو ———

کہیئے: میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں ——— اس نے میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا، ——— اور ایک دم اس کے گداز جسم سے ایک طرح کی ہیجان پرور خوشبو پھوٹ کر میری ناک سے ٹکرائی کہ مجھے پھریری سی آگئی ——— میں نے ترچھی نظروں سے اُسے دیکھا، اس کے سینے کا ابھار، کپکپاتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں کا گلابی پن اور مرمریں باہوں کا لوچ ——— یہ سب چیزیں اس طرح دعوت نظارہ دے رہی تھیں کہ آؤ، مجھ سے لپٹ جاؤ، مجھ میں ڈوب جاؤ ——— مجھ میں کھو جاؤ ——— میں ایک بہتا ہوا دریا ہوں، دھو لو ہاتھ، ورنہ پچھتاؤ گے ———.

میں نے چاہا کہ لپٹ جاؤں ——— مگر دفعتاً بازو ڈھیلے پڑ گئے ——— میری نگاہیں میز پر رکھی ہوئی دود کی تصویر پر جم کر رہ گئیں ——— مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ اُسی کی تصویر ہے ———

میں نے پوچھا "یہ کس کا فوٹو ہے ———"

کیوں ——— ؟ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"کچھ نہیں، یونہی پوچھ رہا ہوں ——— بہت خوبصورت ہے ———"

"میرے بھائی کی ہے ———" مجھے اب بھی یقین نہیں آیا ———

"کیا نام ہے" میں نے قدرے توقف کے بعد اس کے نزدیک ہوتے ہوئے کہا تا کہ وہ مطمئن ہو جائے۔

"عبدالودود ——" اور یقین کیجئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ پر اٹیم بم پھٹ پڑا ——— اور چاروں طرف دھواں ہی دھواں، تلخ سے تلخ تر، زہریلی پرچھائیاں، ہر طرف آگ ہی آگ، شعلے ہی شعلے، لپکتے ہوئے، جھپٹتے ہوئے —— پھر ان کا تصادم —— دھماکہ —— اور موت —— میرا دم گھٹنے لگا ——— عورت ایک لطیف شے ہے، ہوا سے بھی زیادہ لطیف ——— پانی سے زیادہ خنک —— مکمل کیف —— مجسم لذت ——— لیکن مرد کیا ہے ——— ؟

اور جب اس نے بڑھ کر اپنی باہیں میرے گلے میں ڈالدیں، اور میری گود میں بیٹھنے لگی تو میں بوکھلا کر چیخ پڑا ——— "نہیں، نہیں۔ میں نے عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے ——" اور بے اختیار اُٹھکر بھاگا ——— گلی کے نکڑ پر ایکدم کسی نے میرے چہرے پر بیٹری کی لائٹ ماری ——— ساتھ ہی سید کی آواز آئی ——— کون ——— جمیل ——— ؟ جانے کیوں دفعتہً میرے پیر زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے اور زبان گنگ ——— دماغ میں ریل کا انجن سنسنا رہا تھا ———

جائزے

جھوٹ سچ

رفتار ادب

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد

ادب

زندگی کی تخلیق کرتا ہے

اور زندگی

ادب کی خالق ہے

شوکت تھانوی

جھوٹ سچ

مثل مشہور ہے سانچ کو آنچ نہیں مگر یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہدے کہ آگ ٹھنڈی ہے، اس کا مطلب، فرض کیجیے آگ کا ٹھنڈا ہونا ممکن بھی ہو جائے تو بھی یہ ہمت کوئی کہاں سے لائے کہ اس سے کھیلنا شروع کر دے سچ کی بہت سی خوبیاں بڑی بھی ہیں اور بزرگوں سے سنتے بھی آئے ہیں، دل کو بھی یقین ہے کہ سچ کا درجہ انسان کی تمام خوبیوں میں سب سے زیادہ بلند ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ سچ بولنے والا نہایت بہادر نہایت ایماندار، نہایت خوش حلمہ اور ہر اعتبار سے نہایت قابل قدر ہوتا ہے۔ اکثر جی بھی چاہتا ہے کہ چند روزہ زندگی ہے لاؤ سچ بولنا شروع کر دیں مگر ہمیشہ سچ کے خوفناک نتائج سامنے آجایا کرتے ہیں اور ہم سہم کر لرز کر اور کانپ کر عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے جھوٹ ہی کو زندگی کا سہارا بنا کر رہیں اور سچ بول کر عاقبت کے ثواب کے لئے زندگی کے وہ عذاب مول نہ لیں جو زندگی ہی دوبھر کر دیں۔ سچ کتنا ہی پاکیزہ ہنر کیوں نہ ہو، لیکن خدا محفوظ رکھے اس کے نتائج سے، دنیا کے کسی بڑے سے بڑے عیب اور بڑے سے بڑے جرم کے بھی وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے جو اس سچ کے پیدا ہوتے ہوئے ہم نے خود دیکھے اور سنے ہیں بڑی بڑی باتوں کو جانے دیجئے جن میں سچ بولنے کی بدولت مقدمہ چل جانے اور سزا ہو جانے تک کی نوبت آسکتی ہے، روزمرہ کی گھریلو زندگی ہی کو لیجئے کہ کیسے کیسے ہنگامے محض سچ نہ بولنے کی وجہ سے ٹل جایا کرتے ہیں۔ رات دیر سے گھر آئے بیوی آگ بگولہ بیٹھی ہیں کہ آنے دو اس سیلانی کو آج بتا سکے بغیر نہ رہونگی۔ اب کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ اس ایٹم بم کے سامنے دلیری سے سچ بول کر کہدے کہ ہم دوستوں میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور تم نے جو دام دیئے تھے کپڑا لانے کے لئے وہ ہار کر آئے ہیں۔ اس سچ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ اہل دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرے اس قسم کا سچ کوئی آرٹسٹک چیز بھی نہیں ہے۔ ہاں اس کو ایک سپاٹ قسم کی خودکشی کہا جا سکتا ہے، مگر بجائے اس کے جھوٹ اس قسم کے موقعوں پر نہایت مجرب بھی ثابت ہوتا ہے اور فنکار جب چاہے اس کو حسین بھی بنا سکتا ہے۔ فن کا کمال یہ ہے کہ یہی غصہ ہمدردی میں تبدیل ہو جائے۔ آرٹ اسے کہتے ہیں کہ مقابل کا آتش فشاں پھول برسانے لگے۔ تھکے ہارے انداز سے پہنچے، ایک آدھ ٹھنڈی سانس بھری زیر لب مصرعہ پڑھا: ع موت سے کس کو رستگاری ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ پوچھینگی ضرور کہ کیا ہوا۔ اب اس کا جواب خواہ کتنا ہی سفید جھوٹ سہی مگر غور کیجئے کہ کیسا برمحل ہے۔ حسب معمول ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ جواب دیا "قبرستان گیا تھا، بیچارے کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا، مگر اللہ ری خیرت کبھی اپنی مصیبت کی کسی کو خبر نہ ہونے دی" دیر میں آنے کے سلسلہ میں بازپرس کی جو تقریر بیوی صاحبہ نے تیار کر رکھی تھی وہ تو یہیں سے التوا میں پڑ گئی۔ ایک دم نہایت غمگساری کے ساتھ پوچھا "کون آخر کون" جواب دیا: عبدالکریم میرے ساتھ کا پڑھا ہوا تھا، چھوٹے چھوٹے چار بچے چھوڑے ہیں اور دو سال کی بیماری میں گھر کی ایک ایک چیز اس حد تک ختم ہو چکی تھی کہ مرنے کے بعد کفن دفن کے لئے ایک پائی بھی نہ تھی، مجھ سے تو ضبط نہ ہو سکا، تم نے جو روپیہ دیا تھا وہ میں نے بھابی کو دیا اور کچھ ایک اور دوست سے لیکر کفن دفن کا انتظام کیا، ہائے کیا بیکسی کی موت تھی، جو دوسروں کا دستگیر تھا اس کی آخری منزل اس طرح طے ہوئی" بس ذرا سی بات میں غصہ کا

...ن ذکری نہیں روپیہ کل کے لئے فرمایا "آپ نے بہت اچھا کیا اگر آپ کسی کو پرچہ لکھ کر بھیجدیتے تو میں دس روپے بھیجدیتی ...ا خیر اب ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا لیجئے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں" ہم برج پارٹی میں خوب ڈٹ کر کھا پی چکے تھے ...رہے ہوائیاں تو ہارنے کی اُڑ رہی تھیں، لہذا ہم نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "نہیں اب کھانا کھ... کھایا جائے گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ کریم میرا کیسا دوست تھا، بچپن کا ساتھی ہمیشہ درد دکھ میں شریک اور شریف ایسا کہ ...پنے مر گیا مگر ہم میں سے کسی سے نہ کہا کہ گھر میں دوا تک کے دام نہیں ہیں، افسوس تو یہی ہے کہ اگر باقاعدہ علاج ہوتا شاید بچ جاتا۔"

اب اسے چاہے آپ افسانہ نگاری کہئے یا اداکاری مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جھوٹ بجائے خود عظیم الشان فن ہے جس میں افسانہ نگاری اور اداکاری کی قسم کے خدا جانے کتنے فن سمائے ہوئے ہیں اور دو فنکار ہر کو آپ نہایت حقارت کے ساتھ محض جھوٹا کہدیتے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ کتنا بڑا ماہر نفسیات، کیسا ماہر اداکار، کس قدر مشاق افسانہ نگار، اور کیسا کہنہ مشق شاعر ہوتا ہے۔ سچ کے نتائج خواہ کیسے ہی خوفناک کیوں نہ ہوں مگر سچ بجائے خود نہایت سادہ سی چیز ہے، ہر کودن سے کودن شخص بغیر کسی دقت کے جب چاہے سچ بول سکتا ہے، ایک واقعہ کا اظہار جو دیکھا ہے، اس کا بیان جو گذرا ہے اس کا حال نہ کسی صناعی کی ضرورت ہے نہ کسی خلاقی کی، نہ کسی ذہانت کی اس میں کھپت ہے نہ طبّاعی کی۔ مگر جھوٹ بولنے کے لئے انسان کو دماغ کا تیل نکالنا پڑتا ہے، بات کی بات پیدا کرنا پڑتی ہے، جو نہ ہوا ہو اس کا ہونا ثابت کیا جاتا ہے جو ہو چکا ہو اس کو نابود کرنا پڑتا ہے، سفید کو سیاہ سیاہ کو سفید، دن کو رات، رات کو دن بنا دینا ثابت کر دینا اور اس صناعی کا یقین دلا لیجانا، نہ بچوں کا کھیل ہے نہ ہر ایک کا کام، مگر ایک آسانی ہے کہ یہ فن خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو حاصل کرنے کی کوشش کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن سچ بولنے کی ہمت تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے امکان ہی میں نہیں ہے۔ ہاں اگر انسان زندگی سے بیزار ہو جائے اس کو دنیا بھر کے عذابوں کا شوق ہو وہ عزیزوں کی غیرت، دوستوں کی دشمنی، اپنوں کی بیگانگی وغیرہ کے علاوہ قانون کی گرفت، جیل کی کوٹھری، کالے پانی کی خوشگوار فضائیں، پھانسی کا روح پرور تختہ وغیرہ دیکھنا چاہتا ہو تو بیشک سچ بول سکتا ہے، قتل کرنے کے بعد سچ بول کر پھانسی سے بچ جائے تو ہم سمجھیں کہ سانچ کو آنچ نہیں۔ چوری کرنے کے بعد داروغہ جی سے سچ بول دیجئے اور داروغہ جی آپ کو سزا دینے کے بجائے گلے سے لگا لیں تو ہم سمجھیں کہ سانچ کو آنچ نہیں۔ خیر یہ تو بہت بڑی بڑی باتیں ہیں، ان کے لئے تو بڑے خوفناک قسم کے سچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو ہم اور آپ مجلسی آئین کے ماتحت، آدابِ محفل کے پیشِ نظر، اخلاقی حیثیت سے، معاشرتی نقطۂ نظر سے کاروباری حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے لئے مجبور ہیں کہ قدم قدم پر سچ سے کترائیں اور جھوٹ بول کر جان بچائیں ایک شخص آپ سے ملنے آیا ہے جس کے متعلق آپ کو یقین ہے وقت برباد کریگا۔ آپ کو اس کے آنے کی قطعاً خوشی نہیں آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ اس سے نہ ملیں مگر آپ اس سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور سفید جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ کو ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ہاتھ ملانا جھوٹ ہے، یہ مسکراہٹ جھوٹی ہے اور یہ بیان سراسر جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ آپ سچائی سے کام لیکر بغیر ہاتھ ملائے چہرے پر بیزاری پیدا کر کے اگر یہ کہدیں کہ آپ سے ملکر سخت کوفت ہوئی تو آنے والا آپ کو سچا تو نہیں البتہ نہایت بداخلاق نہایت مغرور اور نہایت خود دماغ تک سمجھ لیگا۔ اگر آپ دفتر سے چھٹی لینے کے لئے اپنی علالت کے بجائے درخواست میں یہ سچی بات لکھدیں کہ مجھے کنکوا اُڑانا ہے لہٰذا آج کی غیر حاضری معاف کی جائے تو آپ ہی بتائیے تو اس کا اثر آپ کے افسرِ اعلیٰ پر کیا ہوگا۔ درخواست تو خیر نامنظور ہو ہی جائے گی

اس کے علاوہ بھی آپ کی گستاخی آپ کی شوقینی اور آپ کی پتنگ بازی ضرب المثل بن کر رہ جائیگی۔ اگر آپ اپنی دوکان پر ان گاہکوں سے سچ بول بول کر یہ کہتے رہیں کہ صاحب یہ موزہ بالکل نفافہ ہے، ابھی آپ جاکر اس کو پہن لیں گے اور رہیں پھر مجھ ہی سے آکر دریافت کریں گے کہ اس کی ایڑی اور پنجہ شاید یہیں رہ گیا تھا، مگر قیمت اس کی منھ مانگی لوں گا بالکل اس میں مجھ کو بارہ آنہ فی روپیہ نفع کمانا ہے، تو شاید ہی کوئی گاہک آپ کے یہاں ٹھہر سکے۔ ڈاکٹر اگر مریض کو کہتے ہی سچ بول دے کہ اس کو میرے علاج سے فائدہ نہ ہوگا تو اس کو ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ کر پیری فقیری کرنا پڑے گی ہیں مگر سچ بول کر کہہ دے کہ یہ مقدمہ دو ہزار پیشیاں ہونے کے بعد ہار جائیگا، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ہوگا وہ عقل کا غلام کشندہ جو ہارنے کے شوق میں وکیل صاحب کا محنتانہ دیتا رہے۔ نوکر اگر سچائی کے ساتھ مالک سے کہدے کہ میں پیٹ سے مجبور ہوں ورنہ کون مسخرا آپ کا وفاشعار اور اطاعت گزار ہے، تو علٰحدہ ہونے کے بجائے شاید مار بھی کھائے۔ حد تو یہ ہے کہ عشق و محبت کے معاملات میں سچائی سے کام نہیں نکلتا بلکہ اگر خدانخواستہ سچ بول دیا جائے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ کون محبوب ایسا ہے جو اپنے طالب سے یہ سنکر کبھی توجہ کرے گا کہ صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ نہ دل میں درد ہے نہ جگر میں زخم، نہ آپ کے تیر نظر کا بندہ قائل ہے، نہ تیغ ابرو کا۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ مر رہا ہوں، نہ میں خدانخواستہ آپ کا دیوانہ ہوں، ہاں ذرا آپ پسند ہیں مجھ کو اگر آپ مل جائیں تو سبحان اللہ ورنہ خیر۔ ظاہر ہے کہ واقعہ صرف یہی ہوتا ہے، مگر کہنا یہی پڑتا ہے کہ دم نکلا جاتا ہے، مرے جاتے ہیں، بلٰلہ رحم کرو ورنہ ہمارا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ محبوب جانتا ہے کہ اس پر مرنے والا زندہ ہے، اس کا دیوانہ بالکل صحیح الدماغ ہے، اس کا بیمار نہایت تندرست ہے مگر وہ اسی جھوٹ سے خوش ہوتا ہے اور یہی جھوٹ عاشق کے حق میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ ادبی حیثیت سے آپ طے کرکے بیٹھئے کہ ایک شعر بھی جھوٹا نہ کہیں گے اور اپنے شاعرانہ درجہ کو اسی حالت پر قائم رکھیں گے، ہماری سمجھ میں آتا نہیں کہ آپ کا یہ ارادہ کیونکر پورا ہوسکیگا۔ افسانہ نگاری کو لے لیجئے، ڈرامہ نویسی کو لے لیجئے اور ذرا ثابت کرکے دکھائیے کہ بغیر جھوٹ کے یہ دالیں کس طرح گل سکتی ہیں۔

اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ یہ خاکسار جھوٹ کا مبلغ ہے اور سچائی کے خلاف پروپیگنڈا کرنا چاہتا ہے جی نہیں۔ سچ کی تمام خوبیاں ہمارے پیش نظر ہیں، ہم جانتے ہیں کہ صرف ایک سچائی دنیا کے ہر جرم اور ہر عیب سے انسان کو بچا سکتی ہے، سچائی کی تمام بلندیوں سے ہم واقف ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ ایک راستباز کس قدر ارفع اور اعلیٰ کیسا ڈھنگ اور بہادر، کیسا ایماندار اور قابل اعتماد ہوسکتا ہے، مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے گرد و پیش سے مجبور ہوکر اپنی معاشرت اور اپنے ماحول سے عاجز آکر اپنا بھرم ہی جھوٹ کے سنگ بنیاد پر قائم کیا ہے اور اب اگر ہم جھوٹ کو چھوڑنا بھی چاہیں تو جھوٹ ہم کو نہیں چھوڑتا، ہمارے حالات ہم کو سچ بولنے سے روکتے ہیں، ہمارے تعلقات ہم کو جھوٹ بولنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں جان پر کھیل کر سچ بولدیتے مثلاً بیوی سے ہی کہدیتے کہ صاحب ہم تاش کھیلتے ہیں اور بازی لگاکر کھیلتے ہیں تو اسی وقت جو کچھ ہونا تھا ہوجاتا، ظاہر ہے کہ وہ ہماری قمار بازی کو ٹھنڈے دل سے گوارا نہ کرتیں، کچھ قسمت کو روتیں کچھ بھوک ہڑتال فرماتیں، کچھ دن پھولی سوجی رہتیں، مگر آخرکار ہم اس روز روز کے نیت نے جھوٹ اور اس مسلسل چوریوں سے بچ جاتے، سانچ کی آنچ ہم پر ضرور آتی مگر یہ آنچ ہم کو خوب تپاتی خوب گلاتی اور آخرکار جھوٹ کی کھوٹ نکل جاتی اور ہم سونا ہی سونا بن کر اس آنچ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہجاتے۔ شروع شروع میں ہمارے ضمیر نے بھی یہی کہا، ہر روز کہا، ہر وقت کہا، پہلے اس کی آواز ہم روز سنتے رہے، پھر دوسرے تیسرے سننے لگے، رفتہ رفتہ ہفتہ وار یہ آواز آنے لگی، مگر اب تو نہ جانے بیچارہ زندہ بھی ہے یا اللہ کو پیارا ہوا۔ (باقی صفحہ ۹۶ پر)

رشدی

رفتارِ ادب

ہندوستانی ادب جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ کی قومی لائبریری میں جس میں سات ملین سے زیادہ نسخے ہیں اس وقت ہندوستانی زبان کی ایک لاکھ پچاس ہزار کتابیں موجود ہیں اور اب اس ملک سے مزید کتابیں امریکی لائبریری کے لئے حاصل کی جائیں گی، لائبریری کے ہندوستانی شعبے کے صدر ڈاکٹر ہورس پولمین نے بتایا ہے کہ امریکی ہندوستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں اور جنگ کے ختم ہونے کے بعد سے ہندوستانی کتابوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے ۔ یہ لائبریری خاص طور پر ایسی ہندوستانی کتابیں کو جمع کر رہی ہے جو زراعت، مذہب، لسانیات، قانون، ادب، طب، موسیقی اور فلسفہ سے متعلق ہیں ۔ اس کا بطور خاص لحاظ رکھا جا رہا ہے کہ بجائے انگریزی ترجموں کے ہندوستانی زبانوں میں ہی کتابیں حاصل کی جائیں ۔ اس وقت اردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی، بہاری، نیپالی، کشمیری، آسامی، اڑیا اور تامل کی ادبی کتابوں کو تلاش کیا جا رہا ہے ہندوستانی کتابوں کے علاوہ اس لائبریری میں آجکل ۶۲ ہندوستانی اخبارات نہایت باقاعدگی کے ساتھ آرہے ہیں اور رسائل کی تعداد ۳۲۹ تک پہنچ گئی ہے، لائبریری کی ایک لاکھ ۵۰ ہزار ہندوستانی کتابوں میں سے ۸۰۰ جو بیش قیمت اور نایاب ہیں ایرکنڈیشنڈ کمرہ میں محفوظ ہیں ۔ یہاں دکھانا اس وقت یہ تھا کہ بیرون ہند ہندوستانی ادب کو کیا اہمیت دی جا رہی ہے اور ہندوستانی ثقافت و ادب کی آفاقیت کس طرح تسلیم کی جا رہی ہے ۔ آئیے اب ہم ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی ادب کا ایک سرسری سا جائزہ لیں ۔

اردو

جنگ کے خاتمے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئی سرگرمی دیکھنے میں آرہی ہے، ہندوستان کو مختلف نوع مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، ان میں سے ایک اہم مسئلہ زبان کا ہے ۔ کلکتہ میں ۱۸۵۱ء میں جو لسانی اختلاف پیدا ہوا تھا وہ بڑھتے بڑھتے آج اس قدر وسیع ہوگیا ہے اس کا دور ہونا ناممکن نظر آرہا ہے، ہندوستان کی مشترکہ زبان کی گتھی نے اتنی پیچیدگی اختیار کرلی ہے کہ بہت سے لیڈر تک اس کے حل سے عاجز آگئے ہیں، گاندھی جی نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے از سر نو کوشش کی ہے اور اب ان کا کہنا ہے کہ اگر تم آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنی ملکی زبان استعمال کرو جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، یہ امر باعث مسرت ہے کہ اردو بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے ادبا اور عوام دونوں نے زبان کو ترقی دینے میں سرگرمی کا اظہار کیا ہے، اور ایک طرف عثمانیہ یونیورسٹی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، عبدالحق اکیڈمی، دارالاشاعت اردو، مکتبۂ ادبیات و جامعہ ملیہ، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، انجمن ترقی اردو، اشاعت گھر حیدرآباد اپنے ادبی جواہر پاروں سے اردو کو مالا مال کر رہے ہیں تو دوسری طرف آل انڈیا ریڈیو اور فلموں نے بھی اس ضمن میں بہت کچھ کیا ہے۔ مسلمانوں نے سارے ہندوستان کے لئے ایک زبان کا مسئلہ حل کرلیا ہے ۔ پنجاب ہو یا یوپی ۔ سی پی ہو یا سنٹرل انڈیا ۔ مدراس ہو یا بمبئی، تمام ادبی شاہکار اردو ہی میں شائع ہو رہے ہیں، مدراس، میسور، پشاور اور کراچی میں روزانہ اردو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں جو ملک

...مشاعرے ہو رہے ہیں ... تمام بڑے بڑے شہروں میں آئے دن مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

تعلیمی میدان میں اردو ... ترقی کے ساتھ پیش قدمی جاری ہے۔ اگرچہ اس وقت برطانوی ہند میں کوئی اردو یونیورسٹی نہیں ہے، مگر عثمانیہ یونیورسٹی کی مقبولیت سے اس کی تشکیل مستقبل قریب میں یقینی نظر آرہی ہے۔ مولانا عبدالحق برابر اردو یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہیں، جامعہ اردو آگرہ نے اپنا کام بڑی خوبی سے شروع کر دیا ہے اور ادیبؔ، ادبیات اردو کے امتحانات کے مختلف حلقے قائم کر چکا ہے۔ اس سال کل ہند انجمن ترقی اردو نے راشٹر بھاشا طرز کے امتحانات کی ایک اسکیم جاری کی ہے۔ سال زیرِ تبصرہ میں کئی اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی اور مولانا ایم۔ اے گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی کی مسلمانوں کا نظامِ تعلیم اور پالیسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن ترقی کی مطبوعات کو بھی اس سال نمایاں حیثیت حاصل رہی، صحافت کے میدان میں بھی اردو کا امتیازی درجہ رہا۔ جنگ سے پیدا شدہ مشکلات کے باوجود نئے نئے رسائل، اردو اخبارات جلوہ گاہ اشاعت پر نمودار ہوئے، بنگلور سے ایک بہترین ترقی پسند ماہانہ رسالہ "نیا دور" صمد شاہین کی ادارت میں جاری ہوا، جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی، اس کے علاوہ دہلی اور لاہور سے بھی کئی نئے پرچے شائع ہونے لگے، اس سال کئی مشہور رسائل و جرائد نے بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنے خاص نمبر شائع کئے، ان میں "شاعر" آگرہ کے افسانہ نمبر کو اس کی ندرت کے باعث سب پر فوقیت حاصل رہی، کیوں کہ اس میں سب افسانے اردو کی مشہور افسانہ نگار خواتین کے رشحاتِ فکر کا نتیجہ تھے۔

اردو میں افسانہ نگاری کے فن نے زبردست ترقی کر لی ہے اور اس وقت اردو میں جو افسانے شائع ہو رہے ہیں ان میں سے بیشتر ہندوستانی ادب کے لاجواب شاہکار ہیں، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، دیا رتھی، مہندر ناتھ، منٹو، عصمت، مرزا ادیب نے بہترین شہ پارے پیش کئے۔ ترقی پسند حلقے کی سب سے اچھی نمائندہ کتاب "نئے زاویئے" کی دوسری جلد شائع ہوئی جسے کرشن چندر نے مرتب کیا ہے، ترقی پسند ادباء کی اکتوبر میں حیدرآباد میں کامیاب کانفرنس ہوئی، جیپور میں منعقدہ پی۔ ای۔ این کانفرنس میں اردو کی نمائندگی کی گئی۔ اس سال اقبال پر تقریباً تیس نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بچوں کے لئے بیشمار مفید اصلاحی کتابیں شائع کی گئیں، ان میں بھوپال کے مکتبۂ نظامیہ کے بچوں کی کہانیوں کے ۵۰ سیٹ سب سے اچھے رہے۔ اردو ادب میں جدید رجحانات پر کئی اچھی کتابیں شائع ہوئیں، اس سلسلہ میں پروفیسر احتشام حسین، عزیز احمد اور فراق گورکھپوری کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ہندی

اس سال دو باتیں ہوئیں، وہ یہ کہ گاندھی جی اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن کے درمیان ہندی اور ہندوستانی کے مسئلہ پر بحث و تمحیص کا زور رہا اور دوسرے یہ کہ ہندی ساہتیا سمیلن کے جیپور سیشن کی صدارت کے لئے شری یت کنھیا لال ایم منشی کا چناؤ عمل میں آیا، یہ دونوں واقعات ناخوشگوار رہے ہیں۔ ہندی۔ ہندوستانی کا قضیہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ہندی کے حامیوں نے آل انڈیا ریڈیو پر اردو نوازی کا الزام لگایا اور ہندی کو سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کی جدوجہد شروع کر دی، حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آل انڈیا ریڈیو جس قسم کی ہندوستانی میں خبریں سناتا ہے وہ اردو۔ ہندی ملاپ کا اچھا نمونہ ہوتا ہے، سر سلطان احمد نے اس لسانی قضیہ کے بارے میں ایک مشاورتی کمیٹی طلب کی اور بعد میں حکومت کے اعلامیہ میں اس کی وضاحت بھی کر دی گئی مگر پھر بھی ہندی ادبا اپنی ضد پر جمے رہے۔ ہندی میں اس سال لفظی بحث و تمحیص کے علاوہ کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا، جو

[illegible] شائع ہوئیں ان میں یشپال کا ایک ناول، ہزاری پرشاد دویدی کے تنقیدی مضامین، امرت لال کے مضامین اور [illegible] کے مجموعے قابل لحاظ ہیں۔ اس کے علاوہ پریم چند کی سوانح عمری اس سال کا خاص کارنامہ ہے جو ان کے بیٹے [illegible] نے لکھا ہے۔ بعض جگہ اس میں توازن اور تناسب برقرار نہیں رہا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود لکھنے والے کی سوانح حیات ہے۔

آجکل کے حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہندی ادیبوں کے رجحانات میں انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ کل کے رومانیتی شاعر حقیقت پسند بن گئے ہیں اور رومان اور محبت کی جگہ حب الوطنی نے لے لی ہے۔ "پسندی" رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے اور قومیت کے جذبات ابھر رہے ہیں۔ اور پھر جنگ نے موجودہ انسان کے نظریات کو یکسر بدل ڈالا ہے، اس سے نئی نئی قدریں پیدا ہو گئی ہیں۔ آجکل کا ادیب ایک بالکل غیر مانوس دنیا میں حیرت و استعجاب سے دیکھ رہا ہے کہ وہ اپنے کو ماحول کے مطابق کس طرح بنائے۔ ہندی میں دوسری زبانوں کے تراجم کی بہت کمی ہے۔ اگر موجودہ دور کے ہندی ادیب کو تیزی کے ساتھ چلنا ہے تو اسے اپنے قارئین کے سامنے ان تمام غیر ملکی مصنفوں کے افکار پیش کرنا چاہیئے جنھوں نے اپنے وطن اور دوسرے ممالک میں جوش و خروش کی لہر دوڑا دی ہے، ان میں سے چند یہ ہیں، برنارڈ شا، رومان رولاں، پرل بک، لن یوٹانگ۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ بیشتر ہندی والے ان کے نام سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ہندی میں مسائل حاضرہ پر بھی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ مثلاً ویول مشن، شملہ کانفرنس یا عام انتخابات وغیرہ حالانکہ اردو میں اس نوع کی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

بنگالی

۱۹۴۵ء میں بنگال برابر اپنے کام میں مصروف رہا، کاغذ کنٹرول کے باوجود ناشرین نے بنگالی زبان میں بیشمار کتابیں چھاپیں اور اس کام میں اس قدر مستعدی اور سرگرمی کا اظہار کیا کہ دوسرے لوگ حیرت کرنے لگے۔ بنگال میں کتابیں خریدنے اور مطالعہ کرنے کی عادت ترقی کر رہی ہے۔ تاراشنکر بنرجی، سوشیل یاتا، نرائن سانیال، اجنتیا سین گپتا، منوج بوس، سروج رائے چودھری اور پریمن مترا مختلف مکاتب خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک جداگانہ اسٹائل اور ٹکنک کا حامل ہے، پھر بھی ان سب کا پس منظر ایک ہے۔

تاراشنکر بنرجی کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، وہ معاشرتی اور سیاسی زندگی کی گھما گھمی سے پوری طرح باخبر ہے اور اپنے بے نظیر طرز سے زندگی اور آرٹ میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے انتھک جد و جہد کر رہا ہے، "دیوتا گاتا" پہلی اہم کتاب ہے جس سے اس کے انقلابی خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ "کبھی" آرٹ کا نادر نمونہ ہے۔ نرائن گنگولی نوجوان اور ہونہار ادیب ہے، اس کی تازہ کہانیاں اس کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ وہ کس چیز کے بارے میں لکھ رہا ہے اور اس کے اسٹائل میں ایک خاص توازن ہے جو ایک عرصہ کی مشق کے بعد حاصل ہوتا ہے، دھرجتی پرشاد نے اس سال کچھ نہیں لکھا، منوج کی تازہ ترین کتاب "درپن" دماغی وہم اور تحلیل نفسی کے رجحان سے پاک ہے۔

آجکل بنگال میں افسانہ نگاروں کی کمی نہیں ہے بلکہ روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فن کے لحاظ سے یہ نوآموز اور تجربہ کار دونوں کے لئے کشش انگیز ہے، بعض حالات میں ادبیات کی اس ایک صنف سے بہت سے لوگ شہرت کے بلند درجے پر پہنچ گئے اور ایسا بھی ہوا ہے متعدد قعر مذلت میں جا پہنچے جیوتر مئی رائے "ہمراہی" کا مصنف ایک محتاط ادیب ہے، اس کی تازہ ترین تصنیف "تماشا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ

ایک خاص تکنک کا مالک ہے، "بھنگر" بلند پایہ افسانوی شاہکار ہے۔ بھابنی کرجی بھی ترقی کر رہا ہے اور اس کے ناول "اکیلی ناگن" اور "کالی رات" قابل ذکر ہیں، شریمتی بینی رائے کے نگارشات جمیل عمومیت سے پسند کئے جا رہے ہیں۔ سوشیل جانا ایک پارٹی ورکر ہے "مارکسیت" کی طرف رجحان اس کی کہانیوں سے صاف ظاہر ہے۔

جہاں تک مزاحیہ خاکوں کا تعلق ہے پریمل سوامی کا قلم باغ وبہار کے نمونے پیش کر رہا ہے، اس کا مزاح طنز آمیز ہے مگر جراحت رساں نہیں۔ اس کی تازہ کتاب "بلیک مارکٹ" ہے۔ پنندو بوس کو بنگالی مضمون نگاروں میں بڑا مرتبہ حاصل ہے، اصول تنقید سے واقفیت، متوازن طرز تحریر اور وسیع مطالعہ نے اسے بہت اونچا کر دیا ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کی "مسلم راجنیتی" بنگال کی تاریخ معاشرت اور اقتصادیات پر ڈاکٹر نہار رائے کی تصنیف بہت خوب ہیں۔ افسانوں اور مضامین میں جتنی ترقی ہوئی شاعری اور ڈرامے اس سے محروم رہے۔ بنگالی ادب نے دوسری زبانوں کے تراجم سے کافی استفادہ کیا۔ اشوک گوہا نے متعدد روسی کتابیں بنگالی میں ترجمہ کی ہیں، بچوں کے ادب کا معیار بھی بلند ہو گیا ہے۔ وسوا بھارتی کی مطبوعات بھی بہت سی ہیں۔ افسانے اچھے ہوں یا برے بہر قیمت نکل جاتے ہیں، ڈراموں اور مقالات کی طرف کوئی نہیں دیکھتا اور مصنف کو خود غرض ناشر کے رحم وکرم پر رہنا پڑتا ہے۔

گجراتی

ساری دنیا کے مصنفین اور ناشرین کو کاغذ کی کمی اور مطابع کی بدنظمی کے باعث جن عام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کے باوجود کسی نہ کسی طرح ادبیات کی تقریباً تمام اصناف پر کتابیں شائع ہوئیں۔ گجراتی زبان میں گاندھی جی کے متعلق مختلف کتابیں بالخصوص جنھیں مسٹر چندر شنکر شکلا نے تیار کیا تھا شائع کی گئیں۔

نوجیون پرکشن مندر، نوجیون کرپالیا اور گجرات ودیاپیٹھ احمد آباد نے اپنا مفید کام برابر جاری رکھا "مرد اور عورت کے روابطی حدود" کے جی مشرو والا کی قابل لحاظ تصنیف ہے۔ پنڈت نہرو کی "تاریخ عالم کی جھلکیاں" کی دوسری جلد، اور مریضان دق کے لئے ہدایت نامہ جسے متھراداس ترکمی نے لکھا ہے، نمایاں مطبوعات ہیں، ان اداروں نے بچوں کے لئے بھی مفید کتابیں شائع کی ہیں، ٹیلیکر اور چنی لال مادیا نے گاؤں کی زندگی پر اچھا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ گجراتی میں چونکہ طبع زاد چیزوں کا فقدان ہے اس لئے انگریزی، بنگالی، اور اردو سے برابر تراجم کئے جا رہے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کا آزادانہ ترجمہ اس سال کا قابل توجہ مجموعہ ہے۔ مسٹر میگھانی نے اصل کے مطابق ترجمہ کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔

گجرات میں کئی ساہتیہ سبھائیں ہیں۔ احمد آباد کی ساہتیہ سبھا سب سے زیادہ سرگرم ہے، اس کی تازہ کتاب "حرف ولفظ" کسی قدر فنی موضوع پر روشنی ڈالتی ہے۔ بڑودہ اور سورت کی سبھائیں بھی کام کر رہی ہیں۔ پروفیسر کانتی لال بی ویاس کی کتاب "بھاشا" بڑی جانفشانی سے لکھی گئی ہے۔ کیٹس کی "آئزابیلا" کو ایک مسلم ادیب نے گجراتی نظم کے قالب میں بڑے دلکش پیرایہ میں ڈھالا ہے، مسلمان اور پارسی بھی گجراتی کی ترقی میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ گجراتی میں اچھے افسانوں کی کمی ہے اگرچہ اس کو پورا کرنے کی برابر کوشش کی جا رہی ہے۔ گجراتی ادب بھی ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہے اس میں بھی ترقی کی راہیں پیدا ہو رہی ہیں اور گجراتی ادیب سوچ سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔

مرہٹی

نشر واشاعت کی مشکلات کے باوجود مرہٹی ادب نے اس سال خاص ترقی کی اور تقریباً ۴۰-۵۰

تع ہوئیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ کونسی کتاب نمایاں اہمیت رکھتی ہے تو اس کا جواب مشکل سے ملے گا۔ مشہور ادیبوں نے
اس سال کچھ زیادہ توجہ مبذول نہیں کی، پھر بھی افسانوں اور ڈراموں کے کئی اچھے مجموعے مارکٹ میں آگئے۔ سوانح عمریاں
تنقیدی کتابیں بھی لکھی گئیں اور سیر و تفریح پر بھی کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان میں سب سے سنسنی خیز، سب سے اہم تصنیف
مرہٹہ تاریخ ہے جو مسٹر راناڈے نے لکھی ہے اور جس پر زبردست احتجاج کا طوفان برپا ہوا تھا، اس کا نام ہے
"پیشوا نراین راؤ مارا گیا یا اس نے خودکشی کی" کتاب میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرہٹہ حکومت کے
آخری دور کا برہمن مدبر نانا فرنویس بہت برا آدمی تھا، اس سے پونا میں کتاب کے متعلق کافی ہلچل مچ گئی تھی، بہرحال یہ کتاب
مرہٹی ادب میں ایک نظیر آپ ہے۔ دوسری اہم کتاب ڈاکٹر این ڈی ساورکر کی وہ تاریخ ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ
قدیم زمانے میں ہندوؤں نے کس طرح اپنا اثر و اقتدار پھیلایا تھا۔ اس سلسلے میں مس پریا کنٹک کی کتاب "ہندو عورتوں کی
زندگی" بھی قابل ذکر ہے۔

اس سال زیادہ تر ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ کھانڈیکر، پھڑکے، مدکھولکر، پی، وائی،
پانڈے، وادیکر مہاراشٹر کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ مگر ابھی کئی افسانہ نگاروں نے زندگی کے اصل مسائل کو
نظرانداز کر دیا ہے۔ جدید مرہٹی ادیبوں میں شیورام مہادیو پرانجپے کی سوانح عمری شائع ہوئی ہے۔ پرانجپے تلک کا ہمعصر
تھا اور مشہور اخبار "کل" کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا تلک کے "کیسری" کے بعد سب سے زیادہ اثر پیدا کرنے
کے اخبار کا تھا، اس کا طرز تحریر زوردار اور پُرجوش تھا۔ افسوس حکومت کے امتناعی احکام کے باعث اس کی چند
تصانیف ہی عوام تک پہنچ سکی ہیں، جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے ناطق فلموں نے اسٹیج کو ختم کر دیا ہے، جدید مرہٹی ادب
میں ڈرامہ کو ممتاز درجہ حاصل ہے اور بنگالی اسٹیج کو چھوڑ کر مہاراشٹر بہترین اسٹیج کا حامل ہے۔ پرانے ڈرامہ نگار
کھاڈلکر اور کیلکر ابھی تک موجود ہیں، مگر انھوں نے اب لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مسٹر وررکر نے البتہ اسٹیج کو حیات نو
عطا کی ہے۔ اب سے دو سال قبل مہاراشٹر میں ڈرامہ کی صد سالہ تقریب منائی گئی تھی۔ مرہٹی میں مختصر افسانہ نگاری
بتدریج ترقی کر رہی ہے۔ اس سال تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں جس سے مرہٹی زبان کی آئندہ ترقی کے
امکانات ظاہر ہوتے ہیں۔

تامل

تامل ادب کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا آنجہانی سبرامنی بھارتی کے سر ہے، اس کی پوری زندگی مادر وطن کی
خدمت سے پُر ہے، وہ ایک عرصہ تک پانڈیچیری میں جلاوطن رہا اور وہیں اس نے حقیقتاً اپنی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں، گذشتہ
جنگ عظیم کے اختتام کے کچھ عرصہ بعد ہی بھارتی اس دنیا سے نہایت ہی المناک اور اندوہگیں حالات میں چل بسا، اس کی
صحیح قدر و منزلت کا بعد میں احساس ہوا۔ بھارتی جدید تامل ادب کا بانی تھا۔ چنانچہ اس کی قوم نے حال ہی میں اس
شاعر انقلاب کو جس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے واقعی وہ ہم سب کے لئے قابل غور ہے۔ حال ہی میں ایک تامل اخبار
"کلکی" نے بھارتی میموریل فنڈ کے لئے ۱۰ ہزار روپئے کی اپیل کی تھی، مگر تھوڑے ہی عرصہ میں ۶۰ ہزار روپئے جمع
ہوگئے، اس رقم میں سے بھارتی کی بیوہ کی امداد کرنا، اس کے وطن ایٹیاپورم میں ایک لائبریری اور دارالمطالعہ
کھولنا ممکن ہوگیا۔ چنانچہ مسٹر راجگوپال اچاری نے تامل باشندوں کے ایک بہت بڑے مجمع میں اس عمارت کا سنگ بنیاد
رکھا، پانڈیچیری میں بھی بھارتی کی یادگار قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تامل باشندے اپنے ادبا و شعراء کی بڑی قدر
کرتے ہیں اس کی معمولی سی مثال یہ ہے کہ حال ہی میں مشہور شاعر رام لنگم پلائی کو مدراس میں سپاسنامہ پیش کیا گیا اور ایک تھیلی

تمد کی گئی۔ تامل لیڈروں نے اس تقریب میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ رام لنگم پلائی کی شاعری بہت ہی اثر انگیز اور پُرجوش ہے۔ حال ہی میں اس کی تقاریر کا مجموعہ اور داستان حیات شائع ہوئی ہے۔

۱۹۴۵ء میں شاعری سے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں کمبا دسن کا "پہلا پیار" ٹی۔ پی۔ پترکس کا "رقص عمر" اور سدھانند بھارتی کا "نغمۂ لاہوتی" کو سب پر برتری حاصل ہے۔ ڈرامے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے۔ این مندرشن کا "کانن" اور گندھاری "ستراج شاستری کا "بھوجن" اور سری کرشنا سوامی آئرکا "میرا بائی" اچھے ہیں۔

تامل میں تخلیقی ادب کے لحاظ سے افسانہ کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ کھتویرن، بجامورتی، گوپا پری، ویکانن، ڈی۔ ایس ورڈن، بہترین افسانے لکھ رہے ہیں۔ ایس۔ ایس۔ کا ناول "کنقم" نئی روشنی کی عورت کا اچھا مطالعہ ہے۔

ڈی۔ ایس کھانڈیکر اور ٹیگور کے تراجم بھی تامل میں کئے گئے ہیں۔

گذشتہ بارہ ماہ میں روزویلٹ، کستوربا، مولانا آزاد اور اسٹالن کی سوانح عمریاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ تامل ادب اور صحافت بتدریج ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔

تلیگو!

آندھرا میں ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی ضرورت چاہتی ہے کہ ملک کے ہر حصہ میں حقیقی ادب ابھر رہا ہے۔ گڈیارم وینکٹ سیشی کی "سور بھارتم" کی اشاعت نے آندھرا میں ادبی کوششوں کا رخ ہی بدل دیا۔ اب ہر جگہ اس عظیم الشان تصنیف کا عکس لیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا مضمون تاریخی ہے مگر شاعرانہ نزاکت نے اس میں جان ڈال دی ہے اور اس میں قومیت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

تنالی میں نوی ساہتیا پریشد کے اجلاس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ تنالی میں ہی جدید تلیگو شاعری کی بنیاد پڑی ہے جدید تلیگو شعراء میں کستوری کا نام قابل ذکر ہے، اس سال کے شروع ہی سے یہ جدوجہد کی جا رہی ہے کہ تلیگو ادب میں استحکام پیدا کیا جائے، چنانچہ مندرجۂ بالا کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی تھا جس میں ان مشہور ادباء نے شرکت کی تھی:۔

دیودلا پلائی، چنتا، مادھو پیڈی، جونا لمڈاکا، ریا پروہو، نرسی برارسی کٹھیلا، کروگنتی، پلاکرا، آدرج، تلاورج جھولا، جوراتی، کالادنسم، منی میسرم، سری رنگم، دنجو موڑی، تونالا، پولاورتی، لٹوکوری۔

اخبارات میں جو افسانے نکلے ان میں "پاپا" کی "پلی" بہترین ہے، اس کے علاوہ میکاتی، وسوناتھ، پوارا جو کی کہانیاں بھی توصیف کے قابل ہیں۔ علامۂ اقبال کے "اسرار خودی" کا ترجمہ جو "موریا پربھا" کے سالنامہ میں شائع ہوا ہے خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔

(بقیہ جھوٹ سچ)

تو مطلب کہنے کا یہ کہ سچ کے تو خیر ہم قائل ہو سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے سچ بولنے کے قائل نہ ہوں۔ البتہ یہ بات ہم کبھی مان نہیں سکتے کہ سانچ کو آنچ ہی نہیں لگتی۔ ایسی لگتی ہے کہ آدمی آدمی جھلس کر رہ جائے۔ جھلس کر رہ جائے بھسم ہو جائے۔ بلکہ اب تو زندگی اس حد تک سراسر جھوٹ بن چکی ہے کہ گویا بارود کا ایک ذخیرہ ہے۔ سانچ کی اگر ذرا بھی آنچ لگ جائے تو ہم معہ اپنے ماحول کے بھک سے اڑ جائیں۔ البتہ سانچ کو آنچ نہیں کا اگر یہ مفہوم ہے تو بالکل ٹھیک ہے کہ ایک سچ بولنے والے پر دوزخ کی آنچ حرام ہے، مگر یہ بھی غلط ہے کہ ایک جھوٹ بولنے والا جھوٹ بولتے بولتے یکایک سچ بول کر دنیا ہی میں جنت کے امکانات پیدا کر سکتا ہے۔

[illegible] عالم ہمہ افسانۂ ما دارد.....!

۱۰- میسزان: ایڈیٹرز کوثر چاندپوری ۔ رشدی ۔ صہبا لکھنوی ۔ ریاست بھوپال سے ایک عرصۂ دراز کے بعد
حیدرآباد دکن پہلی دفعہ ایک معیاری ماہنامہ کا اجرا عمل میں آیا ہے جس کی پیشانی پر اقبال کا یہ شعر ہے ؎

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود ٭ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آغاز کار میں بتلایا گیا ہے کہ افکار اگرچہ نوخیز ہے، لیکن اس کے ارادوں کی طاقتیں جوان ہیں اور وہ اپنے سامنے خدمت کا ایک وسیع میدان رکھتا ہے، لیکن اس وسعت کے کسی گوشہ میں بھی اختلاف اور باہمی جنگ و جدال کا کوئی سیاہ دھبہ نہیں" ہم اس مسلک کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔ یہ معلوم کر کے بھی بڑی خوشی ہوئی کہ "افکار زندہ ادب پیش کریگا لیکن عریانی اور برہنگی سے ہمیشہ الگ رہنے کی کوشش کریگا ۔ زیر نظر شمارے میں غزلیں بھی ہیں، افسانے بھی ہیں، تنقیدی مضامین بھی ہیں اور فلمستان بھی ۔ شعرا اور مضمون نگاروں کی فہرست میں احمد ندیم قاسمی ۔ بہزاد لکھنوی ۔ پروفیسر شور ۔ علی اشرف، کوثر چاندپوری کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ابھی تو ابتداء ہے لیکن امید ہے کہ آئندہ افکار اور بھی معیاری مضامین اور افسانے پیش کریگا ۔ دنیائے ادب میں ہم افکار کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے متمنی ہیں ۔ (۷ مارچ ۱۹۴۶ء)

۱۱- حیات: بھوپال کی سرزمین، ترقی پسندانہ ادبی سرگرمیوں کے لئے چنداں سازگار ماحول نہیں پیش کرتی، اسی لئے
مراد آباد جب میں افکار کے صفحات پر نظر ڈالتا ہوں اور پھر مقام اشاعت بھوپال دیکھتا ہوں تو حیرت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود ٭ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا ۔ افکار کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، سرورق سادگی و پُرکاری کا دلفریب امتزاج ہے ۔ شعبۂ ادارت میں کوثر چاندپوری، جناب رشدی، اور جناب صہبا لکھنوی کے اسماء گرامی نظر آتے ہیں ۔ جس رسالے کے ادارے میں اتنے اچھے لکھنے والے موجود ہوں، بلاشبہ اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے "افکار" سے بھی خدمت علم و ادب کی سرگرم توقعات وابستہ کر رکھی ہیں ۔ زیر نظر شمارے کے چودہ صفحے شعراء کے لئے مخصوص ہیں اور شعراء بھی وہ جن کے افکار شعری ہر بہترین رسالے کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں ۔ احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری ایم ۔ اے شریف کنجاہی، بہزاد لکھنوی، مسعود اختر جمال، باسط بھوپالی ۔ احسن بھوپالی، پروفیسر شور، اور نظم اکبرآبادی وغیرہ کا کلام حصۂ نظم میں موجود ہے

"افکار" کا افسانوی معیار بھی قابل تعریف ہے، اسی اشاعت میں پانچ افسانے موجود ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں پسندیدگی کے قابل، تیسرا حصہ علمی و ادبی مضامین کے لئے محفوظ کیا گیا ہے ۔ جس کا عنوان ہے "جائزے" اس عنوان کے ماتحت تنقیدی قسم کے دو مقالے ہیں اور اگر تنقید کا معیار غیر معمولی طور پر بلند نہ کیا جائے تو کہنا پڑیگا کہ خوب ہیں ۔ آخر میں ایک صفحہ فلمستان کے لئے بھی مخصوص کر کے ادبی سنجیدگیوں، علمی متانتوں، شعری نزاکتوں اور افسانوی رعنائیوں [illegible] شریک کر کے اس شراب کو سہ آتشہ و چہار آتشہ کر دیا گیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی ماہنامہ "افکار" وقت کے [illegible] بہرحال میں ایک ایسی دور کی منزل کا نشان راہ ہے جس کی طرف ذہین ذہنوں کا قافلہ رواں [illegible]

سب سے بڑی خوبی اس کا حسن ترتیب ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ کے کیا کہنے؟ میرا خیال یہ ہے کہ ہندستان کے شاید کسی رسالے کے عام نمبر کی کتابت و طباعت اس قدر نفیس اور اس درجہ دلآویز ہوتی ہو۔ میں جملہ اراکین اور خصوصاً صہبا صاحب لکھنوی کو ان کی کامیاب ترین کوششوں کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بہت پہلے انھوں نے مجھ سے خراج تحسین حاصل کر لیا تھا، لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک کامیاب صحافی کی حیثیت سے انہیں مبارکباد دے رہا ہوں۔ اس عزم و یقین کے ساتھ ان کا ہر قدم پہلے قدم سے شاندار تر اور سود مند تر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ادب و انشاء کا ستھرا ذوق رکھنے والے حضرات "افکار" کی سرپرستی کرکے ایک ایسے ماہنامہ کی امداد کریں گے جس کی زندگی بہر حال و بہر صورت ضروری ہے، صرف اس کے لئے ہی نہیں بلکہ خود ہمارے لئے بھی۔ (۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء)

"سرپنچ" لکھنؤ ادارۂ تحریر کوثر چاندپوری، رشدی، صہبا لکھنوی۔ کاغذ کی اس نایابی کے دور میں جبکہ جاری پرچوں کی زندگی کو متوازن رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں کسی نئے پرچہ کا اجرا وہ بھی اس شاندار طریقہ سے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ افکار کے نقش اول سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہندوستان کے شعراء اور ادباء کی قلمی سرپرستی حاصل ہے۔ زیر نظر شمارے میں جو ادب پیش کیا گیا ہے وہ عصر حاضر کے تقاضوں کا آئینہ دار ہے۔ ماہنامہ کی ترتیب و تدوین نہایت خوش وضع اور لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ہے۔ غرضکہ ماہنامہ صوری و معنوی اعتبار سے قابل قدر اور پذیرائی ہے۔ ہم ادارہ تحریر کو اس مستحسن اقدام پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور ترقی کے خواستگار ہیں۔ (۱۹ مارچ ۱۹۴۶ء)

"جائزہ" لکھنؤ ادارہ، کوثر چاندپوری۔ رشدی، صہبا لکھنوی۔ جنگ ختم ہو چکی ہے، مگر ہنوز جنگ کی پیدا کردہ اور تباہ کاریوں کا کوئی حل دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ جنگ کے بعد دنیا از سر نو جوان ہوگی، جہاں فراغتوں اور شادمانیوں کی فراوانی ہوگی مگر ایک بار سر تا پا خون سے نہانے کے بعد بھی انسان ابھی اسی پستی پر ہے، جہاں اب سے پچاس سال پیشتر تھا۔ ہر طرف طاقتور کمزور کو دبانا چاہتا ہے۔ ہر جانب سے تیز آندھی اٹھکر مظلوم کو ختم کرنے کی کوشش میں ہے، جو قومیں آزادی کے نام پر لڑ رہی تھیں وہی آج آزادی کو نظر آتی ہیں، جن میناروں سے خیال تھا کہ آزادی کے پرچم بلند ہوں گے انہی گوشوں میں غلامی کی زنجیریں ڈھلتی لیکن باوجود ان پابندیوں اور مجبوریوں کے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کوشش کر رہا ہے کہ جتنی خدمت ملک و قوم کی ہوسکے اس سے دریغ نہ کیا جائے، قومی خدمت کا ایک ذریعہ صالح اور صحت بخش ادب بھی ہے جس کی پرورش اگر صحیح طریقہ پر کیجائے تو یقیناً نفع بخش ہوسکتی ہے۔

اسی گروہ کے چند اشخاص نے تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھوپال سے ایک ماہنامہ "افکار" جاری کیا ہے۔ ریاستوں کا ماحول برطانوی ہند سے بھی زائد تنگ ہے اور وہاں کے لئے ایسا قدم خواہ تمامتر ادبی ہی کیوں نہ ہو بڑی حد تک دشوار اور اسی لئے بہت زائد قابل تحسین ہے۔ سیاست ہماری زندگی میں ترقی کرتی جارہی ہے، یہاں تک کہ ہمارا ادب اور ہمارے معاشی تعلقات پر بھی اس کا بہت کچھ اثر پڑ رہا ہے۔ افکار کو سیاست سے بچانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کس حد تک ممکن ہوگا، اس کا صحیح اندازہ ابھی انتہاپسندی دور حاضرہ کے ادب کا ایک جزو بن گئی ہے، ایک طبقہ ایسا ہے جو پرانے رجحانات سے بدلتی ہوئی ضرورتوں پر نظر نہیں ڈالنا چاہتا۔ دوسرا گروہ پچھلی ادبی خدمات کو بھول کر یکسر نئی ترکیبوں اور نئے فرائض میں ہے اور وہ ہر شے کو بے نقاب کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی کثیف اور گندہ ہی کیوں نہ

[illegible] نے کتنی ہی شکل کیوں نہ ہو۔

[illegible] ادب کا پرتو ہے۔ جس میں وہ تمام ترجمعہ تخیلات کی عکاسی ہے اور دیکھنے [illegible] جذبی۔ پرچہ کی ترتیب بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔ ہر حصہ اپنی جگہ الگ اور نمایاں ہے [illegible] حصہ نظم قابل توجہ ہے جس میں مسعود اختر جمال۔ بہزاد لکھنوی اور نظم اکبرآبادی کی غزلیں، غزل کے [illegible] کا پرتو ہیں اور احسن بھوپالی کی نظم "پیمانہ" جدت تخیل کا آئینہ دار ہے۔ (یکم مارچ ۱۹۴۶ء)

"افکار" ایک مدت سے سرزمین بھوپال سے "افکار" کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کی توقع کی جا رہی تھی، اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ افکار کا پہلا پرچہ ہی ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے۔ [illegible] زمانہ میں جبکہ حصول کاغذ و اجازت پر بیحد پابندیاں عائد ہیں، کارکنانِ "افکار" کا ایسا دیدہ زیب پرچہ شائع کرنا ان کی ہمتی اور مستقبل کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ کارکنان "افکار" نے ملک کے بہترین دماغوں کے افکار سے اس مجلہ کو [illegible] دی ہے۔ ادارہ میں کوثر چاند پوری۔ رشدی اور صہبا لکھنوی ایسے اہل قلم حضرات موجود ہیں۔ (۲ مارچ ۱۹۴۶ء)

لاہور

آجکل "افکار" بھوپال ایک نیا ادبی ماہنامہ ہے، جس کا اجرا گذشتہ ماہ ریاست بھوپال سے ہوا ہے۔ پہلے ہی شمارہ میں بلند پایہ قلمی معاونین شریک ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی سرگرمی سے کام لیا گیا ہے۔ یہی صورت رہی تو بہت جلد اسے اُردو کے معیاری رسائل کی صف میں رکھا جا سکے گا۔ کتابت وطباعت نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ یہ پرچہ سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوا ہے جو آجکل دنیائے صحافت میں بالکل عنقا ہے۔ (یکم اپریل ۱۹۴۶ء)۔

دہلی

"آئینہ" ماہنامہ "افکار" حال ہی میں بھوپال کے آسمانِ صحافت سے ایک درخشندہ ستارے کی طرح طلوع ہوا ہے، دوسرا شمارہ پیش نظر ہے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اس نے اپنی طفلی ہی میں لوگوں کو ادبی روشنی کی حکایات سنانی شروع کر دی ہیں۔ مضامین نظم و نثر نہایت کامیاب اور معیاری ہیں۔ ترتیب نہ صرف انوکھی ہے بلکہ جاذب توجہ بھی۔ قیمت ۸ر آنے ہے جو کہ اس گرانی کے زمانہ میں بہت ہی کم ہے۔ (۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء)۔

بمبئی

"شاعر" بھوپال۔ سنٹرل انڈیا کی ایک مشہور ریاست ہے جہاں ہر دور میں علم و ادب کے چرچے رہے ہیں۔ جہاں اچھے اچھے ادیب بھی پیدا ہوئے اور شاعر بھی، لیکن ابھی تک بھوپال سے کوئی معیاری ادبی ماہنامہ نہ نکل سکا تھا، اگر کوئی نکلا بھی تو بند ہو گیا۔ البتہ ایک روزنامہ اخبار "ندیم" وہاں سے پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ ہاں ایک [illegible] مولانا نیاز فتحپوری کا "نگار" ضرور شائع ہوا لیکن اس کا قیام بھی کچھ عارضی سا تھا۔ مقام مسرت ہے کہ بھوپال کے ادبی حلقوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور "افکار" کے نام سے ایک ترقی یافتہ ماہنامہ نکالا۔ "افکار" کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ رسالہ کی ترتیب چھپائی اور کاغذ قابل تعریف ہے۔ ادارہ نے اپنے بلند مذاق کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ ابتدا میں ادارہ کے دو افتتاحیہ مضامین ہیں [illegible] کے تحت حصۂ نظم ہے، پھر "آبشار" کے تحت افسانے اور آخر میں "جائزے" کے تحت تنقیدی اور ادبی مضامین، اس کے بعد علمی خبروں کا [illegible] صفحہ ہے۔ ادارہ نے رسالہ کی ترتیب اور مضامین کے انتخاب میں کافی کاوش سے کام لیا ہے۔ حصۂ نظم وزنی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر ادارہ [illegible] نظموں اور غزلوں کی اشاعت سے پہلے ان پر ایک فنی نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہے۔ ادارہ نے "افکار" کے مقاصد کے متعلق [illegible] اور زیر نظر شمارہ میں جو معیار پیش کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "افکار" صحیح معنوں میں ترقی یافتہ [illegible] زبان و ادب کی بہترین خدمات انجام دے سکے گا۔ ہم "شاعر" کے ناظرین سے خصوصاً [illegible]

آگرہ

نقد و نظر

ہفتہ وار جائزہ لکھنؤ دورِ جدید کے ادب اور مسلم سیاست کا جائزہ لینے کے لئے لکھنؤ سے ہفتہ وار جائزہ ملک کے مشہور افسانہ نگار جناب نسیم سندیلوی ایم۔ اے کی زیر ادارت جاری ہوا ہے۔ اس وقت تک جائزہ کے سات شمارے شائع ہو چکے ہیں آٹھواں شمارہ زیر تبصرہ ہے ابتدائی نمبروں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جائزہ معیاری ادب کے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے بنیادی نظریوں کا بھی حامی ہے۔ زیر تبصرہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء کا پرچہ ہے جو عام ہفتہ وار پرچوں سے ہٹ کر اپنا ایک انفرادی اور امتیازی رنگ رکھتا ہے۔ قارئین افکار سے ہم پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ وہ جائزہ کی سر پرستی قبول فرما کر اپنی بلند مذاقی کا ثبوت دیں تاکہ یہ ہفتہ وار رسالہ ملکی ادب و مسلم سیاست کی ٹھوس خدمت انجام دینے کے قابل ہو سکے۔ اس پرچہ کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ابتدا ہی سے ہندوستان کے ایۂ ناز ادبا و شعراء کا تعاون حاصل ہو گیا ہے اور یہ پرچہ نہایت پابندی کے ساتھ تمام ممتاز قلمکار حضرات کی نگارشات رنگیں سے مزین ہو کر ہر ہفتہ شائع ہو رہا ہے۔ کاغذ چکنا اور سفید — طباعت اچھی — کتابت نفیس۔ زر سالانہ ۵ روپیہ ششماہی ۳ روپیہ ۸ آنہ۔ فی پرچہ ۲ آنہ ملنے کا پتہ:۔ منیجر ہفتہ وار جائزہ۔ رفیع منزل، بارود خانہ۔ لکھنؤ۔

نیا دور ۲ (دو ماہی رسالہ) ایڈیٹر:۔ صمد شاہین پتہ:۔ نیا دور ۶۲ خلاصی پالیم۔ بنگلور سٹی۔ جنوبی ہند کا یہ واحد رسالہ جدید ترقی پسند اشتراکی ادب کا نمائندہ ہے زیر نظر پرچے میں احمد علی۔ کرشن چندر کے مضامین آرٹ سیاست اور زندگی اور ادب کے نئے تقاضے قابل ذکر ہیں جن میں ادب کے ہمہ گیر پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ترقی پسند جنسی ادب میں ریوتی سرن شرما نے عریانی و فحاشی اور ادبی خطوط کی حقیقی معتدلانہ رہنمائی کی ہے۔ افسانے تمام کے تمام جدید ادبی معیار کے حامل ہیں۔ اختر اورینوی کا "ڈائنامائٹ" رامانند ساگر کا "جب پہلے روز برف گری" ہماری سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے صحیح خاکے ہیں۔ گذشتہ شماروں میں حصۂ نظم کی کمزوریوں کی حسن تلافی اس شمارہ نے صحیح طور پر کر دی ہے واثق کی نظم "مینا بازار" طویل ہوتے ہوئے بھی کافی شعریت افروز اور حقیقت انگیز ہے۔ ہم اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی "ماضی اور مستقبل" ساحر لدھیانوی کی "ایک شام" ابن انشاء کی "بغاوت" علی جواد زیدی کی "شکستِ مکاں" کامیاب منظومات ہیں جہاں تک پرچہ کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے جاذبیت و دلکشی کے عناصر کم نظر آتے ہیں، مضامین میں تنوع کاری کا فقدان ہے۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے "نیا دور" ہر طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کی پذیرائی کی جائے۔ ہم اس کا پوری طرح خیر مقدم کرتے ہیں۔

منتخب نظمیں مرتبہ ادارۂ ادب جدید فیض آباد۔ ادارۂ ادب جدید کا یہ خاص منظومات نمبر جنوری ۱۹۴۶ء ہمارے پیش نظر ہے۔ ابتدا میں ادارہ کی جانب سے ہماری شاعری کی گذشتہ و آئندہ رفتارِ ارتقا کا ایک ہلکا سا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء کی شاعری میں سے پسندیدہ و چیدہ نظموں کو شعرا کے اسماء گرامی کی حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے۔ انتخاب میں ایسی نظموں کا خیال رکھا گیا ہے جو شعرا کی انفرادیت اور شخصیت کی آئینہ دار ہیں لیکن بہت سی ایسی منظومات فراہم کر دی گئی ہیں جو دوسرے منتخب کتابچوں میں آ چکی ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ جدید و تازہ نظموں سے اس شمارہ کو آراستہ کیا جاتا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے یہ خاص نمبر کامیاب ہے۔ ہم جناب [illegible] کی خصوصی کاوش پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

فلمستان

انڈین فلم کونسل

"پچھلے دنوں دہلی میں حکومت ہند کے نمائندوں اور صنعت فلمسازی کی بڑی بڑی شخصیتوں کے درمیان جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں انڈین فلم انسٹیٹیوٹ اور کونسل کے قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا تھا معلوم ہوا ہے کہ اس کونسل کا مقصد ایک ریسرچ اور ٹیکنیکل ادارہ کی تشکیل ہے تاکہ صنعت کی سرگرمیوں میں ایسا ارتباط قائم ہو جائے جس سے اس کا معیار بلند کیا جا سکے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کیمرہ مینوں، ساؤنڈ انجنیروں، آرٹ ڈائرکٹروں، پروجیکشنسٹوں اور دیگر فنی اشخاص کو ٹریننگ بھی دیگا۔ حکومت اب فلمسازی میں زیادہ دلچسپی لے رہی۔ اس قسم کے فنی ادارے کے قیام کی ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، ہندستانی فلم تکنک کے لحاظ سے بہت معمولی ہوتے ہیں کیونکہ ناخدایان فلم فنی پہلو کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ادارہ صحیح معنوں میں صنعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

آشا پکچرز کا دلیرانہ اقدام

بمبئی کے ایک نئے فلمی ادارے آشا پکچرز نے اپنے پہلے فلم کی کہانی "شریمتی" ۲۰ ہزار روپیہ میں خریدی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اچھے افسانہ نگاروں سے تغافل کا دور ختم ہو رہا ہے، وہ دن دور نہیں جب ہندستانی فلمساز کہانیوں کے حصول میں امریکنوں کی طرح زیادہ روپئے کی بازی لگایا کرینگے۔

کانن ہالی ووڈ کو

معلوم ہوا ہے مشہور فلم اسٹار کانن کچھ روز کے لئے ہالی ووڈ جا رہی ہے۔

آرٹ پروڈکشنز آف انڈیا

ہندستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر کی سرپرستی میں آرٹ پروڈکشنز آف انڈیا کے نام سے حکیم پنڈت ترلوک ناتھ، بھگوانداس گلوبجہ پروپرائٹر رنگون، اسٹوڈیوز نئی دہلی ایم آدوی شرما منیجنگ پروپرائٹرز جمیس پکچرز اور ہری کرشن نول

منیجنگ ایڈیٹر "دشگیر" نے ایک فلمی ادارہ قائم کیا ہے تحت چار اچھی فلمی کہانیوں کا انتخاب ہو چکا ہے۔ ایک ماہر انگریز ڈائرکٹر اور ایک انگریز خاتون کی بھی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ ان کی نگرانی میں ہندستانی کہانیاں انگریزی میں فلمائی جائینگی، جن کی بین الاقوامی نمائش کا خاطر خواہ انتظام ہو چکا ہے۔ عنقریب پہلی دو تصاویر کا اعلان کیا جائیگا۔

نوشابہ پکچرز کی سرگرمیاں

نوشابہ پکچرز آجکل اپنے پہلے فلم "تصویر کے دو رخ" کی تیاریوں میں مصروف ہیں حیدر شاہ ہدایت کاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اسٹوری شکل صاحب کی ہے اور مکالمے اور گانے اختر مرحوم نے لکھے ہیں۔

اشوک کمار کی ہدایت کاری

اشوک کمار فلمستان کی ایک تصویر کو جس میں وہ خود بھی کام کر رہا ہے، ڈائرکٹ کریگا۔ دوسرے اداکاروں میں سینہ پربھا، بیگم پارہ اور ونیتی کا نام قابل ذکر ہے۔

فردوس

ڈائرکٹر قانی مازوبدار سنٹرل فلم کارپوریشن کے "فردوس" کو ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ شمیم اور نسیم نمبر۲، اس کے لیڈنگ کاسٹ میں ہیں۔

ڈائرکٹر صفدر آہ بحیثیت پروڈیوسر

اطلاع ملی ہے کہ ڈائرکٹر صفدر آہ سیتاپوری نے اپنا ذاتی فلمساز ادارہ "بہارستان" کے نام سے قائم کر دیا ہے جس کے [illegible] کی [illegible] ہی فلموں کی تیاری کے ابتدائی [illegible]

عشق و محبت، درس و اصلاح اور ادب و فن سے لبریز دلکش

فلمی جواہر پارے

جنھیں شمالی ہند کے دو نامور ادیب و صحافی پیش کر رہے ہیں!

ایک عورت کی داستانِ حیات

جس نے تکمیلِ آرزو کی دُھن اور گوہرِ مقصود کی تلاش میں گھر بار اور محبوب کو بھی چھوڑ دیا لیکن بےسود! بالآخر محبت کی آغوش میں اس کی تلاش ختم ہو گئی۔

تاجور پروڈکشنز کی رومانی و اصلاحی پیشکش

تلاش

جسے ملک کے تین سربرآوردہ ادیبوں نے لکھا اور جس میں پردۂ سیمیں کے تابناک ستارے جگمگا رہے ہیں!

سرزمینِ عرب کا درس آموز رومان

"لیلیٰ مجنوں" سے زیادہ پُردرد!

"شیریں فرہاد" سے زیادہ اثر آمیز!

"وامق و عذرا" سے زیادہ پُرجوش!

تاجور پروڈکشنز کا تاریخی کارنامہ

قیس و لُبنیٰ

افسانہ: شمس العلماء حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی

تفصیلات کے لئے آئندہ اعلان کا انتظار فرمائیے!

جاری کردہ

تاجور پروڈکشنز نمبر ۲۶۴ بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸

صالح ادب، پاکیزہ مذاح اور مسلم سیاست کا واحد ترجمان !

ہفتہ وار جائزہ لکھنؤ

ایڈیٹر:- نسیم سندیلوی ۔بی، اے (آنرز) ایم، اے۔

ہندستان جس بحرانی دور سے گذر رہا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں اس عبوری دور میں مسلم قوم کو جس کشمکش کا سامنا کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق کو تسلیم کرانا ہے اور اپنی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لئے جد و جہد کرنا ہے اُس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں —— مسلم قوم بیدار ہوکر ترقی کی جانب اپنا قدم اُٹھا چکی ہے۔

اب آپ کا

فرض ہے کہ دور حاضرہ کی مسلم سیاست معاشرت اور اخلاقیات نیز علمی و ادبی ترقی سے پوری طرح واقف رہیں اس سلسلہ میں

ہفتہ وار جائزہ لکھنؤ کا

مطالعہ آپ کے لئے نہایت ضروری ہے جو پابندی کے ساتھ ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء سے شائع ہو رہا ہے اور جس میں پاکیزہ اور معیاری ادب کے جدید رجحانات اور مسلم قوم کے تعمیری سیاسی نظریات آپ کو دوش بدوش نظر آئیں گے

لکھنے والے :-

ادب و سیاست

ڈاکٹر صمدی ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ پروفیسر احتشام حسین رضوی ۔ رباب مسلم ۔ رازداں ایم اے ۔ حبیب الرحمٰن ایم اے ۔ مس وحیدہ عزیز ۔ احسن فاروقی ایم اے ۔ ملا رموزی ۔ فضل احمد وغیرہ ۔

شعرستان

مسعود اختر جمال ۔ روش صدیقی ۔ سلام مچھلی شہری ۔ اختر ہوشیار پوری ۔ راغب مراد آبادی اسعد شاہجہانپوری ۔ جانثار اختر ۔ عمر انصاری ۔ شاعر لکھنوی وغیرہ ۔

افسانہ و حکایت

ابراہیم جلیس ۔ اخلاق حسین عارف ۔ انور کاظم ۔ شفیق بانو شفق ۔ امین مفتی ۔ رانی کانتا بی اے وغیرہ ۔

لکھائی چھپائی اور گیٹ اپ شاندار ۔ سرورق آرٹ کا نادر نمونہ ۔ ضخامت ۲۴ صفحات ۔ زر سالانہ ۱۲ روپے ۸ آنے ششماہی ۶ روپے ۔ فی پرچہ ۴ آنے ۔ نمونہ کے لئے ۴ آنے کے ٹکٹ بھیجئے ۔

نوٹ :- محش اشتہارات کی اشاعت سے "جائزہ" قاصر ہے لہذا مشتہرین حضرات بطور خاص اس کا لحاظ رکھیں ۔

منیجر ہفتہ وار "جائزہ"
بارود خانہ ۔ لکھنؤ ۔

بچوں کا کتب خانہ

بچوں کی نفسیات کے پیش نظر ہم نے ہندستانی بچوں کے شعور کے مطابق نہایت دلچسپ اور
ں اخلاقی کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کہانیوں کے
ے بچوں میں ذہنی بلندی، دلیرانہ امنگ، قوت ارادی اور شریفانہ اخلاقی اسپرٹ
تی ہے۔ بچوں کے محسوسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور خاص یہ حسین جمیل کہانیوں کا سیٹ
ان کے قابل فخر اور ممتاز اہل قلم حضرات صہبا لکھنوی، متین سروش۔ فخر الدین نگینوی سے گرانقدر معاوضہ
کر لکھوائی گئی ہیں علاوہ ازیں اس کی تیاری میں ملک کی مایۂ ناز انشا پرداز خواتین پروین رشدی، رخشندہ سلمان
ن وجدی اور سعیدہ بیگم کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔

یوں کی کہانی	۵ر	۱۴۔ رانی کملاپتی	۵ر	۲۶۔ ظالم جادوگر	۵ر	۳۸۔ لنگڑا بھکاری	۵ر
ی بیٹی	۵ر	۱۵۔ شیر گیدڑ	۵ر	۲۷۔ سونے کا فقیر	۵ر	۳۹۔ بگلا بھگت	۵ر
ہ کا پیالہ	۵ر	۱۶۔ جنگل میں منگل	۵ر	۲۸۔ سیب شہزادہ	۵ر	۴۰۔ دشمنی کا انجام	۵ر
ں کا جزیرہ	۵ر	۱۷۔ سونے کا سیب	۵ر	۲۹۔ پونے میں	۵ر	۴۱۔ جنگل کی شہزادی	۵ر
روں کی کانفرنس	۵ر	۱۸۔ جادو کا شہر	۵ر	۳۰۔ پریوں کی شہزادی	۵ر	۴۲۔ طلسمی صندوق	۵ر
دغہ جی	۵ر	۱۹۔ بادشاہوں کی سخاوت	۵ر	۳۱۔ ترکی سپاہی	۵ر	۴۳۔ بارہ بھائی	۵ر
در ملاح	۵ر	۲۰۔ شہزادی نیلوفر	۵ر	۳۲۔ ٹوٹا ہوا چاند	۵ر	۴۴۔ ماہی گیر کا خواب	۵ر
زبان کی چڑیا	۵ر	۲۱۔ دو سہیلیاں	۵ر	۳۳۔ بچوں کی حکومت	۵ر	۴۵۔ شکیلہ	۵ر
لو ئیتے	۵ر	۲۲۔ ہار کی چوری	۵ر	۳۴۔ ننھا شکاری	۵ر	۴۶۔ چوروں کا گروہ	۵ر
ی بیٹی	۵ر	۲۳۔ شیطان ماموں	۵ر	۳۵۔ ٹھگوں کا ٹھگ	۵ر	۴۷۔ شیطان کا چیلہ	۵ر
بہنوں کی کہانی	۵ر	۲۴۔ چھم چھم پری	۵ر	۳۶۔ جادو کا ڈنڈا	۵ر	۴۸۔ کنول رانی	۵ر
فران پری	۵ر	۲۵۔ سنہرا دیو	۵ر	۳۷۔ جادو کی بلی	۵ر	۴۹۔ سمندر کا رکھوالا	۵ر
دو کا	۵ر					۵۰۔ لالچی بادشاہ	۵ر

مکتبۂ افکار، بھوپال

افکار کی چند ایجنسیاں!

اجمیر:۔ شاندار نیوز ایجنسی۔ پوسٹ درگاہ شریف

احمد آباد:۔ شفیع بک ڈپو۔ کالوپور ٹاور

کراچی:۔ علی بابا پبلسٹی، ایوب بلڈنگ، کننگھم اسٹریٹ صدر

کانپور:۔ محمد حنیف۔ نیوز پیپر ایجنٹ، گرانڈ ہوٹل۔

بنگلور سٹی:۔ دار الاخبار انجمن ترقی اردو، نرسمہا راجہ روڈ۔

پشاور:۔ صادق کمیشن ایجنسی رجسٹرڈ۔ بازار قصہ خوانی۔

لکھنؤ:۔ نگم اینڈ کو۔ امین آباد۔

[illegible] نیوز ایجنٹ۔

دھولیہ:۔ عبدالحئی ادیب انصاری، مکتبہ صدائے بازگشت

ٹھانکوٹ:۔ محمد نظیر خاں نیوز ایجنٹ۔

گوجرانوالہ:۔ نیشنل نیوز ایجنسی۔

کھنڈوہ:۔ حنفی نیوز ایجنسی۔ مالی کنواں

بھوپال:۔ حکمت اللہ صدیقی۔ صدر ڈاکخانہ جمعراتی۔

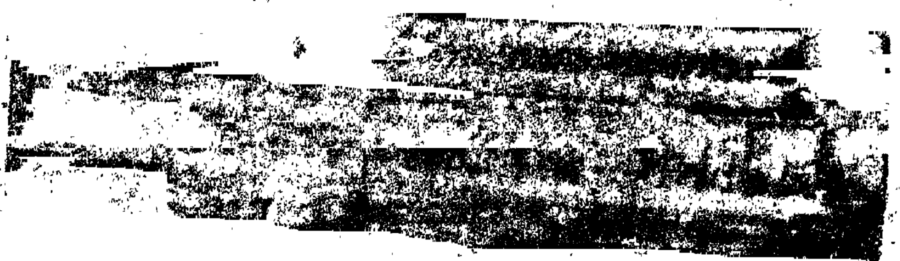
آئندہ پرچے کے

لکھنے والے

سیماب اکبرآبادی۔	ثاقب کانپوری۔
علی جواد زیدی	ابراہیم جلیس۔
مقبول حسین احمدپوری۔	نذیر میرزا برلاس۔
لطیف انور۔	ادا بدایونی۔
اسلم فاروقی۔	ڈاکٹر شہرت۔
وجدی الحسینی	نفیسہ اختر۔
رئیس امروہوی۔	ظفر الاسلام
سید فارغ بخاری	نازش پرتاپگڈھی
غلام ربانی تاباں	عنبر چغتائی۔
شہاب مالوی	اصغر انصاری وغیرہ

THE "AFKAR" MONTHLY
BHOPAL
MAY 1946 | No

شالیمار باغ کشمیر



جہاں وزارتی مشن نے ہندوستان کی آزادی کیلئے "سکون قلب" کے ساتھ غور کیا





افکار
The
MONTHLY
AFKAR
BHOPAL
8

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
(اقبالؒ)

ماہنامہ

افکار بھوپال

جولائی ۱۹۴۶ء

"بمبئی آفس"
۲۶۴ - بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸

نگراں :-
حکیم سید قیصر الحسن

ادارہ
کوثر چاندپوری
رشدی
صہبا لکھنوی

زر سالانہ ۶ر ششماہی ۳ر فی پرچہ ۸ر بیرون ہند سالانہ ۱۵ر

جلد نمبر (۲) — شمارہ نمبر (۵)

خیال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ

انکار کی چار اشاعتیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور وہ مقاصد واضح ہو چکے ہیں جو انکار کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں اب تک جس قسم کا ادب پیش کیا گیا ہے وہ آسانی سے اربابِ نقد و بصیرت کو ایک خاص فیصلہ تک پہنچا سکتا ہے۔ کم سے کم یہ تو اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انکار کے عزمِ بلند میں رجعت پسندانہ، بیمار اور مدقوق ادب کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر بھی کچھ لوگ انکار کے ادبی مواد پر نگاہِ تنقید ڈالے بغیر، مفروضات کے دھندلکوں سے وہ چیز مل ڈھونڈ لاتے ہیں جو اُن کے ضمیر کی تاریکیوں پر گواہ بن جاتی ہیں۔ اگر کوئی چیز سامنے نہ ہو تو اس کے متعلق قیاسات سے کام لیا جاسکتا ہے، لیکن ایک بدیہی امر کے متعلق اس کے نتائج اور باز اثر سے بحث کرتے وقت صرف انھیں حقائق سے گفتگو کی جاسکتی ہے جو ایک چیز کے وجود اور مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں، جس طرح نیت سے کام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح کام سے بھی انسان کے ضمیر اور اُس کے تمام گوشوں کو ٹٹولا جاسکتا ہے مگر اس کے لئے ایک بلند اور بیدار شعور کی ضرورت ہے۔

جولائی کا مہینہ ساون کی بہار آفریں لمحات کے دوش بدوش دلوں میں جذبات کا ایک ہنگامہ برپا کر رہا ہے، پپیہے کی دھڑکتے ہوئے سینے میں عشق و محبت کی وہ آگ سلگ چکی ہے جس نے اُسے ہندی لٹریچر میں ایک غیر فانی حیثیت عطا کر دی ہے، اسی طرح "آبشاروں" کے پُر کیف شور اور ان کی ترنم انگیز روانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ برسات جس کی گل دلفریبیاں جولائی سے ہی شروع ہوتی ہیں نہایت جذباتی اور خوشگوار موسم ہے۔ کم سے کم بھوپال کی حدود میں برسات کو ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں برسات بہار بن کر آتی ہے اور ویران فضاؤں کو دفعتاً کشمیر بناتی چلی جاتی ہے، ندی نالوں میں جوانی سیلاب اور طوفان بن کر دوڑنے لگتی ہے، پہاڑوں کی بلندیوں اور وادیوں کی مسطح پنہائیوں میں سبزہ زندگی بن کر رقص کرنے لگتا ہے اور دلوں میں وہ دھڑکنیں پیدا ہو جاتی ہیں جو شباب بہار یا بہارِ شباب ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ ایسے پُر لطف موسم میں جب آبشاروں میں جوانی انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور ان کی روانی یکسر ترنم اور موجیں سراپا نغمہ بنجاتی ہیں۔ آیئے اُن افسانوں میں بھی موسم کی اس دیوانگی کو ٹٹولیں جو ایک ادبی آبشار کی خاموش لہروں میں بہتے ہوئے آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ اس اشاعت میں پانچ افسانے شامل ہیں۔

(۱) خلیج، طفیل ملک کی تخلیقی فن کاریوں کا نمونہ ہے۔ کشمیر کی جنت میں قدم قدم پر بہت سے چلتے پھرتے دوزخ نظر آتے ہیں، ان کے سینوں میں انگارے دہکتے ہیں، تنفّس سے شعلے نکلتے ہیں، آنکھوں سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ دولتمند اس جنتِ ارضی میں تفریحی مقاصد کی تکمیل کے لئے جاتے ہیں اور ان چلتے پھرتے دوزخوں کو اور دہکا آتے ہیں، کوئی انھیں بجھانے کا عزم لیکر نہیں جاتا، ——— اور سچ یہ ہے کہ دولت اور سرمایہ پر جب ٹھیکہ کی حیثیت سے ایک ہی شخص کا قبضہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ دوزخوں کی تخلیق کر سکتی ہے انھیں بجھا نہیں سکتی، ——— وہ جو مزدوروں کی ہمدردی کے جذبات سینہ میں رکھتے ہیں عمل کے وقت یعنی جب مزدور کی محنت براہِ راست ان کے سرمایہ پر اثر انداز

ہوتی ہے، جذبات ہمدردی سے عاری ہو جاتے ہیں اور یہ دوزخ پھر دہکنے لگتے ہیں۔ کشمیر کی جنت اور دوزخ کے دونوں پہلو خلیج میں نمایاں ہیں۔

(۲) تاج محل تھا شاہجہاں پوری کا ندرت آفریں مختصر خاکہ ہے۔

(۳) جنگ نے ہندستان کو کیا دیا اور اس سے کیا چھین لیا؟ اس دلخراش اور دلدوز حقیقت کا ہلکا سا نقش تابش جاوید عزیز نے دکھایا ہے۔

(۴) خلاء میں دو حادثے ذہن و دماغ سے دوچار ہوتے ہیں ایک بڑھیا لاری سے دب کر مر جاتی ہے اور یہ حادثہ کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ پھر مرانڈا کی سائیکل تانگے سے ٹکرا جاتی ہے اور وہ اپنے خراشوں کی تکلیف احساس میں چھوڑ کر رخصت پر چلی جاتی ہے۔ یہ حادثہ دنیا میں ایک خلا پیدا کر دیتا ہے۔ . . . .

. . . .

(۵) یہ دنیا، شمس نوید کا چھوٹا سا افسانہ ہے اس میں ماضی و حال کا فرق دکھایا گیا ہے۔

———— • ————

"جائزے" میں اسلم فاروقی آفریدی کا "توریث" پر ایک عمدہ علمی مقالہ پیش کیا جا رہا ہے، اگرچہ مختصر ہے اور بعض مقامات پر پڑھنے والے کو کچھ تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے تاہم اسلم صاحب نے ایک ضروری اور اہم مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے — اس عنوان پر اردو کا دامن جدید علمی تحقیقات سے تقریباً خالی ہے۔ امید ہے کہ اسلم صاحب آئندہ بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے۔

جنت و دوزخ میں وحیدہ عزیز نے ڈینٹے کے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر ادبی روشنی ڈالی ہے، یہ کوئی مذہبی چیز نہیں، اس کو صرف ادبی حیثیت سے دیکھئے۔

———— • ————

اس بار "آبگینے" بہت وزنی ہیں، اگر ایک طرف اختر انصاری، مسعود اختر جمال، قتیل شفائی، یزدانی جالندھری، عزیز اختر وارثی، افسر سیمابی اور ساقی صدیقی جیسے مایۂ ناز نوجوان ترقی پسند فنکار اپنی تازہ ترین منظومات سے افکار کو زینت دے رہے ہیں تو دوسری طرف خان بہادر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، مولانا الم مظفر نگری، اختر ہوشیارپوری، اصغر شعری، اسد بھوپالی جیسے ملک کے سربرآوردہ اور مشہور شعراء اپنی بہترین غزلیات کے ساتھ شریک بزم ہیں۔

"ترانے" — مجموعہ ہے چند رومانی وارداتوں کا جن سے شاعر دوچار ہوا ہے۔

"عزم سفر" — زندگی کی صحیح اقدار کا واضح اور فنکارانہ تجزیہ ہے ؎

فکر بیدار ہوئی ذوقِ نظر جاگ اُٹھا ❊ جاگ اُٹھا آج مرا عزم سفر جاگ اُٹھا!

"چاندنی رات" — کے پس منظر میں کاروانِ حیات کی سیکڑوں آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔

"طلسم ایام" — حال سے بیزاری اور ماضی کے حسین لمحوں کی یاد کا ایک لطیف تصور ہے ؎

پھر وہی ہم ہوں، وہی رقص بہار ❊ ٹوٹ جائے یہ طلسم ایام!

"بھوکا ہندستان" — غلام آباد کے کروڑوں افراد کی موت و زیست کا واضح خاکہ ہے۔

"اپالو پر ایک شام" — گرد و پیش کی جانگداز تلخیوں کی واضح تفسیر ہے۔

"انگڑائی" — ایک حسین و دلکش نفسیاتی تحلیل ہے ؎

جیسے محراب حرم، جیسے نمود کہکشاں ❊ جیسے ماہِ نو کی طفلی اور زیرِ آسماں

(ادارہ)

مدوجزر

نوکر شاہی حکومت!

تین ماہ سے ہندستان میں سیاسی لیڈروں اور برطانوی وزارتی مشن اور وائسرائے کے درمیان جو سیاسی مذاکرات ہو رہے تھے وہ ختم ہو چکے ہیں۔ مشن نے طویل میعاد کے لئے جو اسکیم پیش کی تھی وہ کانگریس، مسلم لیگ اور ریاستوں نے قبول کر لی ہے۔ وائسرائے درمیانی عرصہ کے لئے جو عارضی حکومت بنانا چاہتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ جماعتی تنازعات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کی تازہ تشریحات کی بنا پر عارضی مشترکہ حکومت میں جس کی تجویز کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے وائسرائے اور مشن نے اپنی رائے کے مطابق پیش کی تھی شرکت منظور کر لی مگر کانگریس نے اس اسکیم کو مسترد کر دیا۔ کانگریس نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ عارضی حکومت میں مساوی نمائندگی کا اصول مان لیا گیا ہے اور بڑے فرقہ وارانہ مسائل میں مسلم لیگ کے ویٹو کو اہمیت دی گئی ہے اور کانگریس کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق نہیں دیا گیا ہے اس لئے وہ اسے منظور نہیں کر سکتی، کیونکہ اس طرح اس کی قومی حیثیت پر حرف آتا ہے۔ اگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر راضی ہو جاتی تو یقیناً ایک اچھی عارضی حکومت کی تشکیل عمل میں آ جاتی، ملک کو اس وقت مزدوروں کی بڑھتی ہوئی بے چینی کی وجہ سے شدید قسم کی ہڑتالوں کا خطرہ ہے، قحط کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، بعد جنگ کے زمانہ کے نازک اور اہم مسائل سامنے آ رہے ہیں، لاریب ان سب چیزوں کو صرف ایک ایسی ہی حکومت خوش اسلوبی سے طے کر سکتی ہے جس کو عوام کا اعتماد حاصل ہو، —— مگر کانگریس نے محض اپنی تمکنت اور ناسمجھی سے ایسا فیصلہ کیا جس کے باعث مرکز میں عارضی نمائندہ حکومت نہ بن سکی۔ چنانچہ وائسرائے نے عارضی حکومت کی اسکیم کو فی الحال ملتوی کر دیا ہے اور سرکاری افسران پر مشتمل ایک کام چلاؤ حکومت تشکیل دے لی ہے، کس قدر بے مقدرت ہیں ہندستانی! معلوم ہوا ہے، وائسرائے کچھ روز بعد پھر اس امر کی کوشش کریں گے کہ نمائندہ عارضی حکومت بنائی جائے اس عرصہ میں طویل المیعاد اسکیم کے مطابق نمائندہ اسمبلی کے انتخاب کا کام جاری رہیگا۔ تمام صوبوں میں نمائندے چننے کا کام شروع ہو چکا ہے جس سے ہندستان کی آزادی قریب تر ہو جائیگی!۔

امتیاز نسل و رنگ!

جنوبی افریقہ میں ملکیت اراضی اور نمائندگی کے قانون کے خلاف نیٹال انڈین کانگریس کے زیر اہتمام تحریک مقاومت مجہول کا آغاز کر دیا گیا ہے ۔ —— اسمٹس کی حکومت نے رنگ و نسل کی بنا پر ایشیائیوں کے خلاف جو نفرت انگیز قانون بنایا ہے اس کی ہر جگہ —— مذمت کیجا رہی ہے، دنیا اس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر جنوبی افریقہ آنکھیں بند کر کے ایسا وحشیانہ اور قابل نفریں اقدام کر رہا ہے جو انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما دھبہ ہے، ادارہ متحدہ اقوام کیا بھی ہندستان کے نمائندے سر راماسوامی مدالیار نے اس کی شکایت کی ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ برطانوی حکومت جنوبی افریقہ پر دباؤ ڈالکر یہ چیز ختم کرا دے، ورنہ اس کے نتائج بہت مہلک اور دور رس ہونگے، جنوبی افریقہ کی حکومت کو تدبر اور ہوشمندی سے کام لینا چاہئے، اسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندستانی بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے ہیں۔

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

جدائی

تصور

ایک ضمیر آزما جدائی ہے
شغلِ بچھڑنے کی بند ہیں راہیں
میں نے اس ماہرو کی گردن میں
ڈال دی ہیں خیال کی باہیں

—×—

ایک یاد

بیٹھے رہنا وہ اک سلیقے سے
سلسلہ دیر تک وہ باتوں کا
دل مجروں کو یاد ہے اب تک
سوز لندن کی سرد راتوں کا

—×—

ایک خواب

حسن کو بے حجاب دیکھا ہے
عشق کو کامیاب دیکھا ہے

اس کے زانو پہ میرا سر ہو اُف
کیسا جانسوز خواب دیکھا ہے!

—×—

گذشتہ رات

چاند کے پاس ایک ستارہ تھا
میں نے دیکھا تو اشک بہنے لگے

کوئی مجھ سا نہ ہو تمنائی
ایسی حسرت خدا کسی کو نہ دے

—×—

غم بہار

اجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو
غم کی محفل کو سجایا ہے ذرا دیکھو تو
چشمِ گریاں، دلِ پُرخوں، جگرِ زخم آلود
میں نے اک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو

اختر انصاری

عزمِ سفر

جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

رخصت اے عرشِ محبت کے حسین مہ پارو
رخصت اے فرشِ گلستاں کے بہک انگارو
اے مرے ہمدم و ہمراز۔ مرے غمخوارو
رات اب ختم ہوئی۔ نورِ سحر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

تیرہ خوابی کا فسوں ٹوٹ گیا آخرِ شب
پھر نسیمِ سحری لائی ہے پیغامِ طرب
جھوم اُٹھے ارض و سما۔ رند اُٹھے جام بلب
کھل اُٹھے پھول۔ ہر اک گل شجر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

ریشم و اطلس و دیبا میں چمن ہے ملبوس
فصلِ گل آئی ہے یا کھنچ گئی تصویرِ عروس
جل اُٹھے دل میں امیدوں کے ہزاروں فانوس
آج خاکسترِ ہستی سے شرر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا۔ آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

سُست رَو ابر نے پھر صاعقہ گامی سیکھی

ذرّۂ خاک نے پھر عرش مقامی سیکھی
کوکبِ زیست نے پھر حشر خرامی سیکھی
میری خوابیدہ تمنّا کا اثر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

راہ میں جس کی ہے بتخانۂ دل ۔ کعبۂ ناز
چھیڑ دیتی ہے جہاں فکرِ رسا وقت کا ساز
جس سے ہونے کو ہے اک منزلِ نو کا آغاز
آج وہ نقشِ سرِ راہگذر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

رقص فرما ہے صبا پھر چمنِ دل کی طرف
تہ نشیں موج خراماں ہوئی ساحل کی طرف
کارواں شوق کا بڑھنے لگا منزل کی طرف
نشۂ خواب سے ہر فردِ بشر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

علم کے نور سے روشن ہے عمل کی دُنیا
جگمگا اُٹھی ہر اک دشت و جبل کی دُنیا
جاوداں ہوگئی اسباب و علل کی دُنیا
فکر بیدار ہوئی ۔ ذوقِ نظر جاگ اُٹھا
جاگ اُٹھا آج مرا عزمِ سفر جاگ اُٹھا

مسعود اختر

غزل

آزاد ہو چکے ہیں غمِ ماسوا سے ہم
اپنا ہیں مدعا دلِ بے مدعا سے ہم

منزل سے آشنا ہیں نہ جذبِ رسا سے ہم
پامالیوں کی راہ میں ہیں نقشِ پا سے ہم

ہر چند کچھ نہیں ہیں مگر پھر بھی کچھ تو ہیں
عبرت فروشیٔ لبِ حسرت نوا سے ہم

کیونکر قرار آئے دلِ بیقرار کو
کیونکر گلے ملائیں اثر کو دعا سے ہم

کیسی خبر کہ جا کے پلٹتا نہیں خیال
اتنے رہے ہیں دور کسی بے وفا سے ہم

طاعت میں اور نیاز میں کچھ فرق چاہئے
لیتے ہیں کام ترکِ دعا کا دعا سے ہم

محکومِ آرزو و پشیمانِ آرزو
آفت میں پڑ گئے ہیں دلِ مبتلا سے ہم

ٹھکرائے جا رہے ہیں خود اپنے دیار میں
یہ ہے خطا کہ بھٹکے نہ راہِ وفا سے ہم

سرمایۂ حیات لٹاتے پئے حیات
مستانہ وار گزرے ہیں راہِ فنا سے ہم

مانندِ صبحِ گل کہ ہے آلودۂ بہار
ہیں ہمکنارِ نکہتِ دیر آشنا سے ہم

کیا کم ہے اشکِ تر جو پئے زینتِ گلو
شبنم کا تکمہ لائیں سحر کی قبا سے ہم

وہ دن گئے کہ یہ بھی تھا غیرت کو ناقبول
اب تم کو مانگتے ہیں دعا میں خدا سے ہم

جتنے حجابِ دیدہ و دل تھے سب اٹھ گئے
لیکن جھکے نہ سجدے میں فرطِ حیا سے ہم

آئینہ تیرے ناز کا اپنا نیاز ہے
آ، دیکھ، کیا ہوئے تری حسرت میں کیا سے ہم

حسن حیا سرشت ہے مائل نمود پر
یہ کس فضا میں آ گئے کیسی فضا سے ہم

لذت کشِ فغاں نہ ہوا ذوقِ غم اثر
مجبور ہو گئے دلِ ضبط آزما سے ہم

اثر لکھنوی

چاندنی رات

ندیم ! میری محبت کے رازدار ندیم — !

وہ ریگ زار پہ چاندی بچھا رہا ہے چاند
وہ کائنات کی نیندیں چرا رہا ہے چاند

ردائے نور میں لپٹے ہیں کوہسار ندیم
وہ چھاتی چٹانوں پہ ہے نکھار ندیم

ہوائے عطر فشاں نور میں نہانے لگی
رُخِ حیات سے غم کی نقاب اُٹھانے لگی

کلی کلی ہے مسرت سے ہمکنار ندیم
رواں ہیں چرخ پہ کرنوں کی آبشار ندیم

نقوشِ ماضیٔ مرحوم بھی اُبھرنے لگے
اُفق کے پاس وہی کارواں گذرنے لگے

چمک اُٹھے ہیں تخیل کے رہگذار ندیم — !

دل و دماغ پہ نشہ سا چھائے جاتا ہے
کوئی امید کا شانہ ہلائے جاتا ہے

قتیل شفائی

طلسمِ ایام

("خ" کے نام)

قت نے تیرِ جدائی پھینکا — میری اُمید کے پر ٹوٹ گئے
م کے یہ شعلہ بداماں لمحے — دل میں دنیائے الم کوٹ گئے

وح ہے آئینۂ رقصِ شرار — دلِ غمگیں میں رواں ہیں شعلے
ل پنہاں مِری شریانوں میں — اور آنکھوں سے رواں ہیں شعلے

ورِ صہبائے طرب ختم ہوا — مے سے خالی ہیں امیدوں کے ایاغ
حفلِ شوق ہوئی تیرہ و تار — بجھ گئے دل کی امنگوں کے چراغ

تجھ سے ملنے کی ہیں راہیں مسدود — دور ہوں تجھ سے بہت دور اے دوست
و محبت میں دھڑکتے ہوئے دل — آج ہیں ہجر سے مجبور اے دوست

کاش! خورشیدِ مسرت چمکے — ختم ہو جائے یہ دورِ آلام
پھر وہی ہم ہوں، وہی رقصِ بہار — ٹوٹ جائے یہ طلسمِ ایام

یزدانی جالندھری

غزل

دل کے ہاتھوں زندگی اک سوزِ پیہم ہو گئی
نغمۂ عشرت کی ہر لے سازِ ماتم ہو گئی

اک قیامت اور یادِ زلفِ برہم ہو گئی
کیا بلا یا رب درازیٔ شبِ غم ہو گئی

اب بھی ہے نا آشنا طرزِ فریبِ حسن سے
گو محبت رازدارِ ہر دو عالم ہو گئی

احترامِ حسن یوسف کی ضمانت تھی وہی
جو زلیخا کی خطا رسوائے عالم ہو گئی

آ گیا ہے کاروانِ عمر منزل کے قریب
اے مسافر اب تو تکلیفِ سفر کم ہو گئی

ایک شب کی دوستی کا اور کیا ہوتا مآل
صبح ہوتے ہی جدا پھولوں سے شبنم ہو گئی

اب نہ سازِ شمعِ محفل ہے نہ پروانوں کا سوز
مجلسِ غم مدتیں گذریں کہ برہم ہو گئی

کیوں نظامِ عالمِ ہستی میں پیدا ہے سکوں
ملتفت شاید نگاہِ حسنِ برہم ہو گئی

میرے ذوقِ مے پرستی کا تصرف دیکھئے
لب تک آئی جو پیالی ساغرِ جم ہو گئی

جب نہ رویا کوئی میت پر شہیدِ عشق کی
بیکسی آخر شریکِ بزمِ ماتم ہو گئی

اب کہاں گلشن میں وہ پہلے سی آئینِ کہن
اب تو شبنم بھی حریفِ چشمِ پُرنم ہو گئی

وقتِ پیری اب کہاں ہے وہ جوانی کی امنگ
موجِ طوفاں تا بہ ساحل آ کے خود کم ہو گئی

بزم میں پامالِ استغنا ہے پروانوں کی خاک
اے الم قدرِ محبت کس قدر کم ہو گئی

الم مظفر نگری

بھوکا ہندستان

ہر جانب سے آئی صدائیں، بھوکا ہندستان
بس میں نہیں انسانوں کے اب قحط کا یہ طوفان
پھوٹ پڑا یہ قحط کہاں سے تجھ میں ہندستان
بھوکا ہندستان

خودداری اب کر لے اپنی موت کا خود سامان
سود ملا کر بھی نہیں ہو سکتا پورا نقصان
ظاہر ہے میزان، ابھی سے فکر کرے انسان
بھوکا ہندستان

موت نے اب تو بربادی کی دنیا سے ہے گھیرا
لاکھوں ٹن کا اندازہ ہے کون کرے گا پورا
ہستی کے معمورے کا سب ختم ہوا سامان
بھوکا ہندستان

قحط کو روکا جا نہیں سکتا ہائے رے مجبوری
موت کو ٹوکا جا نہیں سکتا وائے رے معذوری
بے بس ہو کر ڈال رہا ہے اب ہتھیار انسان
بھوکا ہندستان

روپ دھار کے پڑوسی کا اب دنیا میں کال آیا
یعنی عالمگیر غذا کی قلت کا سال آیا
سوچ رہا ہے اس کا تدارک آج ہر اک انسان
بھوکا ہندستان

بے فکری کے جتنے تھے آثار ہوئے معدوم
جنت بن جاتی ہے دوزخ آج ہوا معلوم
آگ لگی کچھ ایسی چمن میں جل گیا سب سامان
بھوکا ہندستان

بھوکا ہندستان، کہ جو تھا دنیا کا رکھوالا
جس نے اپنوں کو ہی نہیں بیگانوں کو بھی پالا
ہائے آج وہی ہے اپنی بھوک سے خود حیران
بھوکا ہندستان

عزیز اختر وارثی

[illegible]

غزل

ہیں نے چاہا تھا کہ بجھ جائیں ان آنکھوں کے چراغ
جگمگا اُٹھے شبِ ہجر مگر سینے کے داغ

ل اگر یونہی چھلکتے رہے ساغرِ بزم
مل ہی جائیگا کبھی تیری نگاہوں کا سُراغ

بھی بیتے ہوئے لمحوں کو تو آواز نہ دے
اے غمِ عشق ٹھہر جا کہ پریشاں ہے دماغ

ج تک تیرگیٔ بزمِ تمنا نہ گئی
جانے کس لمحہ تم اُٹھے تھے جلانے کو چراغ

رہا عین دمِ گریہ بھی آئی ہے ہنسی
قلقلِ مینا سے جیسے متبسم ہوا ایاغ

ب کا مُرجھا چکا ہنگامۂ ہجراں کے طفیل
آج تم دیکھنے آئے ہو تمناؤں کا باغ

عشرتیں خون اگلتی رہیں میخانوں میں
اور ساقی لئے بیٹھا رہا ہاتھوں میں ایاغ

اختر ہوشیارپوری

"اپالو پر ایک شام"

اے اپالو! مری شاداب میدوں کے مزار
آج کیوں تیری فضاؤں میں چمکتے ہیں شرار؟
مسکراتے نہیں نورستہ کنول! کیوں آخر؟
(ہو گئی "نزہتِ مسرور" بھی محزون آخر!)

میں نے پتھر کے دِل، آہن کے جگر دیکھے ہیں
تیرے ساحل پہ بہت شمس و قمر دیکھے ہیں
لیکن انوار سے محروم ہیں یہ شمس و قمر
(وہ شجر، جن کی ہر اک شاخ ہے بے برگ و ثمر!)

کتنے طوفان ہیں بیتاب ترے سینے میں
کتنے جوہر ہیں درخشندہ اس آئینے میں!
تیرے دامن میں ہیں افلاس کے مارے کتنے!
تجھ پہ ٹوٹے ہیں ضیا بار ستارے کتنے!
کتنے منظر تری موجوں نے دکھائے ہیں مجھے!
کتنے عصمت کے جنازے نظر آئے ہیں مجھے!

جگمگاتے ہوئے شانوں کی نمائش کا جنوں
اُف یہ مغرب زدہ! ایوانِ فرنگی کے ستوں!
ذرّہ ذرّہ میں ہے اس عالمِ ناپاک کے، سانپ
رقص کرتے ہیں یہاں دولت و املاک کے سانپ
کار فرما ہے گرانی بھی، گراں جانی بھی،
حیف، صد حیف کہ بکتا ہے یہاں پانی بھی
ہیں فریبِ نظر و عقل یہ بجلی کے چراغ
میں سمجھتا ہوں اِنھیں سینۂ مزدور کے داغ
چھپ گیا ہے مری آنکھوں سے تماشائے حیات
ہے یہ افسردہ و مغموم تجلائے حیات
آہ! اِنسان کے قدموں پہ ہے انساں کی جبیں
کاش یہ پختہ عمارات ہوں پیوندِ زمیں۔

افسر سیمابی

لہ بمبئی کی مشہور بندرگاہ۔

غزل

یقینِ سوز ہوں میں، اعتماد ساز ہوں میں
حقیقتوں میں جو چھپ جائے وہ مجاز ہوں میں

یہ کون کہتا ہے ہستی سے بے نیاز ہوں میں
جہاں وہ خود ہیں حقیقت وہاں مجاز ہوں میں

مرے حضور ملائک ہوئے ہیں سر بسجود
مآلِ بندگی و حاصلِ نیاز ہوں میں

ترا خیال سلامت، مرا جنوں آباد
بس اب فضائے دو عالم سے بے نیاز ہوں میں

کسی کے سینہ میں جو منتقل کبھی نہ ہوا
ترے فسانہ کا ایسا لطیف راز ہوں میں

زمانہ مجھ کو سمجھنے کی کوششیں نہ کرے
جو خود ہیں راز ابھی تک انھیں کا راز ہوں میں

پہنچ ہی جاتا ہوں شعریؔ بغیر اذنِ جمال
ہنوز بے ادبِ نیاز گاہِ ناز ہوں میں

اصغر شعری

نگڑائی

شاخِ بیدِ لرزاں سرکش و رفعت بسر
بالائی مناظر جیسے پروازِ نظر ——— !

جیسے سیتا کی نگاہیں جیسے ارجن کی کمان
جیسے پانی میں ہو عکسِ موجۂ ابرِ رواں

زلفوں کے گھماؤ جیسے پگڈنڈی کے پیچ
انگڑائی سے چاکِ دامنِ مشرق بھی ہیچ

جیسے نیندوں کا تسلط عالمِ بیدار پر
جیسے لرزیدہ سے سائے ملگجی دیوار پر

حائل کر رہی ہو جیسے صورت دور کی
ظلمات میں جیسے لکیریں نور کی

جیسے شانوں کی بلندی جیسے سینوں کا اُبھار
رہ گذارِ کہکشاں پر جیسے تاروں کی قطار

ے محرابِ حرم جیسے نمودِ کہکشاں
ے ماہِ نو کی طفلی اور زیرِ آسماں

جیسے پستی کی بلندی جیسے رفعت کا کمال
مفلسی کی ٹھوکروں میں جیسے شاہوں کا جلال

مظہرِ اسرارِ فطرت اُن کی انگڑائی ہوئی
گلستانِ رنگ و بو میں ہے بہار آئی ہوئی

ساقی صدیقی

غزل

تغافلِ حسن سرگیں ہے، خلوص بھی آشکار سا ہے
ہر اک الم حاملِ خوشی ہے، ہر اک ستم خوشگوار سا ہے

جبیں پہ بکھرے ہیں کچھ ستارے حسین رخ پر نکھار سا ہے
تمہارا جود بہار لیکن، تمام عالم بہار سا ہے

مست مست سی ہے نفس نفس بادہ خوار سا ہے
تمہاری پہلی نظر کا اب تک حیات پر اک خمار سا ہے

جنوں بآغوشِ زندگی ہے، خیال میں انتشار سا ہے
پھڑک کے دامن وہ جا رہے ہیں نفس نفس بیقرار سا ہے

کمالِ وحشت میں ذکر ان کا، لبوں پہ بے اختیار سا ہے
ابھی خرد کا ہے کچھ تصرف، ابھی جنوں ہوشیار سا ہے

ستارے خاموش، چاند حیراں، ہوائیں بیتاب گل پریشاں
مری طرح جانے کیوں تمہارا ہر ایک کو انتظار سا ہے

خوشی کی ہلکی جھلک بھی پیدا نہ کر سکے اُنکے عہد و پیماں
ہنوز آئینۂ یقیں پر گماں کا دھندلا غبار سا ہے

میں اُنکے پیہم گریز کا بھی گریز ہی سے جواب دیتا
مگر مرے دل کہیں یہ سب ہی وفا کا کچھ کچھ وقار سا ہے

کچھ اس طرح ان کی یاد میں ہے غمِ جدائی سے مضطرب دل
کہ جیسے پچھلے پہر میں شب کے کوئی عبادت گزار سا ہے

ترا نظارہ ہے خاص نعمت، کسی کو میں کیوں شریک کر لوں
کسی کا کیا خود وجود اپنا مجھے یہاں ناگوار سا ہے

وقارِ خودداریٔ محبت بہر قدم پیش پیش لیکن
اسدؔ مجھے انکی برہمی کا بھی منتظر کچھ پیار سا ہے

اسد بھوپالی

آبشار

خلیج

تاج محل

زاویئے

خلاء

یہ دُنیا

ہر حقیقت ایک خاموش فسانہ ہے اور ہر فسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

طفیل ملک

خلیج

بلند و بالا پہاڑ کی ڈھلوان سے میں نے نیچے نگاہ دوڑائی ۔ بائی سرن کے میدان میں گھوڑا چرتا رہا تھا ۔ تلی ایک بڑے پتھر کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا ۔ اتنے فاصلے سے وہ بالکل ایک کھلونا سا دکھائی دے رہا تھا ۔ میرے سامنے پتھر ہی پتھر تھے ۔ چھوٹے بڑے مختلف شکلوں کے پتھر ٹلین جھیل اور میرے درمیان حائل تھے ۔ ان پتھروں پر سے ایک پر شور ندی پہاڑ کے دامن میں آکر گر رہا تھا ۔ اس کے کناروں پر سفید سرخ ، نیلے پیلے کاسنی پھول بے ترتیبی کے ساتھ لہرا رہے تھے قریب ہی ایک شیریں پانی کا چشمہ نغمے بلند کر رہا تھا ۔ موسم نہایت خوشگوار تھا ۔ ہوا میں نکھار اور تازگی تھی ۔ سبزہ جو جگہ جگہ اُگا ہوا تھا ، دلفریب اور نظر نواز تھا ۔ اس وقت جسمانی اور روحانی طور پر مجھ پر ایسی مسرت مسلط ہو گئی جو جانوروں کو ، پھدکنے کودنے اور پرندوں کو آسمان کی نیلی چھت کے نیچے چہچہانے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ اچانک میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے دونوں بازو اوپر اٹھاؤں ، پنجوں پر اچھلوں اور سر کے بل چھلانگ لگا دوں اور صبح کے چمکیلے ستارے کی طرح صاف ہوا کے جھونکوں میں سے گذرتا ہوا دھم سے نیچے میدان میں پہنچ جاؤں ۔ خوشی سے میں نے اپنا سینہ کھول دیا اور تازی اور پاکیزہ ہوا کے گھونٹ پینے لگا ۔ دنیا ایک خواب کی طرح تھی جواب اور کسی یونانی مجسمے کی طرح صاف اور حسین ہے اور زندگی کی خانہ بدوش کنواری کی پائل پر تھرکنے والی لے کی طرح پُر کیف ۔ کاش میں اس وقت نیلگوں آسمان کے نیچے ہری ہری نرم گھاس پر سر رکھ کر اس طرح فضا کے نشہ سے مست ہو کر لیٹ جاؤں کہ پھر کوئی مجھ کو اس دنیا کی دل شکن حقیقت میں کبھی بیدار نہ کر سکے ، کاش .... اے کاش ۔

میرے قدموں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چیل اور دیودار کے سوکھے پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا ۔ میں نے ان پر بیٹھ کر پھسلنے کی کوشش کی مگر میرا سر ساگون کے ایک درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل بچا ۔ اور میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا ۔ [illegible] گھاس اور سوکھے سڑے پتوں نے پگڈنڈی کے قریب قریب تمام نقوش چھپا رکھے تھے ، بار بار میرے پاؤں چھوٹے بڑے اڑتے ہوئے پتھروں پر سے پھسل پھسل کر مڑ مڑ جاتے ۔ آخر کار پھسلتا پھسلاتا میں نیچے میدان تک پہنچ گیا ۔

تلی مجھے دیکھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ۔ میرے پشتر کو اپنے کندھوں پر ڈال کر گھوڑے کو میرے قریب لا کر بولا " لیجئے صاحب " !

میں پھرتی سے ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہو گیا اور وہ گھوڑے کے سموں کی ٹاپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا ۔ [illegible] تلی کشمیر مسلم ہوٹل کے بالمقابل رہتا تھا ، ہر روز شام کو سرمئی دھندلکوں میں وہ اپنی جھونپڑی میں جو پہاڑ کی ڈھلوان میں سفیدے کے دو مضبوط درختوں کے سائے تلے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی ، واپس آتا ۔ میں [illegible] ہمیشہ آتے ہی دیکھتا ، جاتے کسی دن بھی نہیں دیکھا ۔ خدا جانے کب صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا [illegible] ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اس کا سایہ پھیل جاتا اور ہوٹل کی کھڑکی میں سے [illegible]

گذشتہ رات میں نے اس سے کہدیا تھا " میرا ارادہ کل ٹلیاں جانے کا ہے [illegible] ٹلیاں ، سات میل جانا اور سات میل آنا ، چودہ میل کا پہاڑی [illegible]

جیپال

...محنت صرف بارہ (۱۲) آنے۔

وقت کاٹنے کے لئے میں نے اس سے پوچھا "آجکل کیا کما لیتے ہو؟"

"کما لیتا ہوں صاحب" وہ گھوڑے کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے بولا "بس یہی کوئی بارہ چودہ آنے"

"تمہارا گھر کہاں ہے"

"یہاں سے بیس کوس پر ایک گاؤں ہے، پلاندری"

"بال بچے"

"ایک لڑکا، تین لڑکیاں اور ایک گھر والی، پھر لڑکا ہر وقت بیمار رہتا ہے۔ جب موسم بدلتا ہے اور نیچے میدانوں سے لوگ یہاں سیر کے لئے آنا شروع ہو جاتے ہیں، میں اپنی تین لڑکیوں ایک بیمار لڑکے اور گھر والی کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگم بھاگ آ جاتا ہوں، یہاں سارا سارا دن گھوڑے کے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں۔ یہ بڑا کٹھن کام ہے، لیکن پیٹ کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ صاحب میں بیمار بچے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں"

"دیکھو" میں نے برائے نام ہمدردی جتلانی شروع کی "میں چند دنوں تک یہیں ٹھہروں گا، اگر تمہیں کوئی ضرورت پڑ جائے یا پلاندری سے ایسی ویسی چٹھی ہی آ جائے تو مجھے خبر دینا، ممکن ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں" اور وہ بیچارہ خوش ہو گیا اس کے پژمردہ اداس شام کی طرح بے کیف چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی تہہ ابھر آئی۔

"بہت اچھا صاحب"

اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کے ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے پر پھیلی ہوئی پتلی سی مسکراہٹ میں تلخی ہے، زہر ہے مگر میں ایک فاتح کے انداز میں مسکراتا ہوا اس قلی پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بعض لوگ انسانی بھیس میں فرشتے بھی ہوتے ہیں، اچھے طبقے کے لوگوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے، چنانچہ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پرجوش آواز میں کہا "اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، کیا ہم دونوں انسان نہیں ہیں، اگر میں زیادہ خوش قسمت ہوں تو .... یہ بارہ آنے گھوڑے کی اور اپنی مزدوری، اور چار آنے .... ناگہاں میرے چہرے پر ہمدردی سے بھرپور جھوٹا وقار اور جھوٹی مسکراہٹ پھیل گئی ...... ازلی بھوکا، چودہ میل کے صرف بارہ آنے اور چار آنے بخشش، سالا، اپنی ہمدردی جتلا رہا ہے۔

ایک روپیہ کا نوٹ وہ اپنی کھدر کی میلی شلوار کے نیفے میں گھرستے ہوئے بولا "صبح سے شام تک موٹروں کے اڈے کے ... گھوڑا لیکر آنے جانے والے لوگوں کا مونہہ تکتے وقت میرے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ جو آتا ہے مجھے ڈھونڈنے ... جیسے میری روزی کھنچی چلی آ رہی ہو اور کسی کا جو نے گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے گھوڑا لے لیا تو روٹی کھالی ورنہ یوں ہی سو رہا ... صاحب یہ سچ ہے کہ اس گھوڑے نے مجھے بھوکا کبھی نہیں رکھا۔ مجھے اس سے محبت ہے، اس قدر محبت ہے کہ اگر روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ بھی مل جائے اور وہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہو چکا ہے، جب بھی میں اسے نہ چھوڑوں، یہ میرا پیشہ ہے، میرا باپ بھی گھوڑا لئے پھرتا تھا اور دادا بھی، میرا بچہ ہر وقت بیمار رہتا ہے وہ اس پیشہ کو کیسے نبھا سکیگا۔ یہ ... جاتا، جب کبھی مجھے اپنا ناتواں بچہ یاد آتا ہے میں اس گھوڑے سے لپٹ جاتا ہوں اور اسے بے اختیار ہو کر چوم ... یہ گھوڑا میرے بچوں کی روزی کا وسیلہ ہے، بے زبان کسی وقت بھی تھکا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ نہایت وفادار ... مزدوری کا سہارا سب کچھ یہی ہے، میرے ہاں صبح و شام چھ آدمی کھانے والے ہیں اور یہ کچھ عجیب سی بات ہے ... کمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر اچھی واقع ہوا ہوں" میں نے دیکھا اس کے چہرے سے بے چینی اور بھوک کے آثار ...

"عرض ہے، اگر آپ کو کبھی گھوڑے کی ضرورت پڑے تو ...... جیسے لاکھوں التجائیں اور فریادیں کسی تاریک سرنگ میں گھٹنے سے ابھر کر پھر ڈوب جائیں۔ قلی کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کے ماتھے اور ہونٹوں پر پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں چمک اٹھیں، سینہ پھول گیا اور وہ زور سے اوپر نیچے ہونے لگا۔ جب میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر بات کا رخ بدل دیا "جناب یہ مغل راستہ ہے۔" پہاڑوں کے سینوں کو چیرتا ہوا ایک تنگ سا راستہ صنوبر کے ایک جھنڈ میں جا کر کہیں گم ہو گیا تھا۔

"مغل بادشاہ اس راستے سے کشمیر آتے تھے، بڑے بوڑھوں سے سنا ہے، ان دنوں بہت چہل پہل تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا، اب تو کوئی چیز مہنگی ہو جاتی ہے، ہر طرف ایک شور مچ جاتا ہے، بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصلیں تباہ ہو گئی تھیں، مغل بادشاہ بھی کیا لوگ تھے، جب فصلیں سوکھ جاتیں تو بادشاہ سلامت سارے سال کا لگان معاف کر دیتے، یہ اسی زمانہ کی ایک یادگار ہے۔"

میں نے دیکھا مغلوں کی ایک شکستہ عمارت اپنی چند قدیم دیواروں کے ساتھ اپنے بنانے والوں کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔ شکستہ کمرے، تہہ خانوں کو جاتے ہوئے غیر آباد راستے، اچانک مجھے ایک دیوار کے پیچھے سے بڑی عجیب و غریب سی مبہم انسانی شکل دکھائی دی، وہ ایک بڈھے بیل کی طرح دبلا اور سوکھا انسان تھا۔ درمیانہ قد، لاغر، نیم مردہ جسم، بےنور آنکھیں، اور چہرہ اس انسان کا سا جس کی زندگی بہت تلخ گذری ہو۔ میں نے دل میں کہا "یہ کون ہے اس کی زندگی کس قسم کی ہو گی اور کیوں اس شکستہ عمارت میں تنہا پھر رہا ہے"

"کیا تم بھیک مانگتے ہو" میری اجنبی بارعب آواز پہاڑوں میں گونج اٹھی وہ بیچارہ سہم گیا اور مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو، اس کے چہرے پر ایسی وحشت چھائی ہوئی تھی کہ وہ انسان کم اور حیوان زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک درخت پر بیٹھے ہوئے چند کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے اڑے اور عمارت کے ایک کونے میں جا چھپے، بڈھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کی نگاہوں میں ایک قسم کی بھیانک افسردگی عیاں تھی، وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر صرف کھال اور ابھری ہوئی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنے میلے لباس میں وہ ایک ایسے مردہ کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو کفن پہنے ہوئے قبر میں سے کھڑا ہو گیا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ انسان بھوکا ہے، ننگا ہے اور مصیبت زدہ ہے، اس کے چہرے پر ایک احتجاج ہے، محرومی ہے اور نامرادی ہے، اس کی آنکھوں میں دکھ، درد، تکلیف اور کبھی ختم نہ ہونے والے آنسو ہیں، اس کی روح بھوکی ہے، جسم بھوکا ہے، وہ خود بھوکا ہے اور میں نے یہ کہہ کر اس انسان پر حملہ کیا ہے جو نہتا ہے، جو بے بس ہے جس کے پیشے کے ذمہ دار ہم خود ہیں، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے۔ وہ کون شخص ہو گا جو اچھی طرح زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا، آخر اسے کیا غرض ہے کہ وہ بھیک مانگتا پھرے، شاید یہ ایک آنے والے زمانہ کی امید پر زندہ ہے۔ وہ نیا زمانہ جب صدیوں کی بھوک مٹ جائیگی جب بیکاری مٹ جائیگی، جب گداگری مٹ جائیگی، جب دنیا میں انسانیت کا راج ہو گا، جب ایک نئی زندگی کی پہلی کرن طلوع ہو گی۔ یہ تھکا ہارا زمانے کے ہاتھوں بیدردی سے ستایا ہوا چپ چاپ انسان، چودہ میل کی پہاڑی مسافت صرف بارہ آنے میں طے کرنیوالا قلی اور گھوڑے، سب اس عمارت ہی کی طرح شکستہ حال بھوکے ننگے ہیں۔

———•———

میں نے گھوم کر دیکھا پہاڑوں کے دامن میں لیٹی ہوئی وادی میرے سامنے آ گئی جو جنگلوں کے پیچھے چھپے ہوئے سرسبز کھیتوں کے جھنڈوں میں حد نگاہ تک اپنی پڑی تھی، چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں چمکتے ہوئے ٹین اور چوکور سلیٹی پتھر کی چھتوں والے مکانوں کے سامنے موٹر سڑک جو پہلگام سے سری نگر کی طرف جاتی ہے دور دیہ شمشاد کے خوبصورت پیڑوں سے گھری ہوئی تھی اس سڑک پر سیاح لوگ گھوڑوں پر سوار نظر آ رہے تھے، ان کے پیچھے پیچھے پیدل زنگت والے کشمیری ہاتو ہانپتے ہوئے

[illegible] کسی کے ہاتھ میں ڈگری تھی کسی کے ہاتھ میں پیشہ ور کسی کے ہاتھ میں تھرموس، کچھ فاصلے پہ ایک مزدور [illegible] سب [illegible] آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کی نرم ہنسیاں دھان کے کھیتوں کے بیچ [illegible] جیسے [illegible] کھیتوں کے کنارے جہاں کہیں پانی کھڑا یا چلتا پھرتا تھم سا گیا تھا، وہاں کنول کھلے ہوئے تھے۔ کہیں [illegible] کے نیچے [illegible] بھیڑیں چرا رہے تھے، دوسری طرف سفید بادلوں کی گیلی ہوئی تہیں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے بڑے بڑے کپڑے کے تھان کھولے اور لپیٹے جا رہے ہیں۔

شام کے وقت جب سورج ایک اداس سی پیلی روشنی پھینکنے لگا اور قریبی ڈھلانوں پر سبز رنگ کے پس منظر میں ایک سرخی پھیلنے لگی تو میں ہوٹل میں واپس پہنچ گیا۔ اس وقت ہوٹل کے سامنے ایک امیرآدمی ایک مزدور سے جھگڑ رہا تھا۔ اس سے ایک بھاری بھرکم ٹرنک اور ایک بستر اٹھا کر لایا تھا، مزدور چلا رہا تھا، دو کوس تک تو دہرا ہو کر چلا آیا ہوں، اور آپ ایک آنہ دیتے ہیں، کیا یہی انصاف ہے، میں کہتا ہوں یہ آنہ تھوڑا ہے ۔ ــــــــــــ

ہوٹل میں کھانا کھا کر میں آرام کرسی پر چند لمحوں کے لئے ستانے کی غرض سے سگریٹ سلگا کر آنکھیں بند کر کے ذہن پر [illegible] کمرے کے ٹکڑوں میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا، حامد اور رشید دونوں دوست بیٹھے ہوئے حسب معمول دن بھر کی باتوں پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے، حامد ایک نوجوان دراز قد دبلا پتلا، عمر تقریباً پچیس برس، سیاسی اقتصادیات کا طالب علم ہے۔ رشید ابتدائے جوانی میں نزلہ کا شکار ہو گیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر وہ قبل از وقت بوڑھا دکھائی دیتا ہے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں، ہر وقت پریشان حال، فکر مند ہمیشہ الم و یاس کے فلسفہ کا مطالعہ کرتا رہتا۔ زندگی میں اونچے نیچے نشیب و فراز ہیں اور یہ زندگی ایک دورا ہے، ایک المیہ ہے، یہ ہے وہ ہے۔

"یہاں کا حسن مردہ ہے، یہاں کا شباب عنقا ہے اور یہاں کی زندگی جامد ہے۔ یہاں کے مکینوں کے رنگ زرد ہو کر جھلس جاتے ہیں۔ آنکھوں میں اداسی اور ہونٹوں پر گدلا پن آ جاتا ہے، ان لوگوں کی زندگی میں نہ کوئی عشرت ہے نہ کوئی کیف، یہاں کی دنیا، یہاں کا آسمان، یہاں کا سورج، چاند اور ستارے سب ویران ہیں حتیٰ کہ زندگی بھی۔ میرے کہنے کا مطلب فقط یہ ہے کہ آخر کیوں بعض لوگوں کی زندگی بیکار اور بے لطف بنا دی جاتی ہے" حامد نے نہایت متانت کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے رشید کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

"تم شاید اشتراکی خیالات کے حامی ہو، تم سنگلاخ سڑکوں پر گھوڑوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے قلیوں اور دو دو اڑھائی من اسباب اپنی پیٹھ پر اٹھانے والے مزدوروں کے تھکے تھکے پاؤں اور دھندلی دھندلی آنکھیں دیکھ کر موجودہ سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور بورژوا نظام کے خلاف اتنی گہری گہری باتیں سوچ سکتے ہو مگر خشک پتوں پر گرتی ہوئی بوندوں کے ترنم کا احساس نہیں کر سکتے" رشید کا سر کندھوں میں ڈھلک گیا۔ وہ اپنی ناک پر سے آہستہ سے عینک اتار کر اس کے شیشوں کو رومال سے صاف کرنے لگا اور اس کے چہرے پر موٹی سرخ ڈوروں بھری آنکھیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔

"جی ہاں میں اشتراکی خیالات رکھتا ہوں، میں ہندستان کا لینن بننا چاہتا ہوں، سامراجی مشین کا پرزہ بننے کو میں تیار نہیں" حامد نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"میرے دوست دراصل نہ اشتراکیت کوئی چیز ہے نہ رومانیت، خیالات ضرور ماحول کے پابند ہوتے ہیں"

"تو پھر کیوں نہ زمانہ میں ہزاروں برس پیچھے ان بے حس انسانوں کے جسموں میں گرمی پہنچائی جائے، غیظ و غضب کی آگ بھڑکائی جائے، بغاوت کی روح پھونک دی جائے"

"لیکن میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں" رشید نے نہایت سنجیدگی سے کہا "تم اس معاملہ میں کچھ بھی نہ کر سکو گے۔

پر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عملی دنیا میں تم بزدل اور نکمے ہو۔ ماں کے چند آنسو اور باپ کی ایک ہونہہ نے تمہارے ارادوں کو تہہ و بالا کر دیئے تھے تم میں اتنی تو ہمت نہیں تھی کہ اپنی محبت کے تحفظ کے لئے ماں باپ کی مرضی کے خلاف ڈٹ جاتے، تم ماں باپ کے سامنے مجبور ہو کر رہ گئے، کیوں ٹھیک ہے نا؟ کتنے انسان ہیں جو وطن کی غلامی اور بیچارگی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں مگر بس سوچ کر رہ جاتے ہیں اور پھر ـــ کوئی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے کوئی فلم کمپنی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور کوئی دفتروں کی [illegible]

"ہاں .... نہیں" ایک اٹکتی ہوئی آواز میرے منہ سے نکل کر کمرے کے شور و شغب میں ڈوب گئی۔ نچلی منزل میں ہوٹل سے تیز مسلسل آواز گونج رہی تھی، شاہی ٹکڑا، قورمہ ایک پلیٹ، پلاؤ ایک پلیٹ، مرغ ہاف پلیٹ، آیا صاحب، جی صاحب، لایا صاحب اتنے میں سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پر سے کوئی پکارا "مبارکباد، پورے اکیس دن کے صبر آزما انتظار کے بعد آج خط آیا ہے"

"خدا کرے اب ہر روز آیا کرے، ہم کنواروں کے لئے یہی تو ایک دل بہلاوا ہے"

"کیا لکھا ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو"

"بس غضب ہی غضب ہے"

"ہمیں بتاؤ تو سہی یار ہم ایسے ہی مر جائیں گے"

"کیا بات ہے؟" کوئی نئی آواز ابھر کر چھت کی کڑیوں میں گم ہو گئی۔

"کچھ نہیں"

"جو بات ہے خدا کی قسم لاجواب ہے"

آہستہ آہستہ ان آوازوں میں تصنع اور الفاظ میں بازاری پن پیدا ہوتا گیا۔ اور یکدم شور و غل برپا ہو گیا۔ دھڑ دھڑا دھڑ دھڑام، بیچارے کنوارے، اور کسی نے بڑے آرام کے ساتھ ایک گالی ٹانک دی، پھر عجیب عجیب گالیاں، طرح طرح کی آوازیں گندے گندے چٹکلے، ہائے اوہائے اور حسینہ، ریحانہ اور جمیلہ کے نعرے گونج اٹھے۔ ہی ہی، ہا ہا، ہو ہو۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جانے لگے۔ پھر بیرے کی آواز کی نقلیں اتاری جانے لگیں "جی صاحب، آیا صاحب، پلاؤ ہاف پلیٹ، قورمہ ایک پلیٹ، مرغ ایک پلیٹ، جی صاحب، آیا صاحب" بارش ہو رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ بارش کے ساتھ ہی تاریکی بھی سیاہ راکھ کی طرح زمین پر گرتی اور چھائی جا رہی ہے، ہوا میں تکلیف دہ خنکی پیدا ہو چکی تھی، شام کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ افسردہ معلوم ہوتے تھے، تھوڑے مکانوں کے روشندانوں میں سے امنڈتی ہوئی روشنی بھی افسردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ سامنے درختوں کے سائے تلے کی جھونپڑی میں چراغ کی کانپتی ہوئی مدھم اداس لو میں ایک انسانی سایہ حرکت کر رہا تھا۔

دوسرے روز کی بات ہے۔ میں پلاٹون نمبر ۱ میں اپنے چند احباب سے ملکر ہوسٹل واپس آ رہا تھا کہ کشمیر مسلم بیکری کے سامنے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان معاً مجھے آشنا سی آواز سنائی دی، جیسے کوئی چیخ چیخ کر مجھے مدد کے لئے بلا رہا ہو، میں نے نہایت غور سے دیکھا لوگوں کی بھیڑ میں حامد کی شخصیت نمایاں تھی، پاس ہی وہی گھوڑے والا تھا جس کے چہرے پر بیچارگی اور بے بسی ٹپک رہی تھی لوگوں سے فریاد کر رہا تھا کہ ان صاحب نے مقررشدہ اجرت سے کم پیسے دیئے ہیں، صبح سے میں ان کے ساتھ ساتھ گھوڑے کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا ہوں اور یہ مجھے آٹھ آنے دے رہے ہیں صرف آٹھ آنے۔

ہجوم سے دو تین گز کے فاصلہ پر مجھے وہ دبلا اور سوکھا بڈھا دکھائی دیا، انسان کم اور حیوان زیادہ اور چند لمحوں کے لئے شکستہ عمارت میری نگاہوں کے سامنے آ گئی اس بڈھے کے بے کشش چہرے پر موٹی موٹی جھریاں زمین پر ہل چلنے کے بعد بن جانیوالی

نالیوں کی طرح کچھ گہری ہو ہو کر نہایت تیزی کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھیں، دفعتاً تلی کی سی پیلی پیلی چپ چاپ آنکھیں بے ترتیب ہجوم کو چیرتی ہوئی میرے چہرے پر آکر جم گئیں، وہ جگر سوز نگاہیں جیسے کسی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو، میرے دھڑکتے ہوئے دل پر ایک انگارا پھینک دیا ہو، مجھے اپنے خون میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں مفلوج و ساکت سا ہو گیا، جامد، مبہوت، میں آنکھیں بند کرنے کی بیہودہ کوشش کرنے لگا۔

موٹر کے اڈے کے قریب ایک نیلی دھاری دار سوٹ میں ملبوس نوجوان کے سامنے ایک نیم برہنہ ٹانگوں اور ننگے پاؤں والا انسان کہہ رہا تھا "اتنے سامان کا صرف ایک آنہ صاحب"

"اور کیا لوگے ایک روپیہ"

"صاحب غریب آدمی ہیں"

"اچھا اچھا ہم تو یہی دیں گے، لینا ہے تو لو ورنہ مت کرو"

اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سرمئی سا دھندلکا آسمان سے اتر کر پہاڑوں کی گود میں گھس گیا اور یہ لامحدود دھندلکا چرخے دیوتا کے پاٹ کی طرح ہر آن، ہر لحظہ پھیلتا ہی چلا گیا، تلی، زرد اور فرط غم سے گرا ہوا چہرہ، اس کی روزی کا وسیلہ بے زبان گھوڑا، ہمارا ہندوستان کا لیمن، مستقبل کی امید، ہجوم، وہ چپ چاپ دبلا انسان، مغلیہ خاندان کی عمارت کا تصور، نیلی دھاری دار سوٹ، اور مزدور، سب اس کی پیپٹ میں آکر میری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئے، ہوا سرد و یخ بستہ تھی، میں نے کوٹ کے کالر کو ٹھیک کیا، نکٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان جو سدراہ، خلیج حائل ہے وہ روز بروز وسیع کیوں ہوتی جا رہی ہے۔

فدا شاہجہاں پوری

تاج محل

تاج محل چودھویں کی مدھم چاندنی میں اپنی تمام شان و شوکت، عظمت و زیبائش کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے میناروں سے طلائی کرنیں اور صحن میں نقرئی قہقہے بکھر رہے تھے۔

مریضہ نے کروٹ بدل کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس کے پپڑیلے ہونٹ ہلے اور اندھیرے جھونپڑے میں ایک مدھم آواز لہرائی: "تاج ..... میرے سرتاج! ...... کہاں .... ہو ...... تم؟"

کوئی جواب نہ ملنے پر وہ پھر بولی "تا..... ج ..... " اس پر غنودگی طاری ہو گئی، دیاسلائی گھسنے کی سرسراہٹ ہوئی اور دھیمی سی زرد روشنی جھونپڑے میں پھیل گئی، وہ آگے بڑھا —— کھری اور ٹوٹی ہوئی کھاٹ کے پاس پہنچ کر مریضہ کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر جھکتے ہوئے پکارا "ممتاز .... ممتاز..... " جواب ندارد۔

اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا "میں آگیا ہوں ممتاز! تمہارا تاج —— تمہارا اپنا شاہجہاں!"

مریضہ نے دھیرے دھیرے پلکیں اوپر اٹھائیں، آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی، لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک مری ہوئی سی آواز تھرتھرائی "تاج ..... میرے ..... شاہجہاں ..... تم ..... آگئے ..... مگر تا .... تاج محل؟" گلا خشک ہو گیا۔

وہ پیچھے مڑا، کونے میں پڑے ہوئے مونگر ٹوٹے گھڑے سے ٹوٹے پیالہ میں پانی کے آخری قطرے ٹپکائے اور پیالہ مریضہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سفید ہونٹ ہلے "تاج محل .... کہاں ہے، ہمارا تاج محل، بنا نہیں ابھی تک؟"

اس نے مریضہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاکر محبت بھرے لہجہ میں کہا "بن چکا ہے میری ممتاز! دیکھو، ادھر دیکھو..... وہ ہے ہمارا تاج محل!"

مریضہ کی پتلیاں گردش میں آئیں، اس نے دیکھا، تاج محل —— کچی دیوار پر سفید کھریا سے بنا ہوا تاج محل —— خشک اور طنزیہ مسکراہٹ، چراغ کی زرد اور مدھم روشنی میں جذب کر رہا ہے، اس کی مینار نما لکیریں اور صحن نما ٹوٹی لگی ہوئی دیواریں ہر طرف حسرت و یاس بکھیر رہی ہیں۔ تاج محل سے نظریں ہٹاتے ہوئے وہ بولی "کیوں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہو جی؟ ... بھلا یہ تصویری تاج محل ہمارے کس کام کا؟ اس میں تو مکھیاں ہی رہ سکتی ہیں، آدمی نہیں، ہم کوئی .... مکھ .... " غنودگی پھر طاری ہو گئی۔

وہ سوچنے لگا۔ مکھیاں؟ —— ہم کوئی مکھیاں ہیں؟ پگلی کہیں کی۔ تو کیا جانے کہ ہم لوگ بھی مکھیوں سے کم نہیں، عام مکھیاں نہ سہی، شہد کی سہی! آخر ہیں تو مکھیاں ہی! وہ دن رات —— ایک کر کے دور دور کے چکر لگا کر، پھولوں کے رس چوس کر شہد جمع کرتی ہیں —— میٹھا اور مزیدار شہد! مگر جب ان کی محنت کا پھل، ان کی زندگی کا حاصل شہد، جمع ہو چکتا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ سر توڑ محنت کے بعد کچھ دنوں آرام سے بیٹھ کر اپنی زندگی کی پونجی کام میں لائیں تو کوئی نہ کوئی انسان، انسان نہیں بلکہ دو پیروں کا ظالم حیوان آکر ان کی ناک میں زہریلا دھواں چھوڑ دیتا ہے، ان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لئے وہ مجبوراً اپنی پونجی کی حفاظت سے ہاتھ اٹھا لیتی ہیں، بے رحم اور جلاد صفت آدمی ان کی دولت ہی پر نہیں بلکہ ان کے گھروں پر بھی قبضہ جما لیتا ہے —— وہ بیچاری یہ سب کچھ دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر سکتیں کیوں کہ وہ [illegible]

اُن کی تمام تمنائیں ملیا میٹ کر کے رکھ دیتا ہے اور...... اور......

ہوا کا ایک جھونکا آیا، چراغ کی لو تھرتھرا کر خاموش ہوگئی، جھونپڑے میں مچھروں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی، اس نے جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی، جس میں صرف ایک سلائی باقی رہ گئی تھی۔ ایک سرسراہٹ ہوئی اور چراغ کی لو پھر تھرتھرانے لگی، اس کے کان پر بیٹھے ہوئے مچھر نے ایک باریک سی سوئی چبھوئی اور "پیں پیں" کرتا ہوا اُڑ گیا۔ اُس نے "تاج محل" کی طرف دیکھا، اُس کے صحن میں ساتھ تین چار مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔!

وہ پھر سوچنے لگا —— مکھیاں ؟۔ یہ مکھیاں آدمی کو موت کے گھاٹ بھی تو اتار دیتی ہیں۔ شاید شہد کی مکھیوں کا انتقام لینے کے لئے ایسا کرتی ہیں، وہ شہد کی ہیں تو کیا ہوا؟ آخر ہیں تو مکھیاں! مگر وہ بھی تو بپھر جاتی ہیں۔ کہتے ہیں جب وہ بپھرتی ہیں تو ان سے دشمن کے لئے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" والا معاملہ ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ پانی میں غوطہ لگانے کے باوجود اس سے خلاصی نہیں ہوتی جب بھی سر پانی سے نکلتا ہے، اوپر منڈلاتی ہوئی مکھیاں اپنے تیز ڈنک چبھو دیتی ہیں، وہ تلملا ہی تو اُٹھتا ہے اور کچھ دیر بعد سوجن اس کا علیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے —— تو پھر یہ غریب مزدور انسان نما مکھیاں —— اپنی پونجی خاموشی سے دھنوان لوں کی نذر کیوں کر دیتے ہیں ؟۔ گھر لٹتا اور جلتا دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ مکھیوں سے بھی گئے گذرے ہیں؟ کیا ان میں حیوانوں جتنا بھی احساس کا مادہ نہیں؟ کیا ان کا انتقامی جذبہ کبھی بیدار نہ ہوگا؟ یونہی ظلم وستم سہتے رہیں گے! آخر یہ ظلم و مظلومیت اور ظالم ومظلوم کا تباہ کن نظام کب تک؟ اب بولتی ہوئی مکھیوں کو زردار کی چھوٹی تسلیوں اور مہربانی کی صورت میں ظاہر ہونے والے زہریلے دھوئیں کا احساس کب تک نہ ہوگا ؟......

ایک مکھی کی زور سے بھنبھنانے کی آواز آئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا، کونے میں تنے ہوئے مکڑی کے جالے میں ایک مکھی پھنسی ہوئی تھی۔ مکڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور مکھی چلا رہی تھی گویا اپنی ہم جنسوں کو مدد کے لئے پکار رہی ہو مگر "تاج محل" کے صحن میں کسی مکھی کا نام تک نہ تھا، مکڑی قریب آگئی، پھنسی ہوئی مکھی نے آزاد ہونے کے لئے آخری زور لگایا اور دوسرے ہی لمحے وہ مکڑی کی قید سے آزاد تھی اُس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا —— "شاباش!"

"کیا ہوا؟..... کیا تاج محل چلنے کا انتظام ہوگیا؟" مریضہ کی کمزور سی آواز سنائی دی، اُس نے گھوم کر دیکھا وہ مسکراتے ہوئے اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی —— آگے بڑھ کر وہ بولا۔

"ہاں ممتاز! ہم کل ہی تاج محل چلیں گے......"

"سچ؟" بیہوشی پھر طاری ہوگئی۔

مریضہ کا جسم گودڑی سے اچھی طرح ڈھانپ کر، دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

خیالات کی ندی پھر بہنے لگی۔ جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کی کسی نے بھی مدد نہ کی۔ آخر وہ اپنی ہی کوششوں سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو سکی تو کیا میں کوشش سے اپنی ممتاز کو تاج محل دکھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا؟ ضرور ہو سکتا ہوں —— ایک شاہجہاں نے شہنشاہ بنکر اپنی ممتاز کے لئے تاج محل بنوایا تھا تو دوسرا شاہجہاں مکھی بن کر اپنی ممتاز کو تاج محل دکھائے گا۔ اُس کی دیرینہ آرزو پوری کریگا۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اُسے تاج محل ضرور دکھاؤں گا ——! اور دوسرے لمحے وہ ایک سیٹھ جی کے مکان میں تھا۔

چراغ کا تیل ختم ہو رہا تھا۔ روشنی مدھم سے مدھم ہوتی جا رہی تھی کہ دروازہ کھلا، خون میں لت پت، ماتھے کے زخم بہہ رہا تھا سے وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پکارا ——

"ممتاز! میں روپے لے آیا ہوں۔ کل سویرے تاج م....."

(باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

جاوید عزیز

زاویئے

آج وہ ملازمت سے علیحدہ کیا جارہا تھا، دفتر میں آج اس کا آخری دن تھا، آج سے چار سال پہلے اس نے بی، اے کی ڈگری لی تھی، لیکن عرصہ دراز تک اسے کہیں نوکری نہ ملی تھی، دفتروں کی خاک چھانتے چھانتے وہ تھک چکا تھا اور عرضیاں لکھتے لکھتے اس کے قلم کی سیاہی سوکھ چکی تھی لیکن جب اس کے ایک دوست سلیم نے اسے فوجی موٹروں کے ڈپو میں قسمت آزمائی کے لئے کہا تو اس نے یونہی عرضی لکھ ماری تھی، لیکن اب جنگ ختم ہوچکی تھی، فتح کے پرچم فضاؤں میں لہرا رہے تھے۔ تہذیب اور انسانیت کے دشمن ہونیا کے اسٹیج پر اپنا وحشیانہ اور بہیمانہ رقص ختم کرچکے تھے اور اب ایک نئی دنیا کا نظام بنانے کے لئے کانفرنسیں منعقد کر رہے تھے۔ امریکی، برطانوی سپاہی اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہو رہے تھے اور ہندستانی فوج De-mobilization کے قانون کے تحت توڑی جارہی تھی۔ پانچسال کی جان توڑ محنت اور انتھک کوششوں کا صلہ انہیں بیکاری کے تمغوں کی صورت میں دیا جارہا تھا۔

ڈپو میں اس کے ہمراہ عورتیں، گوری گوری کالی کالی اینگلو انڈین عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ ڈپو کی موٹریں سات قسموں میں تقسیم تھیں۔ "کلاس ون" سے لیکر "کلاس سیون" تک۔ دفتر کے منچلوں نے موٹروں کی طرح عورتوں کو بھی تین قسموں میں تقسیم کررکھا تھا۔

کلاس ون۔

کلاس ٹو۔

کلاس تھری۔

کلاس ون کی عورتیں جوان، خوبصورت اور صحت مند ہوا کرتیں، ان کے حسین رخسار اور گداز شانے ایک خاص کشش کے حامل ہوتے، اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈپو میں ان کی قدر زیادہ تھی۔ فوجی افسروں سے لیکر سیولین کلرک تک ان پر مرتے۔ یہ عورتیں بھی کتنی چالاک تھیں۔

کلاس ٹو کی عورتیں، ادھیڑ عمر والی ہوتیں، جو اپنے ناز و ادا، عشووں اور غمزوں سے اہل دفتر کو خواہ مخواہ گھائل کرتیں۔ ایک عجیب انداز سے گفتگو کرتیں۔ ایک عجیب قسم کا تبسم اپنے لپ اسٹک زدہ سرخ، عنابی ہونٹوں پر لاتیں، جس سے جنسی حس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگتیں۔

کلاس تھری کی عورتیں سہ پہر کے آفتاب کی طرح تھکی ہوئی، نڈھال ہوتیں، ان کے جسم سوکھے سوکھے ہوتے یا بہت موٹے اینگھے ٹھنگے، بھدے، ——— چہروں پر ماضی کے نقوش جال کی صورت میں بکھرے دکھائی دیتے انہیں نہ کوئی دیکھتا اور نہ چھیڑتا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ حسین، نوخیز جوان لڑکیوں پر کڑھتیں۔ ان کا مذاق اڑاتیں۔ ان پر طنز کرتیں ان سے نفرت کرتیں۔

ان تین قسموں کی عورتوں میں پارسی لڑکیاں بھی تھیں جن کا رنگ سفید تھا جو صنوبر کی شاخوں کی طرح نازک اور انگور کی بیل کی طرح لچکیلی تھیں۔ کرسچین لڑکیاں جو عموماً سیاہ، موٹی بھدی سی تھیں اپنی رنگت کو پوڈر کی موٹی موٹی تہوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتیں جن کے جسموں سے ہر وقت شامپین اور سینٹ کی لپٹیں نکلتی رہتی تھیں۔ اور ملکی عورتیں جن کی آنکھوں میں ایک چمک ہوتی ایک خواہش ہوتی، ایک التجا ہوتی، جیسے کہہ رہی ہو "ہمیں لیلو" اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان پر کوئی بھی نہ مرتے۔ جنگ نے ان کی فطرتوں کا گلا گھونٹ رکھا تھا، وہ ہندستانی غلاموں سے نفرت کرتیں اور حکمراں گوروں سے ہنس ہنس کر

باتیں کرتیں، وہ جونکوں کی طرح اس سے چپکی پڑتیں۔ وہ سوچا کرتا اس جنگ نے تو دیس کی عورتوں سے شرم وحیا تک چھین لی۔ شرم وحیا جو اس دیس کی عورتوں کے خمیر میں داخل ہے۔

کہاں گئی وہ ہندوستانی شرم وحیا جو ہماری تہذیب و تمدن کا انمول رتن تھی، اب وہ شرم وحیا بال روم، کلب گھر اور سینماؤں کی زینت بن چکی تھی۔ اشوک اور اس کے اکثر ساتھیوں کو ان عورتوں سے نفرت تھی۔ لیکن ان میں ایک دو ایسی بھی تھیں، جو اشوک سے گھل مل گئی تھیں۔ اشوک فرصت کے لمحات میں ان عورتوں کے متعلق سوچا کرتا جنگ کے بعد ان عورتوں کا کیا ہوگا۔

چنانچہ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ للّا کی آواز اس کے کانوں میں سرسرائی۔

"کیا سوچ رہے ہو مسٹر اشوک"

"ڈارلنگ! میں سوچ رہا تھا کہ جنگ تو ختم ہو چکی۔ اب تم عورتوں کا کیا ہوگا؟"

اس نے ڈارلنگ کا لفظ دل ہی دل میں کہا، کیونکہ اس کے اردگرد اور بھی کلرک جمع تھے۔

"تم اس کی فکر نہ کرو؟" للّا اتنا کہکر آگے بڑھ گئی۔

"ہاں! تمھارا کیا ہے، تم تو کسی نہ کسی طرح روپیہ پیدا کرسکتی ہو، لیکن پریشانی تو ہم مردوں کو ہے" اس نے آہستہ سے کہا، گو للّا تو سن نہ سکی، لیکن اس کے ساتھی ہنس پڑے۔

اس نے سوچا "جنگ ختم ہوگئی، عارضی محکمے توڑ دیئے جائیں گے۔ ان لاکھوں بیروزگاروں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ اخباروں میں غذائی بحران کے متعلق پڑھ چکا تھا، اس خیال کے آتے ہی بنگال کی ٹریجڈی اس کی نظروں کے سامنے ابھر آئی۔

سڑی گلی متعفن لاشیں۔ بلکتے معصوم بچے۔ سوکھی چھاتیاں۔ چیختی چلاتی مخلوق۔ اور پھر زندہ لاشوں کے گرد گھومتے ہوئے کتے کیا ہندوستان کو ایک اور قحط سے دوچار ہونا پڑیگا۔ گذشتہ ہفتہ ایک مقامی اخبار میں اس نے پڑھا کہ لاہور کے بازاروں اور گلی کوچوں میں جنوبی ہند کی چند ٹولیاں روٹی کے لئے گشت کرتی نظر آئیں، ان کے جسموں میں خون سوکھ چکا تھا، آنکھیں ابل پڑی تھیں، پیٹ میں گڑھے پڑ گئے تھے ان کی گھٹی گھٹی آوازیں فضا میں سسک رہی تھیں۔

"یہ آثار اچھے نہیں" اس نے خیال کیا۔

لیکن نہیں ——— ہندوستان میں، ایک اور قحط کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں، ان لیڈروں کو غذائی صورت حال کا کوئی حل تلاش کرنا چاہئے لیکن پھر نہ جانے کیوں اس کو ان لیڈروں سے نفرت ہونے لگی۔

اس نے سوچا " آخر کب یہ ہند کی دھرتی بھوک، افلاس، اور بیروزگاری سے نجات پائیگی۔ دھرتی ان کے پروان چڑھتے بیٹوں کو کب آزاروں سے چھٹکارا دیگا"

وہ چاہتا تھا کہ اس کے کانوں کے قریب آکر نرم و نازک لہجے میں کوئی بولے "بھائی فکر نہ کرو، دیکھتے نہیں، تمھارے ملک کو آزادی دینے کے لئے انگلستان سے وزارتی وفد آیا ہوا ہے، شملہ کی خوشگوار فضاؤں میں کانفرنس ہو رہی ہے۔ یہ سب تمھارے ملک کی آزادی کے لئے ہی تو ہے، وفد کشمیر کی وادیوں کی سیر و تفریح بھی تو تمھارے ملک کی آزادی کے لئے کر رہا ہے۔ آزادی کی دیوی تمھارے دروازہ پر کب سے انتظار کر رہی ہے، دیکھتے نہیں کتنی کٹھن شرط ہے اس کی۔ تم اگر متحد ہو جاؤ تو میں تمھارے گھر میں داخل ہو سکتی ہوں اس گھر میں جہاں سے ایک بار تم نے مجھے دھتکار کر باہر نکالدیا تھا، لیکن مجھے تم سے ہمدردی ہے، اسی وجہ سے تو سات سمندر پار کرکے چلی آئی ہوں، لیکن نہ تو تم متحد ہی ہونا چاہتے ہو اور نہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچنا چاہتے ہو ——— دیکھو اب بھی وقت ہے ——— مان جاؤ"

"مسٹر اشوک تنخواہ لینے چلئے" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا، پیشانی پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے، اس نے ان قطروں کو رومال میں جذب کر لیا، اس کے بعد دیگرے

متلاشی آنکھوں سے وہ چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا، جیسے کسی کی تلاش ہو۔
معاف کیجئے ہو مسٹر اشوک " تانا کی آواز آئی۔
"ہاں ڈارلنگ!"
"پھر کب ملاقات ہوگی؟"
"تم جب کہو"
"آج شام"
"کہاں؟"
"میرے گھر پر"

تنخواہ لیکر وہ ڈپو سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم دو فرلانگ لمبی سڑک پر تیزی سے بڑھنے لگے۔ اس دو فرلانگ لمبی سڑک پر آتے جاتے اس کے پیر اس قدر عادی ہوچکے تھے کہ اگر آنکھوں پر سیاہ پٹی بھی باندھ دی جاتی تو وہ آسانی سے اسٹیشن سے ڈپو پہنچ سکتا تھا لیکن آج جانے کیوں اس کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ —————— یہ سڑک، یہ پل، یہ طویل قامت تاڑ کے درخت، چھوٹی موٹی جھاڑیاں نرسوں کے کوارٹر، گوروں کے طعام خانے، فوجی دواخانے، اور ڈپو کی موٹریں —————— اجنبی ہیں، بالکل اجنبی۔ گویا وہ پہلی مرتبہ اس سڑک پر رینگ رہا ہو، فوجی موٹریں اس کے قریب سے خاک اڑاتی ہوئی گذر رہی تھیں جیسے یہ اس کا مذاق اڑا رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں: تم اب بیروزگار انسان ہو۔ جانتے نہیں" بیروزگاری قدرت کی بھیجی ہوئی سب سے بڑی لعنت ہے"!

دو فرلانگ لمبی سڑک عبور کرکے وہ شارٹ کٹ سے اسٹیشن پہنچا، ٹرین کے آنے میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ اسٹیشن سے نکلکر وہ کوتنار کی سڑک پر آگیا۔ سڑک قدیم و جدید عمارتوں کے درمیان لیٹی ہوئی درد و کرب سے کراہ رہی تھی۔ فوجی موٹریں گذر کر اس کے درد میں اور اضافہ کررہی تھیں، چند لڑکیوں کی ٹولی فٹ پاتھ پر سے گذرتے ہوئے اپنے پیچھے سینٹ اور کریم کی لپٹیں چھوڑ گئی۔ ایک گورے کے شانہ سے شانہ ملائے ایک اینگلو انڈین لڑکی اس کے قریب سے گذری۔ گورا اس کی طرف دیکھکر مسکرا رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو
" دیکھو تمھارے دیس کی لڑکیاں ہمارے ساتھ کتنی خوش رہتی ہیں"

وہ تیز تیز چلنے لگا اور قریب ہی ایک ریستوران میں داخل ہوگیا۔ اس نے بیرے کو آواز دی، بیرے کے آنے میں دیر ہوگئی وہ چلّایا "کہاں مرگئے تھے تم، ابھی جاکر رپورٹ کردوں تو نوکری سے نکال دیئے جاؤ گے"
" صاحب اس ٹیبل پر Serve کر رہا تھا، آنے میں دیر ہوگئی" اس کی آواز میں ایک التجا تھی۔
" صاحب میری نوکری جاتی رہی تو آپ کو کیا ملیگا، اس گرانی میں، میں کس طرح بیوی بچوں کی پرورش کرسکوں گا"
وہ سوچنے لگا۔ واقعی اس نے اس پر زیادتی کی، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں —
"بن ، کریم چاپس اور ایک پلیٹ فروٹ سلاڈ لے آؤ" اس نے کہا۔

بیرا چلا گیا تو وہ اس طرف دیکھنے لگا جس طرف بیرے نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ چند لڑکیاں آئس کریم اڑا رہی تھیں ان میں گوری، کالی، سانولی اور گلابی رنگت کی لڑکیاں تھیں، جیسے یہ مختلف ملکوں کے حسن و رنگ کی نمائندگی کرنے آبیٹھی ہیں۔ وہ آپس میں چھیڑ چھاڑ کررہی تھیں، ان کے نقرئی قہقہے، ریستوران کی فضا میں ساز بجا رہے تھے۔ ان میں سفید ساری والی لڑکی کو وہ بہت دیر تک دیکھتا رہا، گھورتا رہا۔ حتّٰی کہ بیرا آگیا۔

اس نے سوچا کتنا صبیح چہرہ ہے اس لڑکی کا، جیسے گلاب کا پھول، یہ تشبیہ بہت پرانی ہوچکی تھی، لیکن اسوقت اس کے دماغ میں اس سے بہتر کوئی اور تشبیہ نہیں آئی۔

کسی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] کرنی
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
اس نے سوچا خوش [illegible] ـــ کاش "
[illegible] [illegible] [illegible] اس کی نظریں آئینہ پر [illegible] وہ اپنے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ
[illegible] ـ چند سال کے عرصے میں وہ کتنا بدل چکا تھا، اس کے چہرے سے سرخی مفقود ہو چکی تھی۔ ابھرے ہوئے
[illegible] کی [illegible] جا چکا تھا، جیسے کسی نے مشین میں اس کا سینہ دبا دیا ہو، آنکھوں کے گرد سرخی حلقے پڑ گئے تھے۔
اس نے [illegible] [illegible] کرتے ہوئے کہا " چلو اچھا ہوا ملازمت سے نجات ملی ـ [illegible] بھی گھر دن کی غلامی ـــ اب
[illegible] [illegible] ـ [illegible] نہیں ـ آزادی کا [illegible]!"
ملازمت سے اب اس کو نفرت ہو چکی تھی، صبح سویرے ٹرین کے لئے بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ـ ٹرین کسی دن چھوٹ جاتی تو اُسے
سائیکل پر آٹھ میل کا طویل راستہ طے کرنا پڑتا ـ پھر ہفتہ میں صرف ایک ہی دن کی چھٹی ـ وہ بھی اتوار کے دن جبکہ اس کے ساتھی کالج
یا دفتر گئے ہوتے ـــــ وہ صبح جا کر شام گھر واپس لوٹتا، نہ تو وہ دوست احباب ہی سے مل سکتا تھا، نہ سیر و تفریح کر سکتا تھا۔
لیکن اب وہ خوش تھا ـ ایک آزاد پنچھی کی طرح اب وہ فضائی پہنائیوں میں پرواز کر سکتا تھا، چکر لگا سکتا تھا، اب اس کو کوئی روکنے والا
نہ تھا ـ انہی خیالات میں اس کی نظریں قریب بیٹھی ہوئی ایک بنگالیوں کی ٹولی پر پڑیں ـ
ایک بنگالی دوسرے سے کہہ رہا تھا ـ " کتنی حسین لڑکی ہے ـ وہی، سفید ساڑی والی ـــــ "
دوسرا جو ایک کرسچین لڑکی کی برہنہ پنڈلیوں کو دیکھنے میں محو تھا، چونک کر کہنے لگا " ہاں ـــ بہت حسین ہے سالی "
لڑکیاں اٹھ کر جانے لگیں تو سب کی نظریں ایک مرکز پر سمٹ آئیں ـ جب وہ باہر جا چکیں تو ریستوران میں خاموشی چھا گئی، جیسے
وہ سارا شور انہی کی وجہ سے تھا ـ وہ پھر خیالات کا تانا بانا بننے لگا " اگر عورت نہ ہوتی تو شاید کائنات کی تخلیق مکمل نہ ہوتی، یہ کائنات
کتنی سونی سونی ہوتی، اور مرد کی زندگی کتنی بھیانک ـــ " اس خیال کے آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی بھی تاریک ہے ـــ
قبرستان کی طرح خاموش ـــ کاش کوئی اس کی " جیون ساتھی " بننا قبول کرلے ـــــــــ
اس خیال کے آتے ہی اس کو سفید ساڑی والی یاد آگئی ـ وہ چاہتا تھا کہ اسی وقت اس لڑکی سے شادی کا Appointment
لے ـ اگر وہ نہ مانے تو خودکشی کی دھمکی دے ـ لیکن ـــ خودکشی کے خیال کو اس کے دماغ میں منجمد کر کے وہ جا چکی تھی ـ اب وہ تنہا تھا ـ
(جیسے اس سے پہلے وہ سفید ساری والی لڑکی ـــ اس کے پہلو میں تھی) ـ
شام ہو چکی تھی ـ افق پر سورج سونا اگل رہا تھا ـ افق کا بیشتر حصہ سونے کا سمندر دکھائی دے رہا تھا ـ
وہ سوچنے لگا " کاش یہ سمندر منجمد ہو کر نیچے گر پڑے، ہر ایک جتنا چاہے سونا اٹھا لے ـ نہ کوئی پرولتاری رہیگا اور نہ کوئی بورژوا
ـــ نہ اشتراکیت ہوگی ـ نہ سرمایہ دارانہ نظام ـــ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا ـ سونے کا سمندر تحلیل ہو کر نیلے نیلے آسمان کی
پہنائیوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا ـ ریستوران میں لوگ آ جا رہے تھے ـ
" ہیلو! مسٹر اشوک "
اس نے پلٹ کر دیکھا ـ اس کا دوست نجم فوجی وردی میں مسکرا رہا تھا ـ
" ہیلو کیپٹن نجم " اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھا دیا ـ
" کہاں روپوش تھے نجم "
" عراق " " اور تم " " یہیں ـ اسی مقام پر ـــ یہی تو ہماری جنم بھومی ہے " " لیکن ملازم بھی ہو یا نہیں؟ "

کی جو وقت آ زادو پھرتی ہیں ۔ آئندہ دیکھا جائیگا "

نجم نے اپنی زندگی کے تمام واقعات اس سے بیان کئے ۔ اس نے پھر سوچا " اگر وہ بھی فوج میں بھرتی ہو جاتا تو تمام ملکوں کی سیر و تفریح ہو جاتی ۔ عراق ۔ ترکی ۔ افریقہ ۔ مصر ، اطالیہ —— مختلف ملکوں کی سیر —— مختلف کوٹھوں کی سیر ! "

دو کامریڈ سامنے والی میز پر آ بیٹھے ، ایک نے سگرٹ سلگا کر پارسی لڑکی کو گھورنا شروع کیا ۔ لڑکی کے ہمراہ ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا کامریڈ نے بچے کو اپنے پاس بلانا چاہا ، اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا ، بچہ اپنی بہن کی طرف دیکھنے لگا ۔ جیسے اجازت طلب کر رہا ہو —— لڑکی نے معنی خیز نظروں سے بچہ کو دیکھا ، وہ سہم کر اپنی بہن کے قریب کھسک گیا ۔ دوسرے لمحے لڑکی کامریڈ پر قہر آلود نظریں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئی —— جیسے کہہ رہی ہو —— " مجھے تم جیسے ڈھونگ رچانے والے نوجوانوں سے نفرت ہے ۔ تم اشتراکیت کا پرچار کرتے ہو ، تم خود کو اشتراکی بتاتے ہو ، تم ایک بہروپیے ہو ، تمہارے گھروں میں آرام و آسائش کے تمام سامان مہیا ہوتے ہیں ، تم کبھی کبھی تو بورژوا طبقہ کو بھی مات کر دیتے ہو ، تم سرمایہ دارانہ نظام کو مٹانا چاہتے ہو ، لیکن تم خود ان زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہو ۔ مجھے تم سے نفرت ہے ، تمہارے اس جھوٹے پروپگنڈے سے نفرت ہے "

" دیکھا تم نے سالی کیسی کہیں کی ، کن نظروں سے دیکھ رہی تھی ، اگر بس چلتا تو شاید ہمیں نگل جاتی " پہلے کامریڈ نے اپنے ساتھی سے کہا ۔ دوسرا کامریڈ مسکرا رہا تھا ۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک طنز تھا ۔

نجم کی نظریں اخبار پر جمی ہوئی تھیں ، اس نے پوچھا " کوئی خاص چیز "

" ہاں —— سہ جماعتی کانفرنس ناکام ہو گئی " نجم نے جواب دیا ۔

اس نے نجم کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا ۔ جلی حروف میں چند سرخیاں اس کی نظروں کے سامنے کانپ رہی تھیں ۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی ۔ عارضی حکومت کا قیام —— دارالامرا میں چرچل کی تقریر —— ہندستان کا غذائی بحران —— اس کو یکایک لتا کا خیال آیا آج رات وہ اس سے ملنے کا وعدہ کر آیا تھا ، ایک تحفہ خریدنے کے ارادے سے اس نے نجم سے اجازت طلب کی اور سیدھا بازار کا رخ کیا وہ سوچنے لگا " آخر کس قسم کا تحفہ خریدا جائے " کئی چیزیں اس کی نظروں کے سامنے ابھر آئیں " —— خوبصورت سنگار دان ، چاندی کا فوٹو فریم ۔ مرمر کا تاج محل —— اس نے دوکان سے ایک چھوٹا سا تاج محل خریدا ۔ اب اس کے قدم تیزی سے لتا کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے ، وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد جا کر لتا سے کہے " آؤ —— آج ہم دونوں اس مرمریں تاج کے سامنے محبت کا عہد و پیمان باندھیں رات ہو چکی تھی ۔ تاریکی کے اژدہے ہر طرف پھنکار رہے تھے ۔ وہ تاریکی میں لتا کے گھر پہنچا ، لیکن لتا گھر پر نہ تھی ۔ ملازم سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی گورے کے ہمراہ شام ہی سے باہر چلی گئی ۔ اس نے محسوس کیا کہ مرمریں تاج اس کے ہاتھوں سے [illegible] گرنا چاہتا ہے ۔ اس نے انگلیوں کی گرفت کو مضبوط کیا ۔ مبادا کہیں تاج گر کر ٹوٹ نہ جائے ——

اور پھر —— تاریکی میں اس کے قدم اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے !!!

(بقیہ تاج محل) [illegible] —— [illegible] کے پیچھے بے ہوش پڑی تھی ۔ اس کا بایاں ہاتھ [illegible] وہ اس طرف [illegible] کے صحن میں ٹوٹے پھوٹے افسانے میں لکھا تھا —— [illegible] محبت کا [illegible] مذاق [illegible] کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ [illegible] چراغ نے آخری ہچکی لیکر دم توڑ دیا ——— !

تاج محل چاند کی روشنی میں اپنی قدیم شان و شوکت اور عظمت و رعنائی کے ساتھ [illegible]

نسر ہاشمی

خلاء

اُس کی آواز متواتر میرے کانوں میں آ رہی تھی "بابو بھگوان کے نام پر ایک پیسہ"

سگریٹ، کلاک ٹاور، مشن روڈ، کوتوالی، نشاط ٹاکیز سے گذر کر ۳، ۴ میل کی مسافت طے کرتا ہوا میں ٹیلیگراف آفس تک آ گیا، لیکن میرے کانوں میں اُس کی آواز مسلسل آ رہی تھی "بابو جی بھگوان کے نام پر ایک پیسہ.........!"

گذشتہ مغموم کن خیالات اور تخیلات کے غیر محدود سلاسل کو توڑنے کے لئے میں ایک دم پلازا کی دیو پیکر عمارت میں داخل ہو گیا اُس شب قلوپطرہ کی نمائش تھی۔ باوجودیکہ میں مناظر کی رنگینیوں میں کھو گیا تھا لیکن وہی آواز صدائے بازگشت بنی ہوئی تھی میں ایک دم چیخ اُٹھا ——

میں اس قدر سہا ہوا تھا کہ مجھے گرد و پیش تک کا خیال نہ تھا، برابر کے ایک صوفے سے ایک مرمریں پیکر حسینہ نے میرا بازو پکڑ لیا

"کیا بات ہے کیپٹن" —— وہ تھی مرانڈا، میرے ساتھ کام کرنے والی فوجی لڑکی (سارجنٹ)۔

"کچھ نہیں سارجنٹ" —— میں نے کہا۔

وہ خاموشی کے ساتھ پکچر دیکھ رہی تھی، بڑے انہاک سے اور غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ۔ انٹرول میں اُس نے بیئر کے دو گلاس طلب کئے اور ایک گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی! "شاید حوالدار ملکا سنگھ کے پکڑے جانے پر آج تمہیں دلی صدمہ ہوا ہے، کیپٹن —— !(Have it) کی آواز کے ساتھ ساتھ مرانڈا کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر نیچے آ رہا اور زمین کے سینے پر ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو کر رہ گیا۔

مجھے ہنسی آ گئی، مرانڈا کچھ پھیکے سے تبسم کے ساتھ کہنے لگی "اچھا ہی ہوا اس میں دم تو بھی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "ہاں ٹھیک کہتی ہو میں اس قدر سادگی کے ساتھ پینے کا عادی بھی نہیں" میں نے کیس بڑھاتے ہوئے کہا "لو۔ سارجنٹ سگریٹ"۔

اُس نے اپنا گلاس ختم کر دیا تھا، سگریٹ لیکر کہنے لگی "آج چیسٹر فیلڈ (Chesterfield) ایک عرصہ بعد ملا" میں نے دو Coldings کا آرڈر دیا اور سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا —— ہاں تو اچھا ہی ہوا سارجنٹ لوٹ گیا۔ نغمے نے بجتے ہوئے شور پر قابو پا لیا۔ کھیل شروع ہو چکا تھا (Tunes) کی نغمہ باریاں کھیل رہی تھیں۔ —— جھلملتی ہوئی مدھم روشنی میں ذرات قلابازیاں لگا رہے تھے ——

"بوائے" میں نے لڑکے کو آواز دی۔

"یا جناب"......... لڑکے نے دو گلاس میری طرف بڑھائے، مجھ کو پہلا ایک مرانڈا لے چکی تھی ——

پہلی بار مرانڈا کے دل میں گھس کر اُس کے جذبات کا اندازہ کیا، وہ مجھ سے پہلے سے مانوس تھی اور اکثر رقص کی دعوت دیتی لیکن میں ہمیشہ کوئی بہانہ لیکر اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف مسرور تھی بلکہ آسودگی محسوس کر رہی جس کا اندازہ اُس کی بھوری بھوری آنکھوں کی تبسم آفریں نظروں سے ہوتا۔

اُس نے مجھ سے سگریٹ طلب کیا "کیپٹن ایک گلاس بیئر (Beer) اور" یہ کہکر وہ ہنسنے لگی میں کیس دیکر

کمہانی ہنسی ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کہا "سارجنٹ آج بہت خوش ہو"

مرانڈا ــــ "ہاں آج ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں میرا ڈانس ہے، تمہیں چلنا ہوگا کیپٹن ۸ ½ بجے ہیں اس وقت میں نصف گھنٹہ اور ہے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دھوئیں کے پُر پیچ و خم جال بنا رہی تھی ــــــ مرانڈا کا سانس پھولنے لگا، ۹ بجے تک کھیل ختم ہو گیا ــــ باہر نکلتے ہوئے مرانڈا نے کہا "کیپٹن موٹر بائیک لائے ہو"

میں ــــ ہاں لایا ہوں لیکن میرے سر میں درد ہے اس لئے گھر چلا جانا چاہتا ہوں۔

مرانڈا ــــ تو کیا ڈانس میں نہ چلوگے۔

میں ــــ ہاں شاید نہ جاسکوں سارجنٹ، پھر کبھی۔

وہ فوراً موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی ـــ وہ مغموم تھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان گُنگ ہو گئی۔ آج پہلی بار مجھے اس کی معصومیت کا احساس ہوا۔

میں نے کہا سارجنٹ "میں چلتا ہوں"

مرانڈا ــــ کیا سچ کہہ رہے ہو کیپٹن۔

میں ــــ ہاں، ہاں میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اُسے پُشت کی جانب آنے کا اشارہ کیا ــــ وہ (Back Seat) پر آ گئی۔ ۱۱ ½ بجے تک محفلِ رقص گرم رہی۔ کلب کے تمام ممبر ۱۲ بجے تک اپنے گھر جا چکے تھے۔ مرانڈا کہنے لگی

"کیپٹن رات زیادہ جاچکی ہے مجھے گھر تک پہنچا دو"

"سارجنٹ تمہارے مکان کا نمبر $\frac{3B}{40}$ / 129 مال (Mall) ہے؟"

"ہاں، ہاں کیپٹن بہت تیز میموری ہے تمہاری، صرف ایک بار گئے ہو،"

سارجنٹ کو اُس کے گھر چھوڑتا ہوا، میں اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔ بازار پہنچکر دیکھا، قریب قریب تمام ہوٹل کھلے ہوئے تھے ایک ریسٹوران میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ ہوٹل کے لڑکے چلّانے لگے صاحب چائے؟ کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ شہر کے گندے ہوٹل اور یہ گندے کالے ہندوستانی بچّے ملیٹری افسروں کو دیکھ کر بھیڑیوں کی طرح چلّانا شروع کر دیتے ہیں میں نے حقارت آمیز جذبے کے تحت اُس پر ایک بھرا تُو دنگاہ ڈالی اور خاموشی کے ساتھ چائے کا ایک ٹرے لانے کا حکم دیا۔

چائے پیتے وقت ایک شور نے میرے سکون آمیز خیالات کو جو راستے کی خنک ہواؤں سے یکجا ہو گئے تھے منتشر کر دیا۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا ایک دیوانی عورت ایک لاری کے نیچے دب کر زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی معمولی سا واقعہ تھا ہندوستان میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے ــــــ جیسے مجھ پر اثر تک نہ ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ــــــ

ہوٹل کا مالک اور کچھ ملازمین دیوانی عورت کی بزرگانہ عظمت کے قصیدے پڑھ رہے تھے اور نہ جانے کب تک اس کے ــــ کشف و کرامات پر رطب اللسان رہے، گھر پہنچا تو بھابی برج کھیلنے میں مصروف تھیں، مجھے بھی دعوت دی گئی، بھابی کی خاطر سے میں بھی کچھ دیر تک کھیلتا رہا لیکن بے کیفی کے ساتھ کیونکہ در اصل میں کافی ماندہ ہو چکا تھا اور غیر معمولی کسل محسوس کر رہا تھا ــــ کھانے کے لئے بھابی نے دریافت بھی کیا لیکن اشتہا بالکل نہ تھی ایسے ہی سو رہا۔ دوسرے دن صبح

آئیں پہنچا تو میں نے مرانڈا کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پائی، ایک نئے قسم کا احساس اور ایک شگفتگی۔

میں نے کہا "سارجنٹ آج بہت خوش نظر آ رہی ہو" اس نے پہلی بار مجھے ڈارلنگ کہکر پکارا ــــــ "ہاں ڈارلنگ بہت خوش" مرانڈا نے کہا۔

اس کے بعد دو دن تک مرانڈا آفس نہ آئی ....

میں نے معلوم کیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اسی روز شام کو ہسپتال گیا تو جیسے وہ کسی کی منتظر تھی ــــــ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہنے لگی ــــــ "کیپٹن اچھا ہوا تم آ گئے میں کل گھر جا رہی ہوں"

میں نے ہسپتال میں آنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ سائیکل کا شہر کے کسی تانگہ سے تصادم ہو جانے سے اس کے کچھ خراشیں آ گئی ہیں۔

میں اُس سے رات کے ۹ بجے تک مختلف پہلوؤں پر باتیں کرتا رہا، رقص، دفتر، کلب، جنگ، سیاسیات، اقتصادیات پر گفتگو ہوتی رہی، دوسرے دن وہ لمبی رخصت پر چلی گئی ــــــ

اُس کے جانے کے بعد میں نے ایک قسم کی تنہائی محسوس کی، زندگی میں پہلی بار ایک خلاء نظر آیا۔ گہرا اور وسیع خلاء .... !

شمس نوید

یہ دُنیا ——!

سربلند آسمانوں پر !

"فردوس" کے ایک آئینہ خانہ میں کچھ انسان بیٹھے تھے ان کے مرمریں جسم ایسے معلوم ہوتے تھے گویا چاند ستاروں کی حسین ترین درخشاں صباحتوں کو ایسی لطیف و پُرنور تصویروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جن میں قوس قزح کی گلابی ارواح تیرتی پھر رہی ہیں ——— مردوں کے پہلو بہ پہلو "حوریں" بھی مؤدبانہ ان کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ان سب کے درمیان ——— ان مقدس انسانوں کے حلقہ میں ایک شخص خاص جگہ پر کھڑا ہوا تھا! اس کی نظریں "آئینہ خانے" کے دریچہ سے گذر کر "کوثر و سلسبیل" کی بصلات لہروں پر مرکوز تھیں، یہ وہی تھا جو "معبود مقدس" سے پوچھ کر دنیا کی سیر کرنے گیا تھا اور سراسیمہ احساسات لئے ہوئے فردوس میں دوبارہ جلد تر واپس آ گیا تھا

کہو! سب نے اسی کو مشتاق آواز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "دنیا" میں کیا کیا دیکھا، اس نے ایک گھومتی ہوئی نظر سے مجمع کو دیکھا اور دنیا کے مکدر سفر کا حال بیان کرنے لگا۔

"میں گورستان کی ایک بے نام و نشان قبر سے نکلا" اس نے کہنا شروع کیا، اس وقت رات تھی! بیابانوں میں تاریک اور گھناؤنی ——— لیکن شہری آبادی میں دنیاوی رنگ و نور کا مجموعۂ جمیل! میں نے مجموعۂ جمیل اس لئے کہا ہے کیونکہ انسانی زندگی میں ——— مادّی جسم میں تبدیل ہو کر میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا ورنہ تم جانو فردوس کا باشندہ غلیظ دنیا کی مکروہ رعنائیوں کو کب پسند کر سکتا ہے۔

ہاں آگے کہو! کسی نے کہا۔

اُجاڑ صحرائی ظلمتوں کو چیرتا ہوا میں آبادی کی روشنی میں نمودار ہوا۔ میں نے دیکھا کہ بازار آراستہ ہیں، شدید زرق برق جھنگاتے ہیں، ونچے اونچے آہنی کھمبوں پر جگمگاتے ہوئے عجیب چراغ آویزاں تھے!

یک بے جانور چلتی ہوئی خوبصورت سواری ——— شور مچاتی ہوئی۔

ترقی یافتہ تانگے اور رکشے ——— ایک مخصوص "کھٹاپٹ" پیدا کرتے ہوئے۔

ایسی مزین گاڑیاں چلتی ہوئی جن کو جانوروں کے بجائے انسان کھینچ رہے تھے ——— دردناک بے بسی کے ساتھ!! ایک اور خاموش سواری دیکھی جس پر صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا ٹانگوں کی حرکت سے اس کو چلا رہا تھا، اس کے پہیے کچھ عجیب طرح بالمقابل واقع ہوئے تھے، میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ گرتی کیوں نہیں؟ ——— یہ کیسے چلتی ہے؟؟ آراستہ دکانیں ——— نگار خانے ——— عصمت فروش بالاخانے، اور ان سیکڑوں نرم و خوشگوار ہنگاموں کے بوجھ میں دبا ہوا میں ایک بھوکا انسان! جو ابھی ابھی قبر کی تاریک اندھیاریوں میں سے نکل کر آیا تھا۔

میرے جسمانی ڈھانچہ میں سیکڑوں سال پیشتر دنیا کی "روح" تھی اس لئے میں نے حیرتناک کیفیت بن کر دیکھا کہ "جب" اور "اب" میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلا تمدن ایک خواب کی طرح وقت کے دھندلکوں میں گم ہو گیا اور ماضی و حال کے درمیان ایک سیاہ پردہ اٹکا گیا ہے۔

میرا دماغ —— میرا دل —— میرا تمام باطن ماضی کی چیز تھا اور میرا جسم بیسویں صدی کا کمزور جسم! زندگی کے پیکر میں دوبارہ تبدیل ہو کر مجھے فطری طور پر بھوک معلوم ہو رہی تھی، ایک شدید بھوک! لیکن جدید دنیا کا شدید انقلاب میری بھوک کو "حیرت" بناتا جا رہا تھا۔

میں نے جدھر نظر ڈالی یہ معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر چیز بدل گئی ہے، حیوانات سے لیکر جمادات تک ایک زبردست تغیر کے طوفانوں میں ہچکولے کھا رہے ہیں نہ وہ انسان —— نہ وہ تمدن —— بازار بدل گئے، تجارت بدل گئی، سامان بدل گئے، —— اخلاق بدل گئے، سب کچھ بدل گیا اور بدلتا جا رہا ہے، نجانے وہ "تبدیلی" کی تیز رفتار کس سنگلاخ پہاڑ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائیگی —— کون جانے!

یکایک میرے کانوں نے "زناٹے" کی مسلسل آواز سنی ہر طرف دیکھا مگر نگاہوں کے حدود اربعہ پر کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی، کچھ غیر ارادی طور پر میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا! اوپر نہ زمین میں نہ آسمان میں بلکہ فضاؤں کے خلا میں "ایک سواری گاڑی" اڑ رہی تھی جس کا نام لوگوں نے "ہوائی جہاز" بتایا۔ پہلے تو میں اسے "عنقا" سمجھا، وہی عنقا جو ہمارے زمانہ میں "نام" تک زندہ تھا، میں نے خیال کیا کہ یہ پُر وقار جانور اب بیسویں صدی کی ترقی پسند فضاؤں میں پرواز کر رہا ہے!

ایسی ہی سیکڑوں ایجادات کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ "بنی آدم نے حیرتناک، خلاف امید ترقی کر لی ہے"

مرد ایک جدید لباس میں دیکھے، برہنہ سروں پر عجیب تراش کے بڑے بڑے بال! سر سے پاؤں تک آرائشوں میں غرق —— اور مردوں کے دوش بدوش "عورتیں" دیکھیں جو نیم عریاں باریک ملبوس زیب تن کئے ہوئے بے حجابانہ [illegible] رہی تھیں ہوسناک نگاہوں کے تیز نشتروں کو دیدہ و دانستہ شرم و حیا کے سینہ میں پیوست کرتی ہوئی لا اماں! میں کانپ گیا۔ دیکھکر کہ وہی عورتیں آج بیشرم مسکراہٹ بن کر غیروں کی تسکین نگاہ ثابت ہو رہی ہیں جو کبھی اپنے مکانوں کی چہار دیواری میں رہنا پسند کرتی تھیں اور دریچہ سے سر باہر نکالنا "گناہ" تصور کرتی تھیں۔ کیا یہ نظریہ کبھی غلط ہو سکتا ہے کہ "عورت" بے پردہ ہو کر تمدن کے لئے زہریلا جرثومہ بن جاتی ہے!!؟ ——

میں نے چند خراب حال بھکاریوں کو دیکھا جو التجا بن بن کر تڑپ رہے تھے اور اپنی نحیف آوازوں تک مغرور راہگیروں کو کھینچنا چاہتے تھے لیکن یکے بعد دیگرے سب اخلاقی گناہگار اور مذہبی مجرم بنکر گذر جاتے، کوئی طنز کرتا ہوا۔ کوئی مسکراتا ہوا کوئی خشمگیں حقارت سے دیکھتا ہوا۔ بھکاریوں کی امیدیں کانپ کانپ کر گر جاتی تھیں، کہیں فقیر، گدا اگر ناامید ہو کر بھی ناامید نہیں ہوتا، وہ یہ تلخ تجربات سہکر بھی کرم کی التجائیں کر رہے تھے، گویا ان کی زندگی کا مقصد یہی ہے! ان کی زندگی کے اس غلط یا صحیح مقصد کے مقابل مذہب و اخلاق کے احکام چپ چاپ موت کی نیند سو رہے تھے اور ان لاشوں پر انسانی خود غرضیوں سے بنائے ہوئے درندے بیدریغ پاؤں رکھکر چل رہے تھے!

ایک سیاسی جلوس آ رہا تھا —— سبز پرچم لہراتا ہوا۔

نعرۂ تکبیر! اللہ اکبر

مسلم لیگ زندہ باد

پاکستان لے کے رہیں گے

دوسرا جلوس مقابل آ گیا جس کا [illegible] رنگا تھا، لوگ جذبات کی شدت میں کہہ رہے تھے:۔

بھارت کی [illegible] جے!

کانگریس زندہ باد

آزادی پیکے رہیں گے

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جلوس ٹکرا گئے، وحشیانہ جنگ شروع ہوگئی —— میں نے یہ سب کچھ دیکھا اور سوچتا ہوا آگے بڑھا کہ " آزادی کی کوشش اور —— خانہ جنگی، باہمی عداوتیں، غلام ہی رہیں گی یہ!

شاہراہ پر دیکھا کہ ایک مرد ایک عورت بغل گیر تھے! اور فحش مذاق ہو رہا تھا تف، تف" میں تیز قدم رکھتا ہوا اس جہنمی منظر سے دور آگیا ——

عشاء کی نماز کا وقت تھا —— میں ایک مسجد میں داخل ہوگیا۔ مسجد کے در و دیوار پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، خوب آراستہ عمارت تھی، لیکن نمازی غائب، نئی ترقی کے جسم میں روح نہیں —— معلوم ہوا کہ یہاں نمازی آتے ہی نہیں اُفوہ! نہ پوچھو کیا گزر گئی دل پر! مشرق کے انسان روحانیت کو بھول کر ہجوم در ہجوم " مادیت کی وادی " میں داخل ہو رہے ہیں۔

حیرتناک اور غلیظ ترقی یافتہ انسانیت میرے نظریات کی فردوسی پاکیزگی پر ہیبت ناک دھواں بنکر محیط ہوگئی —— مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

میں قبرستان کی طرف بھاگا —— دیوانہ وار —— بدحواس! —— اور میرے منھ سے بے اختیار زور زور سے یہ الفاظ نکل رہے تھے :-

" ترقی " ! لیکن پستی

جہنمی کائنات!

گناہ

جرم

ہوسناکیاں فحاشی عریانیت

اُف

" جب " اور " اب " میں

زمین و آسمان کا فرق!

جائزے

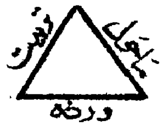
توریث

بہشت و دوزخ

اسلم فاروق

توریث

فرد کی شخصیت تین اجزاء سے مرکب ہے ۔ ورثہ، تربیت اور ماحول ۔ اگر ہم ان تینوں کو ایک مثلث کی شکل میں ظاہر کریں تو ورثہ کی حیثیت بنیادی ہوگی جس کے دونوں بازو ماحول اور تربیت ہونگے ۔



یہ تینوں عناصر اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ۔ مگر ماحول اور تربیت کا دارومدار ورثہ پر ہے ۔ اگر کسی نے خراب ورثہ پایا ہے تو ماحول اور تربیت قطعاً بیکار ہیں ۔ اگر ورثہ اعلیٰ ہو اور باقی دونوں اجزا ادنیٰ تب بھی شخصیت ناقص رہجاتی ہے ۔ رومیؒ نے اس فلسفہ کی بنیاد ڈالی جسے آج بھی تمام ماہرین حیاتیات حقیقت تسلیم کرتے ہیں ۔ اس مختصر بحث میں ہم صرف ورثہ پر اظہار خیال کریں گے ۔

ورثہ نام ہے اس ترکہ کا جسے فرد اپنے والدین سے حاصل کرتا ہے ۔ ورثہ جسم اور اخلاق دونوں صورتوں میں نمودار ہوتا ہے ۔ جہاں تک کردار اور اخلاق کا تعلق ہے یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا تعلق والدین سے ضرور ہے مگر کیسا؟ اور کتنا؟ یہ دونوں سوال ابھی تک حل نہیں کئے جاسکے ، ہماری موجودہ تحقیقات صرف جسم تک محدود ہیں ۔

انسان کے جسم میں دو قسم کے خلئے (Cells) ہوتے ہیں ۔ خلیہ ان خانوں کا نام ہے جس سے ہمارا جسم بنتا ہے ۔ پہلی قسم جسمانی خلیوں کی ہے اور دوسری جنسی ۔ جہاں تک ساخت کا تعلق ہے دونوں ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں ۔ خلیہ کے بیچ میں ایک مرکزہ (Nucleus) ہوتا ہے جس میں کروموسوم یا لونی ریشے یا توریثی ریشے ہوتے ہیں ۔ مرد میں ان کی تعداد ۴۷ اور عورت میں ۴۸ ہوتی ہے ۔ ہم جنسی سے پہلے ہر ایک جنسی خلئے کے ریشے دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں ۔ یعنی مرد کے دو ثانوی جنسی خلیوں میں سے ایک میں ۲۴ اور دوسرے میں ۲۳ ، اور عورت کے دونوں میں ۲۴ ، ۲۴ ریشے ہوتے ہیں ۔ جب مرد کا ۲۴ ریشوں والا خلیہ عورت کے خلئے سے ملتا ہے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے اور جب ۲۳ والا ملتا ہے تو لڑکا ۔ ان ریشوں کے اوپر چھوٹے چھوٹے خیالی طاق ہوتے ہیں جنہیں ہم جین (Gene) کہتے ہیں ۔ ایک جین ایک خصوصیت کا حامل ہوتا ہے ۔

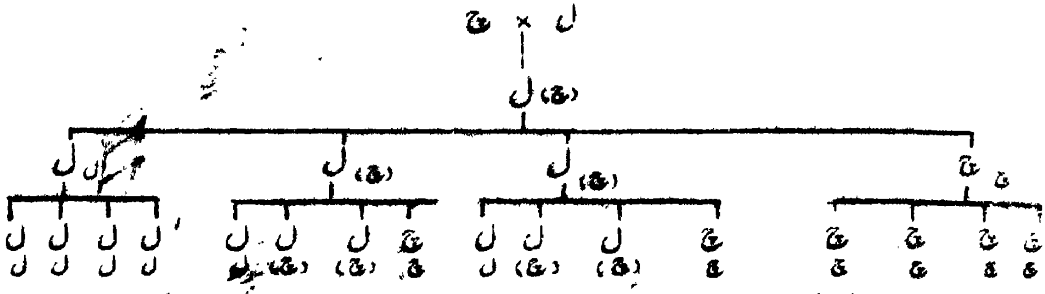
کیونکہ لڑکی کے حصہ میں ۴۷ ریشے آتے ہیں اس لئے یقیناً وہ کمزور ہوتا ہے اور عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑکوں کی شرح اموات زیادہ ہوتی ہے ، قدرت اس کمی کو یوں پورا کرتی ہے کہ لڑکے پیدا زیادہ ہوتے ہیں ۔ اگر بیس سال سے کم عمر کے بچوں کو گنا جائے تو زیادہ تعداد لڑکوں کی ہوگی ۔ بیس سے چالیس تک تقریباً برابر اور چالیس سے اوپر لڑکیاں زیادہ ہونگی ۔ یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پانچ ماہ تک ماں کے پیٹ میں بچہ مرد اور عورت دونوں کی جنسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے ، بعد میں جیون رس یا ہارمون کے اثر سے مرد یا عورت میں تبدیل ہو جاتا ہے ، یعنی وہ فرد جس میں ۴۷ ریشے ہونگے اس کو ہارمون مرد بنا دیں گے ۔ "تیسری جنس" اس وقت وجود میں آتی ہے جب مخالف جیون رس عمل کردیں ۔ ایسا کم ہوتا ہے ۔

وراثت پر عملی تحقیقات سب سے [illegible] مینڈل نے پچھلی صدی میں کی ۔ اس نے مٹر کے ایک لمبے اور ایک چھوٹے پودے کو خلط کرایا ، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بچے لمبے [illegible] ہوئے اور جب ان لمبوں کو خلط کرایا تو تین لمبے اور ایک چھوٹا وجود میں آئے ۔ ان

[illegible] بچے پیدا ہوئے، دو کے والدین کی طرح تین لمبے اور ایک چھوٹا۔ البتہ چھوٹا خالص نکلا۔
ذیل نقشے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائیگی۔

ل = لمبا اور چ = چھوٹا

قوسین میں جو چ کا حرف ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لمبا چھوٹائی کا عنصر لئے ہوئے نکلا یعنی خالص نہ تھا۔



اس نقشے سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ 'ل' غالب ہے، اور 'چ' مغلوب۔ یہی قانون حیاتیات کے دونوں شعبوں نباتات اور حیوانیات میں اسی طرح رائج ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ درجات بنجاتے ہیں، مثلاً سرخ اور سفید پھول کے پودوں کو ملاپ کرایا جائے تو سرخ، ہلکا سرخ، سفیدی مائل اور سفید بچے پیدا ہونگے، مگر یہ کم ہوتا ہے۔

آئیے ہم اس قانون کی روشنی میں انسانی جسم کا مطالعہ کریں۔

آنکھ۔ گہرا رنگ غالب ہے ہلکے پر۔ سیدھی ٹیڑھی پر، چینی فرنگی پر، چوڑی پتلی پر، بند عام پر، لمبی پلکیں چھوٹی پر۔

بال۔ انگوٹھی نما غالب ہیں گھونگریالے پر، گھونگریالے لہرداروں پر، لہردار سیدھے بالوں پر، سخت ملائم پر، بالوں کے متعلق یہ یاد رکھئے کہ ان کا فطری رنگ سفید ہے، بچپن میں سفید بالوں پر ہلکا رنگ چڑھ جاتا ہے، جوانی میں وہ گہرا ہو جاتا ہے۔ مگر بڑھاپے میں پھر ہلکا ہونا شروع ہوتا ہے، اور سفید رنگ رہجاتا ہے۔ بعض بیماریاں اور شدت غم یکدم کالے بالوں کو سفید کر دیتے ہیں۔

ناک۔ رومن، وسط ایشیائی پر غالب ہے، اونچی نیچی پر، موٹی پتلی پر، سیدھی ٹیڑھی پر۔

کھال۔ کھال کے رنگ کا دارومدار مادہ پر ہے۔ آب و ہوا کا بھی اس پر کافی اثر پڑتا ہے، ویسے گہرا رنگ ہلکے پر غالب ہے۔

کان۔ لمبے غالب چھوٹے پر، چوڑے پتلے پر، علٰحدہ جڑے ہوئے پر۔

ہونٹ۔ چوڑے غالب پتلے ہونٹوں پر۔

دانت۔ چھوٹے غالب بڑوں پر۔

جبڑا۔ چھوٹا غالب بڑے پر، باہر کا نکلا ہوا مغلوب ہوتا ہے۔

قد۔ چھوٹا غالب ہے لمبے پر۔ اس پر آب و ہوا کا بھی کافی اثر پڑتا ہے، اگر کوئی جاپانی امریکہ پہنچ جائے تو اس کے بچے لمبے ہونگے، بالآخر مناسب قد ہو جائیگا، یہی حال حبشیوں کا جاپان پہنچ جانے پر ہوگا۔ دراصل قد میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

سر۔ لمبا مغلوب ہے، ویسے اس کی شکل کا انحصار سونے کی عادت وغیرہ پر ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جسم کے ہر حصے پر آب و ہوا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولئے کہ بہت سے جنین ساتھ ملکر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ عمل اور ردعمل سے ایک مرکب تیار ہوتا ہے جسے فرد کہتے ہیں۔

بیماریاں۔ کوئی بیماری توریثی نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کا اثر بچوں پر پڑے۔ مثلاً آتشک توریثی بیماری نہیں ہے

مگر ایسے مریض کے بچے بدصورت پیدا ہونگے۔ بات یہ ہے کہ فعلیاتی بیماریاں عموماً جین میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ مگر بیماریاں بذات خود منتقل نہیں ہوتیں، بلکہ ماں سے بچے کو لگتی ہیں۔

بعض خصوصیات کسی جنس سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اندھرنگی کو عموماً مردوں سے لگاؤ ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ مغلوب خصوصیت ہے ورنہ نہ جانے کتنی بڑی تعداد ایسی ہوتی جو رنگوں کو پہچان بھی نہ سکتی۔ اسی طرح گنجاپن مردوں میں غالب خصوصیت اور عورتوں میں مغلوب، یہی وجہ ہے کسی گنجے کے لڑکے عموماً گنجے ہوتے ہیں۔ عورتیں نہیں ہوتیں۔

دماغ۔ بیوقوفی اور کند ذہنی کو بعض توریثی کہتے ہیں بعض تغذیہ اور ماحول کی خرابی پر محمول کرتے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں دماغ کا ورثہ سے تعلق ضرور ہے مگر ماحول اور غذا کافی اثر انداز ہوتے ہیں، مالیخولیا اور جنون غالباً وراثتی ہیں۔

عمر۔ اس کا تعلق پیشہ اور غذا دونوں سے ہے، غریبوں میں بچے زیادہ ہوتے ہیں مگر مرتے بھی بہت ہیں۔ کسان اور مالی کی عمر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد سادھو اور زاہد کی، اس کے بعد پیشہ وروں کی اور سب سے کم عمر دماغی کام کرنے والوں مثلاً استاد، وکیل، ڈاکٹر وغیرہ کی۔

انسانوں میں کالے جینین بھی پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ذیابیطس، بہرہ پن، اندھرنگی وغیرہ فعلیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

خون۔ ابھی حال میں، انسان کے خون پر تحقیقات ہورہی ہے، جن میں امریکہ پیش پیش ہے، خون چار قسم کا ہوتا ہے اور ان چار کی بھی اور قسمیں ہیں۔ خون کا تجزیہ کرکے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس بچے کا باپ یا ماں کون ہے۔ آیا وہی جو دعویدار ہے یا کوئی اور۔ امریکہ میں حرامی بچوں پر اس کو آزمایا گیا۔ ایک بچے میں س قسم کا خون تھا اور اس کی ماں میں ا قسم کا اور اس کی ماں کا جو شوہر تھا اس کا خون د قسم کا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کیونکہ ا اور د کے امتزاج سے س قسم کا خون نہیں پیدا ہوتا اس لئے بچہ کسی اور کا تھا تحقیقات پر یہ بات سچ معلوم ہوئی اور عورت نے خود اقبال کرلیا۔

موسیقی۔ یہ غالب خصوصیت ہے، بہت سے ایسے خاندان گذرے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ اس فن میں ماہر ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً استاد فیاض خاں ماں کی طرف سے تان سین کی اولاد ہے اور اس کا بیان ہے کہ اس کے نانا اور ان کے آبا تمام مغنی تھے۔ ایسے خاندان یورپ میں بہت سے موجود ہیں۔

جرائم۔ آوارگی، شراب خوری اور بدکرداری کا بالواسطہ وراثت سے تعلق نہیں ہے اگر کچھ ہے تو بلاواسطہ ہے۔ مثلاً اگر کسی آدمی کے دماغ کی ساخت جرائمی ہو تو اس کے بچوں میں بھی ممکن ہے ایسا دماغ منتقل ہو جائے۔ راقم الحروف کے خیال میں صرف ماحول اور تربیت کی خامی کی وجہ سے یہ بری خصوصیات فرد میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے کہ شراب خواروں کی اولاد عموماً غصہ ور ہوتی ہے، راقم نے خود اس کا کافی مطالعہ کیا ہے، مگر ایسا کیوں ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتا، شاید اس وجہ سے کہ شرابی کے بچے بیماریوں کو جلد قبول کرلیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہتی ہے اور خرابیٔ صحت سے مزاج چڑچڑا ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔

آپ شاید یہ سنکر متعجب ہوں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ہستی ہو جو مکمل مرد یا مکمل عورت ہو۔ مردوں میں نسوانیت اور عورتوں میں مردانہ پن کافی پایا جاتا ہے۔ تفصیلاً پروفیسروں میں پچاس فیصدی، طلبا میں تیس، زاہدوں اور کسانوں میں دس فیصدی نسوانیت ہوتی ہے۔ اسی طرح استانیوں میں پچاس، طالبات میں تیس اور گھریلو عورتوں میں دس سے بیس فیصدی تک مردانہ پن ہوتا ہے۔ گھبرایئے نہیں یہ کوئی بری علامت نہیں ہے۔

اب میں آپ کی توجہ ایک دوسری طرف مبذول کرتا ہوں اور وہ ہے قوم و نسل۔ سائنسداں قوم اور نسل سے انکار کرتے ہیں۔

دراصل دنیا میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں ہے جو "خالص خون" رکھتا ہو۔ خون کی آمیزش ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہیگی۔ سب سے پہلے جرمنی سے آریہ نسل کی برتری کی تشہیر ہوئی، جسے ہمارے ہندستانی بھائیوں نے من بھاتا کھاجا دیکھ کے جلد قبول کر لیا ہے۔ گوبنیو نے آریہ ان افراد کو کہا ہے جو آریائی زبانیں بولتے ہیں اس کی مراد کوئی نسل نہیں تھی، مگر لوگوں نے آریہ ایک نسل کا نام رکھ لیا۔ راقم الحروف کا خیال جو موجودہ تحقیقات پر مبنی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے عراق کے شمال میں اور بحیرہ خزر کے جنوب میں انسان ارتقا حاصل کر کے موجودہ شکل میں نمودار ہوا۔ اس کو تقریباً پچیس ہزار سال ہوتے ہیں۔ اس کی شاخیں ہر سمت پھیلنی شروع ہوئیں وہاں ماحول اور آب و ہوا کی وجہ سے ان کے جسم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ان میں سے اکثر نے پھر ترک وطن کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان سب نسلوں میں ہمیشہ سے اختلاط رہا اور ہمیشہ رہیگا۔ جہاں تک جسم اور دماغ کی ساخت کا تعلق ہے "آریا" اور "سامی" ایک جیسے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروپ کے دو نام ہیں۔ پھر یہ دو نسلیں کیسے بن گئیں۔ اگر کوئی عرب جسے لوگ سامی کہتے ہیں چین چلا جائے تو چینی شکل اختیار کر لیگا۔ دراصل نسل وغیرہ ڈھکوسلے ہیں جو غالب افراد پر ٹھونس دیتے ہیں۔ زیادہ محنتی اور جفاکش انسان غالب آ کر مغلوب میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لئے اسے کم نسل کہتے ہیں تاکہ غریب میں ابھرنے کے غیر شعوری امکانات بھی نہ رہیں، جیسا ہندستان میں اچھوتوں کے ساتھ سلوک ہوا۔ اگر نسل کوئی مقررہ وجود ہوتا تو آخر حبشی امریکہ پہنچکر جہاں انھیں اعلیٰ تعلیم ملی اتنے عالی دماغ بن گئے۔ اگر شودروں اور دراوڑوں کو اعلیٰ تعلیم ملے تو وہ بھی اعلیٰ انسان بن جائیں۔ وہ اچھوت جو مسلمان یا عیسائی ہو گئے اور تعلیم حاصل کر لی، تاریخ شاہد ہے کہ رہبر بنے۔ ضرورت ہے کہ اس طلسم کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا جائے۔ انسان کی بقا ہی اسی میں ہے کہ مختلف گروہوں کے لوگ آپس میں شادیاں کریں تاکہ ان کے بچے دوغلے پیدا ہوں۔ یاد رکھئے دوغلا بچہ ہمیشہ یک نسلی سے زیادہ طاقتور اور عالی دماغ ہوتا ہے کیونکہ وہ دو گروہوں کی غالب خصوصیات اخذ کر لیتا ہے اور یہ کچھ قانون قدرت ہے کہ غالب خصوصیات عموماً اچھی ہوتی ہیں۔ ایک ہی خاندان میں ہمیشہ شادی کرتے رہنا جنوں کو دعوت دینا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خاندان میں ہی شادیاں کرنے لگے۔ ایسی قوم ہمیشہ فنا ہو جاتی ہے۔ رومن، اطالوی، مصر اور یونانی تہذیبوں کا حشر کس قدر خوفناک ہو چکا ہے۔ اگر آپ صحت مند اور اعلیٰ دماغ بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اپنے محدود خاندان سے علیحدہ ایسے خاندان میں شادیاں کیجئے جو اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہو۔ اس سے نئی اور اچھی خصوصیات وجود میں آئیں گی۔ رشتہ داری جتنی قریبی ہوگی اتنی ہی شادی کے لئے نقصان رساں ہوگی۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرے۔ عموماً مسلمانوں سے زیادہ عالی دماغ ہندوؤں میں ہے۔ آخر کیوں؟ ہندوؤں میں بھی قوم کا جھگڑا ہے، جس کی وجہ سے صرف ایک ہی قوم کی خصوصیات گھومتی رہتی ہیں۔ یہ بھی باقی نہ رہنا چاہئے۔ یاد رکھئے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"۔ ملت یا قوم کا دار و مدار تہذیب اور ہمخیالی پر ہے۔ نسل اور جغرافیائی حدود بے مطلب باتیں ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے کے بعد آج ہندوستان کی سیاسی گتھی بھی سلجھ سکتی ہے۔

عموماً محبت کی شادیاں ناکام رہتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہر فرد اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، جسمانی خصوصیات کے علاوہ ایک دوسرے سے قطعاً آگاہی نہیں ہوتی۔ فریب پر فریب اور پردہ پہ پردہ پڑتا رہتا ہے محض جنسی خواہش کا غلام بن کر آدمی شادی کر بیٹھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنسی خواہش پوری ہونے کے بعد کوئی لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ ایسے لوگ معاشرہ کی زنجیروں کو توڑ پھینکتے ہیں اور سماج کی قدر نہیں کرتے۔ نتیجہ وہی ناکامی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شادی پسند کی نہ کی جائے بلکہ سوچ سمجھ کر اور پرکھ کر کرنی چاہئے، خاندانی خصوصیات کا مطالعہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس فرد کا۔ سماجی زنجیروں میں لچک پیدا کیجئے، مگر بالکل اتار نہ پھینکئے کہیں ایسا نہ ہو "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم"۔ (باقی صفحہ ۴۶ پر)

وحیدہ عزیز

بہشت و دوزخ

(ڈینٹے کے نقطۂ نظر سے)

یورپ کی تہذیب کی تاریخ کو چار ابواب میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کے زیرِ عنوان چار عظیم الشان شاعروں کے نام ہیں۔ پہلا باب قرونِ قدیمہ کی تہذیب پر مشتمل ہے جس کا خلاصہ ابوالآبائے شاعری ہومر کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا دور قرونِ وسطیٰ کے نام سے موسوم ہے اور اس دور کی روحِ رواں اٹلی کے شاعرِ اعظم ڈینٹے کی تصانیف ہیں۔ تیسرا دور پہلے دور کی علمی و ادبی تجدید تھا، اس وجہ سے احیاء العلوم کا نام دیا جاتا ہے اس کا نمائندہ فنِ ڈرامہ کا استادِ کامل شیکسپیئر ہے، چوتھا دور زمانۂ حاضرہ کا ہے جو اٹھارویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے اور اگرچہ جنگِ عالمگیر نے دنیا کی تہذیب میں ایک انقلابِ عظیم برپا کیا ہے، لیکن یہ کہنا حقیقت سے بعید نہیں کہ اس چوتھے دور کی خصوصیات تمام و کمال باقی ہیں۔۔ اس دور کے ذہنی ارتقا کا مظہرِ کامل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے آج بھی عصرِ جدید کا مجدد مانا جاتا ہے۔

یورپین تہذیب کے ان ارکانِ اربعہ میں سے دوسرا رکن یعنی ڈینٹے اس وقت ہمارا موضوعِ بحث ہے، وہ اٹلی کے مشہور خوبصورت شہر فلورنس میں ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ ڈینٹے اٹلی کے پرانے خاندان "فرنگی پانی" سے تعلق رکھتا ہے، مگر شاعر خود اپنا سلسلۂ نسب بہادر کیسا گیڈا سے ملاتا ہے جس نے ایلڈیگری سے شادی کی تھی اور جو شہنشاہ کانرڈ سوم کے ساتھ مذہبی جنگ کے دوران میں شہید ہوا۔ شاعر کا باپ اٹلی کا زبردست وکیل تھا اور خاندانی ہونے کے باعث قرب و جوار میں ہر دلعزیز تھا۔ ڈینٹے کے زمانۂ طفلی کے متعلق ہمیں زیادہ معلوم [illegible] صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے ذہین عالی دماغ اور برنٹوٹینی کا شاگرد تھا۔

ڈینٹے کے کلام کی دلچسپی کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ اس سے زمانہ کی معاشرت، تہذیب و تمدن اور مذہبی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی مشہور نظم "زمزمۂ قدس" میں ہمیں سارے عالم کے اندر ایک حیرت انگیز سفر کراتا ہے کہیں تو وہ ہمیں تحت الثریٰ میں پہنچاتا ہے اور کہیں عالمِ بالا میں عالمِ سیارگان سے بھی پرے پہنچاتا ہے [illegible] اس لحاظ سے ہمیں حیرت انگیز اور مافوق العادت معلوم ہوتی ہے کہ تیرھویں صدی میں طبقاتِ عالم کے متعلق دنیا کی [illegible] احاطہ اتنا وسیع نہ تھا جتنا آج ہے۔

ڈینٹے کے زمانہ کے نقوش کو اگر ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باغِ عدن دریائے گنگا سے پرے کہیں [illegible] واقع ہے جس کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہے اس لئے اس تک پہنچنا ناممکن ہے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ طارطاش جہاں مُردوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں، زمین کے اندر ہے اور اس خیال کی بنا پر اکثر مسیحی مفسرین نے دوزخ کو زمین کے اندر قرار دیا ہے۔

ڈینٹے کے عشق و محبت کا افسانہ بھی اس ذیل میں ہے کہ ڈینٹے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بیٹرس سے متعلق جس سے اُس کی محبت پرستش کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہا ہے۔ [illegible] جس طرح بادشاہ بے نوا گداؤں سے نفرت کرتے ہیں اور گدا بار بار انہیں کے [illegible]

شمع پروانوں کی دشمن ہے اور پروانے چھا چھا کے اس پہ دم توڑنے آجاتے ہیں اسی طرح بیٹرس میں بھی ہر پھر کے تیری ہی حریم نازکے سائے میں دم لیتا ہوں "

مذکورہ نظم " زمزمۂ قدس " کے افتتاحی سین میں شاعر نے اس تکلیف کا خاکہ کھینچا ہے جب وہ ایک تاریک اور خوفناک جنگل سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، مگر تین جنگلی جانور اس کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں اس وقت بیٹرس ان پر رحم کھا کر بہشت سے ورجل کو اس غرض سے وہاں بھیجتی ہے کہ وہ اسے دوزخ اور اعراف سے گذار کر دوسری طرف پہنچادے۔ اس استعارہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی روح گناہوں کے جال اور غلط کاریوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ فلسفہ اسے استغفار کے راستہ پر لیجاتا ہے اس کے بعد اس کی آنکھیں نیکیوں کے سرچشمہ یعنی خدا کا مشاہدہ کرتی ہیں۔

جس وقت ڈینٹے اور ورجل دوزخ کے دروازے سے نکل کر تحت الثریٰ میں اترتے ہیں شفق کی سرخی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے، مگر زمین کے نیچے کے طبقہ میں تاریکی ہوتی ہے۔ اس سے مراد گناہ کی تاریکی ہے۔ وہاں ستارے نہیں چمکتے، سورج نہیں نکلتا۔ ہر طرف اندھیری اندھیرا چھایا ہوا ہوتا ہے دروازہ پر روح کا امتحان ہوتا ہے۔ دوزخ بہت بڑی مخروطی شکل کی ہے جس کے اندر سیکڑوں ستون ہیں۔

جن لوگوں نے زیادہ خوفناک جرم کئے ہیں، ان کے بوجھ زیادہ بھاری ہوتے ہیں، ان طبقات تک پہنچنے کے لئے جہاں ان کی روحیں ہوتی ہیں ڈینٹے کو ڈیس کے شیطانی شہروں کی فصیلوں کے اندر سے گذرنا پڑتا ہے۔ جن کے محافظ خدائی قہر کے مجسمے ہیں۔ راستے میں اسے ایک خون کی بہتی ہوئی ندی نظر آتی ہے اور ایک خوفناک جنگل جس میں انسان کی صورت کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ یہ ظالموں، بدکاروں، مفسدوں اور مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنیوالوں کی روحوں کا مسکن ہے۔ اس جگہ ورجل کا اشارہ پاکر ایک صورت نمودار ہوتی ہے جس کا بدن ایک بہت بڑے اژدھے سے ملتا جلتا ہے، جونہی وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہوکر وہاں سے گذرتا ہے تو اسے چور، مکار، مفسد اور جادوگر وغیرہ سزا پاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں روحیں پہلے طبقات کی بہ نسبت زیادہ غلیظ ہوتی ہیں آگے چل کر انھیں ایک عمودی گہرائی سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں ایک بڑا دیو انہیں اتار کر نیچے لیجاتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بخدھار پر چل رہے ہیں۔ اس جھیل کے اندر اُن لوگوں کی روحیں غرق ہیں جنھوں نے پاس نمکی کی اور اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں سے غداری کی۔ اس تاریک کرۂ ہوائی میں ڈینٹے کو ایک چیز نظر آتی ہے جسے وہ پن چکی سمجھتا ہے جس کی گردش سے برف کی طرح سرد ہوا پیدا ہوتی ہے، لیکن نزدیک پہنچکر اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام بدیوں کے منبع شیطان سے پُر ہیں۔ کسی زمانہ میں وہ عالم بالا پر فرشتوں کا استاد تھا اب تمام گناہوں کا مرکز و منبع ہے۔

تیسری شام کو ڈینٹے چٹان کے آخری زینے پر سو جاتا ہے اور دن نکلنے پر اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر پاتا ہے۔ درختوں پر پرندے چہچہاتے ہیں۔ زمین پر پھول اُگے ہوئے ہیں اور شفاف پانی کی ندیاں بہ رہی ہیں۔ درحقیقت وہ اعراف کے چبوتروں سے بھی بالائی کرۂ ہوائی میں پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ جب وہ طلوع ہونیوالے سورج کی طرف دیکھتا ہے تو دھیمی دھیمی رفتار سے چلنے والی بادنسیم اس کے چہرے سے مس کرتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ طبقات کی گردش کا اثر ہوا پر بھی پڑتا ہے اور ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ فردوس بریں کو اس جگہ قائم کرنے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہاں ڈینٹے اپنی محبوبہ بیٹرس کو دیکھتا ہے اور ورجل انھیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اب وہ بہشت کی طرف

روانہ ہوتے ہیں۔ یہاں ڈینٹے نے ستاروں کی کیفیت نہایت ہی دلچسپ طریقہ میں بیان کی ہے، اس کے بعد دونوں فلک اولی پر پہنچتے ہیں جس کو بیٹرس ایک گلدستہ سے مشابہ قرار دیتی ہے۔ یہاں محبت اور خوشی حکمراں ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں تمام شکوک رفع ہوجاتے ہیں اور اعلیٰ ترین نیکی (یعنی خدائے بزرگ) کے سامنے تمام خواہشیں پوری ہوجاتی ہیں۔

(ماخوذ از "ڈیوائن کامیڈی")

(بقیہ توریث)

شادی پسند کی کیجئے چاہے جہاں کیجئے، مگر ان قیود کو سلامت رہنے دیجئے جنھیں رسم نکاح کہکر یورپ والے مذاق اڑا کر گمراہی میں جارہے ہیں۔ تاکہ آپ میں ایک دوسرے سے لاشعوری طور سے مغائرت نہ ہو۔

مجھے افسوس ہے کہ میں طوالت کے خوف سے بہت سی جزئیات نظرانداز کرگیا۔ صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ فرد میں بعض ایسی نئی تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں جن کا تعلق ماں باپ سے نہیں ہوتا۔ ایسی تبدیلیوں کو اگر وہ توریثی بنجائیں، یعنی آئندہ نسلوں میں بھی چل نکلیں، ہم تغیر کہتے ہیں۔ اس پر آئندہ بحث ہوگی۔

نقد و نظر

اشاعتِ اسلام (حصہ اول)

مؤلف :- حافظ مولوی سید جلال الدین احمد جعفری -
ناشر :- مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات، قیمت عہ -

حافظ مولوی سید جلال الدین احمد صاحب اپنے مخصوص علمی و ادبی ذوق کی بنا پر ہندوستان کے ان مشاہیر ارباب علم میں شامل ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے، موصوف کی عمر کے عزیز ترین لمحات تصنیف و تالیف ہی کی نذر ہوئے ہیں اور کبر سنی کے باوجود اب تک یہ محبوب مشغلہ جاری ہے، اشاعت اسلام حصہ اول موصوف کے تازہ رشحات قلم کا نتیجہ ہے: اسلام ہمہ گیر مذہب ہے، وہ فاران کی چوٹیوں پر چمکا اور ساری دنیا کو اپنی تنویروں سے روشن کر دیا، وہ طوفان کی طرح عرب کی ریگستانی سرزمین سے امنڈا اور پورے کرۂ ارض کو اپنی لہروں سے سیراب کرتا چلا گیا، اتنے بڑے اور عظیم مذہب کے متعلق یہ بنیادی سوال عام طور پر مختلف دماغوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے کہ آخر اسلام پھیلا کیونکر؟ اور اتنی سرعت کیساتھ وہ کیونکر کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ تک جا پہنچا؟ وہ لوگ جو صرف جذبات کی رو میں بہ کر ظاہری حالات سے بحث کیا کرتے ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت میں اول سے آخر تک تلوار کی چمک اور خون کی سرخی کام کرتی رہی ہے، اس سے انکار نہیں کہ تلوار اور خون کو بھی اشاعت اسلام میں خاص مرتبہ حاصل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی اشاعت کو صرف انہیں چیزوں تک محدود رکھا جائے، تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا، اہم، اور بنیادی ذریعہ اس کے متبعین کا وہ اخلاق اور استقلال ہے جو انہیں مصائب کے مقابلہ میں پہاڑ کی سی مضبوطی عطا کر دیتا تھا، ان کی وہ صداقت اور ایثار پیشگی ہے جو انہیں دشمنوں میں بھی مقبول بنا دیا کرتی تھی فاضل مصنف نے بڑی قابلیت سے اس مسئلہ پر مختلف تاریخی واقعات و شواہد کی روشنی میں بحث کی ہے اور بڑی خوبی سے اس مشکل سوال کا جواب دیا ہے، زبان نہایت سلیس اور انداز تحریر بیحد شگفتہ ہے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے مطالعہ میں رہے اور اسلامی مدارس میں بطور نصاب تعلیم اسے داخل کیا جائے، ٹائیٹل رنگین اور جاذب نظر، کتابت و طباعت بہت روشن اور دیدہ زیب ہے۔

شہیدِ حق

مولف :- پروفیسر سید نواب علی ایم، اے
ناشر :- نظامی پریس لکھنو، ضخامت ۱۰۸ صفحات، قیمت عمر

علامہ نواب علی ایم، اے نہایت بالغ نظر مصنف ہیں وہ مشرقی و مغربی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اسی کیساتھ قدرت نے تصنیف و تالیف کا نہایت پاکیزہ ذوق بھی ودیعت کیا ہے زیر نظر کتاب انکی تازہ ترین تالیف ہے جس کو نظامی پریس نے پورے حسن صورت کیساتھ منظر عام پر پیش کیا ہے اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ کربلا کا خونی واقعہ اعلائے کلمۃ الحق، حریت فکر و رائے، آزادی ضمیر، اور اسلام کے نظریہ حکومت کی بہترین تبلیغی مثال ہے شروع میں حضرت مسیح کے ابتلا کا کربلا کے مہیب واقعات کی پوری کامیابی کیساتھ مقابلہ کیا گیا ہے پھر واقعات کربلا کے ماخذوں سے گفتگو کی گئی ہے مولف کی نگاہ نے ہر عنوان کا پوری وسعت، اور عمق کیساتھ جائزہ لیا ہے۔ ترتیب اور انداز بیان نہایت دلچسپ اور موثر ہے، مؤلف نے جس عنوان پر قلم اٹھایا ہے اس پر نہایت وسیع معلومات پیش کی ہیں، دوران تحقیقات میں مغربی مصنفین کی دماغی کاوشوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اس خصوصیت نے کتاب کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا ہے -

اسلام کا نظامِ سیاست و عدالت

مؤلف: یعقوب الرحمٰن عثمانی، ناشر: نفیس اکیڈیمی عابد روڈ حیدرآباد دکن، [illegible]

سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سیاست و جہانبانی کے بنیادی اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں ایک مسلم فرمانروا جب تک وہ سچا مسلمان ہے انھیں اصولوں و ضابطوں کا پابند رہے گا رعایا کیساتھ بھی ایک مسلمان فرمانروا کا اصولِ سیاست و عدالت وہی ہوگا جس کی قرآن و حدیث میں تعلیم دی گئی ہے۔ اسی لیے مسلم تاجداروں کے دورِ حکومت میں غیر مسلم رعایا ہمیشہ پوری مذہبی اور سماجی آزادی کیساتھ زندگی بسر کرتی رہی ہے لیکن اس عنوان پر عوام کا مطالعہ بالکل محدود ہے اور جو لوگ پاکستان پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ یہ جاننے کے خواہشمند رہتے ہیں کہ پاکستانی حکومت میں غیر مسلم رعایا کے متعلق مسلم عہدیداروں کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی نے اس کتاب میں پوری وسعتِ نظر کیساتھ اس اہم اور ضروری سوال کے مالہٗ و ماعلیہ کا جائزہ لیا اور بڑی خوبی سے اسلامی سیاست و حکومت کے اصول پر بحث کر کے اسلامی عدالت کی تاریخ بیان کی ہے مصنف نے دلپذیر اندازِ تحریر میں وزنی دلائل کیساتھ ثابت کیا ہے کہ مذہب نے مسلم فرمانرواؤں پر عدل و انصاف اور سیاست و جہانبانی کے سلسلہ میں کس قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں اور ایک مسلم تاجدار اپنی رعایا کے مختلف طبقات پر حکومت کرنے کے لئے کن اصول و ضوابط کا پابند ہے مصنف کی نظرِ وسیع، مطالعہ عمیق، اور ماخذوں کی دنیا غیر محدود ہے اور کتاب کے لئے ایک عظیم الشان علمی پس منظر موجود ہے، کارکنانِ نفیس اکیڈیمی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی قیمتی کتاب شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مقالاتِ جمال الدین افغانی
عربی مقالات کا اردو ترجمہ

مترجم:- مبارز الدین رفعت، ایم، اے
ناشر:- نفیس اکیڈیمی حیدرآباد دکن، ضخامت ۲۵۱ صفحات قیمت [illegible]

علامہ جمال الدین افغانی کی شخصیت عالمِ اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ ایک پرجوش مجاہد، مشہور مفکر، اور بیدار مغز عالم تھے شیخ محمد عبدہ اور سعد زغلول جیسی ہستیوں نے ان کے فیضان سے تمتع حاصل کیا، علامہ کی تحریر میں جوش، اثر، درد، تڑپ اور ایک خاص قسم کا کرب ہے وہ امتِ مسلمہ کے زوال اور اس کی اخلاقی انحطاط پر جب کچھ لکھتے ہیں تو الفاظ سے یہ کرب اور درد صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے، مقالاتِ جمال الدین افغانی، علامہ ممدوح کے بارہ مقالات کا نہایت سلیس اور عام فہم ترجمہ ہے جس کو مبارز الدین رفعت ایم اے عثمانیہ نے براہ راست عربی سے ترجمہ کیا ہے فاضل مترجم نے اصل زبان کی روح اس کی روانی، سلاست اور اثر کو برقرار رکھنے کی اس قدر کامیاب کوشش کی ہے کہ ترجمہ نے ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عربی الفاظ کے مقابلہ میں اردو کے ایسے سلیس شیریں، اور بامحاورہ الفاظ منتخب کئے ہیں جن کے اجتماع نے کتاب میں ایک تصنیف کی سی شان پیدا کر دی ہے علامہ کے ان مقالات کے لئے رفعت ایسا فاضل مترجم نفیس اکیڈیمی کو نہ ملتا تو کتاب کی افادی حیثیت کبھی اتنی مکمل نہ ہوتی جتنی اب ہے عربی زبان سے ایسا بے تکلف ترجمہ کر لینا بہت مشکل ہے، گرد پوش رنگین، طباعت و کتابت نہایت روشن۔

رگِ سنگ

مصنف:- علی جواد زیدی ناشر:- اشاعت گھر حیدرآباد دکن۔
کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ نفیس، گرد پوش فن کا اعلیٰ نمونہ، ضخامت ۲۰۹ صفحات قیمت [illegible]

رگِ سنگ علی جواد زیدی کا مجموعۂ کلام ہے۔ علی جواد ملک کا ہوشمند، بالغ نظر اور حقیقی ترقی پسند شاعر ہے۔

ں سنگ "مجموعہ آج سے پانچ چھ سال قبل کی نظموں کا مجموعہ ہے اور جس کی بیشتر نظمیں شاعر نے جیل میں لکھی ہیں، تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعر انداز فکر میں گہرائی، مشاہدہ میں وسعت اور زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے جس کے باعث رگ سنگ کی تقریباً تمام نظمیں ہر زمانہ میں چھا جانے والی طاقت اپنے اندر رکھتی ہے۔ ہماری دانست میں وہی ادب ترقی پسند ہے جو ہر زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ گذشتہ چند سالوں میں ترقی پسند ادب کے نام سے جو ادب پیش کیا گیا ہے افسوس ہے کہ وہ سب کا سب ترقی پسند نہیں، ملک کو آج زندہ اور صحت مند ادب کی ضرورت ہے۔ رگ سنگ کا مصنف نہ تو ماضی کی اقدار سے گریز پا ہے اور نہ حال کی گمراہ کن رَو میں بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے بہت سوچ سمجھ کر کہتا ہے فکر و عمل اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اعتدال پسندی رگ سنگ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ نظموں میں بلا کی روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ یوں تو رگ سنگ کی ہر نظم قابل مطالعہ ہے مگر نیا موڑ، وصیت، چند مناظر، تصویر کا دوسرا رخ اور منزلیں جیسی بہترین نظمیں بطور خاص قابل مطالعہ ہیں۔ جن میں بھی جواد زیدی کا اپنا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔

کارکنان اشاعت گھر اس قابل قدر مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

پاکستان نمبر

قیمت ۱۲ ؎ - مرتبہ :- ڈاکٹر سید محمود۔
ملنے کا پتہ :- دفتر نئی زندگی آلہ آباد۔

ماہنامہ نئی زندگی الٰہ آباد کے ارباب انتظام نے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یعنی "پاکستان" پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جو ۲۵۲ صفحات پر محیط ہے تقسیم کے لحاظ سے یہ نمبر دو کتابوں پر مشتمل ہے۔ کتاب اول نئی زندگی کے مدیر مسٹر عبدالرحمٰن کے تین قیمتی مضامین پر ختم ہوتی ہے۔ کتاب دوم کی ترتیب میں ہندستان کے مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔ اس کتاب میں گیارہ مضامین ہیں، جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کا مضمون "پاکستان پر اجتماعی نظر" کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ دوسرے مضامین بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ البتہ مولانا حسین احمد صاحب کا مضمون ایسا رکن عرضی حیثیت رکھتا ہے جو صرف وزن پورا کرنے کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ شعر کی روح پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑا۔ مولانا کے علمی تبحر سے انکار نہیں مگر ان کی یہ کاوش چند اخبارات کے اقتباسات تک محدود ہے جو دوسروں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پاکستان کے مسئلہ پر نہایت عمیق غور و فکر کی ضرورت ہے جو اس مضمون میں مفقود ہے۔ پاکستان نمبر اپنے پیش نہاد مقاصد کے اعتبار سے کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ اس میں یہ کمی ضرور ہے کہ مخالف نقطۂ نظر کی نمائندگی نہیں کی گئی جو لوگ مختلف عنوانات پر سیاسی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں ہم ان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ نئی زندگی کے "پاکستان نمبر" کو ضرور پڑھیں۔

ماہنامہ "حکیم دکن" (درد نمبر)

مرتبہ :- حکیم محمد ظفرالدین ناصر، ملنے کا پتہ :- محلہ مغل پورہ، حیدرآباد دکن
زر سالانہ بیرون حیدرآباد ۳ ؎ - فی پرچہ ۵ ؍

حکیم دکن، حیدرآباد دکن کا ایک بہترین طبی رسالہ ہے جو نہایت پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت حکیم دکن کا درد نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ "درد نمبر" ہر قسم کے دردوں کی تفصیل، ان کے کامیاب علاجوں اور نہایت مفید اور معلومات افزا مضامین کا حامل ہے۔ مرتب نے نہایت سلیقہ سے "درد نمبر" کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب مکمل داستان درد ہے۔ سب سے آخر میں "ادبیات درد" کا باب ہے جس میں درد کی دوا، درد دل اور دردیات جیسے عنوانوں کے تحت نہایت دلچسپ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ علم طب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے خصوصاً اور مبتلائے درد اصحاب کے لئے عموماً "درد نمبر" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ادارۂ حکیم دکن کی یہ پیشکش ہر آئینہ قابل ستائش ہے۔

نقد و نظر

اسلام کا نظامِ سیاست و عدالت

مؤلف: مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی
ناشر: نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن

سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں جب تک اسلام نے سیاست و جہانبانی کے بہت سے اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں ایک مسلم فرمانروا جب تک وہ سچا مسلمان ہے انھیں اصول و ضوابط کا پابند رہ کر رعایا کیساتھ ہی ایک مسلمان فرمانروا کا اصولِ سیاست و عدالت وہی ہوگا جس کی قرآن و حدیث میں تعلیم دی گئی ہے۔ اسی لیے مسلم تاجداروں کے دورِ حکومت میں غیر مسلم رعایا ہمیشہ پوری مذہبی اور سماجی آزادی کیساتھ زندگی بسر کرتی رہی ہے لیکن اس عنوان پر عوام کا مطالعہ بالکل محدود ہے اور جو لوگ پاکستان پر اعتماد رکھتے ہیں وہ یہ جاننے کے خواہشمند رہتے ہیں کہ پاکستانی حکومت میں غیر مسلم رعایا کے متعلق مسلم عہدیداروں کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی نے اس کتاب میں پوری وسعتِ نظر کیساتھ اس اہم اور ضروری سوال کے مالۂ و ماعلیہ کا جائزہ لیا اور بڑی خوبی سے اسلامی سیاست و حکومت کے اصول پر بحث کر کے اسلامی عدالت کی تاریخ بیان کی ہے مصنف نے دلپذیر اندازِ تحریر میں وزنی دلائل کیساتھ ثابت کیا ہے کہ مذہب نے مسلم فرمانرواؤں پر عدل و انصاف اور سیاست و جہانبانی کے سلسلہ میں کس قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں اور ایک مسلم تاجدار اپنی رعایا کے مختلف طبقات پر حکومت کرنے کے لئے کن اصول و ضوابط کا پابند ہے مصنف کی نظرِ وسیع، مطالعۂ عمیق، اور ماخذوں کی دنیا غیر محدود ہے اور ان کی مدد کے لئے ایک عظیم الشان علمی پس منظر موجود ہے، کارکنانِ نفیس اکیڈمی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی تحقیقی کتاب شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مقالاتِ جمال الدین افغانی
عربی مقالات کا اردو ترجمہ

مترجم:- مبارز الدین، رفعت، ایم، اے
ناشر:- نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن، ضخامت ۲۵۱ صفحات قیمت عہ

علامہ جمال الدین افغانی کی شخصیت عالم اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ ایک پرجوش مجاہد، مشہور مفکر، اور بیدار مغز عالم تھے شیخ محمد عبدہ اور سعد زاغلول جیسی ہستیوں نے ان کے فیضانِ علم سے تمتع حاصل کیا، علامہ کی تحریر میں جوش، اثر، درد، تڑپ اور ایک خاص قسم کا کرب ہے وہ امتِ مسلمہ کے زوال اور اس کی اخلاقی انحطاط پر جب کچھ لکھتے ہیں تو الفاظ سے یہ کرب اور درد صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے، مقالاتِ جمال الدین افغانی، علامہ ممدوح کے بارہ مقالات کا نہایت سلیس، اور عام فہم ترجمہ ہے جس کو مبارز الدین رفعت ایم اے عثمانیہ نے براہ راست عربی سے ترجمہ کیا ہے فاضل مترجم نے اصل زبان کی روح اس کی روانی، سلاست اور اثر کو برقرار رکھنے کی اس قدر کامیاب کوشش کی ہے کہ ترجمہ نے ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عربی الفاظ کے مقابلہ میں اردو کے ایسے سلیس شیریں، اور با محاورہ الفاظ منتخب کئے ہیں جن کے اجتماع نے کتاب میں ایک لطف کی سی شان پیدا کر دی ہے علامہ کے ان مقالات کے لئے رفعت ایسا فاضل مترجم نفیس اکیڈمی کو نہ ملتا تو کتاب کی افادی حیثیت کبھی اتنی مکمل نہ ہوتی جتنی اب ہے عربی زبان سے ایسا بے تکلف ترجمہ کر لینا بہت مشکل ہے، گرد پوش رنگین، طباعت و کتابت نہایت روشن۔

رگِ سنگ

مصنف:- علی جواد زیدی ناشر:- اشاعت گھر حیدرآباد دکن۔
کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ نفیس، گرد پوش فن کا اعلیٰ نمونہ، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت عہ

رگِ سنگ علی جواد زیدی کا مجموعۂ کلام ہے۔ علی جواد ملک کا ہونہار، بالغ نظر اور حقیقی ترقی پسند شاعر ہے۔

رگ سنگ اگرچہ آج سے پانچ چھ سال قبل کی نظموں کا مجموعہ ہے، اور جس کی بیشتر نظمیں شاعر نے جیل میں کہی ہیں، تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعر اندازِ فکر میں گہرائی، مشاہدہ میں وسعت اور زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے جس کے باعث رگ سنگ کی تقریباً ہر نظم ہر زمانہ میں چھا جانیوالی طاقت اپنے اندر رکھتی ہے۔ ہماری دانست میں وہی ادب ترقی پسند ہے جو ہر زمانہ کا ساتھ دے سکے پچھلے چند سالوں میں ترقی پسند ادب کے نام سے جو ادب پیش کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ وہ سب کا سب ترقی پسند نہیں، ملک کو ویسے ہی زندہ اور صحت مند ادب کی ضرورت ہے۔ رگ سنگ کا مصنف نہ تو ماضی کی اقدار سے گریز پا ہے اور نہ حال کی گمراہ کن ترقی پسندی میں بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے بہت سوچ سمجھ کر کہتا ہے فکر و عمل میں اس کی امتیازی خصوصیت وہ اعتدال پسندی رگ سنگ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ نظموں میں بلا کی روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے، یوں تو رگ سنگ کی ہر نظم قابلِ مطالعہ ہے مگر نیا موڑ، وصیت، چند مناظر، تصویر کا دوسرا رخ اور منزلیں جیسی بہترین نظمیں بطورِ خاص قابلِ مطالعہ ہیں۔ جن میں علی جواد زیدی کا اپنا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔

کارکنان اشاعت گھر اس قابلِ قدر مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔

پاکستان نمبر

قیمت ۱۲؍ - مرتبہ:- ڈاکٹر سید محمود -
ملنے کا پتہ:- دفتر نئی زندگی الہ آباد -

ماہنامہ نئی زندگی الہ آباد کے اربابِ انتظام نے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یعنی "پاکستان" پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جو ۲۵۲ صفحات پر محیط ہے تقسیم کے لحاظ سے یہ نمبر دو کتابوں پر مشتمل ہے۔ کتاب اول نئی زندگی کے مدیر مسٹر سید انیس الرحمٰن کے تین قیمتی مضامین پر ختم ہوتی ہے۔ کتاب دوم کی ترتیب میں ہندستان کے مشاہیر اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اس کتاب میں گیارہ مضامین ہیں، جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کا مضمون "پاکستان پر اجتماعی نظر" کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ دوسرے مضامین بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ البتہ مولانا حسین احمد صاحب کا مضمون ایسی رکن عروضی کی حیثیت رکھتا ہے جو صرف وزن پورا کرنے کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ شعر کی روح پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مولانا کے علمی تبحر سے انکار نہیں مگر ان کی یہ کاوش چند اخبارات کے اقتباسات تک محدود ہے جو دوسروں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پاکستان کے مسئلہ پر نہایت عمیق غور و فکر کی ضرورت ہے جو اس مضمون میں مفقود ہے۔ پاکستان نمبر اپنے پیش نہاد مقاصد کے اعتبار سے کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ اس میں یہ کمی ضرور ہے کہ مخالف نقطۂ نظر کی نمائندگی نہیں کی گئی۔ جو لوگ مختلف عنوانات پر سیاسی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں ہم ان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ نئی زندگی کے "پاکستان نمبر" کو ضرور پڑھیں۔

ماہنامہ "حکیم دکن" (درد نمبر)

مرتبہ:- حکیم محمد ظفر الدین ناصر، ملنے کا پتہ:- محلہ مغل پورہ، حیدرآباد دکن
زرِ سالانہ بیرون حیدرآباد ۳؍ - فی پرچہ ۵؍

حکیم دکن، حیدرآباد دکن کا ایک بہترین طبی رسالہ ہے جو نہایت پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت حکیم دکن کا "درد نمبر" ہمارے پیشِ نظر ہے۔ "درد نمبر" ہر قسم کے دردوں کی تفصیل، ان کے کامیاب علاجوں، اور نہایت مفید اور معلومات افزا مضامین کا حامل ہے۔ مرتب نے نہایت سلیقہ سے "درد نمبر" کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب مکمل داستانِ درد ہے۔ سب سے آخر میں "ادبیات درد" کا باب ہے جس میں درد کی دوا، دردِ دل اور دردیات جیسے عنوانوں کے تحت نہایت دلچسپ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ علمِ طب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے خصوصاً اور مبتلائے درد اصحاب کے لئے عموماً "درد نمبر" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ادارۂ حکیم دکن کی یہ پیشکش ہر آئینہ قابلِ ستائش ہے۔

نمائندہ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے۔

فلمستان

غیر ملکی فلمیں ہندستانی میں

امریکی اور برطانوی پروڈیوسروں اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندستان کی مارکٹ پر اپنا اثر قائم کریں، چنانچہ انہوں نے غیر ملکی فلموں کو ڈب کر کے ہندستانی زبان میں پیش کرنے کی اسکیم بنائی ہے جس پر عمل بھی شروع ہوگیا ہے، اور "بامی" نامی فلم اس وقت ہندستانی میں ڈھالی جا رہی ہے، ہندستانی فلمسازوں کی جماعت نے اس پر احتجاج کیا ہے کہ غیر ملکی فلمساز اس طرح یہاں کی مارکٹ پر چھا جانا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈسنے کے خصوصی نمائندے نے ایک پریس انٹرویو میں بتایا ہے کہ ڈسنے کا یہ اقدام کسی طرح بھی "اقتصادی لوٹ" نہیں ہے۔ صرف منتخب فلموں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی پہل ہے۔ نمائندہ مذکور نے ہندستانی فلمسازی کے نقائص کا حوالہ دیا اور بتایا کہ ہندستانی فلمساز یقیناً ہمارے فلموں سے اپنا معیار بلند کرنے کی کوشش کرینگے۔ بہرحال یہ فلمسازوں کی "تالیف قلب" کے لئے اچھا عذر ہے۔

فلمی شادی

منروا مودی ٹون کے چیف اور ممتاز ہدایت کار و اداکار مسٹر سہراب مودی ایک طویل عرصہ کے بعد تجرد کی زندگی سے ازدواجی زندگی کے دور میں داخل ہوگئے ہیں اور مہتاب کو اپنا شریک حیات بنا لیا ہے۔ اس بندھن کی ایک عرصہ سے توقع تھی!۔

انجان گھر

نئے ہدایت کار بمل رائے "ہمراہی" بناتے ہی صف اوّل کے ہدایت کاروں میں پہنچ گئے ہیں، وہاں ان کو بیشمار تعریفی خطوط موصول ہو رہے ہیں انہوں نے ہندستان کے فلمی نقشہ پر بنگال کو پھر نمایاں کر دیا ہے لوگ بےچینی سے بمل رائے کے دوسرے شاہکار کا انتظار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ نیو تھیٹرز اسٹوڈیو میں "انجان گھر" کی تعمیر شروع کر دی گئی ہے، اس کی کہانی "بنگال کے ترقی پسند ادیب [illegible]

ہندوبوس کے قلم کی رہین منت ہے جس میں موجودہ جنگ کی عکاسی کی گئی ہے، نیتابوس، راجہ گنگولی اسی کار کے بال ہندوستان کاسٹ میں شامل ہیں موسیقی کو فسہ دار آر سی بورال ہیں۔

انمول گھڑی

محبوب پروڈکشنز کی ایک انمول تصویر "انمول گھڑی" عنقریب نمائش کے لئے بمبئی کے کسی بھی سینما میں پیش کر دی جائیگی۔ یہ ایک ولولہ انگیز قصہ ہے جسے نغمات و موسیقی میں ملا جلا کر ثریا اور نورجہاں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے، محبوب کا آئندہ شاہکار "املان" ہوگا۔

شوکت آرٹ پروڈکشنز کا "جگنو"

زینت اور خاندان کے ہدایت کار شوکت کی آزادانہ مساعی کا نچوڑ "جگنو" نامی فلم ہوگی جو ایک انتہائی دردانگیز کہانی ہے، اس میں نورجہاں اور دلیپ کمار کام کر رہے ہیں۔

دھرتی کے لال

اشتراکی ادیب کرشن چندر کی کہانی "دھرتی کے لال" کی نمائش بمبئی میں بارش کے بعد شروع ہوگئی ہے بہت سے اشتراکیوں نے ان کو بنایا ہے اور اشتراکی فلمساز کمپنی پیپلز تھیٹرز نے تیار کرنے کے بعد پیرلیس پکچرز کو اس کے حقوق تقسیم فروخت کر دیئے ہیں۔ اس فلم کے ہدایت کار نصف اشتراکی خواجہ ہیں، اس کہانی کا تعلق بنگال کے قحط سے بتایا جاتا ہے اداکاروں میں [illegible] اور سینکڑوں اشتراکی اداکار کام کر رہے ہیں۔ [illegible]

سرائے کے باہر

[illegible]

ادا کاروں میں روشنی - مہندر ناتھ اور ببیتا بوس کے نام نمایاں ہیں -

ایاز کی "ان دیکھی"

ایاز پروڈکشنز کی دوسری تصویر "ان دیکھی" کی تیاریاں شروع ہیں - اس فلم میں ہونہار راجن اور نیلا کام کریں گے - آئندہ تصویر "بھول" جس کے لئے سرِیش کو بطور ہیرو اور شمیم کو بطور ہیروئن حاصل کیا گیا ہے، عنقریب ڈائریکٹر اننگ ڈیسائی کی زیر ہدایات تیار کیا جائیگا - اس میں فلم انڈسٹری کا مایۂ ناز ولن یعقوب بھی کام کر رہا ہے -

ایسٹرن پکچرز کا "رنگ محل"

"زرین" کے خالق ہدایت کار آنند کمار کی دوسری کوشش "رنگ محل" تکمیلی مراحل طے کرنے کے بعد کمرۂ تدوین میں جا چکی ہے، اس میں ثریا اور سرِیش کے خوبصورت جوڑے کے علاوہ شاہنواز، للیتا پوار، انور، فیضی اور خلیل بھی اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں -

لالہ رخ

"رتن" تیار کرنے والی کمپنی عنقریب ایک ادبی پیشکش پردۂ سیمیں پر رکھنے والی ہے - اس کے مکالمے مشہور ادیب کاوش سرحدی لکھ رہے ہیں -

کیوپڈ فلمز کی اوّلین تصویر "نغمہ"

کیوپڈ فلمز کی زیر تکمیل فلم "نغمہ" عنقریب ہی پردۂ فلم پر نمائش کے لئے پیش کر دی جائیگی، اس میں خوبصورت ہیرو سرِیش اپنی زندگی میں ایک انتہائی اہم اور بالکل انوکھا کردار ادا کر رہا ہے اور جنھوں نے اس کو فلم بندھن یا بسنت میں بالکل ننھا سا دیکھا تھا اب فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ وہ ایک خوبصورت قوی الجثہ نوجوان اور فلم انڈسٹری کا بہترین ہیرو ہے - کہانی، مکالمے و گانے سید یزدانی جالندھری آذر سرحدی و [illegible] کی دماغی کاوشوں کا عکسِ جمیل ہیں - موسیقار رام پرشاد نے موسیقی کی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر ڈال رکھی ہیں -

"رنگ لائی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد"

[illegible] شاعر نے مصرعے [illegible] کہا ہے اس لئے کر فضلی فلمس کی تازہ ترین پیشکش "مہندی" جلد ہی بھی چونکہ زیر تکمیل ہے بہت جلد نمائش کے لئے پیش کر دی جائیگی اور اس وقت آپ دیکھیں گے کہ مسٹر سبطین فضلی کی "حنا" یعنی یہ "مہندی" کیا رنگ لاتی ہے -

"مہندی" کی شوٹنگ دیکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ تصویر یقیناً ایک امتیازی درجہ حاصل کرے گی -

یقیناً مسٹر سبطین فضلی ہمارے سامنے ایک خاص چیز پیش کرینگے - امید تو یہی ہے کہ "عصمت" بنانے والا دماغ ہمیں مایوس نہ کریگا -

سرِیش "کی محمود آرٹ پروڈکشنز میں شمولیت"

بندھن کا بھولا بھالا اداکار سرِیش جس نے "چل چل رے نوجوان" ایسا انقلابی گیت گا کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی، اب جوانی کی منزلوں سے ہمکنار ہے اور بہت سی فلموں میں بطور ہیرو کام بھی کر رہا ہے، ان میں سے ایک محمود آرٹ پروڈکشنز کی پہلی نغمہ بار سوشل تصویر "جمیلہ" ہے، اس کے مقابل معصوم دوشیزہ لیلا پانڈے ہیروئن کے کردار میں پیش کیجا رہی ہے - محمود آرٹ پروڈکشنز کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ سال رواں کی بہترین اصلاحی تصویر میں بہترین اداکاری کو شامل کر کے بالکل مقبول بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں -

ڈائرکٹر جی، خان کی "سگائی"

ڈائرکٹر جی، خان نے اپنی "سگائی" کے ابتدائی انتظامات مکمل کر لئے ہیں، کمپنی سے آمدہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مس ستارہ اور عاشق حسین ان کے دوش بدوش پوری سرگرمی سے اپنا اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں - ہم نیو سورتی پکچرز والوں کو اس مستحسن اقدام پر مبارکباد دیتے ہیں -

پاپولر انڈیا پروڈکشنز لمیٹڈ

کے نام سے فلمی دنیا کے مشہور مزاحیہ اداکار مسٹر مرزا مشرف نے حال ہی میں ایک فلمساز ادارہ کا سنگ بنیاد رکھا ہے - کمپنی لمیٹڈ ہے اور اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں فلمی دنیا کے متعدد معزز حضرات شامل ہیں - ہندستان کا

آر ٹی کرال مرہم (رجسٹرڈ)

دور حاضر کی سو فیصدی کامیاب ایجاد

"آر ٹی کرال مرہم کو پھوڑا، پھنسی، داد اور خارش کے صدہا مریضوں پر تجربہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس مرہم سے بہتر اس دور کی کوئی دوسری ایجاد نہیں، جو ان تکلیف دہ امراض کا مکمل سدباب کر سکے ——"

ڈاکٹر رام نرائن، ایم۔ ایم۔ بی۔ ایس

"جسمانی امراض مثلاً پھوڑا، پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کا سو فیصدی کامیاب علاج آر ٹی کرال مرہم کے چند روزہ استعمال سے کیا جا سکتا ہے۔ آر ٹی کرال مرہم تجربہ کی بنا پر لاثانی ایجاد ثابت ہوئی ہے، اس مرہم کے تمام اجزا قطعی غیر مضرت رساں ہیں"

ڈاکٹر شیخ اصغر علی

خارش۔ داد۔ پھوڑا پھنسی خواہ وہ کسی قسم کی ہوں اور آگ سے جھلسے ہوئے جسم کے حصوں پر آر ٹی کرال مرہم لگاتے ہی آرام ہو جاتا ہے مستند ڈاکٹروں اور سند یافتہ طبیبوں نے آر ٹی کرال مرہم کو تجربہ میں لانے کے بعد اسے دور حاضرہ کی سو فیصدی کامیاب ایجاد تسلیم کیا ہے، اس مرہم کا ہر گھر میں موجود رہنا نہایت ضروری ہے

قیمت چھوٹی ڈبیہ ۶ ر

قیمت بڑی ڈبیہ ۱۴ ر

تیار کردہ

آر ٹی کرال مینوفیکچر ورکس (انڈیا)

سول ایجنٹ

سید ذاکر حسین عبد الحسین۔ چوک بھوپال

نوٹ:۔ اپنے شہر کے ہر بڑے ایجنٹ سے طلب فرمائیے!!

یہ وہ پہلا لمیٹڈ فلمساز ادارہ ہے جس میں بڑے بڑے نامور اداکار، ڈائرکٹر اور فلم لائن میں زبردست تجربہ رکھنے والی معزز شخصیتیں شامل ہیں۔ اس ضمن میں سیٹھ آر۔ بی۔ ہلایا مینیجنگ ڈائرکٹر جیت پروڈکشنز بمبئی۔ مسٹر کے۔ آر۔ تھاپر، پروپرائیٹر تھاپر پروڈکشنز لاہور۔ مسٹر جواہر لال شرما جنرل مینیجر سن رائز پکچرز بمبئی۔ پروڈیوسر، ڈائرکٹر ایس۔ ایم۔ یوسف، ڈائرکٹر رفیق رضوی، مشہور اداکارہ الہاس اور مرزا مشرف خصوصیت کے قابل ذکر ہیں۔

پاپولر انڈیا پروڈکشنز لمیٹڈ کی پہلی تصویر کی کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ڈائریکشن کے فرائض ہدایت کار رفیق رضوی انجام دیں گے۔ اداکاری میں ابتک بیگم پروین۔ الہاس اور مرزا مشرف سے معاہدہ ہو چکا ہے۔

اے۔ ایم جلیس کی کلامندر میں شمولیت

یہ خبر نہایت مسرت کی تھی سنی جائیگی کہ ملک کے مایۂ ناز ترقی پسند افسانہ نگار اور افکار کے خصوصی فلمی معاون اے۔ ایم جلیس کلامندر میں شامل ہو گئے ہیں امید ہے کہ جلیس کی شرکت سے کلامندر کی تصاویر ترقی پسند زاویوں کو واضح کرنے میں نمایاں حصہ لیں گی۔

نگارخانوں میں جمود

خام فلم کے یکایک مارکیٹ سے غائب ہو جانے کی باعث بمبئی میں بیسیوں نگارخانے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اطلاعات کے بموجب تقریباً دو ماہ تک خام فلم کے دستیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ خام فلم کے ذخیرہ کرنے والوں نے بلیک مارکٹ کا افتتاح کر دیا ہے۔

اداکاروں کی بیروزگاری

فلمی دنیا کے مشہور اداکاران چندر موہن پرتھوی راج، سہگل، چارلی، وینا، خورشید، درگا کھوٹے، لیلا ڈیسائی۔ لیلا چٹنس وغیرہ ان دنوں بیروزگاری کا شکار رہیں۔ کوئی پروڈیوسر ان کی خدمات حاصل نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ نئے اداکاروں کو کم سے کم تنخواہ پر ملازم رکھا جا رہا ہے۔

سینما بدمعاشوں کا ہالی ووڈ کلب

ہالی ووڈ (امریکہ) میں سینما کے بدمعاشوں کا ایک کلب قائم ہو رہا ہے جس میں یہ بدمعاش اپنی اپنی شرارتوں کی داستانیں ایک دوسرے کو سنا کر محظوظ کیا کریں گے۔ اس کلب کے وہی ایکٹر یا ایکٹریس ممبر ہو سکتی ہیں جو پردۂ فلم پر بدمعاش اشخاص کا کردار پیش کرتے ہیں چنانچہ اس ضمن میں بورس کارلوف، ایرک اسٹروہیم، سڈنی گرین اسٹریٹ اور دوسرے مشہور بدمعاش اشخاص کو رکنیت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس کلب کا نام "بیڈ بوائز انکورپوریٹڈ" (یعنی شریر بچوں کی کمپنی) قرار پایا ہے۔ ہالی ووڈ کی دوسری مزیدار خبر یہ ہے کہ وہاں فلم کمپنیوں کو سانپ، شیر، ہوا وغیرہ عارضی طور پر مہیا کرنے والوں کو اس قدر منافع ہوا ہے کہ وہ اب اپنی فضائی فوج قائم کرنے کی تجویز کر رہے ہیں۔ اس تجویز کے تحت انھوں نے فلموں میں کرایہ پر دینے کے لئے امریکہ کی ہوائی فوج سے پونے پانچسو طیارے حاصل کر لئے ہیں جن میں ہر قسم کے جنگی اور غیر جنگی طیارے موجود ہیں ان کی مجموعی قیمت تین کروڑ پونڈ ہے۔ ابھی حال میں کالمبیا پکچرز نے ان ہوائی جہازوں کو اپنی فلم گیلنٹ جرنی میں پیش کیا ہے۔

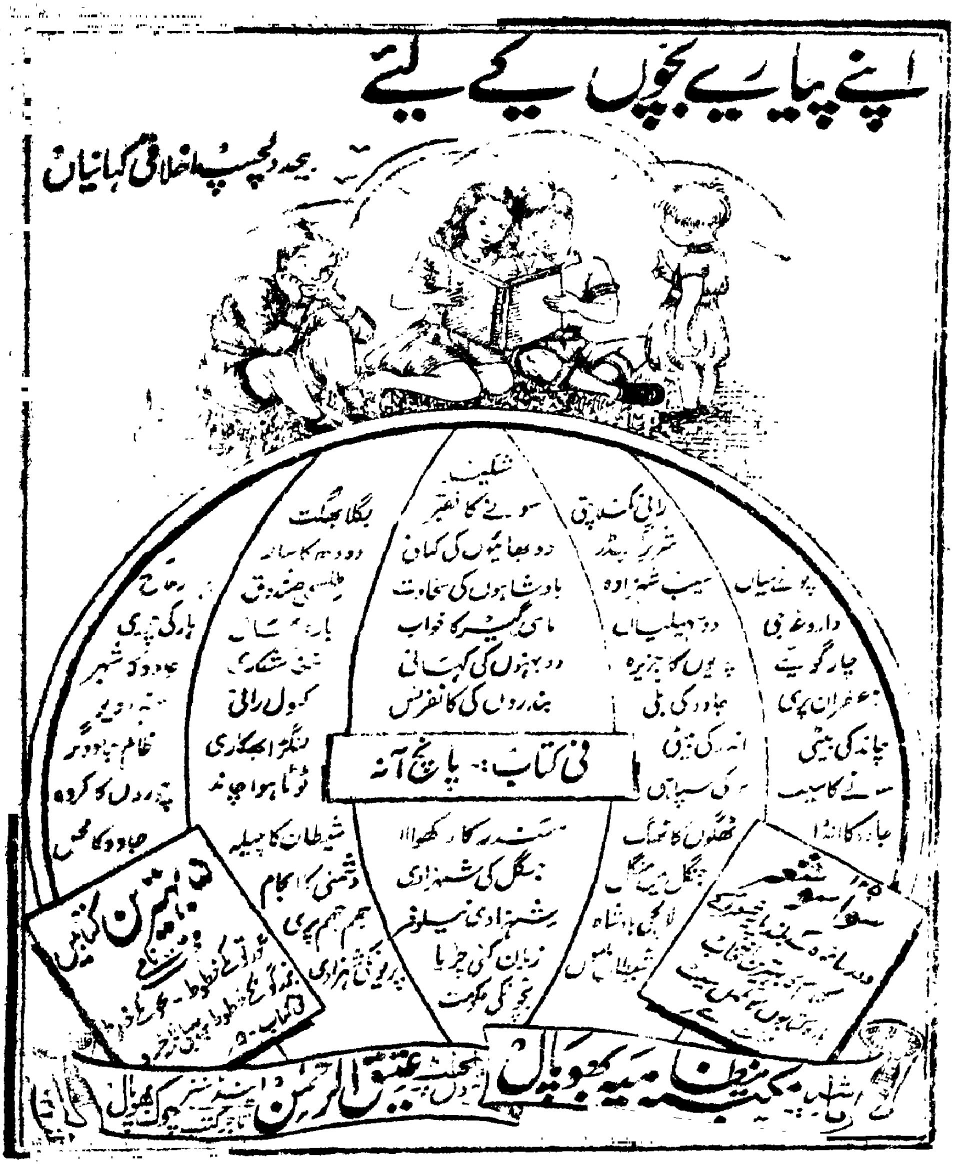
پروڈیوسر آشا رانی

اے۔ آر۔ پروڈکشنز لاہور کی اولین تخلیق "نرگس" کو ایک شاہکار کی صورت میں پیش کرنے کے لئے نہایت سرگرمی سے مصروف بکار ہیں۔

نرگس کی کہانی ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگار مرزا ادیب بی۔ اے آنرز کی دماغی کوششوں کا حاصل ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل اداکاروں کا انتخاب ہو چکا ہے

روحی، غلام محمد۔ پریم ناتھ یا سی۔ راجہ آصف۔ مبارک علی خاں۔ کسم لتا۔ (ہیروئن سوشی [illegible]) امرت۔ راج کھنہ وغیرہ۔

"نرگس" موسیقی کا بھی ایک نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔



اپنے پیارے بچوں کے لیئے
بیحد دلچسپ اخلاقی کہانیاں
بگلا بھگت
دو دھ کا سانپ
کنول رانی
لنگڑا بھکاری
ٹوٹا ہوا چاند
شیطان کا چیلہ
دشمنی کا انجام
چھم چھم پری
پریوں کی شہزادی
ہاری پری
جادو کا شہر
ظالم جادوگر
چڑیوں کا گروہ
جادو کا محل
سونے کا فقیر
دو بھائیوں کی کہانی
بادشاہوں کی سخاوت
ماہی گیر کا خواب
دو بہنوں کی کہانی
بندروں کی کانفرنس
فی کتاب :- پانچ آنہ
جنگل کی شہزادی
شہزادی نیلوفر
زبان کی چڑیا
بچوں کی حکومت
رانی کی سدا پتی
دو دھیلیاں
جادو کی بلی
ٹھگوں کا تماشہ
لالچی بادشاہ
چار گویّے
چاند کی بیٹی
دو بہترین کتابیں
مکتبہ منظر معیہ بھوپال
عتیق الرحمن



آپ بدصورت کیوں رہیں
جب
فیسرین کریم
بدنما کیلوں چھائیوں اور جلد کی تمام بیماریاں دور کرتی ہے
جلد کی خشکی اور جلن کو دور کرکے اس کی حفاظت کرتی ہے



شاندار افتتاح!

تبارتخ ۰ رجون ۱۹۳۶ء بروز جمعہ بوقت ۲ بجے دن اختر منزل
ڈاکخانہ بھوپال میں ایک جدید میٹرنٹی ویلفیر سنٹر یعنی "مرکز
تندرستی زچگان واطفال" قائم کیا گیا ہے، جہاں ایک تجربہ کار
ہوشیار لیڈی ڈاکٹر ادیبلقہ وزیٹر کی زیر نگرانی مستورات کو
...ری طبی مشورہ مفت دیا جائیگا، لہذا ضرورتمند خواتین زیادہ سے
زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

اوقات مرکز:۔ ہر جمعہ کو ۲ بجے دن سے ۶ بجے شام تک۔

ڈاکٹر ایم اے، اسلو
ایم بی، سی ایچ بی۔ ایم آر سی، او، جی
کے آئی، ایچ

"لیڈی ڈاکٹر!"

"نادرہ الائیڈ انجنیرس" نے اہل بھوپال کی شدید ضروریات
کے پیش نظر عورتوں اور بچوں کے ہر قسم کے علاج کے لئے
نادرا میڈیکل کلینک" واقع چوراہہ چنتامن بھوپال میں
خاص انتظام کیا ہے۔

میڈیکل کلینک میں ... ایم بی، بی، ایس لیڈی ڈاکٹر
کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں جو بچوں اور عورتوں کو مفت
مشورہ دیں گی۔ ادویات ... یافتہ کمپاؤنڈروں کی زیر نگرانی
تیار کرانیکا بھی بہت خاص ... کیا گیا ہے۔

"نادرہ میڈیکل کلینک" کا افتتاح
... ہے۔
... ایم ...

ایکٹنگ جنرل منیجر نادرہ الائیڈ انجنیرز (رجسٹرڈ) بھوپال



بچوں کے پیٹ کے درد، پیٹ پھولنے، مروڑ اور کالی کھانسی وغیرہ کے لئے بابولین سے بہتر کوئی دوسری دوا نہیں دانتوں کے نکلتے وقت بابولین کا استعمال حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے۔

تنہا تیار کنندہ:۔ دی بابت کیمیکل ورکس بمبئی نمبر ۲۔
نمبر ۲ و ۳ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ۔

سول ایجنٹس برائے سی پی برار سی آئی۔ راجپوتانہ	نادرا الائیڈ انجنیرز (رجسٹرڈ) ہیڈ آفس اختر منزل بھوپال۔

نوٹ:۔ اسٹاکسٹ ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

نادرا میڈیکل ہال

اسرار منزل۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال میں

تشریف لاکر اپنے پیچیدہ اور خطرناک امراض کا علاج کیجئے۔ لاعلاج امراض سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ صرف ایک مرتبہ ہمیں موقع دیجئے آپ یقیناً صحت یاب ہوجائیں گے۔ ایک بی، ایس سی ایم بی، بی، ایس ڈاکٹر ہمہ وقت آپکی خدمت کیلئے حاضر ہے جو بلا کسی معاوضے کے آپکو مشورہ دیگا۔ ادویات سند یافتہ کمپاؤنڈروں کی نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں اور نہایت مناسب قیمت لیجاتی ہے۔ ہر قسم کی انگریزی پیٹنٹ ادویہ اور انجکشن کنٹرول نرخ پر خرید فرماکر کمیشن سے فائدہ اٹھائیے۔

:اوقات مطب:

صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دن ——— شام ۴ سے ۹ بجے شب

:بروز جمعہ:

... ۹ ... شام ۴

:اوقات ڈسپنسری:

صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دن ——— شام ۴ سے ۹ بجے شب

ایل سنگھ
مالک نادرا میڈیکل ہال بھوپال

افکار کی چند ایجنسیاں!

کوہاٹ :۔ نصرت قریشی مہتمم مفید عام بک اسٹال۔
پشاور :۔ صادق کمیشن ایجنسی رجسٹرڈ، بازار قصہ خوانی۔
پٹھانکوٹ :۔ محمد نذیر خاں، نیوز ایجنٹ۔
گوجرانوالہ :۔ نیشنل نیوز ایجنسی۔
کلکتہ :۔ دی کلکتہ نیوز ایجنسی۔ ۳۴۔ چیپر لین۔
دہلی :۔ انڈیا نیوز اینڈ بک ڈپو۔ چوک فتح پوری۔
لکھنؤ :۔ نگم اینڈ کو، ایجنٹ اخبارات۔ امین آباد۔
کانپور :۔ محمد حنیف۔ نیوز پیپر ایجنٹ۔ گرانڈ ہوٹل۔
اجمیر :۔ شاندار نیوز ایجنسی۔ پوسٹ درگاہ شریف۔
آگرہ :۔ ظفر فوٹو آرٹسٹ۔ جسونت ٹاکیز۔
کھنڈوہ :۔ حنفی نیوز ایجنسی۔ مالی کنواں۔
مہو :۔ بشیر احمد نیوز ایجنٹ۔
دھولیہ :۔ عبدالحی ادیب انصاری۔ مکتبہ صدائے بازگشت۔
مالیگاؤں :۔ فروغ احمد انصاری۔ محلہ قلعہ۔
کراچی :۔ علی بابا پبلسٹی۔ ایوب بلڈنگ، کننگھم اسٹریٹ صدر
بنگلور سٹی :۔ دارالاخبار انجمن ترقی اردو، نرسمہا راجہ روڈ
حیدرآباد دکن :۔ غوث محی الدین (عثمانیہ) اشاعت گھر، معرفت اورینٹ بک اسٹال
بھوپال :۔ ۱۔ حکمت اللہ صدیقی، صدر ڈاکخانہ جمعراتی
〃 :۔ ۲۔ اسرار اینڈ برادرس، چوک۔ بھوپال

یاد رکھیے!

(۱) جواب طلب امور اور واپسی مضامین کے لئے محصول ڈاک کا آنا لازمی ہے۔

(۲) نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ کے ٹکٹ بھیجکر طلب کیجئے

(۳) افکار کے نہ پہنچنے کی اطلاع ہر مہینہ کی ۱۰ تاریخ تک آنا ضروری ہے۔ اس کے بعد پرچہ قیمتاً ارسال کرنا بھی مشکل ہے۔

(۴) سالانہ چندہ ۶ بذریعہ منی آرڈر بھیجا کیجئے۔ وی پی طلب کرنے میں آپکو تین آنے زیادہ دینا پڑینگے

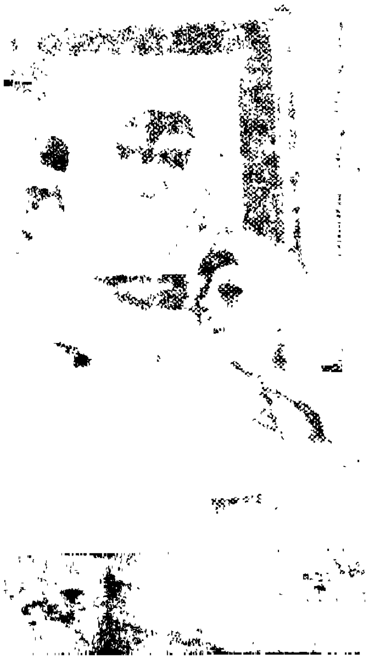
منیجر "افکار" بھوپال

آئندہ پرچے کے چند فنکار!

معظم علی ایم، اے۔	عزیز اثری
احمد ندیم قاسمی۔	مقبول حسین احمد پوری۔
ڈاکٹر شہبستر۔	تسنیم سلیم چھتاری۔
غلام ربانی تاباں۔	اقبال [illegible] صفی پوری۔
افسوں بھوپالی۔	قمر جمالی۔
شکیل بدایونی	اعجاز صدیقی۔
وحید چغتائی۔	مجیب خیر آبادی
انجم صہبائی	[illegible] عالم
محمد احمد سبزواری۔	[illegible] سعدی
جلیل صہبائی	[illegible] سونی۔

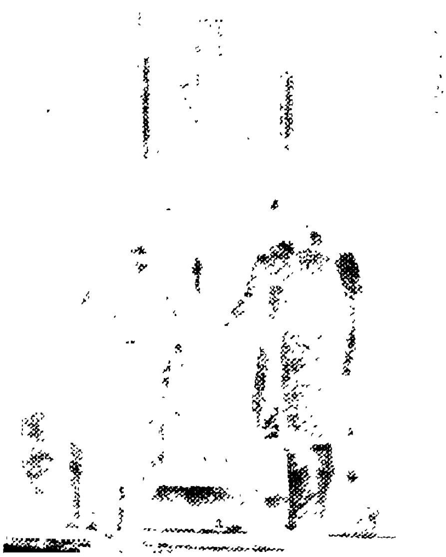
THE AFKAR MONTHLY
BHOPAL

JULY 1946 No.



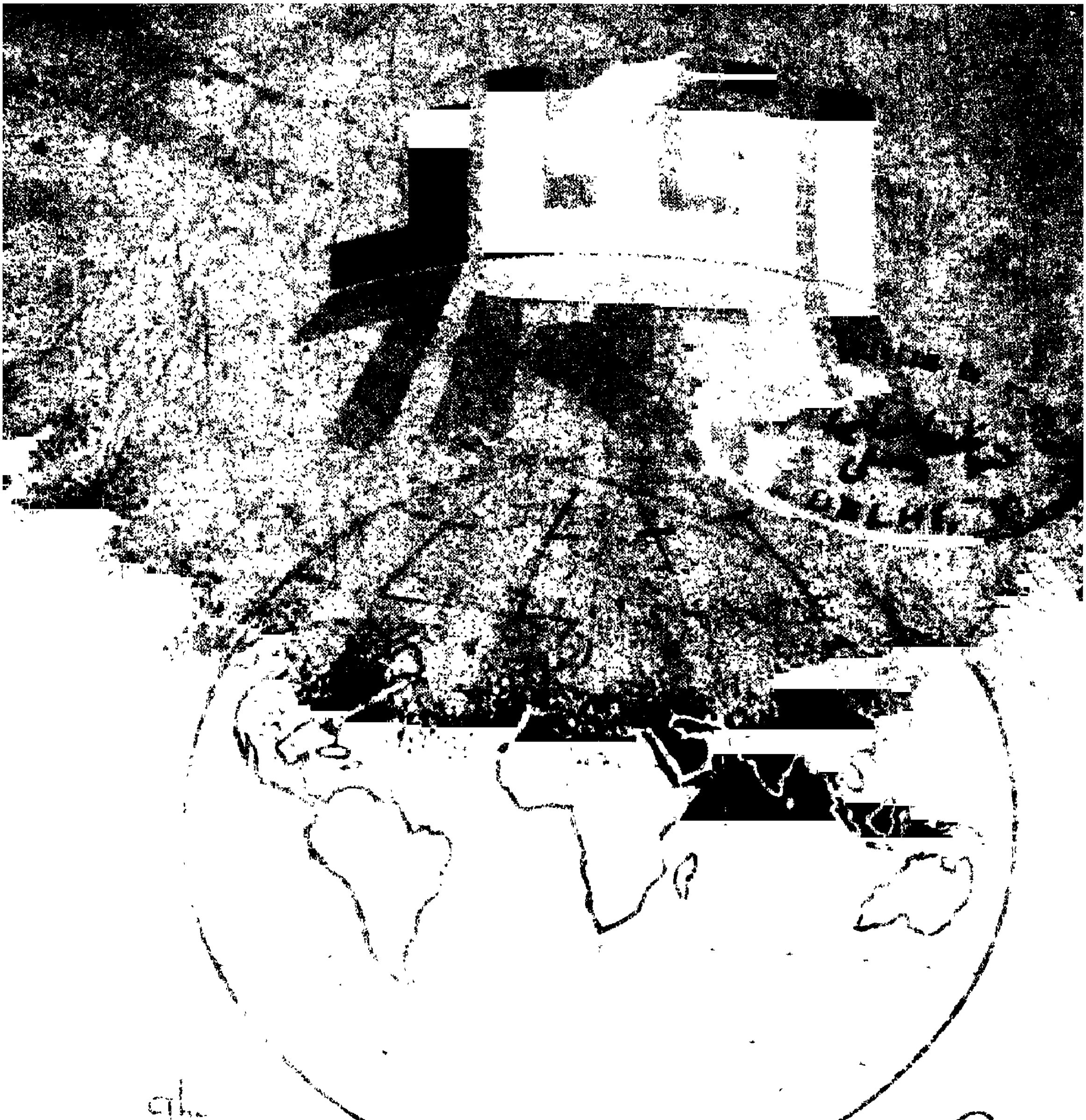






"شمع" کے چار منظر!

... AT THE BHANDARI PRESS, BHOPAL



MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

PRICE 8 ANNAS

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؔ)

ماہنامہ افکار بھوپال

اگست ۱۹۴۶ء

رشدی بھوپالی صہباؔ لکھنوی

نگران: حکیم قسیم الحسن

"بمبئی آفس"
۲۶۴- بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸

زرسالانہ ۵ر
ششماہی ۳ر

فی پرچہ ۸ر
بیرون ہند سالانہ ۶ر

جلد نمبر (۳) شمارہ نمبر (۶)

سرخیاں

ـــــ شارہ ـــــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

اشاریہ

"افکار" جس تیزی اور حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اس سے ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے بہت ہی قلیل مدت میں "افکار" نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے، پھر بھی ہم اس رفتار ترقی سے مطمئن نہیں، ہمارے راستہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں مگر ہمارے عزائم اور زیادہ غیر متزلزل شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ہم "افکار" کو اردو ادب و صحافت کا ایسا نمونہ بنا دینا چاہتے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہو۔ "افکار" کی ہر اشاعت اپنی پچھلی اشاعت پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہے جسے ارباب صحافت "ادبی معجزہ" سے تعبیر کر رہے ہیں۔ بہر حال ہم دکھاوے اور خوش فہمی کے بجائے عمل کے قائل ہیں۔ تازہ اشاعت آپکے سامنے ہے، مندرجات پر ایک نظر ڈالتے ہی آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ یہ کس قدر گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے، اب کے چار افسانے ہیں۔

ـــــ معظم علی پہلی مرتبہ بزم افکار میں شامل ہو رہے ہیں۔ "نامراد" معظم علی کی افسانوی فنکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ گاؤں کے سادہ ماحول میں جنسی کشمکش کا جو منظر پیش کیا گیا ہے، اس میں ہزار ہا کچلی ہوئی آرزوؤں کا عکس نظر آ رہا ہے ـــــ "آخر کار ناکامیوں اور مایوسیوں کی تاریک بدلیوں میں گھرا ہوا کلو اسوچنے پر مجبور ہو گیا کہ رحمتی اتنی بُری تو نہیں"

"چھپا گلی!" ـــــ المیۂ بنگال کا ایک دلدوز سانحہ ہے، بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جانے والے غلاموں کی عبرتناک زندگی کی جھلک ـــــ "شہر خوشاں ـــــ انسانوں کا بنایا ہوا! اس نے گلی کی طرف دیکھا ـــــ لاشوں کے ڈھیر پر کتے مرے ہوئے پڑے تھے ـــــ اور اُس کا سر چکرا گیا!"

ناہید عالم نے "کھڑکی" میں سے ہمارے معاشرہ کا جو چہرہ دکھایا ہے اُفوہ! کس قدر بھیانک ہے، ـــــ "وہ اس حد تک پیاسی تھی کہ اب اس کی آبحیات کو اپنے لبوں سے مس کرنے کی خواہش بھی مر گئی تھی، بس پانی ـــــ کھاری ـــــ گدلا اُبلتا ہوا، کیسا ہی ہو، مگر پانی ـــــ اور ان سرابوں کے چکر میں پھنس کر وہ اور بھی زیادہ پیاسی ہو گئی تھی ـــــ"
ناہید کا افسانوی مستقبل درخشاں نظر آ رہا ہے ـــ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

"بھاپ" ـــــ عورت کی نفسیات کا حیرتناک تجزیہ ہے، تحت الشعوری کیفیات کو ثمر نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ـــــ "پھر اسے اپنی پیشانی پر مدھم سی خنکی کا احساس ہوا اور ایک بے نام سا لمس جو بڑھتا گیا بڑھتا گیا اور ہلکے سے دباؤ میں تبدیل ہو گیا، اُس نے آہستہ سے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور چونک کر ایک دم اُٹھ بیٹھا ـــ تم ـــ تم نسرین؟"

سرمایہ دارانہ نظام اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انجم صہبائی نے مختصر طور پر سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کا خون تک چوس لیا گیا ہے یہ عالمگیر بیداری کا دور ہے اور اب مزدور "تعمیری انقلاب" سے "نظام نو" کی بنیادیں قائم کر رہا ہے!

آئیگی ـــــ نشستند، گفتند، برخاستند! یہ ہیں "کانفرنس" کے تین بنیادی اصول جن پر ہماری اکثر مجالس کی

کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے — ذرا سوچئے تو سہی — غلام ربانی تاباں نے جو کانفرنس منعقد کی ہے — کیا وہ حقیقت آپ نہیں؟! "کانفرنس" کا لطیف طنز تازیانۂ عبرت ہے "غلام آباد" میں بسنے والوں کے لئے!

"شبستان" — صہبا کی ایک فنکارانہ نفسیاتی تحلیل ہے۔ شبستان کے پس منظر میں جوانی کی سنہری راتیں ہی نہیں بلکہ بے نام آہیں اور کراہیں بھی ہیں اور پھر ایک شدید اور تلخ تاثر ہے جو ہمیں جھنجھوڑ رہا ہے، ہماری روح تک چیخ رہی ہے ع۔ زندگی ایک شبستان محبت ہی تو ہے!

مقبول حسین احمد پوری — گیتوں کے رسیا اس بار پھر میٹھے میٹھے بول سنا رہے ہیں — کتنے سندر اور رس بھرے ہیں یہ بول ہے "ان نینوں سے جب نینن ملے، مر مٹنے کا ارمان کیا"۔

ڈاکٹر شہرت — اس مرتبہ پھر نئے انداز سے جلوہ گر ہیں۔ "اے انسان" پڑھنے سے زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ نظم باوجود مختصر ہونے کے ایک مکمل درس بصیرت ہے — عظمت انسانی کا یہ مآل — اور انسانوں کے ہاتھوں — افسوس!

"عزم سفر" — یہ ہیں مجیب خیرآبادی — نوجوان ترقی پسند شاعر — عجیب — زندگی کی کشمکش اور ماحول کی تلخیوں سے بیزار نہیں — اس کے عزائم فلک رس ہیں — وہ نہایت استقلال کے ساتھ اپنے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہوا جادہ پیما ہے۔

انتظار بجائے خود آتش بجاں ہے — اور پھر وہ انتظار جس سے کسی شاعر کو دوچار ہونا پڑے — اور جس کی تلخ کامیوں سے جسم وجاں سلگنے لگیں — دوسروں کے لئے تسکین کا باعث ہو یا نہ ہو — لیکن وجد کے وجدان وتصور میں تو صرف "انتظار" ہی وہ کیفیت ہے جس سے روحانی سکون مل سکتا ہے۔

آئینہ خانے، سخن پارے، سرخ ستارے، دھتیں، آسرا، اور ننگ وناز جدید تغزل کے بہترین نمونے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ندیم، شکیل، نشور، افسوں، اقبال اور محکم سنگھ سونی زادہ کی اس مردہ صنف میں زندگی کی ایسی روح پھونک دی ہے — جس سے غزل کا مستقبل تابناک اور درخشاں نظر آرہا ہے۔

حیف در چشم زدن

ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ مولانا کوثر چاندپوری کو بعض سرکاری اور ذاتی مصروفیات نے "افکار" سے علحدہ کر دیا ہے۔ آپ نے اس عرصہ میں "افکار" کی جس سرگرمی اور جانفشانی سے خدمات انجام دی ہیں، اس کے لئے ادارہ ان کا خلوص دل سے شکر گذار ہے۔ بہر حال ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی کم از کم اخلاقی ہمدردیاں شدید مصروفیات کے عالم میں بھی "افکار" کو حاصل رہیں گی۔

آئندہ "افکار" سے متعلقہ جملہ مراسلت بنام ایڈیٹر یا منیجر کی جائے۔

(ادارہ)

مدوجزر

صلح کانفرنس!

ان دنوں پیرس میں صلح کانفرنس ہو رہی ہے، پہلے کانفرنسیں مسائل جنگ کو طے کرنے کے لئے ہوا کرتی تھیں، لیکن اب ان سے زیادہ اہم معاملات اور پیچیدہ امور صلح اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے زیر بحث لائے جا رہے ہیں اور مختلف ممالک سے صلح کے معاہدات کی توثیق کی جا رہی ہے۔ حال ہی میں وزرائے خارجہ کی، پیرس میں جو کانفرنس ہوئی اس میں جو کچھ پیش آیا وہ ساری دنیا پر عیاں ہو چکا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ سے روس کے اختلافات اپنے اصلی رنگ میں منظر عام پر آ گئے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں یہ خیال پایا جا رہا ہے کہ روس جرمنی کمیونزم کے ذریعہ یورپ میں سیاسی تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ اتحادی ممالک میں زمانہ جنگ کے دوران میں جو بدگمانیاں، غلط فہمیاں اور اختلافات ہنگامی مصلحتوں کی وجہ سے دبے ہوئے تھے اب ایک دم ابھر آئے ہیں اور انھیں کسی طرح بھی نہیں چھپایا جا سکتا، اور یہ تسلیم کر لینا پڑیگا کہ اتحادیوں میں تصورات، معیار اور طریق کار کے بارے میں اختلافات موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حد تک یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "اربعہ اکابر" میں نقطۂ نظر کا بھی اختلاف موجود ہے اگرچہ ابھی تک اس کا پوری طرح مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالات سے ایسا اندازہ ہو رہا ہے کہ جرمن عسکریت کو مشرق اور مغرب کے جھگڑے میں شطرنج کے مہرے کے طور پر استعمال کیا جانیوالا ہے، اگر جرمن عسکریت کو چھوٹ ڈالکر تسخیر عالم کا پھر موقع دیا گیا تو ان جانی اور مالی قربانیوں پر پانی پھر جائیگا جو دوسری جنگ عالمگیر میں دی گئی ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے پر سیاسی غلبہ پانے کی پالیسی دنیا کے امن کو پھر خاکستر کر دیگی اور انسانیت، تہذیب اور ثقافت کی تباہی و بربادی کی ایسی ہوشربا داستان کا باب کھول دیگی جسے آج تک دنیا نے نہیں دیکھا ——— چنانچہ بڑی طاقتوں کو حرص و آز کی پالیسی ترک کرکے باہمی مفاہمت اور اشتراک کے اصول پر گامزن ہونا چاہئے۔

جرمنی اور آسٹریا کے مسائل ابھی تک واقعی طور پر حل نہیں ہوئے ہیں اور اگر انھیں اطمینان بخش طریقے سے طے نہیں کیا گیا تو یورپ میں طاقت کی سیاست جو رنگ اختیار کریگی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ——— بہرحال پیرس کی صلح کانفرنس میں دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ بڑی طاقتیں کس حد تک اشتراک عمل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ پہلی مرتبہ "اربعہ اکابر" کے علاوہ دیگر اقوام کو بھی امن کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقع ملیگا۔ اگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے ساتھ روس نے بھی صلح کانفرنس کی سفارشات پر معقولیت کے ساتھ غور کیا اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو اس میں شک نہیں کہ ایسا دیرپا امن حاصل ہو سکیگا، جس کی ساری دنیا کو شدید ضرورت ہے۔

(ادارہ)

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

کانفرنس

(ایک طنز)

نشستند:۔

دید نی تھی سوٹ اور ساڑی کی آب و تاب کل
صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے قائدین بے بمل
خانصاحب گل محمد، رائے صاحب رام پھل

گفتند:۔

خوب تقریریں ہوئیں گپیں ہوئیں باتیں ہوئیں
پیش تجویزیں ہوئیں جیتیں ہوئیں ماتیں ہوئیں
اور کچھ بچھڑے ہوؤں کی پھر ملاقاتیں ہوئیں

برخاستند:۔

ساڑیوں کی سرسراہٹ تالی گھر کی [illegible]
پرزے کاغذ بگھیاں اور [illegible] قیمت [illegible]
اور جلے سگرٹ کے ٹکڑے [illegible]

شبستاں -!

یہ شبستانِ مسرت، یہ حریری پردے!
یہ جواں کار آنگیں، یہ ترنگیں، یہ جنوں!
یہ لپکتے ہوئے آنچل، یہ مہکتے ہوئے جسم!
یہ دمکتے ہوئے جلوے، یہ نگاریں احساس!

جنبشِ لب میں تبسم کی اداؤں کا جمال!!
مرمریں باہوں میں رقصندہ بہاروں کا شباب!!
سینۂ زیر و زبر، صاعقہ اندازِ نظر!!
ہر قدم جیسے لچکتی ہوئی شاخوں میں گلاب!!

صرف شب بھر کے لئے زینت کاشانہ ہیں یہ!
یہ تخیّل کے جزیرے، یہ تصوّر کے محل!
صبحدم جیسے تھکی راہوں پہ رہرو کے قدم!
اور پھر سوچ وہی سوچ کے گہرے بادل!

زندگی، ایک شبستانِ محبت ہی تو ہے!!
جس کی تخلیق پہ نازاں ہے دماغِ انساں!!
سالہا سال سے گردش میں ہیں خورشید و قمر!!
پھر بھی پائندہ ہیں اسلاف کی جنت کے نشاں!!

اور "اسلاف کی جنت" کے سوا، کچھ بھی نہیں!!!
آج احساسِ ندامت کے سوا، کچھ بھی نہیں!!!

آئینہ خانے!

چمن کے بھیس میں بکھرے ہوئے ہیں ویرانے
مرے خدا کی حقیقت مرا خدا جانے

میں خود شناس سہی، خوش مذاق ہے صیاد
یہ تیرہ دام، یہ تاروں کے نقرئی دانے

فسانۂ حرم و دیر ہے فریبِ خیال
قدم قدم پہ جب آباد ہیں پری خانے

بچھا دے اِن کو مری بیقرار باہوں پر
کہ بارِ زلف سے تھک جائیں گے ترے شانے

عجیب شمع ہے جو جل کے خود نہیں بجھتی
عجیب تر ہیں مگر بے نیاز پروانے

دلوں میں بس کے فریبِ تلاش دیتا ہے
اگرچہ تو نہ ملا، تیرے راز پہچانے

رُخِ ملیح، لبِ سرخ، زلفِ ژولیدہ
بہت لطیف ہیں رسوائیوں کے افسانے

اگر یہ پہلی نظر ہے تو آگے کیا ہوگا!
چھلک رہے ہیں ابھی سے تمام پیمانے

ندیم سنگ کو صیقل کیا حوادث نے
بہت قریب سے دیکھے ہیں آئینہ خانے

احمد ندیم قاسمی

گیت

اُن نینوں سے جب نین ملے، مر مٹنے کا ارمان کیا
مَن موہ کی ممتا سے چھوٹا، گُن گیان گیا سب دان کیا
آنکھوں میں سمایا وہ مکھڑا، ہرنے سی گیا جگ کا دُکھڑا
اِس جانی بوجھی دنیا کو، چاہت پہ تجا انجان کیا
چت چیت نہیں، سُدھ بُدھ بسری، چنتا کی کلپن من سے مٹی
اب کچھ بھی ہو دُکھ سے لگی ہی لگن، سُکھ چین سبھی قربان کیا
آشا اُنکی اوٹ سی جھانکتی ہی جب پریم کی بھاؤنا من مانی
ہرنے یہ سمجھتا ہے ودھی نے، کلپن کا مری کچھ مان کیا
جس رات یہ پریت کی کامنا ڈھل جاتی ہے منوہر سپنے میں
پل بھر کو یہ دُھوکا ہوتا ہے، جیون نے بنا سامان کیا
من بھاؤنی چاہت کو لیکر، ہر چیز سے جی ہٹ جاتا ہے [illegible]
کہتی ہے کلیجے سے یہ لگن، لے کام ترا [illegible]
سُن لیجئے احمد پوری نے [illegible] گیت [illegible]
جس کان پڑے یہ گان مرا، یہ جان [illegible]

تمنا

سخن پارے!

بے خودی ہے نہ ہوشیاری ہے
بادہ خواری سی بادہ خواری ہے

حُسن مصروفِ پردہ داری ہے
جانے اب کِس نظر کی باری ہے

تو نے دیکھی تو ہو گی اے ناصح
وہ محبت جو اختیاری ہے

کم نہیں شورشِ نفَس لیکن
زندگی پر جمود طاری ہے

غمِ الفت تو دل سے ہار چکا
اب غمِ زندگی کی باری ہے

جس چمن میں کبھی نہ آئے بہار
اُس چمن کی خزاں ہی پیاری ہے

ہائے وہ بادہ کش کہ جس نے شکیل
زندگی بے پیئے گذاری ہے

شکیل بدایونی

اے انسان!

تمام شعلہ و شرر ہے کُل تجلیات میں
جہاں پہ عزم غزنوی وہیں پہ سومنات ہے

زمیں تری فلک ترا یہ تیری کائنات ہے
حیات پا بہ گِل سہی حیات پھر حیات ہے

ہیں مہر و ماہ کے لئے یہ دن بھی اور رات بھی
ترے سفر کے سامنے نہ دن ہے اور نہ رات ہے

تیرے ہر ایک نقش پا میں گم ہے عمرِ جاوداں
یہ تجھ سے کس نے کہدیا جہان بے ثبات ہے؟

شکستہ پائے زندگی ہیں جس کے اس کا کچھ نہیں
جو تیز رَو ہے راہ میں اسی کی کائنات ہے

ترے قدم پہ سجدہ ریز ہیں جنوں کی عظمتیں
تری ہی وسعتوں سے یہ وجود شش جہات ہے

ہر ایک ذرۂ رہِ عمل ہے ایک کربلا!
ہر اک امامِ تشنہ کام کے لئے فرات ہے!

ڈاکٹر شہرت

ماورا

ورائے جفا و وفا ہو گئے ہم
بڑی کشمکش سے رہا ہو گئے ہم

کہیں کیا کہ مل جل کے کیا ہو گئے ہم
وہ بجلی بنے تو گھٹا ہو گئے ہم

خدا آشنائی تو ہے اک بڑی شے
یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم

یہ غم ہے کہ چھٹے اسیری کے ساتھی
مسرت نہیں گر رہا ہو گئے ہم

کچھ اس طرح گذریں مسرت کی گھڑیاں
کبھی وہ، کبھی خود خفا ہو گئے ہم

خدا کے بھروسے، خدا کے سہارے
سفینے کے خود نا خدا ہو گئے ہم

عمل زارِ ہستی میں افسوس یہ ہے
اسیرِ سزا و جزا ہو گئے ہم

ہوئیں ملتفت کب وہ کافر نگاہیں؟
جب آلودۂ ماسوا ہو گئے ہم

رہے گو جہاں میں بہت بچ بچا کر؟
مگر پھر بھی نذرِ خطا ہو گئے ہم

محبت میں ایسا بھی اک دور آیا
کہ مجبور ترکِ وفا ہو گئے ہم

لبوں پر شکوں اور آنکھوں میں آنسو!
بھری انجمن میں یہ کیا ہو گئے ہم!!؟

چمن بھی ہے اک مستقل قید خانہ
اگرچہ قفس سے رہا ہو گئے ہم

بہ باطن حواسوں پہ ہے کوئی قابض
بظاہر کسی سے جدا ہو گئے ہم

خودی نے کچھ اس طرح طوفاں اٹھائے
کہ بندے یہ سمجھے خدا ہو گئے ہم

ابھی اُن کے غم کا سہارا ہے باقی
نہ سمجھو کہ بے آسرا ہو گئے ہم

مصائب کچھ اعجاز ایسے اٹھائے
غم و رنج سے ماورا ہو گئے ہم

اعجاز صدیقی

عزمِ سفر!

جھوم کر عزمِ جواں تاب کی بیداری سے — کام لیں! رندی و بدمستی و سرشاری سے
چین پا جائیں نگاہوں کی شرر باری سے — کھیلتے جائیں زمانے کی ستم گاری سے
دور ہر کشمکشِ گردشِ ایام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!!

شورشِ غم کی فلک گیر گھٹاؤں سے بھی دور — غنچۂ و گل کی شرر بار فضاؤں سے بھی دور
مہ جبینانِ سمن بر کی اداؤں سے بھی دور — اس چمن زارِ غلامی کی ہواؤں سے بھی دور
معبدِ کفر و تجلّی گہہِ اصنام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!!

تیز! ہاں اور قدم تیز! اُٹھاتا ہوا چل — مسکراتا ہوا طوفانوں پہ چھاتا ہوا چل
راہ پُرخار ہے دامن کو بچاتا ہوا چل — جذبۂ شوق کو مہمیز لگاتا ہوا چل
ذوقِ آسائش و ہر خواہشِ آرام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!!

ذوقِ خوابیدہ کو ہر گام صدا دیتا جا — محفلِ عیش کو پیغامِ قضا دیتا جا
زلفِ برہم کو سنورنے کی ادا دیتا جا — شعلۂ عزمِ بغاوت کو ہوا دیتا جا
فکرِ آغاز سے اندیشۂ انجام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!!

کتنے سوئے ہوئے فتنوں کو جگانا ہے ابھی — حشر اُٹھانا ہے ابھی آگ لگانا ہے ابھی
قصر و ایوانِ امارت کو بھی ڈھانا ہے ابھی — خرمنِ ظلم پہ اک برق گرانا ہے ابھی
ساقی و ساغر و مینا مئے گلفام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!!

ہم سفر! ہاں ابھی درپیش سفر اور بھی ہے! — ذوقِ منزل کی قسم! حدِّ نظر اور بھی ہے!!
ظلمتِ شب ہی نہیں - راہ گزر اور بھی ہے! — اس سیاہی کے دھندلکے میں سحر اور بھی ہے!!
خوفِ آغازِ سحر - وسوسۂ شام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور - بہت دور ابھی!

[illegible]

سُرخ ستارے

چلمن سے جو دامن کے کنارے نکل آئے
وارفتہ نگاہی کے سہارے نکل آئے

پیمانہ بکف ساتھ تمھارے نکل آئے
ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے

اک سادگئ حسن کی معصوم ادا میں ؛
رنگین مضامیں کے اشارے نکل آئے

دولت کا فلک توڑ کر عالم کی جبیں پر ؛
مزدور کی قسمت کے ستارے نکل آئے

سب ڈوب گئے تلخئ ناکامئ غم میں ؛
کچھ آپ کے دامن کے سہارے نکل آئے

گستاخئ باراں سے وہ پیراہن پُر نم
بھیگے ہوئے جلووں سے شرارے نکل آئے

تقلید کا زمرہ بھی نہیں درد سے خالی
ان میں سے بھی کچھ عشق کے مارے نکل آئے

آنکھوں میں نظر آنے لگے خون کے آنسو ؛
بس اُٹھو کہ وہ سُرخ ستارے نکل آئے

رضواں سے بغاوت ہے نشورؔ اور مئے کوثر
عقبیٰ میں بھی کچھ کام ہمارے نکل آئے

نشورؔ واحدی

وسعتیں

جب سے وہ چشمِ التفات نہیں — روح میں گرمیٔ حیات نہیں
ہم وہی ہیں مگر وہ بات نہیں — حسنِ صورت ہے حسنِ ذات نہیں
جانتے وہ بھی ہیں کہ ان کے بغیر — زندگی موت ہے حیات نہیں
جو اشاروں پہ تیرے جیتے ہوں — ان کو مرنا بھی کوئی بات نہیں
مجھ کو نسبت ہے تیرے جلوؤں سے — رات بھی میری دن ہے رات نہیں
کیا غضب ہوگئی نگاہِ کرم — جیسے مجھ میں مری صفات نہیں
حسن کو خود ہی بار تھا جس پر — اک وہی لمحۂ حیات نہیں
دل پہ بن بن گئی ہے فرقت میں — وہ سمجھتے ہیں کوئی بات نہیں
ہاں نہ ہوں میری مشکلیں آساں — میں نہیں ہوں کہ کائنات نہیں
تو کہ ہم اہلِ عشق کی فردوس — ہائے دنیا تجھے ثبات نہیں
ہم سے وہ بدگماں ہیں ہم اُن سے — اب زباں پر دلوں کی بات نہیں
ان کے جلوؤں میں گم ہیں یوں نظریں — واقعی جیسے کائنات نہیں
شوق کی وسعتیں ارے توبہ — کوئی قیدِ تعینات نہیں
عشق خود ہے ہمہ حیات و بقا — عشق وابستۂ حیات نہیں

موت کیا مانگیے کہ اے افسوس
زندگی سے کہیں نجات نہیں

انتظار!

کھل گئی آج برستی ہوئی ساون کی گھٹا
دھل کے شفاف نکل آیا ہے شب کا چہرہ
ڈھل گئی نور کے سانچے میں اندھیری دنیا، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں
یہ شب ماہ کے بکھرے ہوئے بھیگے گیسو،
جیسے انگڑائیاں لیتا ہوا جاگے جادو
میرے ہر زخم سے آتی ہے کسی کی خوشبو، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں
چاند جیسے کسی تالاب میں شاداب کنول
وہ ہوائیں کہ ہو جنبش میں کسی کا آنچل
دور بجتی ہے سرِ راہ کسی کی چھاگل، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں
آخرِ شب یہ اُجڑتا ہوا تاروں کا سنگھار
جیسے روندی ہوئی کچلی ہوئی گلشن کی بہار
جیسے بجھتے ہوئے امید کی آنکھوں کے شرار، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں
بجھ گئے رات کے جلتے ہوئے پُرنور چراغ
ہو گئے سرد مہکتے ہوئے پھولوں کے ایاغ
گم ہوئے جاتے ہیں ظلمات میں راہوں کے سراغ، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں
سو گئے زانوئے خورشید پہ تابندہ نجوم
دل میں باقی نہ رہا، شوق و تمنا کا ہجوم
صبحِ ماتم ہے وہاں شام جہاں تھی اک دھوم، اور کوئی پھر بھی نہ آیا مرے ویرانے میں

وجد چغتائی

آسرا

موت کو بھی زیست کی منزل بنا دینا پڑا
ہر قدم پر ان کے غم کو آسرا دینا پڑا

اک زمانے کو رہا دیر و حرم میں اختلاف
تیرے سنگِ در پہ سب کو سر جھکا دینا پڑا

آندھیاں ایسی بھی کچھ آئیں جہانِ عشق میں
خود چراغِ آرزو مجھ کو بجھا دینا پڑا

زندگی کے نام پر کیسی خوشی کس کی خوشی
تیرے غم کی آڑ لیکر مسکرا دینا پڑا

آگئی پروانہ بنکر جس کی ضو میں زندگی
ایک ایسا بھی چراغِ غم جلا دینا پڑا

مرحبا صد مرحبا اے میری چشمِ اشتیاق
آج ان کو بھی نقابِ رخ اٹھا دینا پڑا

پیش آئے راہِ ہستی میں وہ نازک مرحلے
یاس کو امید بنکر آسرا دینا پڑا

عشق مجبورِ وفا تھا حسن مجبورِ ستم
رو دی جب شبنم گلوں کو مسکرا دینا پڑا

لاکھ چاہا چپ رہوں اقبالؔ بزمِ ناز میں
پھر بھی ان آنکھوں کو افسانہ سنا دینا پڑا

اقبال خلیلی صفی پوری

تگ و تاز

آدمی خاک بھی ہے، خاکِ سرافراز بھی ہے
یہ حقیقت بھی ہے۔ افسانہ بھی ہے۔ راز بھی ہے

حسن معبودِ دل و دیدہ نہیں ہے تنہا
عشق خود اپنا خدا بھی ہے، خدا ساز بھی ہے

محتسب تیرے تغلّب کا خلل ہے۔ ورنہ
نگہ رندِ خرابات حرم ساز بھی ہے

کیوں اسیروں کو نہیں راس گلستاں کی ہوا
جرأتِ نغمہ بھی ہے۔ طاقتِ پرواز بھی ہے

ایسے ماحول میں جینے کی تمنا کرنا
میرا ایثار بھی ہے، آپ کا اعجاز بھی ہے

تیری بیداد باندازۂ بیداد نہیں
تیری بیداد میں اک لطف کا انداز بھی ہے

جس سے اے مطربہ جھوم اُٹھے بساطِ کونین
کیا ترے ساز میں ایسی کوئی آواز بھی ہے

خود فریبی میں گرفتار ہیں کیوں اہلِ ہوس
حسرتِ دیں بھی ہے۔ دنیا کی تگ و تاز بھی ہے

میں نے اس ڈھب سے گذاری ہے جوانی محکمؔ
کچھ ندامت بھی ہے اس پر مجھے کچھ ناز بھی ہے

محکم سنگھ سونی

آبشار

نامراد

چمپاکلی

کھڑکی

لچک

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت۔

مظفر علی ایم۔ اے

نامراد

اور وہ پانچویں بار بھی نامنظور کر دیا گیا۔

جب اُس کے مرحوم بھائی کی جواں سال بیوی رحمتی نے حسبِ معمول انگلیاں چٹخاتے اور ناک سڑکتے ہوئے اُسے یہ منحوس خبر سنائی تو چھانجنوں کی چھوٹی سی پوٹلی جسے وہ حرزِ جان بنائے ہوئے تھا اور جو اُس کی روکھی پھیکی منجمد زندگی میں ذرا دیر کے لئے ہلچل پیدا کر دیتی تھی اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر جا پڑی " چھن، چھنن، چھن " اُسے محسوس ہوا کہ فاطمہ، نفیسی، زینب، آمنہ اور بسم اللہ اپنے کھردرے سانولے پیروں کو اُس کی حاصلِ حیات چھانجنوں سے سجائے ہوئے گاؤں کے مختلف لڑکوں کی شکل کے خوفناک جننوں کے حلقہ میں اُس کے سینے پر مصروفِ رقص ہیں " چھن چھنن چھن " اُس کے کانوں میں عجیب عجیب سی آوازیں گونجنے لگیں۔ سینے پر جیسے منوں بھاری سِل رکھ دی گئی ہو۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ چاروں طرف اندھیرا سا چھا گیا اور اس تاریکی میں اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھوں سے بچاؤ کا آخری سہارا بھی چھوٹ گیا، اور وہ تاریک سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے، ڈوبا جا رہا ہے، ڈوبتے ڈوبتے اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ پورے گاؤں کو نہیں تو اُن لڑکوں اور لڑکیوں کو جو اُس کی دانست میں محض اُسے چڑانے کے لئے شادیوں پر شادیاں کئے جا رہے تھے ضرور اپنے ساتھ گھسیٹ لے اور سب کے سب بے پناہ گہرائیوں میں اس طرح دفن ہو جائیں، جہاں سے واپسی کا تصور محال ہو۔

اور یہ آخری چوٹ سب سے زبردست تھی۔ اُس کی منظورِ نظر بسم اللہ ـــــ! وہ تصور میں اُس کے قدرے صاف رنگت کے چھوٹے چھوٹے [illegible] چھبیلے چھانجنوں سے مزین پاؤں کو اپنے دل میں اتار چکا تھا۔ وہیں بونے سے قد کی بسم اللہ تھی اُس سے چھین لی گئی اور شاید غفورا کو سونپ دینے کے لئے۔ غفورا جو کسی نامعلوم بنا پر ہمیشہ اُن کے دکھوں میں مزید اضافہ کا باعث تھا۔

" اللہ کرے [illegible] سہاگ رات ہی کو رانڈ ہو جائے، ہیضہ پڑے اس موئے غفورا پہ " اُس کی بھاوج [illegible] کو [illegible] اُس کے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھی اور کاجل سے پُر آنکھوں کو آنچل سے خوامخواہ ملے جا رہی تھی۔ غفورا کو ہیضہ ہو جانے پر اُسے اعتراض نہ تھا۔ مگر شادی کے دن سُرخ ٹول کی چم چم چمکتی ہوئی [illegible] ہلکی [illegible] کا سفید بغیر گوٹے کا دوپٹہ اُس کے تصور میں لہرا گیا۔ اور اُس کی لال ہری چوڑیوں کی کھنک گویا اُس کے کانوں میں [illegible] ناکامی کا [illegible] کو نہ تھا کہ بسم اللہ کی آنسوؤں [illegible] اس کی [illegible] پکار [illegible] بسم اللہ سے باقی سب لڑکیوں سے [illegible] وہ [illegible] تھی اس [illegible] آواز بلند ہو گئے۔

" تجھے [illegible] کی موت [illegible] بڑھیا [illegible] یہ بڑا یوسف چلا [illegible] بھی تو جورو [illegible] تیری [illegible] کو تیسری لگائی نہ گئی تھی اور گیہوں [illegible] تیری بھاوج آئی۔ چھوٹے ہی کو دیکھ لے۔ وہ بچوں کا باپ ہے، دو کا۔ تیری جیسی [illegible] کی باتیں [illegible] دیتا۔

"کلوا" کلو اور گھر بھر جیسے یونہی چیخنے کی جوں اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بڑے تو اپنے دم توڑتے ہوئے ارمانوں کی تسکین کی خاطر رحمتی کو اس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو چھوڑ بیکنٹھ کو سدھارے اور چھوٹا نہ جانے کہاں مرا کھپا۔ ماں سے جھگڑا کر کے بیوی بچوں کو لیکر جو گھر سے نکلا تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی ۔۔۔ مگر بڑھیا کو سوچنے سمجھنے کی فرض ہی نہیں تھی، بس اس کی تو زبان ذرا سی چھیڑ سے دن بھر کے لئے رواں ہو جاتی تھی اور وہ نت نئے طنزیہ نشتر چبھوتی تھی کہ کلو کا جی گھر سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ بیوی ہوتی تو کب کا اُسے لیکر ماں سے الگ ہو گیا ہوتا۔ اب کس بل بوتے پر ہمت کرے۔ کھانے کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ بے غیرتی لادے پڑا ہوا تھا۔ بیوی نہ ہوتی تو ۔۔۔ مگر بیوی! تازہ چوٹ پرانے زخموں کو بھی چھیڑ گئی۔ فاطمہ۔ نتھی۔ زینب اور بسم اللہ! سب کی یاد بیک وقت اس کے دل کو چھیدنے لگی وہ اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

"چپ جا رے حرامی" ماں بڑی بڑی گالیاں بکھیرنے لگی۔

"ہی ہی ہی۔ زنانوں والی باتیں۔ ہی ہی ہی" رحمتی کھلکھلائی۔ جیسے کمبخت جنم سے اس کی بیرن ہو۔ پڑوس کی آگ بہت سے دلوں کے مرجھائے ہوئے پودوں پر ابر رحمت بنکر برستی ہے اور پھر کلو کے گھر کی آگ جو گاؤں بھر کے لئے مایۂ تفریح تھا۔ اس کے گھر میلا سا لگ گیا۔

"کا ہوئے رے؟" ایک دوسرے پر مستفسرانہ انداز سے ٹوٹا پڑتا تھا۔

"سانپ ڈس گیا رے کلو کو" ایک واقف راز منچلا نوجوان ہنسنے لگا۔

"ڈس گیا ہوتا سانپ ہی موئے کو، یہ بدنامی تو نہ ہوتی رے۔ ہائے مولی۔ ہوتے ہی کیوں نہ اُٹھا لیا تو نے اس جی کے جنجال کو۔ ارے خود تو چل دیئے۔ کاہے چھوڑ گئے اس بس کی گانٹھ کو۔" مرحوم شوہر کی زیادتی پر بڑھیا کی آنکھیں کم اور زبان موسلا دھار برسنے لگی۔

"کا ہوا رے کلو، جی تو اچھا ہے؟" غفورا نے ہمدردی کی آڑ میں اُسے چھیڑا۔

"میں بتاؤں بھیا۔ ہی ہی ہی" بسم اللہ کی ماں نے کہا "بھا آئی تا ہے لونڈیا جو اس پاگل کھٹو سے قسمت پھوڑوں، بس یدھی سے رو رہے ہیں۔ ہی ہی ہی"

رحمتی کی ہنسی کسی طرح قابو میں نہ آتی تھی۔

"واہ رے میرے شیر" ایک مشترکہ قہقہہ سیسہ کی گولی کی طرح کھٹاک سے کلو کے دل و دماغ پر جا لگا۔

"بسم اللہ ہی میں کونسے موتی ٹنکے تھے۔ چل ہم دلوائیں ایک سے ایک سندر چھوکری" غفورا نے ذومعنی انداز سے رحمتی کی طرف دیکھا۔

"ہی، ہی ہی" وہ لال ہو گئی اور انداز بدل کے کلو کی طرف بڑھی۔

"ارے نکھٹو موئے دیور جی، یہ ہنسی مذاق تو رہے ہی ہے۔ بسم اللہ ہی تیرا کام کر دیتی جو میں نا کر سکوں۔ میں آپ ہی تیرے کپڑوں میں پیوند لگا دونگی، تیری روٹی سینک دونگی اور ۔۔۔" ہزاروں کچلی ہوئی امنگیں اور ناتمام آرزوئیں اس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔

کلو جو بھلا بھلا پورا سا بیٹھا تھا، رحمتی کے خلوص کو اس کی اداکاری ہی سمجھا، وہ جو ابھی اس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھی [illegible] اعتبار کر سکتا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر اسے دھکا دیدیا۔ اس کی دانست میں اس کی ساری شکایت [illegible] تھی۔

"باؤلا ہوگیا رے" ماں تنبیہاً غرائی۔

"تو چپ جا ماں، نہیں تو اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گا" اس تمام عرصہ میں اُس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"پاگل ہے بے پاگل" مجمع میں سے کوئی چلایا۔

"پاگل ہے بے پاگل" سب نے اس دریافت کی تائید کی۔

"آؤ سالو ۔۔" وہ غصہ سے بیتاب ہو کر پاگلوں کی طرح ڈھیلے سمیٹتا ہوا لوگوں پر برس پڑا۔

عدت کے بعد رحمتی سسرال آئی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست ہو رہی تھی، چہرہ خون کی حدت سے سانولا گیا تھا۔ بےچین سی، بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی۔ عجیب پاگل سی آنکھیں۔ بہکی ہوئی چال۔ رگ رگ سے جوانی پھٹی پڑتی تھی کلو نے اُسے مشکوک انداز سے دیکھا، مگر وہ بہت کم کسی بات پر غور کرنے کا عادی تھا، وہ سادگی کی حد سے بڑھا ہوا سیدھا سا آدمی دنیا کی باتوں سے بےخبر اپنے کام سے کام رکھنے کو ہی زندگی سمجھتا تھا۔ زندگی کی پُرپیچ پگڈنڈیوں پر قدم دھرنے کی اس میں ہمت تھی نہ اہلیت۔ اُس کی دنیا اُس کا تخیل اُس کی بوڑھی ماں، بڑا بھائی، چھوٹے کی گھر چھوڑ کر چلے جانے کی حرکت سے اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ اس کا ذکر بھی نہ سننا چاہتا تھا۔ چند زنگ خوردہ استروں اور مسافروں کا سامان اسٹیشن سے اُن کے گھر تک پہنچا کر حاصل کئے ہوئے چند آنوں تک محدود تھا۔ مدت سے اُس کی زندگی کسی تغیر کے بغیر ایک ہی رفتار سے گذر رہی تھی، وہ اس یکسانیت سے خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے بھائی کے انتقال کے بعد گویا کاہی ایک جھٹکے سے رکی اور پھر اُسی رفتار سے چلنے لگی۔ ہاں رحمتی کی آمد نے گھر بھر میں ہلچل مچا ڈالی اور اُس نے اپنی بیباک شوخیوں اور خطرناک حد تک بڑھی ہوئی بےتکلفی سے اُس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ ڈالا۔ معلوم نہیں اُس نے تختۂ مشق کلو کو ہی کیوں بنایا۔ گاؤں کے بہت سے چھوکرے اُس کے اشاروں پر سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار تھے۔ شاید اُسے گھر کی دال مرغی سے بھلی معلوم ہوتی تھی، وجہ جو کچھ بھی ہو۔ کلو پر عنایتوں اور نوازشوں کی بارش ہونے لگی۔ مگر کلو میں اتنی غیرت اور سمجھ ضرور تھی کہ اپنے بھائی کی ناموس کا لحاظ رکھتا، وہ رحمتی کو ماں کی تنہائی اور بڑھاپے میں کام کاج کی تکلیف کی وجہ سے اُس کے میکے بھجوانے میں ناکامیاب رہا تو اُس نے اُس کا وجود ہی نظر انداز کرنا چاہا، مگر وہ ربڑ کی گیند کی طرح جتنی مندرسے پٹخو اُسی قدر اُچھلنے والی خاصیت کی لڑکی، مست ہاتھی کی طرح جھومتی جھامتی وقتاً فوقتاً اُس کے سینے پر سوار رہنے لگی۔

"دیور جی، کاہے چپ چپ لیٹے رہو، پاؤں دُکھے، لاؤ میں دبا دوں" کمر کو لچکاتی، مستی آلودہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی وہ دھپ سے کلو کی چارپائی پر اس طرح جا پڑتی کہ اُس کا بالائی حصہ جسم کلو کے گھٹنوں سے ذرا اوپر جا لٹکتا اُس کے اعصاب میں لمحہ بھر کے لئے ہیجان سا پیدا ہوتا، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی، پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگتیں مگر لمحہ بھر کے بعد بالکل سکون ہوتا، وہی پہلے کا سا جمود۔

"کاہے گری پڑے ہے ری، ہٹ کے بیٹھ" وہ اکھڑپن سے چلاتا۔

رحمتی کو غالباً اُس کی بات کا برا ماننے کی فرصت نہ ہوتی تھی وہ ڈھٹائی سے اُس کے اوپر ڈھے جاتی، اس کا تنفس تیز تر ہو جاتا اور آنکھیں کسی شرابی کی آنکھوں کی مانند چڑھ جاتیں۔

"ہمکا ڈراتے دیور رے، یو دیکھو۔ دل کا زور زور سے چلے ہے" وہ کلو کا فولادی ہاتھ ایک دلشکن ادا سے اپنے سینے پر رکھ کر زور سے بھینچ لیتی کلو متاثر ہوئے بغیر زناٹے سے اُسے دھکیل دیتا۔ اس آنے وقت پر جیسے چوتھی جماعت تک کے پڑھے لکھے شہری دوست کی صحبت اور امام صاحب کی چلیں بھرتا آنے آئیں۔ انا

امام صاحب اُس کی خدمت کے صلہ میں اُسے خدا اور رسول کے احکامات بتایا کرتے تھے اور برکت نے شہر میں دیکھی ہوئی فلموں، اور سُنی سنائی کہانیوں سے اخذ کئے ہوئے نتائج کی بنا پر اُسے خوب و زشت میں امتیاز کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنے اندر کے شیطان کو ہی شکست نہیں دی تھی۔ بلکہ ایک اور ہستی کو بھی ڈوبنے سے بچا لیا تھا اُس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ سینہ تن جاتا اور اُسے اپنے چہرہ سے بارش انوار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔

مگر رحمتی ——— اس بارش انوار سے صرف اس حد تک متاثر ہوئی کہ اُس کے ہونٹوں کی نمی بڑھ گئی۔ شانوں پر پڑی ہوئی اوڑھنی لرزنے لگی اور آنکھیں اور زیادہ شرابی ہو گئیں۔ بار بار ڈھکیل دیئے جانے پر بھی اُس کے انداز سے ندامت و مایوسی کا اظہار نہ ہوتا تھا اور وہ ارادوں کی پختگی کے ساتھ محاذ پر جمی رہی۔

"نماج پڑھا کر نماج" وہ عاجز ہو کر اُسے مذہب کی یاد دلاتا "اللہ کے نام میں بڑا اثر ہے۔ شیطان بھاگ جائیگا"

مگر شیطان تو گویا پوری طرح رحمتی میں حلول کر چکا تھا۔ اُس کی جدوجہد جاری ہی رہی۔ مگر کلو جیسے متقی آدمی کے سامنے رحمتی کی لطیف کوششیں کسی طرح بار آور ہوتی نظر نہ آئیں، تب بھی وہ مایوس نہ ہوئی اور اُس کے دور رس دماغ نے ایک نسبتاً مؤثر تدبیر سوچ نکالی۔ اُسے معلوم تھا کہ ماں کی موت کی دھمکی کلوا کی دکھتی ہوئی رگ ہے جب وہ اپنا سپاٹ سینہ کوٹتے ہوئے چیخ چیخ کر میاں عزرائیل کو دعوت دیتی تو کلوا لرز جاتا۔ اُس کی پیاری ماں جس نے خود مر مر کر اُسے جلایا ہے ——— وہ اپنی بیماری کے چند مہلک ایام، جب اُس کی ماں نے اس کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالدی تھی، فراموش نہ کر سکا تھا ——— وہی پیاری ماں اُس کی خاطر جان دے، یہ اُسے منظور نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف بھی بڑی سے بڑی بات کر گذرنے پر تیار ہو جاتا۔ ماں اور رحمتی دونوں اس حربے سے اچھی طرح واقف تھیں جو اُن کے لئے ایک طرح سے علاء الدین کا چراغ ثابت ہوتا تھا۔ میٹھے چاولوں کے لئے گڑ کی مٹکی خالی ملتی، تو ماں ایک بڑی سی گالی اُس کے باپ کو دیکر اور اُس کے سر پر انڈے کی شکل کے محنت سے بنائے ہوئے میدان پر دو ہتڑ رسید کرتے ہوئے اُسے بازار جانے کو کہتی۔ ہمت سے زیادہ بوجھ لاد کر میلوں دوڑنے کی وجہ سے اُس کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی اور پاؤں کی ہڈیاں چیخ چیخ کر بغاوت کا اعلان کرتیں، وہ انکار کرنا چاہتا، مگر ماں کا ہوا میں اُٹھا ہوا ہاتھ اور ہونٹوں کو آمادۂ گفتار دیکھ کر اُس کی ہمت پست ہو جاتی، وہ گھسٹتا ہوا اُٹھتا، وہ تیزی سے چلتا اور پھر گھسٹنے لگتا۔

رحمتی نے اپنی ساری توجہ بڑھیا کی جانب منعطف کر دی، اُس کے ہاتھ پاؤں زیادہ جوش سے کوٹنے لگی، پورا پورا دن بڑھیا کے بالوں کی الجھی ہوئی گنجان جھاڑیوں میں جوؤں کی کھوج میں صرف کیا، اُس کے کپڑے صابن کے بغیر پٹخ پٹخ کر اُجلے کر دیئے اور سب سے زیادہ جس بات نے ماں کو متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وہ تیسرے دن چربی میں تر بتر بھنا ہوا گوشت اُسے کھلانے لگی، اور کلوا کی تن پیٹ کا ٹکرا کھٹی کی ہوئی پونجی روز بروز کم ہونے لگی۔ ماں کو خیال آیا کہ رحمتی جوان ہے اور کلوا کی بیوی ممکن ہے کچھ ایسی تیز طبیعت کی آئے کہ اُسے اس گھر سے جہاں اُس نے نصف صدی سے بھی زیادہ راج کیا تھا، نکال باہر کرے، یہ خدشہ موہوم سا ہی تھا۔ اُس کا گم نڈیل شوہر جو بات سے پہلے اُسترا نکالنے پر آمادہ رہتا تھا اُس کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بنا رہا تو دو بالشت کی چھوکری کی تو بات ہی کیا، البتہ وہ اُسے بھنا ہوا گوشت کبھی نہ کھلا سکتی تھی اور بیچاری رحمتی، اُس نے دنیا کا دیکھا ہی کیا تھا، چھ مہینے بھی تو اُس کا میاں زندہ نہ رہ سکا۔ یہ الگ بات تھی کہ شادی کے دوسرے دن میکہ جا کر وہ عدت کے ایام گذار کر ہی سسرال آئی۔ رحمتی کا درد اُس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ اُس کی آدھی زندگی بھی بیوگی کی حالت میں گذری تھی اُس کے سامنے تو تھوڑا تھوڑا [illegible]

بھیگی بھیگی ساتوں کی کسک آمیز آندھیاریاں تنہا نہ گذر سکی تھی، اُس کا دل رحمتی کے لئے مدت سے بھرپا اندھی سے کلوا کو پھوڑ رہے، سہاگ پڑہ اور ہری مہندی لانے کا حکم دیا، سُرخ ٹول کی اوڑھنی رحمتی کے پاس محفوظ تھی، برادری کی دعوت کے لئے چاولوں اور سارڈ کی ضرورت تھی جس کے حصول میں کچھ دقت ضرور تھی لیکن قرض پر کسی نہ کسی طرح حل ہو سکتی تھی، قرضخواہ کی پشتوں تک کی حجامت بغیر اجرت کے بنا کر کسی حد تک قرض کی ادائیگی ہو سکتی تھی اور پھر کلوا محنت مزدوری کر ہی لیتا تھا۔

کلوا کا دل شادی کے ذکر پر زور سے دھڑکا، مگر رحمتی کا نام سنکر دفعتاً رک گیا اُسے رحمتی سے نفرت تھی، اُس کی شکل سے اُس کی باتوں سے، اُس کی ہنسی سے چڑ تھی اُس کا بھرا بھرا گداز جسم دیکھ کر اُسے پھریری سی آجاتی۔ اُس کے دل میں عجیب سا احساس اُبھرتا تھا جس کا وہ کبھی تجزیہ نہ کر سکا۔ شاید احساس نفرت، احساس کمتری شاید۔

وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا جس کی اُنگلی کے خفیف سے مس سے اُس کے جسم میں بجلی سی دوڑ جائے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دوپٹہ کا شانہ سے ڈھلک جانا، دھند میں لپٹی ہوئی چٹانوں کے یک بیک نمودار ہونے کا مدہوش منظر پیش کر سکے، اور یہ رحمتی کہ اُس کا بہانے بہانے ڈھٹائی سے اُس سے لپٹ جانا اور دوپٹہ اوڑھے بغیر گھر بھر میں کبوتر کی طرح سینہ پھلائے پھرنا، اُس کے دل میں غصہ کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ پیدا نہ کر سکا تھا۔ اُسے رحمتی سے نفرت تھی بےحد نفرت، بڑھیا کے بے جان سے ہاتھ ہوا میں پھیل پھیل کر سپاٹ سینے پر پھسلتے ہی رہے، موت کو نت نئے طریقوں کی دعوت دیجاتی رہی۔ رحمتی کی آنکھوں سے بیک وقت آنسو اور شعلے برستے ہی رہے۔ مگر ان سب باتوں میں کلوا کو متاثر کرنے کی اہلیت حیرت انگیز طور پر معدوم ہو چکی تھی۔ وہ گویا کسی غیبی تحریک کے زیر اثر فاطمہ کے گھر پہنچا اور اپنی بات پکی کر لی۔

ماں کوس پیٹ کر خاموش ہو رہی، وہ جانتی تھی کہ راجہ کے من بھانے والی ہی رانی کہلائی ہے، مگر رحمتی کے دل میں جو انتقام کی چنگاری سلگ رہی تھی وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی اور وہ تن دہی سے کلوا کی جڑیں کاٹنے میں منہمک ہو گئی۔

اور ——— کلوا کا کنوارا پن اُس کی کوششوں میں کامیابی کا ضامن تھا۔ وہ طبعاً نیک تھا، محنتی اور رکھ رکھاؤ، اُسے لڑکی ملنی مشکل بات نہ تھی، وہ اتنا شرمیلا اور شریف تھا کہ آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے جھینپتا تھا، بزرگوں میں اُس کی یہ عادت پسندیدہ تھی کسی قسم کی بُری صحبت میں اُس نے کبھی دلچسپی نہ لی تھی۔ اُس کے ساتھی ہر فن میں طاق تھے، اُسے بگاڑنے کی بھی اُنہوں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی، کوئی اور ہوتا تو منی بائی کی خوبصورت زہریلی ناگا ہوں اور دلفریب بیباک اداؤں سے بچ نکلنا اُس کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ مگر دریا میں گھسنے کے باوجود اس کے دامن کی خشکی، معجزہ ہی تو تھا، وہ وہاں بیٹھا ہوا اپنے ساتھیوں کو منی بائی اور اُس کی ہم پیشہ سہیلیوں سے کھل کھیلتا دیکھتا رہا، دل میں ہلکی سی دھڑکن اور جسم میں خفیف سی جنبش ضرور ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ وہ ہلکے دل سے گراموفون پر رکارڈ پر رکارڈ بجاتا رہا۔

"فرشتہ ہے بابا یہ تو کوئی" اُس کے بعض ساتھیوں نے اپنے جسموں پر کہیں کہیں ابھرے ہوئے پھوڑے پھنسیوں کو چھپاتے ہوئے اپنی کمزوریوں کو کھوکھلے قہقہوں میں دفن کر دینے کی سعی کی۔

"کوئی بات تو ہے۔ ہاں نہیں تو ———" منی بائی ذومعنی انداز میں آنکھیں مٹکاتی ہوئی حیا کی سے مسکرائی۔

"ہی ہی۔ ہو ہو۔ واہ بائی جی کیا ارگڑا ہے" وہ سب جی کھول کے کھلکھلائے، دوسروں کا حسد اپنی تکلیف کا مداوا نہ سہی، کسی قدر تسلی کا باعث ضرور ہوتا ہے کہ صرف ہم ہی مبتلائے آلام نہیں ہیں۔ کلوا کے کیریکٹر کو جیسے کسی نے برچھے چھید دیا ہو۔ اُس کے دل میں خصوصیت سے خفو دا سے، جس کا قہقہہ سب سے بلند تھا، خوفناک انتقام لینے کی خواہش

پیدا ہوئی۔ مگر وہ اُس کی اولین محبت کے مرکز فاطمہ کا اکلوتا بھائی تھا، وہ کلوا طبعاً نیک تھا، محنتی اور کماؤ، اپنے موروثی کام سے نمٹ کر، دو چار مختلف قسم کے اوزاروں سے بھری کسبت کو کیل پر ٹانگ کر وہ قریبی قصبہ کے اسٹیشن پر مزدوری کے لئے چلا جاتا تھا، مزدوری کی اوسط پانچ سات آنے پڑتی تھی، اور وہ یہ پیسے اپنی دلہن کے واسطے جھانجن خریدنے کے لئے جمع کر رہا تھا۔ نہ جانے کب سے یہ جھانجن اُس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، اُس کے محسوسات کو جگانے میں جھانجنوں کی موسیقی کے علاوہ کوئی دوسری شے مشکل ہی سے کامیاب ہوتی تھی، چھن چھنن چھن، جب نئی بیاہی ہوئی دلہنیں نیلوں میں گاگریں دبائے ہوئے قدم قدم پہ فتنے جگاتی، کاجل آلودہ آنکھوں سے ڈھکے چھپے تیر چلاتی، اور نوجوانوں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر "ہائے ظالم" کی صداؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے، مترنم ہنسیاں بکھیرتی، جھانجن کی بین سی بجاتی ہوئی پنگھٹ پر جمع ہوتیں تو وہ اُن کے کالے کھردرے، بڑے چھوٹے ہر نمونہ کے پاؤں کے گرد جگمگاتے ہوئے ہالے دیکھ کر سب سے زیادہ متاثر ہوتا، وہ اس نظارہ کا بچپن سے عادی تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ دلہن اور جھانجنوں کا تخیل اُس کے ذہن میں ساتھ ساتھ آتا تھا، دونوں چیزیں ایک دوسرے کے بغیر بیکار اور نامکمل تھیں، دلہن کی حیثیت سے کوئی خاص لڑکی اُس کے دل پر قابض نہ تھی، فاطمہ نتھی، زینب، آمنہ اور بسم اللہ —— اور باقی وہ سب لڑکیاں بھی جن سے اب تک اُس کے رشتہ کی بات چیت نہ چلی تھی سب سے اُسے یکساں محبت تھی، اُس نے ہر ایک کے فراق میں آہیں بھری تھیں، چھپ چھپ کے نہیں، ہر ایک کو دردِ دل سنا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا بھی تھا، ہر فرد اُس کی تباہی کی داستان پوری توجہ اور دلچسپی سے سنتا، اکثر جن میں زیادہ تعداد جوان بیواؤں، بوڑھے شوہروں کی کمسن بیویوں اور اُن بوڑھوں کی تھی جن کے چلم تمباکو کا وہ کفیل تھا، اُس کی تباہی پر اظہار تاسف کرتے، اُس کے بدتمیز بیہودہ اور نچیس ساتھی غنڈوں کی طرح اُس پر فقرے کستے اور چنچل چھوکریاں منہ میں آنچل دبا کر ہنسی روکتیں، وہ ہر ایک کو اپنی داستانِ غم سے متاثر پاکر اور روتا —— بہت سیدھا تھا وہ اور اُس کے دل میں یہ احساس موجود تھا کہ وہ بہت اچھا ہے اور دوسرے بھی اُسے اچھا سمجھتے ہیں، پھر گاؤں کی بہتر سے بہتر لڑکی ملنے میں اُسے کیا دقت ہو سکتی تھی۔ فاطمہ سے اُس کے پیام کو بہت احترام اور قدر کی نظروں سے دیکھا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور وہ چھوارے اور سہاگ پڑے ہری مہندی —— خیر۔ مگر ایک دن اچانک فاطمہ کے ماں باپ نے غفورا سمیت اُس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔

"دھوکا —— وہ بھی ہمارے سنگ۔ سالا دگا باج۔ گیا تھا شہر کمائی کرنے۔ بسکل سے ہی ہاد لا دکھی ہی سسرا"

دونوں ماں بیٹے ہونقوں کی طرح منہ تک رہے تھے، وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے اور رحمتی آنچل کو گھونگھٹ کی طرح ماتھے پر سرکاتے ہوئے، پکا پکا سہما ہوا سا منہ بنائے پیٹے سے چولھے کی راکھ کریدر ہی تھی۔ فاطمہ کی ماں حدت تھی نسبتاً عدل اُمنہا ان لوگوں کو شش و پنج میں کھنا مناسب نہ سمجھا، دوسرے وہ جلدی وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی، وہ بھی ہوئی تھی اور غفورا کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔

"تونے کاہے چھپایا ری، ڈاگدار جی نے کیا کہا؟ شہر جاکے ایک بیری لگ کے دوا کرالے، پیسے کا کا۔ ہاتھ کا میل ہے۔ ہے ہے کا گبرو جوان" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کلوا کی طرف دیکھا اور جلدی سے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔

کلوا معاملہ کو سمجھتا جا رہا تھا، اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا، آنکھیں شدتِ غضب سے ابل آئیں اور قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک عزم کر چکا ہے۔

"تیرے مریں یار سیاں [illegible] وہی" کلوا کی ماں نے غصہ میں جھنجھلا کر غفورا کی ماں کو ایسی گالی دی جس کی قبولیت کا امکان [illegible] تھا، وہ جو کہ تھی، غفورا کی ماں، زیادہ وزنی گالی لوٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی

کہ کلوا نے رحمتی کے ہاتھ سے چمٹا اس طرح جھپٹ لیا کہ ابھری ہوئی کیل سے رحمتی کا ہاتھ لہولہان ہوگیا۔

"اب بول حرامجادی" اُس پر گویا بھوت سوار ہوگیا، وہ دیوانوں کی طرح چمٹا بجاتا ہوا غفورا کی ماں کی طرف لپکا جس کی تصور میں ساس کی حیثیت سے وہ بارہا خدمت کرچکا تھا۔

"ارے باپ رے" غفورا کے ہاتھ سے خوف کے مارے لاٹھی چھوٹ گئی اور وہ ایک دوسرے کی پروا کئے بغیر گرگر کے سنبھلتے اور سنبھل سنبھل کر گرتے پڑتے بھاگ نکلے، بڑھیا دیر تک بڑبڑاتی رہی، غالباً وہ کوس رہی تھی، فاطمہ کے خاندان کو کم اور کلوا اور اپنے نصیب کو زیادہ ——— کلوا نے ہوش میں آکر سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ وہ پاگل تو نہ تھا اور فاطمہ کے گھر والوں میں بہت مقبول تھا، یہ سب کچھ کیسے ہوا، وہ سمجھ نہ سکا۔ ہاں ایک دن پہلے رحمتی فاطمہ کے گھر سے نکلتی ہوئی دیکھی گئی تھی۔

اور اُس واقعہ کے بعد رحمتی کی کاوشوں کی چنداں ضرورت نہیں رہی، سب کچھ خود بخود اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا رہا۔ رحمتی خود کلوا کا پیغام لیکر جاتی اور وہاں ہم سن چھوکریوں سے گپ لڑانے میں اس درجہ مستغرق ہو جاتی کہ اُسے کلوا کے متعلق یاد ہی نہ رہتا۔ چلتے چلاتے سرسری طور پر ذکر نکالتی اور اس طرح کلوا کی تعریفیں کرتی کہ ذم کا پہلو غالب رہتا، خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہونے پر روتی بسورتی اور کوستی پیٹتی کلوا کی چارپائی پر اس طرح جا پڑتی کہ اُس کا بالائی حصہ جسم اُس کے گھٹنوں سے ذرا اوپر جا ٹکتا، مگر وہ اُس کا گھر بسانے کے لئے اُس کی بے غرض اور انتھک کوششوں کے احترام کے باوجود اُسے بیزاری سے ڈھکیل دیتا۔

آخرکار ——— ناکامیوں اور مایوسیوں کی تاریک بدلیوں میں گھرا ہوا کلوا سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ رحمتی اتنی بری تو نہیں، جیسا کہ وہ سمجھتا رہا، ٹھکرائے جانے کے باوجود وہ اُس کے آرام کا کتنا خیال رکھتی ہے، کلوا کی خاطر اُس نے کس کس کے در کی خاک نہیں چھانی۔ یہ اُس کی قسمت تھی کہ کہیں کام نہ بن سکا۔ مگر کوئی ایسی قربانی کسی کو نہ کرتو دے۔ دوسرے ماں میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ جینے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے آخر۔ اُس کے بعد رحمتی نے دوسرا گھر کر لیا تو ——— وہ کیسے جئے گا۔ کون اُس کے کھانے پینے کا خیال رکھیگا۔ اُس کے کپڑوں کو سدھاریگا زمانہ کی بدسلوکی کا حال کسے سنا کر وہ تسکین حاصل کریگا۔ اس وسیع دنیا میں کسی ساتھی کے بغیر کیسے زندگی کی بوجھل گاڑی کھنچ سکے گی، اور پڑے پڑے جھانجنوں کی رنگت بھی سبزی مائل ہو چکی ہے۔

"کاکرے ہے رہی۔ تنک ہمارے پاس بھی آبیٹھا کر" رحمتی اس پیار بھرے غیر مانوس لہجہ سے چونکی۔ مگر پھر ایک ٹھنڈی سانس لیکر کام میں مصروف ہوگئی، اُسے اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہ آیا، ہمیشہ سراب سے دوچار ہونے والے پانی کو بھی چمکتی ہوئی ریت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مگر جب کلوا نے آرزومند نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے اور بھی پیار سے پکارا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سراپا سپردگی بنی ہوئی اُس کے پاس آبیٹھی اُس کا تنفس تیز ہو رہا تھا اور آنکھیں شرابیوں کی مانند چڑھی ہوئی تھیں، کلوا کو اس وقت وہ بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اُس نے گویا فیصلہ کرلیا کہ وہ اُس کی جوان آرزوؤں اور گھٹی ہوئی امنگوں کا جی کھولکر خیر مقدم کریگا، رحمتی نے لمبی لمبی سانسوں کے درمیان اپنے جسم کا سارا بوجھ اُس کے شانوں پر ڈالدیا۔ اس کے اعصاب میں ہیجان سا پیدا ہوا، دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، مگر لمحہ بھر کے بعد بالکل سکون تھا۔ وہی پہلے کا سا جمود اور اب اُس کی آنکھوں میں درد و یاس اور بے بسی کی گہری کیفیت نمایاں تھی۔

گلی میں سے مارکٹائی، شوروغل کی عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی راہگیر نے (ملاحظہ ہو باقی صفحہ ۳۲ پر)

رشدی

چمپا گلی

آخرکار اس نے فیصلہ کر ہی لیا، —— اب اس کے سامنے چمپا گلی تھی جہاں وہ بیس سال سے رہتی تھی۔
اُس نے اپنے پہچانے ہوئے راستہ پر ایک پُر اشتیاق نظر ڈالی اور اپنے پرانے ساتھیوں کو پہچان لیا چھوٹے بڑے پختہ مکانات جن کی سفیدی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی، ابھی تک دوش بدوش کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے —— اور پیپل کا پرانا درخت کالی کے مندر کے چبوترے کے گرد بدستور سایہ فگن تھا۔
کملا جیسے ہی افسردہ اور نڈھال مندر کی طرف بڑھی اظہار عقیدت کے طور پر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر دیوی کے سامنے سر جھکا دیا، وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ چمپا گلی میں کچھ نئی چیزیں نظر آ رہی تھیں اور کچھ کی کمی محسوس ہو رہی تھی، اسے خیال آیا کہ اس کے بہت سے ساتھی بچھڑ گئے ہیں، جنھیں وہ ایک عرصے سے جانتی تھی۔ نہ تو یہاں کسی قسم کی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی اور نہ زندگی کی سرگرمیاں! اسے چلتے وقت راستہ میں آوارہ گایوں کو دھکا دیکر ایک طرف ہٹانا پڑتا تھا۔ اور بھونکتے ہوئے کتوں کو تو وہ بار بار جھڑکتی تھی، آج یہ سب کچھ نہ تھا، زندگی کی گہما گہمی، ایک طویل سکوت میں دب گئی تھی، حتیٰ کہ کالی بلی کا بھی کوئی نشان نہ تھا جس سے اسے یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں راستہ کاٹ کر بدبختی کا سامان نہ پیدا کر دے۔
ایک اونچی دُکان کے سامنے کملا اچانک رک گئی۔ یہ بسنت لال کا گھر تھا۔ جب سے وہ چمپا گلی میں آئی تھی بسنت لال اس کا مہاجن تھا اور وہ یہاں سے گذرتے وقت اس سے مقامی حالات کے بارے میں ضرور تبادلۂ خیالات کرتی تھی، اب وہ کہاں چلا گیا؟ اس نے بنیے کے ہمسایہ رام نرائن کو تلاش کیا جو پان بیچا کرتا تھا۔ جہاں وہ زمردی پان لینے کے لئے ہمیشہ رکا کرتی تھی، مگر آج نہ تو وہ موجود تھا اور نہ اُس کے زمردی پان!
"ہلو" اس نے اس امید میں آواز دی کہ کوئی تو ضرور بولیگا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی حماقت پر افسوس کیا کہ کسی کو بغیر دیکھے ہی آواز دیدی۔
مٹر کی پھلیاں اور مٹھائی بیچنے والا وہ بوڑھا بھی آج لاپتہ تھا جس کو دن بھر بچے گھیرے رہتے تھے۔
سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں اس نے اندازہ لگایا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے، بچوں کی آوازیں اور ان کے قہقہے جن سے دن بھر گلی گونجا کرتی تھی خاموش تھے، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور وحشت سی برس رہی تھی، دور تک رکشا کی گھنٹی کی آواز بھی منجمد ہو گئی تھی، اس کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک وہ حیرت میں ڈوبی ہوئی کلکتہ کی سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں نے ایک نیا ہی نقشہ دیکھا، وہ واپس چمپا گلی میں آ گئی، ہر چیز اس کے سامنے صاف تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ قحط کی تباہ کاریاں ہیں جس کے مہلک شرارے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔
کملا مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس کا تصور ماضی کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اب سے ۲۰ سال قبل چمپا گلی میں آئی تھی۔ اسوقت تک وہ کلکتہ کے عظیم الشان شہر سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے گھر سے

باہر اس وقت قدم نکالا جب اُس کی شادی کمار سے ہوئی جو کلکتہ میں کاروبار کرتا تھا۔

اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی، شادی کا خیال اُس کے لئے بہت ہی ڈراؤنا اور عجیب تھا۔ وہ ایک عرصے سے کمار کو جانتی تھی اور اُسے کئی بار دیکھا بھی تھا، مگر اس نوجوان کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شادی سے پہلے کمار سے کوئی لگاؤ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اور جب اِس کے ساتھ شادی ہوگئی تو اچانک کملا کو پتہ چلا کہ وہ گاؤں کے تمام لوگوں کا مرکزِ توجہ بن گئی ہے، جو شادی سے قبل اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتے تھے، لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کی شادی کلکتہ میں ہو رہی ہے، جہاں اس کے "دولہا" کی ایک بڑی دکان ہے جس کی صاحب لوگ سرپرستی کرتے ہیں تو وہ ....

کملا کو بہت خوش قسمت سمجھتے اور حیرت سے اسے دیکھتے، اس کی بڑی بہن نے بتایا تھا کہ شادی بڑا کٹھن مرحلہ ہے اور پھر ماں بننے میں جس کرب و ابتلا کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اظہار کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ شادی کی پُرکیف تقریبات میں کملا نے ان سب چیزوں کے خوف کو بھلا دیا۔ سب سے بڑھ کر خوشی اسے یہ تھی کہ وہ کلکتہ جا رہی ہے۔ اس نے اس شہر کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اور ایک عرصے سے وہ اس "جادو کے شہر" کے خواب دیکھ رہی تھی، شادی کے دن بھی وہ اس خیال میں تھی کہ اسے نئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔ اس نے ناچ گانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، حتّٰی کہ پنڈت کے منتروں کو بھی اس نے نہیں سنا۔ اس نے اپنی ماں کے ان آنسوؤں کا بھی کوئی خیال نہیں کیا جو اس کی بیٹی کے کمار سے بندھن کے وقت بے اختیار نکل پڑے تھے —— وہ بندھن جسے صرف موت ہی توڑ سکتی ہے۔ جب وہ، کمار اور اس کا بھائی ٹرین میں سوار ہوئے تو اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے گاؤں سے رخصت ہو رہی ہے، وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ جا رہی تھی جو اُس کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا، وہ ایسے گھر میں جا رہی تھی جہاں اسے اکثر تنہا رہنا پڑے گا۔ کمار کے والدین عرصہ ہوا چل بسے تھے اور وہ دن بھر دکان پر رہا کرے گا، اس قسم کے خیالات سے اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ کمار نے اسے تسلی دی، اس اجنبی کو اسے چھونے کا کیا حق ہے؟ —

جب وہ کلکتہ پہنچے تو کملا کا جوش پھر بڑھ گیا۔ اسے یہ سب اچھی طرح یاد آ گیا —— جب وہ ایک پرانے طرز کی فٹن میں سوار ہوئے تو اس نے حیرت سے بجلی کے لیمپوں اور لوگوں کے ہجوم پر نظر جما دی، اس نے آج تک اتنے آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کاریں ہارن بجاتی ہوئی گذر رہی تھیں، ٹراموں اور بسوں کی نقل و حرکت اس کے لئے بہت ہی تعجب خیز تھی۔ فلک بوس عمارتیں اس کے دماغ کو چکرا رہی تھیں، جب وہ ایک تنگ راستے کی طرف مڑے تو اُس کے شوہر نے کہا "یہ چمپا گلی ہے، یہیں ہمارا گھر ہے ——"

اس نے چاروں طرف دیکھا مگر کہیں اسے چمپا کا درخت نظر نہیں آیا، اسے صرف ایک پیپل کا درخت دکھائی دیا جو کالی کے چھوٹے سے مندر کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے دیوی کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو تعظیماً جوڑ دیا —— اور وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔

—— اس طرح اُس کی ازدواجی زندگی شروع ہوئی۔

تین سالہ بچی کا بوجھ اس کے لئے بہت سخت تھا، لیکن وہ بچی کو اپنے جسم سے علیحدہ نہیں سمجھ رہی تھی، وہ اسے اتنی دیر سے لئے ہوئے تھی کہ وہ بھی اس کا جزو لاینفک بن گئی تھی، دو دن سے پرمیلا اس کی گود میں تھی، اس وقت سے کمار خوراک کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور رمیش بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا، اب وہ بالکل اکیلی تھی، وہ واپس نہیں آئے تھے

اس لئے وہ باہر اس فکر میں نکلی تھی کہ ممکن ہے کہیں نہ کہیں سے راستے اور بچّی کو کچھ کھانے کو ملجائے اور کمار یا اس کا بیٹا ہی نہیں نظر پڑجائے۔ لیکن کملا کو کچھ نہ ملا، وہ دو دن اور دو رات سے بھٹکتی پھر رہی تھی، اُس کو اپنی ہی طرح ہزاروں بھوکے بدحال اور محتاج ملے، وہ انسان معلوم نہیں ہوتے تھے وہ ایک دوسرے کے چہرے پر نظر نہیں ڈال سکتے تھے، اس نے کچھ کھانے کا سامان خریدنے کی کوشش کی، مالدار حلقوں میں کچھ دکانیں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں مگر اس کی نقرئی چوڑیوں سے کچھ زیادہ نہیں خریدا جاسکتا تھا، آخر وہ تکان سے چور ہوکر لاشوں کے ڈھیر کے قریب ہی لیٹ گئی۔

اس نے آج صبح طے کر لیا تھا کہ اگر اسے مرنا ہی ہے تو وہ کالی کے مندر سے واپس جائیگی جہاں وہ یہ دعا مانگیگی کہ آئندہ جنم میں وہ اور اُس کا خاندان یا تو خوشحال ہو یا پھر جنم ہی نہ ملے، ہاں اسے آخری بار پھر کالی کے مندر میں جانا چاہئے۔ اگرچہ کالی نے انھیں بھوکا مارا ہے، مگر وہ یہ دعا ضرور کریگی کہ گھر پر کمار اور اُس کا بیٹا صحیح سلامت ملجائیں۔

رمیش اور کمار ——— کبھی وہ انھیں دوبارہ زندہ دیکھ سکیگی؟

اس نے سڑک پر نظریں گاڑدیں، کیا وہ بیوہ ہوکر مریگی، ایک نیک ہندو بیوی جس نے ہمیشہ یہ دعا کی ہو کہ اس کا کریا کرم کمار کے ہاتھوں ہو؟ کیا وہ اس شخص کو بھی دیکھ سکیگی جو ۲۰ سال پہلے اس کے لئے اجنبی تھا اور وہ اب اُس سے محبت کرتا تھا اور اس کے بچوں سے گھر کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ جب وہ شام کو دکان سے آتا تو وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کا خیر مقدم کرتی اور وہ دونوں بھجن میں شامل ہونے کے لئے مندر جاتے، کھانا کھا چکنے کے بعد وہ آنیوالے بچّہ کے بارے میں باتیں کرتے اور دعا کرتے کہ وہ لڑکا ہو۔ اور جب لڑکا پیدا ہوا تو وہ کالی کے مندر میں اظہارِ عقیدت کے لئے گئے۔

ان دنوں کملا بہت مصروف رہتی شام کو وہ دونوں رمیش سے دل بہلاتے اور اُس کے چہرے پر اپنے خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ بعد کے دو بچے مر گئے، لیکن کمار اور کملا برابر قانع رہے۔

——— وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے اُٹھی اور اس چبوترہ کی طرف بڑھی جہاں کالی کی مورتی نصب تھی۔ اس نے پرمیلا کو اپنی گود سے الگ کرکے فرش پر لٹا دیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کالی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"ماتا!" اس نے سسکی بھرتے ہوئے کہا "مجھے بیوہ کی موت مرنے سے بچالو، مجھے میرا خاوند واپس دیدو، مجھے میرا لڑکا دیدو، مجھے کچھ کھانے کے لئے دیدو، اگر ہم میں سے کسی نے کوئی گناہ کیا ہے اس کا بدلہ مجھ سے لے لو۔ کمار رمیش اور میری بچّی کو بچالو، اگر کسی کی موت آئی ہے تو مجھے دیدو! مجھے ایک مرتبہ اپنے گھر جاکر اپنے خاوند اور بچّہ کو زندہ دیکھ لینے دو، میں انھیں تمھاری حفاظت میں چھوڑ دونگی، انھیں آفت سے بچالو، کالی ماتا! میری یہ التدعا سن لو۔ اگر میں نے اور میرے خاندان نے کوئی گناہ کیا ہے تو اُس کی سزا مجھے دیدو"

وہ دوزانو ہوگئی اور اپنا سر زمین پر رکھدیا اور پھر اُٹھکر اپنی بچّی کو گود میں لے لیا اور مورتی کے چرنوں میں پڑے ہوئے ایک پھول کو اُٹھا لیا اور اُس کو پرمیلا کی پیشانی اور اپنے سر سے لگایا۔

آہستہ آہستہ وہ مندر کی سیڑھیوں سے نیچے اتری اور امید کا سہارا لیکر گھر کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کالی اُس کی دُعا کو قبول کریگی، کیا اس کا شوہر اور بیٹا گھر پر ملجائینگے۔

راستے درمیان میں ایک جگہ رکنا پڑا وہ بہت تھک گئی تھی اس کی دوڑ تک کھل گئی تھی۔

رمیش کتنا اچھا تھا، اُسے کتنی محبت سے پال پوسا تھا، وہ دروازہ کے سامنے ٹھہر گئی۔

اس کو وہ دن یاد آگیا جب رمیش میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوکر خوشی سے اُچھلتا ہوا دوڑ کر اس کے پاس آیا تھا "ماں! میں پاس ہوگیا" اور رمیش کو پیار کیا تھا اور اُس سے کالی کا شکرانہ ادا کرایا تھا۔

شام میں جب کمار گھر آیا تو وہ بھی بہت خوش ہوا، اور سب کے سب کالی کے مندر گئے تھے اور برہمن کو خیرات دی تھی۔ انھیں فخر تھا۔ کیونکہ قرب وجوار میں بہت ہی کم لڑکوں نے میٹرک پاس کیا تھا۔ لیکن جب وہ مندر سے گھر پہنچے تو اچانک صورتحال بدل گئی۔ کھانے کے بعد کمار نے کہا "بیٹا! اب تم نے اپنی تعلیم ختم کرلی ہے، اب دکان میں میرا ہاتھ بٹاؤ، تمہاری وجہ سے مجھے بڑی مدد ملیگی، بعض دفعہ میں انگریزوں کی بات نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا مانگتے ہیں۔ مجھے امید ہے، تم اس کاروبار کو زبردست ترقی دے لوگے"

کملا کو رتیش کی طرف دیکھ رہی تھی ایسا معلوم ہوا جیسے رتیش کی ساری مسرت چھین لی گئی ہو۔ اس کی گردن جھک گئی وہ خاموش رہا، کملا نہ سمجھ سکی کہ باپ کے ان الفاظ سے وہ کیوں اس قدر غمگین ہوگیا، کمار کو بھی لڑکے کی خاموشی سے تعجب ہوا۔

"کیا بات ہے؟ تم نے گردن کیوں جھکالی اور بولتے کیوں نہیں، تم نے ابھی امتحان پاس کیا ہے اور اب روزی کمانا شروع کروگے، تمھیں خوش ہونا چاہیئے" کمار نے کہا۔

رتیش نے افسردگی کے ساتھ ایک چہرہ کی طرف سے دوسرے کی طرف دیکھا اور پس وپیش کے بعد بولا "پتا جی! میں ابھی دکان پر جانا نہیں چاہتا، میرا ارادہ" ——— اور کملا نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف آرزومند نظروں سے دیکھ رہا ہے "یہ ہے کہ میں کالج جاؤں، اس کے بعد آپ کا ہاتھ بٹاؤں"

"کالج جاؤگے؟" کمار نے حیرت سے پوچھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کبھی اس کو یہ خیال آیا ہی نہیں۔

"تم کالج کیوں جانا چاہتے ہو؟ تم میٹرک پاس کرچکے، کیا یہ کافی نہیں؟"

"پتا جی آپ جانتے ہیں" رتیش نے ملتجیانہ انداز سے کہا "میرے تمام ٹیچروں کا کہنا ہے کہ مجھے کالج ضرور جانا چاہیئے اور میں خود بھی جانا چاہتا ہوں، میں نے ابھی پڑھا ہی کیا ہے، مجھے آگے بڑھنا ہے۔ ایک نئی دنیا ———"

ماں باپ میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا، وہ کچھ نہیں سمجھ سکی کہ رتیش کیا کہنے کی کوشش کررہا ہے، مگر اس نے رتیش سے ہمدردی کا ضرور اظہار کیا، وہ جو مانگتا ہے اسے ملنا چاہیئے، کیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا نہیں ہے۔

"پتا جی!" رتیش نے خاموش فضا میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا بہت اچھا ہے۔ ابھی مجھے بہت سی باتیں سیکھنا ہیں، پتا جی کیا میں کالج نہیں جاسکتا"

کملا نے کمار کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھا، اسے امید تھی کہ کمار مان جائیگا۔ اگرچہ وہ رتیش کی باتوں کو نہیں سمجھ سکی تھی، وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا کچھ مانگ رہا ہے اور اسے معلوم تھا کہ اس علاقہ میں کوئی لڑکا کالج نہیں جاتا، مگر کمار کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے۔

"کالج سے فارغ ہونے کے بعد تم کیا کروگے! صرف یہی خیال تمہارے دماغ میں بیٹھ جائیگا کہ کہیں کلرک بن جائیں ——— ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھوکا ہی مرنا پڑیگا، میں بھی اسکول یا کالج نہیں گیا، پھر بھی میں کما کھا رہا ہوں، میں نے تمھیں پالا پوسا، اب تم اور کیا چاہتے ہو" کمار نے رتیش کی طرف دیکھا اور حتمی طور پر کہا "نہیں، میں تمھارے احمقانہ خیالات پر روپیہ برباد نہیں کرسکتا" یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔

کملا نے بےچینی کے ساتھ رتیش کو دیکھا وہ اپنے کو خود بے بس پا رہی تھی، رتیش نے اپنا سر اونچا کرلیا جیسے وہ اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کو چھپا رہا ہو، کیا اسے خبر نہیں تھی کہ کملا اس کی باتوں کو سمجھے بغیر بھی اس سے ہمدردی کررہی تھی؟ کملا سوچ رہی تھی کاش وہ اور کمار اسکول گئے ہوتے، اس وقت وہ لڑکے کی امنگوں کو سمجھ سکتے۔

اچانک اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، رتیش چلا گیا تھا۔ وہ کہاں جاسکتا ہے؟

شاید وہ اپنے کمرہ میں گیا ہوگا۔ اسے میز کی دراز کھلنے کی آواز آئی جہاں بیٹھکر وہ اسکول کا کام کیا کرتا تھا، وہ
ز، ٹھکی اس کے پاس گئی۔

رمیش اپنی میز کے قریب کھڑا تھا، اس کی نظریں کاغذ کے ایک فارم پر جمی ہوئی تھیں ——— اس نے رمیش
آواز دی، مگر وہ نہیں بولا، اس نے آہستہ آہستہ دیدہ و دانستہ کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے اور انھیں
بن پر بکھیر دیا، اس نے کہا " یہ میرا میٹرک کا سرٹیفکٹ ہے، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب مجھے کالج
ہ بجائے پتاجی کی دُکان پر جانا ہے "

کملا کچھ نہیں بولی ——— وہ ابھی تک الگ کھڑا تھا ——— کیا وہ بات بھی نہیں کریگا۔ رمیش نے ماں کو
مضطرب دیکھا تو اس کی گردن میں باہیں ڈالدیں، " ماں میں کالج جانے کے لئے کس قدر بیتاب ہوں، کیا تم نہیں جانتیں
بالکل ایسا ہی ہے کہ میں جس وقت کھانے کے لئے آگے بڑھوں تم میرے سامنے سے اُسی وقت کھانا اُٹھالو۔ میں اب
دکا مر رہا ہوں "

کملا سمجھ گئی، اب وہ اس کی تمام باتیں سمجھ سکتی تھی، رمیش کا غم اس کا غم بن گیا، اس نے پیار سے اس کو بٹھایا، وہ اسکو
لج ضرور بھیجے گی۔

" اچھا اب تم جاکر سو جاؤ —— کل سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا، کالی سے دعا کرو، میں تمھارے پتاجی سے کہونگی، اب میں
رہی ہوں، پرمیلا رو رہی ہے "

اس نے کمار سے ایک لفظ نہیں کہا، جب وہ بستر پر چلا گیا تو وہ اُس کے پائینتی جاکر بیٹھ گئی۔

" میں نے آجتک تمھاری کسی بات سے سرتابی نہیں کی لیکن آج پرماتما معاف کرے، میں تم سے متفق نہیں "
اس نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا " تم نے رمیش کو کالج بھیجنے سے انکار کر دیا ہے، لڑکا اس کے لئے بیچین ہو رہا ہے
ہم نے اس کا کہنا ٹال دیا تو وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے برگشتہ ہو جائیگا، میں نہیں جانتی کہ کالج کیوں اسقدر اہم ہے،
ن مجھے یقین ہے کہ وہ برا بھی نہیں ہے، تم ہی سوچو آج جب میٹرک کا سرٹیفکٹ لیکر آیا تو ہم نے کس قدر فخر کیا تھا۔
رکرو جب وہ کالج سے ڈگری لیکر آئیگا تو ہم کتنا رشک کریں گے "

اس نے پوری قوت سے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " میں سمجھتی ہوں شاید تم اسے اسلئے کالج نہیں جانے
رہتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ عالم بننا چاہ رہا ہے "

کمار کے احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے کہا " تم نے بغیر کسی مددگار کے دکان کے کام کو ابتک آسانی سے
لیا ہے، تم چار ایک سال اور کاروبار کو بخوبی انجام دیتے رہوگے، وہ ہمارا اکلوتا لڑکا ہے، اگر روپئے کا سوال ہے
یا تھیں، اپنے تمام زیورات دینے کے لئے تیار ہوں، جو مجھے جہیز میں ملے ہیں، تم انھیں بلا تامل فروخت کر دو، یہ میں نے
اس کی دلہن کو دینے کے لئے رکھ چھوڑے تھے، مگر ہمیں اس کے دل کی آرزو پوری کرنا ہے، یہ چیزیں ہم پھر بھی خرید لینگے "
اس طرح وہ رات گئے تک کمار سے بحث کرتی رہی حتّٰی کہ اسے راضی ہو جانا ہی پڑا، وہ خوش خوش اُٹھی اور رمیش
کے کمرے میں پہنچی جہاں وہ نیند میں اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

اس نے دھکا دیکر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ احاطہ میں سناٹا تھا، وہ ایک لاش سے ٹکرائی، مگر کوئی توجہ
دیئے بغیر آگے بڑھ گئی، اس نے بہت سی چیزیں دیکھی تھیں، ایک گھر میں تو لوگوں میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ خوراک کی
تلاش میں نکل سکیں، انھوں نے گھر میں رہنا ہی مناسب سمجھا تھا، آہستہ آہستہ وہ مکان کی طرف بڑھی، تیز تیز قدم

وہ سپنے دروازہ پہ پہنچی۔ شاید وہ آ گئے ہونگے اور اندر سو رہے ہونگے، بچینی کے ساتھ وہ اپنے کمرہ کی طرف دوڑ پڑی۔ کمرہ خالی دیکھکر اس کی امیدیں مرجھا گئیں۔ شاید وہ رشی کے کمرے میں ہونگے، نہیں وہ بھی خالی تھا۔ اب صرف باورچی خانہ رہ گیا تھا جو کھانے کے کمرے کا بھی کام دیتا تھا، وہ لوگ وہاں بھی نہیں تھے۔ وہاں جاتا بھی کون جبکہ کئی روز سے چولہے میں آگ بھی نہیں جلی تھی، وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی اور پیالا [illegible] دیا اور [illegible] کرنے لگی ——— شاید وہ لوگ واپس آ جائیں، تھکان سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسے بھوکے پیاسے مرد، عورتیں اور بچے ان سڑکوں پر بھٹکتے ہوئے نظر آ رہے تھے جہاں وہ خود بھی گھومتی رہی تھی وہ سڑک کے کنارے اس طرح گر پڑتے تھے جیسے درخت سے سوکھے پتے اور لاشوں کے انبار پر انبار لگ رہے تھے۔

اچانک یہ بھیانک شہر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ کمار اور رشی اس کو دیکھکر مسکرا رہے ہیں اور موت کا دیوتا یم ان کے ساتھ ہے، انھوں نے اس کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا ———

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ نیند سے چونک پڑی۔ وہ اپنے لڑکے کو پکارتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھی، اس نے پہلی مرتبہ کمار کا نام لیکر پکارا، لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوسی، حسرت اور اضمحلال کے ساتھ اس نے گلی کی طرف دیکھا ——— لاشوں کے ڈھیر بے گنتی مرے ہوئے پڑے تھے، اسے کوئی جاندار چیز نظر نہیں آئی۔

کیا کالی اس کو آخری دعا بھی نہیں کرنے دیگی؟۔ اسے پھر مندر جانا چاہئے، وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کے سہارے اٹھی، جیسے ہی اس نے قدم اٹھایا لڑکی کے رونے کی آواز آئی "ماں!" ——— اور اس کا سر چکرا گیا اس کو لاشوں سے پٹا ہوا ایک گڑھا نظر آیا، جہاں سب سے اوپر اس کے شوہر اور لڑکے کی لاشیں پڑی تھیں۔

"میں آ رہی ہوں" اس نے چیخکر کہا۔

"میں آ رہی ہوں" اور وہ پتھریلی سیڑھیوں پر دھم سے جا گری!

(بقیہ "نامراد")

بھکاری بچوں کے درمیان کوئی سکہ ڈالدیا تھا جسے پالینے کی جدوجہد میں وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں [illegible] کلوا کی نگاہوں میں اس پیدائشی یا کسی حادثہ کی بناء پر معذور و اپاہج بچے کی حسرت نصیب صورت [illegible] اپنے تندرست و توانا ساتھیوں سے الگ بڑ کے نیچے بے حس و حرکت پڑا ہوا دور سے چمکیلے سکوں کو [illegible] نگاہوں سے تکا کرتا تھا۔

ناہید عالم

کھڑکی

ڈائننگ روم کا پردہ سرکاتے ہی اُس کی نظر آنے والوں پر پڑی اور چائے کی ٹرے اُس کے ہاتھوں میں کپکپانے لگی ایکدم اُسے محسوس ہوا گویا کئی آنکھیں اُس پر جم کر رہ گئی ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ٹرے وہیں پھینک کر بھاگ نکلے۔ اس کا جسم ان تیز تیز تنقیدی نظروں کے وار سہتے سہتے بالکل چھلنی ہو چکا تھا اور وہ اکثر تنہائیوں میں اس حد تک درد محسوس کرتی کہ اُسے خودکشی پر غور کرنا پڑتا۔ مگر غور کرنے کے بعد اُس پر عمل کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ وہ چڑ کر زندہ رہنے پر آمادہ ہو جاتی۔

"اچھا ہوتا کہ تو مرجاتی کمبخت" ماں جھلا جھلا کر اُس پر غصہ اتارتی۔

"لیکن ماں ——— " اس کا جی چاہتا کہ وہ چلا کر کہدے "میں بدصورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ قصور تو تمہارا ہی ہے کہ تم اور ابا دونوں ہی تو بدصورت ہو۔ تم اگر کسی خوبصورت مرد سے شادی کر لیتیں تو یقیناً تمہارے بچے تم سے اچھے ہوتے اور بہت سے لوگ جو مجھ سے اس لئے شادی نہیں کرتے کہ مجھے جہیز کافی مقدار میں نہیں ملیگا تو اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں۔ کیوں نہیں ابا زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے؟ لوگ لڑکی کو کب دیکھتے ہیں اُس کی دولت کو دیکھتے ہیں اور یہ صورت شکل کا تو بہانہ ہے ورنہ تم خود سوچو کہ تم میں ایسی کیا کشش تھی کہ ابا نے تم سے شادی کر لی، یہی نا کہ تمہارے باپ نے تمہیں بیدریغ دیا۔ مگر میرا باپ ——— کاش! وہ بھی رشوت لیتا ہوتا"

معاً اُسے خیال آیا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یوں بیوقوفوں کی طرح دروازے میں کھڑی رہی تو اسے اس کی بہت سخت سزا برداشت کرنا پڑیگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی اور قدم ڈالتی ہوئی، صوفے کے نزدیک رکھی ہوئی نیچی سی میز کی طرف بڑھنے لگی۔ ماں شعلہ بار نظروں سے اُسے گھور رہی تھی اور آنے والی ایک سانولی سی لڑکی سوفے کے بازو پر جھکی، زیرلب مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے اپنے لمبے لمبے یاقوتی ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

...... وہ چائے کی پیالی لیکر خاموشی سے ایک کرسی پر ٹک گئی، اس کا تمام جسم، ہلکے ہلکے ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا تھا، اور جب پنکھے کی فراٹے بھرتی ہوئی ہوا، اُس ٹھنڈے پسینے کو خود میں جذب کر لینے کے لئے اُس کے جسم کو لپٹ گئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ برف کی سلوں تلے دبتی جا رہی ہو، وہ کپکپا اُٹھی اور اپنی اس غیر مہذبانہ حرکت کو چھپانے کے لئے سر سے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو درست کرنے لگی۔

"کمبخت کسی کے سامنے بیٹھنے کی بھی تو تمیز نہیں تجھے" اُسے یاد آیا کہ ایک بار جب اس طرح ایکسائز انسپکٹر کی بہن اُسے دیکھنے آئی تھیں تو اُس روز اُسے ہلکا ہلکا بخار اور سر میں سخت درد تھا، وہ اُن کے سامنے خاموش بیٹھی اپنے درد کو دبانے کی کوشش میں بار بار پہلو بدل رہی تھی، اُس کا چہرہ اُداس تھا ——— مضمحل، مگر وہ کیا کرتی، دوسروں کا بولنا ہی اُس کے لئے عذاب ہو رہا تھا، کہا خود چہکتا، لیکن ماں کو اس سے کیا غرض، اسے تو اس کی شادی کرنا تھی چاہے وہ کسی طرح بھی ہو ذلت سے، چمک سے ——— ہنہ، اس سے تو بہتر ہے کہ شادی ہو ہی نہیں، کنواری بیٹھی رہتی، وہ کوئی سوکھ تو نہ جاتی، لیکن زیادہ غضب تو اس روز ہوا جب انسپکٹر کی بہنوں نے جا کر کہا کہ "خدا کی قسم بھائی جان آپکے تو

پیر بما بر کبھی نہیں اور ویسے بھی ٹی۔بی کی مریض معلوم ہوتی ہے۔ دسے ——— میں کہتی ہوں، تمام وقت مجھے ویسا معلوم ہوتا رہا، گویا اب جان نکلی اور اب ———"

اور جیسے اُن کے گھر میں کوئی بم پھٹ گیا ہو "میرے اللہ، اس بدنصیب کو جانے کیا روگ لگ گیا ہے کہ ہر وقت مُنہ سجائے پڑی رہتی ہے۔ آدمی کسی کے سامنے تو ہنس بول لے، اب دلہن بھی تو ہے ———"

دلہن! اور اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، دلہن! کاش یہ اُس کے گھر نہ آئی ہوتی، یہ ذلیل عورت! اور کسی دکھ بھری یاد سے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں ———،

چار برس پہلے جب وہ انیس برس کی ایک خاصی نکھری ہوئی رسیلی لڑکی تھی تو اس کے مکان کی اوپر کی منزل میں کالج کے کچھ لڑکے رہا کرتے تھے، کتنے شریف تھے وہ لڑکے، باوجود اس کے کہ ان کے کمروں کی کھڑکیاں، اُس کے صحن میں کھلتی تھیں۔ انھیں کبھی کھڑکی میں کھڑا نہیں پایا۔ صبح کو دس بجے تک اُن کے گھر میں بالکل سناٹا رہتا اور رات کے بعد گیارہ تک ایک ہنگامہ ——— بانکوں کے ایک ساتھ کھلجانے کی دلچسپ آوازیں، فلمی گانوں کا سیلاب، چینی کے برتنوں کی جھنکاریں، کسی کے بڑبڑاتے ہوئے اسٹو کی گھوں گھوں اور کسی کا قمیص میں بٹن نہ ہونے کی وجہ سے جھنجلا کر جھنجلاتے پھرنا اور بگڑ بگڑ کر بڑبڑانا ——— یہ سب کچھ اتنا دلچسپ تھا کہ وہ بھابی کی معنی خیز نظروں اور رس بھری باتوں کے باوجود گیارہ بجے تک بستر پر پڑی، اس کا مزہ لیا کرتی۔

اور پھر ———، ایک دن اس کی تمام قمیضوں کے بٹن غائب ہو گئے، پتلونوں کے ہک نکل گئے اور اُس کے سب ٹون پر پریشان شکنیں پڑ گئیں، اُس نے غصے میں آکر اپنے نوکر کو پیٹ دیا "پاجی کہیں کا مہینے بھر سے کہہ رہا ہوں کہ سب چیزیں درزی کے پاس لیجا مگر سنتا ہی نہیں۔ آج کالج سے واپسی پر تمام چیزیں ٹھیک نہ ملیں تو کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا ——— اُلّو!"

اور پھر زینے میں سیٹی کی آواز مدھم ہوتے ہوئے بالکل معدوم ہو گئی۔

دوپہر کو سر درد کا بہانہ کر کے اُس نے اپنا کمرہ بند کر لیا، اور پچھلا دروازہ کھول کر اوپر والوں کے نوکر کو بلا بھیجا،

"تمھارے بابوجی، آج تم پر خفا کیوں ہو رہے تھے؟" اُس نے بظاہر کتاب پڑھتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

"جی، بات یہ ہوئی کہ ان کے سب سوٹ استری کے لائق ہو رہے ہیں اور قمیصوں میں بٹن کمبخت دھوبن رہنے نہیں دیتی، مجھے تمام دن اتنا کام رہتا ہے کہ درزی کے ہاں جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بس اسی بات پر خفا ہو رہے تھے۔"

"تو تم بہت کام کرتے ہو کیا؟ اس وقت کیا کر رہے تھے؟"

"صبح سے ابتک تو میں نے چاروں کمرے صاف کئے، کتابیں جمائیں، بوٹ پالش کئے، اب موزے دھو رہا تھا کہ آپنے بلالیا، بڑی مشکل میں جان ہے۔ ابھی تو مجھے شہر جاکر ارشد میاں کی پھوپی کے ہاں سے چند چیزیں بھی لانا ہے۔ درزی کے پاس جانے کا وقت تو شاید آج بھی نہ ملے" اُس نے رحم طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا،

بچارہ بچہ!

"یہ ارشد میاں کون ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہیں، ویسے بچارے ہیں بڑے اچھے، ایک رفیق صاحب ہیں، بس ہر وقت پیٹنے کو تیار جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں، چاہے کسی کا، کام کرتے کرتے، کچھو مر نکل جائے، مگر ان کے فشن میں کمی نہیں آتی، پھر ایک اختر بی بی، سوٹ ووٹ پہن کے لگتے بڑے خوبصورت ہیں۔ ایک دفعہ سینما میں بھی میں نے ایک ایسے ہی بابو کو دیکھا تھا، جو ایک گوری گوری لڑکی سے ملنے اُس کے باغ میں جایا کرتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ ———"

" اور تمھارے بابو سوٹ و شٹ پہن کے کہاں جاتے ہیں ؟ " لڑکا اُسے ظلم کی پوری کہانی سنانے پر آمادہ تھا، مگر اس نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔

" اب میں کس کی بات بتاؤں ؟ میں تو چھیوں بابوؤں کا نوکر ہوں " اس نے اپنی بساط کے مطابق گویا مذاق کیا۔

" رفیق صاحب کی بات ——— "

" رفیق صاحب تو کہیں بھی نہیں جاتے بی بی - بہت ہوا تو بازار کے چکر لگا لئے یا سینما چلے گئے ، ہاں ارشد میاں اور الطاف صاحب کے ساتھ میں نے کئی مرتبہ سینمیں دیکھی ہیں اور خدا جانے کیا عادت ہے ان الطاف صاحب کی ، رفیق صاحب بہت منع کرتے ہیں ، مگر وہ رات کو ایک آدھ گلاس دوائی کا پئے بغیر نہیں رہ سکتے - توبہ ، کتنی سڑی ہوئی اور بدبو دار ہوتی ہے ان کی دوائی ، میں تو کبھی نہ پیوں "

" تو کیا وہ کچھ بیمار ہیں ؟ "

" ہاں جی بی - رات کو دوائی پینے کے بعد تو اُن کی طبیعت ایکدم بگڑ جاتی ہے اور وہ یونہی بکنے لگتے ہیں ، بکنے کیا - رفیق صاحب تو بہت چڑتے ہیں - ایک دن الطاف صاحب کہنے لگے کہ " تم بھی پیو " -

مگر وہ بولے کہ " دیکھو بھائی ، یہیں سے ہمارے راستے الگ ہیں ، ورنہ تم کہو تو تمھارے لئے جان تک دینے کو تیار ہوں "

" مجھے تمھاری جان کی ضرورت نہیں " وہ بہت زور سے ہنس پڑے " اگر تم کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو ایک بوتل ——— ہا ، ایک بوتل ! "

خدا جانے انھیں دوائی پینے میں کیا مزہ آتا ہے ؟ "

" دوائی نہیں ہوگی وہ پگلے ، الطاف صاحب شراب پیتے ہونگے "

" شراب ؟ " وہ چونک پڑا " الطاف صاحب شراب پیتے ہیں ، تب تو وہ بڑے برے آدمی ہیں ، جب میں چھوٹا سا تھا اور گاؤں میں اپنے باپ کے پاس رہا کرتا تھا تو ہمارا ایک پڑوسی شراب پیتا تھا ، ایک دن میں اسکول سے واپس آرہا تھا تو میں نے اُسے اُلٹے منہ نالی میں گرے دیکھا - اسکول میں سب ماسٹر کہتے تھے کہ شراب پینا گناہ ہے ، یہ بہت بُری چیز ہے اور جو ماسٹر صاحب ہمیں پانچویں میں پڑھاتے تھے وہ تو شراب کا نام تک لینا بھی گناہ سمجھتے تھے ، ہم تو خیر بی بی پانچ جماعتیں ہی پڑھے ہیں - مگر الطاف صاحب تو بارھویں جماعت میں پڑھتے ہیں - تب بھی شراب پیتے بُرا نہیں لگتا انھیں ؟ "

" ٹن ——— ! "

ساتھ ہی کمرے میں کلاک نے ایک بجایا تو وہ چونک پڑا - ارے ——— " اچھا بی بی اب میں جاتا ہوں - بہت کام پڑا ہے ابھی تو مجھے "

" ——— ٹھہرو ، ایک بات تو سنو ، دیکھو تم رفیق صاحب کے سب سوٹ اور قمیص مجھے لا دو - میں اُن کو کالج سے آنے سے پہلے سب ٹھیک کر دونگی - لو جاؤ "

" سچ ؟ ابھی لیجئے ، ارے ——— " اور وہ خوشی کے مارے لڑکھڑاتا ہوا بھاگا -

اُس کے کپڑوں پہ استری کرتے ہوئے وہ کچھ عجیب سا سرور محسوس کرنے لگی ، لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبوئیں جیسے اُس کے احساسات پہ چھاتے چھاتے اس کی روح میں مدغم ہونے لگیں ، اس نے سیکڑوں بار اپنے بھائی کے معطر سوٹوں پر بھی استری کی تھی ، مگر جو لطف اُسے آج آ رہا تھا ، پہلے کبھی نہ آیا تھا - ایک ، دو ——— اور تیسرے سوٹ پر استری کرتے ہوئے

وہ ٹھٹک گئی، اُسے جیسے دھکا سا لگا۔ سینٹ میں بسے ہوئے لیڈیز رومال ——— وہ ہولی سے پالی جیت [illegible] کرنے لگی۔ چنلیس کچھ سینما کے ٹکٹ، اور ایک چھوٹے سے نیلے لفافہ میں ملفوف خط، بہت بے نیازی سے اس نے اُسے کھول ڈالا۔ "بھائی جان چلتے وقت جو آپ میرا رومالوں کا ڈبہ اُڑا لائے تھے، خدا کے لئے اُسے استعمال کیجئے لوگ تو یونہی بات سے اُڑتے ہیں۔ اور پھر ارشد بھائی اور اُن کے رشتہ دار، کیا فائدہ کہ کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو! حروف اس کی آنکھوں کے نیچے تتیوں کی طرح ناچنے لگے۔ اُس کی بہن! اُسے غیر ارادی طور پر اُس سے عقیدت ہوگئی اور ایک خیال کسی تیز رفتار پرندے کی طرح اُس کے دماغ میں آیا اور گذر گیا۔ جیسے دھیرے سے کسی نے اُس کے کان میں پھونک دیا ہو، "بھابی!" اور خود ہی خود بچاکر رہ گئی۔ اگلے روز صبح کو وہ ہنڈیا چڑھا کر آ رہی تھی کہ اُس نے منّے کو بچتے بچاتے، باورچی خانہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ "کیا ہے منّے؟" صحن میں دھوپ سینکتی ہوئی بھابی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ ذرا بی بی سے کالی مرچیں لینا ہیں، ہمارے گھر ختم ہوگئی ہیں۔"

باورچیخانہ میں پہنچکر منّے نے چپکے سے ایک لفافہ نکال کر اُسے دیدیا اور کالی مرچیں لیکر کوئی ستا سا فلمی گیت گنگناتا چلا گیا۔

"چھنن۔ چھنن، چھنن، چولہے پہ رکھی ہوئی ہنڈیا میں پانی ختم ہوگیا تھا اور آگ کی لپٹیں بڑھ رہی تھیں۔ اُس نے جلدی میں، پانی کی بھری گڑوی ہنڈیا میں اونڈیل دی۔ اور ایک عجیب سی کیفیت لئے، اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔

دھڑکتے ہوئے دل سے اُس نے خط کھولا ——— "میں آپکی اس تکلیف فرمائی کا بیحد ممنون ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ اس اجنبی شہر میں، آپکی اس ہمدردی نے میرے دل سے اجنبیت کا احساس یکلخت کم کر دیا ہے" اُس کا جی چاہا کہ وہ اس خط کا جواب دے، مگر لکھے کیا؟ عجیب احمقانہ سی بات ہوگی۔ اگر وہ لکھدے کہ جی نہیں۔ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے بھلا۔ مجھے تو خوشی ہوئی کہ ——— " لاحول ولا۔ وہ سمجھے گا کہ بیحد جذباتی لڑکی ہے یہ۔ اور پھر میں تیرا کیا لگتا ہوں جو تجھے میرا کام کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے . . . . .

اُس روز گوشت کا حلوہ بن جانے پر اُسے خوب ڈانٹ پڑی "دو دن کو نوکر نہ ہو تو مصیبت پڑ جاتی ہے اور بنو، کوئی کلرک تک تو تمھیں قبولتا نہیں۔ دماغ بڑھا رکھے ہیں، گویا کوئی ڈپٹی ہی تو مل جائیگا۔ اچھا ہی ہوا تھا جو کلرک نے اُسے نہیں قبولا تھا۔ وہ سوچنے لگی .... اور خدا جانے یہ مرد اپنی شکلیں کیوں نہیں دیکھتے، بس بیوی خوبصورت ہو۔ اور جو خوبصورت بیویوں کو حبشی میاں مل جاتے ہیں تو وہ ہائے واویلا کیوں نہیں کرتیں؟ یہی کہاں کے نواب ہیں کہ ——— اُنھہ، خیر یہی ایک وقت کو [illegible] لیا کہ خوبصورت مرد خوبصورت بیوی کی تلاش کرتے تو کچھ بُرا نہیں کرتے، مگر یہ لنگور کی شکل کے [illegible] جنھیں نہیں تو جو بھی مل جائے اُسی کو غنیمت سمجھو، مگر نہیں، لڑکیوں کے عیب ڈھونڈھ نکالتے [illegible] آگے ہی ہوں گے۔ دوسروں کو بھی خراب کرتے ہیں، جس روز سے اس کلرک نے اُسے بدصورت کہہ کر ٹھکرایا تھا، وہ خود کو واقعی ایسا سمجھنے لگی۔ مگر اب ——— ؟ اب کیا؟ [illegible] احساس تھا۔ رفیق نے اُسے دیکھا ہی کب ہے؟ ایک خط لکھدینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ——— [illegible]

ہی کو وہ کھڑکی میں کھڑا، بظاہر پنسل بناتا ہوا کنکھیوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اب ہر وقت دونوں کھڑکیاں کھلی رہنے لگیں، اس کے کمرے کی کھڑکی بالکل رفیق کی کھڑکی کے مقابل تھی، اس لئے جب وہ کمرے کے اندر ہوتی یا باہر وہ کھڑکی میں کھڑا اُسے تکا کرتا، شروع شروع میں تو وہ نفتے کی خوشامدوں میں لگے رہتے لیکن رفتہ رفتہ ان میں جرأت پیدا ہوگئی اور اب اکثر راتوں کو رفیق کھڑکی میں سے پھینک کر اُسے خط پہنچانے لگا، لیکن ایک رات ــــ اس سے پہلے کہ وہ کام ختم کرکے صحن میں نکلے رفیق خط پھینک چکا تھا۔ اور نہ جانے کیسے وہ ان تک پہنچ گیا۔

اور اس کے بعد ــــ طعنے کوسنے، مار ڈالنے کی دھمکیاں، الزام ــــ، اس کا جی چاہا کہ وہ کہیں ڈوب مرے لیکن جب اُس کے بھائی کی بیوی نے اپنی سہیلی کو تمام قصہ سناتے ہوئے کہا کہ "شریف زادیوں کو یہ چھن، توبہ، توبہ سچ کہتی ہوں، غیرت والی ہو تو ڈوب مرے کہیں جا کے" تو ضد میں آکر اس نے سوچا کہ وہ بس ڈوب ہی نہیں مرے گی۔ جنھ وہ نہ ڈوب مریں، جب شادی سے پہلے قاسم کو اُس کے ہاتھ خط بھجوایا کرتی تھیں، اور ایک دن تو قاسی بھیا نے اُن کے ہونٹ تک ــــ اور اب کیسی پاکباز بنی بیٹھی ہیں۔

اس کے دل میں بھابی کے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات اُمڈے ہی چلے آرہے تھے، پہلے وہ ان ہی بھابی سے کتنی محبت کیا کرتی تھی۔ اُسے خیال آیا، مگر بھابی نے کبھی اُسے اپنا نہ سمجھا ... اُس روز وہ کتنی خوش تھی، جب رفیق کی ماں اُس کے یہاں پیام لیکر اُسے دیکھنے آئی تھی اور تقریباً سب کچھ طے بھی ہو جاتا۔ مگر بھابی کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔

"یہ سویٹر آپ نے خود بنا ہے؟ بڑا خوبصورت ہے" اُس نے اُس کے سویٹر کی تعریف کی۔ بھابی بیچ میں بول اٹھیں۔

"جی ہاں، ویسے تو یہ سویٹر کافی اچھے بنا لیتی ہیں، مگر یہ میں نے بنا ہے"

اور اس کے بعد، گھوم پھر کے جب اُس نے اُس کے باپ کی آمدنی کے متعلق پوچھا تو پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتی، بھابی بول اٹھیں "تنخواہ تو ڈیڑھ سو ہے، مگر الاؤنس وغیرہ ملا کے ڈھائی پونے تین سو کے قریب ہو جاتے ہیں، مگر آجکل اس میں بھی کیا گذارا ہوتا ہے اور پھر بچوں والوں کی تو بہت مشکل ہے، دو جوڑ کپڑے بنانا ہی قیامت ہے"

حالانکہ اس کے باپ کی تنخواہ چار سو کے قریب تھی، یہ سچ ہے کہ چار سو میں سات آٹھ آدمیوں کا گذارہ مشکل ہے، مگر ایسی باتیں کہیں ایسے لوگوں کے سامنے کہی جاتی ہیں؟ ساس نے برا بھلا کہا تو اور بگڑ کھڑی ہوئیں "واہ! کبھی بری بات کہی ہے، جو تنخواہ آتی ہے، جو مجھے معلوم ہو کہ کیا ہے، اور تین سو ہی کیا کم ہیں؟ کون ایسا گورنر کا بیٹا ہے ــــ مجھے کیا پڑی ہے نا، چاہے کتنا ہی کمائے"

"جی، میں وہاں پہنچکر آپ کو خط لکھونگی" اُس نے جاتے جاتے کہا تھا ...

تین مہینے گذر گئے، لیکن اُس کا کوئی خط نہ آیا، بھابی کی مسکراہٹ میں ... ــــ ہاں کھسیا کھسیا سے کچھ کے ڈالتی تھی اور بھیا کی خاموشی سب سے زیادہ معنی خیز تھی، وہ خود کو بالکل بے سہارا محسوس کرنے لگی ــــ اسکے دل میں بیٹھے ہر گھڑی سائیں سائیں کرتی ہوائیں فراٹے بھرا کرتیں ــــ زندگی اس کے لئے بالکل سپاٹ ہو گئی تھی۔ ... وہ شدید احساس تنہائی سے دیوانوں کی طرح چکر لگاتی، لیکن کہیں بھی پیاس بجھانے کا سامان نہ تھا۔ اور وہ اس حد تک پیاسی تھی کہ اب اس کی آب حیات کو اپنے ہونٹوں سے مس کرنے کی خواہش بھی مرگئی تھی ــــ بس پانی ــــ کھاری، گدلا ــــ بہتا ہوا، کیسا ہی ہو مگر پانی ــــ لیکن پانی کا تو ... نشان نہ تھا اور کہیں تھا بھی تو پانی کا دھوکہ اور ان سرابوں کے چکر میں پھنسکر وہ اور بھی زیادہ پیاسی ہوگئی تھی ــــ

ساتھ کے کمرے میں کسی نے کوئی چینی کا برتن زمین پر دے مارا تھا ——— وہ چونک پڑی۔ اُس کی پیالی میں چائے ختم ہو چکی تھی، وہ خالی پیالی میز پر رکھنے لگی، تو آنے والی ایک عورت نے پوچھا "یہ میز پوش آپ نے بنایا ہے؟"

"جی نہیں، میں نے ابتک کچھ نہیں کاڑھا، مجھے ایمبرائڈری سے سخت نفرت ہے۔"

اُس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج بھابی کو شکست دیکر رہیگی۔ آنیوالی عورت اُن کی خالہ کی نند کی بھتیجی تھی!

"اور یہ کیک تو بہت لذیذ بنایا ہے آپ نے۔"

"میں نے؟ جی نہیں، امی نے بنایا ہے، مجھے تو پکانا بالکل نہیں آتا، سب کام امی ہی کرتی ہیں۔"

بھابی نے گھور کر اُسے دیکھا، مگر وہ نظر انداز کر گئی، کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

"خیر اِس بحث کو چھوڑیئے، یہ بتائیے کہ آپکو کونسا افسانہ نگار پسند ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"عصمت اور منٹو"

"ارے ——— لیکن یہ لوگ تو سخت بدنام ہیں۔" "اس سے کیا؟ حقیقت سے تو نزدیک ہیں" "اپنا اپنا خیال ہے۔"

بھابی اپنی جگہ بیٹھی بار بار پہلو بدل رہی تھیں، "یہ برتن لیجاؤ نسرین، اور پان بنا لاؤ۔" "جی اچھا!"

اور جب وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو اُس نے بھابی کو کہتے سنا "کمبخت نوکروں کا بھی آجکل کیسا توڑا ہے چار مہینے سے ایک بھی نوکر نہیں ہے ہمارے ہاں، لیکن نسرین کا دم ہے کہ سارا کام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔"

اس کا جی چاہا کہ وہ پلٹ کر کہدے "یہ سب جھوٹ ہے، گھر میں باورچی بھی موجود ہے، اور لڑکا بھی ——— یہ سب ڈھونگ تو آپکو دکھانے کیلئے رچا گیا ہے" ——— لیکن وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔

ماں نے آتے ہی اُس کی چوٹی کھینچ لی "بدنصیب، وہ جا بھی چکیں اور تیرے پان نہ آئے، یہاں کھڑی آنکھیں لڑا رہی ہے میوا!"

پانوں کا خاصدان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر بکھر گیا، رفیق کھڑکی میں بیٹھا اُسے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اور صاحبزادے، ——— شریفوں کے یہی دستور ہوتے ہیں کیا؟ آپکو شرم ———"

وہ کتنی دیر تک اُسے سناتی رہی مگر وہ خاموشی سے وہیں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

ماں غصے سے اور لال پیلی ہو گئی، اور بیدردی سے، اُسے گھسیٹ کر کمرے میں دھکا دیکر باہر سے دروازہ لگا آئی،

"مر کمبخت بدنصیب" وہ وہیں اوندھی پڑی رہی، نہ جانے کتنی دیر تک ٹپک ٹپک کر روتی رہی، اور جب اُٹھی تو ——— رفیق کی کھڑکی بند ہو چکی تھی اور پرلی طرف اُسے ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کے لئے، پتریوں پر کیلیں ٹھوکنے اور ہتوڑہ چلنے کی آواز جیسے اُس کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔

اس نے جھپٹ کر اپنی کھڑکی بھی بند کر دی۔ اور پتریوں اور کیلوں کی تلاش میں، الماری، درازیں اور ڈبے ٹٹولنے لگی ——— !

قمر جمالی

لچک

کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے جانے کیا ہوگیا —— ایوننگ پیرس اور افغان اسنو کی ملی جلی خوشبو ناک کے سوراخوں سے داخل ہوکر اس کے پورے جسم میں اس طرح پھیل گئی جیسے وہ خود مجسّم خوشبو ہو، مکمل نکہت، سراپا پھول، جس کے تخیّل کی تابناک وسعتوں میں رنگ و بو کے ہزاروں جہان آباد ہوں ..... دفعتاً کانوں کے پردے پھڑپھڑانے لگے، کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اور آنکھوں میں شرارے ناچنے لگے، اور ایک نیم شعوری آرزو گونج بنکر اس کے دماغی خول میں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگی، اس کی رگ رگ میں تشنج ہونے لگا، ایک ایسا بے بنیاد اجتناب کہ جسے وہ نہیں بلکہ اس کا لاشعور محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے استعجابی سکوت کے بعد جانے دھرتی کے پیٹ سے یا آسمان کی نیلی نیلی، اودی اودی وسعتوں سے ڈھکے ہوئے مکان کی چھت کو پھاڑ کر ایک لامحدود جرأت اس کے دل میں اس طرح آگئی کہ وہ سب کچھ بھول گیا، —— وہ کیا ہے ——؟ کیوں ہے —— کون ہے —— اور کس کے پاس کھڑا ہے ——؟؟؟ ابھی ابھی سانسوں کے تموّج کے سوا اس کے دماغ میں انگارے دہک رہے تھے شریانوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

نسرین محویت کے عالم میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لانبے سیاہ بالوں کا جوڑا گوندھ رہی تھی، اُف یہ بال، کالے کالے گھونگھریالے بال اور ان کا پیچ و خم، یہ کشش انگیز الجھاؤ، اس کی طبیعت چاہی ان میں الجھکر رہ جائے —— مگر —— اس نے محسوس کیا نسرین کی رگ رگ میں جواں سال انگڑائیاں ٹوٹ رہی ہیں، ہونٹوں کے سنگم پر مسکراہٹوں کی چنچل پریاں ناچ رہی ہیں، پیشانی پر قوس و قزاح کے رنگ جھلک رہے ہیں، کہکشاں کی لڑیاں جھوم رہی ہیں، حسن مسکرا رہا ہے، محبّت گا رہی ہے وہی پرانا گیت جو پرانا ہونے کے باوجود نیا تھا، ہر بار نیا، ہر آن نیا، جس کی دوامی دلکشی، ناقابلِ تسخیر آسودگی، ابدی نشہ اور لافانی کیف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جوان رہیگا، جوان! جوانی، دیوانی، نشہ، کیف مستی، بے خودی ......

اس کے بکھرے بکھرے، ٹوٹے، ٹوٹے خوابوں کا منتشر سلسلہ اس کے شعور کی گہرائیوں سے اُبھرا اور ابھر کر دل کی کائنات پر ابخرات کی طرح پھیل گیا، دل میں امنگوں کے لامتناہی سلسلے میں ایک لہر سی اُٹھی، گونج سی پیدا ہوئی اور اس نے یقین کے باریک باریک شہد آگیں لبوں کو چوم لیا۔

نسرین کے نرم نرم گداز بازوؤں میں اس کی تھرتھری اُنگلیاں پیوست ہوگئیں، اور —— نسرین ذرا فرطِ لذّت سے ایک ناتمام سسکی بھری —— پھر ایک ادھوری گردش کے بعد، اس کے لرزتے ہوئے گرم گرم انگاروں کی طرح سرخ ہونٹ نسرین کے باریک باریک گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک، برف کی قاشوں کے مانند خنک اور شہد کی طرح شیریں، لبوں سے پیوست ہوگئے، دونوں کی آنکھیں بند تھیں، سانسوں کی باگیں تنی ہوئی تھیں۔ دونوں کھڑے ہوئے تھے قدِ آدم آئینہ کے سامنے ...... دنیا و مافیہا سے بے نیاز، کون و مکاں کی گرفت سے دور، اخلاقی احتساب کی دسترس سے پرے —— جہاں نیلے نیلے، پیلے پیلے، سرخ سرخ، اودے اودے ریشمی پیراہن لہرا رہے تھے، بلبلیں گا رہی تھیں، کوئلیں کوک رہی تھیں کلیاں چٹک رہی تھیں، پھول کھل رہے تھے اور خوشبوؤں کی چنچل پریاں رقصاں تھیں اور تاحدِ نگاہ نور ہی نور، رنگ ہی رنگ، تارے ہی تارے چھٹکے ہوئے تھے، ننھے منے، نیلے پیلے، جھلمل جھلمل کرتے ہوئے شریر تارے

...... پھر ایک دم تنفس کی باگیں ٹوٹ گئیں، دونوں خالی الذہن کھڑے ایک دوسرے کو حمارت آلود نظروں سے گھورنے لگے ——— دفعتاً جھکی جھکی پلکوں کے سائبانوں میں دو ننھے ننھے شرارے کانپے ...... اور بجلی کی طرح تڑپ کر نسرین نے اس کے جذبات کی شدت سے دہکتے ہوئے رخسار پر ایک طمانچہ جمادیا ....

حالانکہ نسرین اس کی بہن تھی، مگر خالہ زاد ——— اس نے ایسا کیوں کیا ——— ؟ کیوں ——— ؟؟ اس کی جھکی جھکی آنکھوں، ہر پل جھپکتی ہوئی پلکوں اور چہرے کے ہر آن بدلتے ہوئے رنگوں نے اس سے کتنی مرتبہ کہا تھا ——— جمیل ! میں تم کو چاہتی ہوں، دل سے، روح کی گہرائیوں سے، مجھے تمہاری ضرورت ہے، کیا ہوا، جو ہم سماجی نگاہوں میں بہن بھائی ہیں، مگر سگے تو نہیں اور یہ رشتوں کا جال تو انسان کو ذہنی آزادی سے معذور کرنے کے لئے بچھایا گیا ہے۔ اس سے کوئی روحانی مفاد نہیں، میرا یہ گریز، یہ اجتناب، دعوت ہے، تمہارے التفات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، تمہارے شوق کو بھڑکانے کا تصدہے، کیا ہم دونوں محبت نہیں کرسکتے ؟؟ لیکن وہ دیدہ و دانستہ گریز کرتا رہا۔ اخلاق کی اقدار، اصولوں، سماج کی قہر آلود نظروں اور اپنے شعور کی دفاعی قوتوں کے خوف سے ....

نسرین تکیہ میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی، اس کی پیٹھ پر سانپ کی کونڈلی کی طرح پڑے ہوئے بال ہولے ہولے پھسل رہے تھے، بکھر رہے تھے، اس کے خیالوں کی طرح، اس کے نغموں کی طرح، اس کے شعروں کی طرح ....

کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کیسی طبیعت ہے جمیل ...... وہ دن بھر خاموش پڑا سوچتا رہا، پرانی باتیں، دھوئے دھوئے سے سپنے اڑے ہوئے رنگ، بکھرے ہوئے نشان، اس کے دل و دماغ اور ذہن میں ایک طرح کا شدید ترین انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ہوک سی اٹھتی، آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑکنے لگتیں، گالوں پر خون جھلک آتا تھا اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنا بایاں رخسار سہلانے لگتا۔

آپ ہی آپ اس کے سینہ کی گہرائیوں میں سے ایک غیر جانبدار قوت ابھرتی اور پوچھتی ——— ہاں، واقعی آخر کونسی قوت تھی جس نے اس کو اس قدر بیخود کردیا، قطعی اندھا، ——— وہ کیوں بھول گیا کہ نسرین اس کی بہن ہے اور بہن ؟ محبت، روحانی نہیں، جذباتی۔ رومانی۔ ایک بہن سے جنسی مراسلت کسی قانون، کسی قاعدے، کسی ضابطہ، کسی اصول کی رو سے جائز نہیں، نہ اخلاق کی رو سے، نہ مذہب، نہ سوسائٹی، نہ سماج، نہ برادری، تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا —— ؟

اس کا ذہن دھیرے دھیرے اڑتا، پردوں کو چیرتا، عقابی نگاہوں سے راستے کی ہر ایک چیز کو دیکھتا ہوا ماضی کے گھنے جنگلوں میں پہنچکر رکجاتا۔ پھر کھو جاتا ......

" اوہو —— آئیے، آئیے، حضرت —— مزاج مبارک —— ؟ " ہر طرف سے اس کا شاندار خیر مقدم ہوتا۔

" اچھا —— تو آپ ہیں، خوب .... اور سنائیے .... ؟ "

" اور دیکھئے —— " کبھی کبھی تعارف کی بھی نوبت آجاتی ——" آپ کا نام ہے ... مسٹر جمیل اختر رشید —— رشید دراصل آپ کا امتیازی نام ہے، ورنہ آپکو شاعری وائری سے کوئی لگاؤ نہیں، آپ اگر شیدائی ہیں تو .....

کہدوں بھائی جان —— شریر احمرین کے گالوں میں گڑھے پڑجاتے، پلکیں جھپکنے لگتیں اور نسرین [illegible] آپ ہی آپ گڑی مڑی ہوکر گٹھری سی بنجاتی ....

" اوہو نسرین —— " رشید چلاّتا ——" کیا بیہودگی ہے یہ، بڈھی ہوگئی مگر ..... "

[illegible] نسرین کا رنگ قرمزی ہوجاتا، جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو، گالوں سے شفق کی لالی پھوٹنے لگتی۔ آنکھوں میں آئینے لہرانے لگتے، پلکیں جلدی جلدی جھپکتیں اور لڑکیوں کے پیچھے سنبھلتے ہوئے [illegible]

اوپر اٹھتیں، اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی ہوئی پاؤں کی چاپ، خاصدان کی چھنک یا سامنے دیوار پر آویزاں کسی بےکسی تصویر پر اٹک کر رہ جاتیں، ہاتھ تیزی سے ڈوپٹہ دپٹہ مروڑنے لگتے، موگرا، موتیا، یا چنبیلی کی نوشگفتہ کلیاں نہایت بے دردی سے مسلی جانے لگتیں، یا پان کے ڈنٹھل پے بہ پے ٹوٹنے لگتے گویا گھر میں پان کھلانے والوں کی فوج ہی تو گھس آئی ہو....

" بھئی ـ ـ " شریر احمر پہ جھکتی ـ " خدا کی قسم آپا جان، بس آپ سے بھی حد ہے، اکیلے میں چلبلی ہی بلی ہیں..... بس عجیب ہیں آپ بھی...."

" عجیب ہی نہیں بلکہ عجائب خانہ میں رکھے جانے کے قابل ـــــ آج سے سو سال پہلے کی ہندوستانی عورت' والی..... اوڑی، موٹی، چھوئی...."

" مگر یہ تو بس ہمیں بھائی کے سامنے ہی ایسی ہو جاتی ہیں، ورنہ دن رات اچھلتی کودتی پھرتی ہیں ملنگوں کی طرح ـــ "

ـــــ وہ اور سکڑ جاتی لیکن اس سکڑاؤ میں ایک عجیب سی کیفیت ہوتی، ایک امنگ پر درلچک، ایک طرح کا طربناک گھماؤ اور ایک ایسا دلفریب، خوبصورت اور رنگین مدوجزر ہوتا جس کو وہ نہیں بلکہ اس کا لاشعور محسوس کرتا، مگر چند لمحوں کے خیر مقدم کے بعد لاشعور اس عجیب سے ہیجان پرور شاہدے کو محسوسات کے پوشیدہ تہہ خانوں میں مقفل کر دیتا لیکن یہ مجرم احساس کبھی کبھی تنہائیوں میں چور دروازوں سے نکل کر اس کے ذہنی توازن میں خلل ڈال دیتا، اس کا ذہن دھرتی کے سینے پر بسنے والی انسانی سوسائٹی کے زہریلے امتیازوں، سماجی احتساب کے ہلاکت آفریں اصولوں اور سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم کے اثرات اور انکی بیہودگی کے احساس مفلسی، بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر جان دینے والوں کی بےبسی و بیکسی کے غم اور انسانیت کی فطری آزادی کے حصول میں مرنے والوں کے جذبۂ انسانیت تیاگ اور قربانی کی سچائی، عداوت اور اس کے بعد انکی بے اثری کے پرالم تاثر سے بھاگ کر، رنگ اور روپ، جوانی اور نکھار خوبصورتی اور آرٹ، حسن و عشق، جوش و امنگ، ولولوں اور آرزوؤں کی سرسبز اور شاداب وادیوں میں نغمہ سرا بلبلوں اور خوش الحان پرندوں کے چہچہوں اور ماحول کے رسیلے سنگیت میں ڈوب جاتا، کھو جاتا اور محسوس کرتا کہ زندگی کا تمام کیف، تمام رس، تمام لذت ان ہی نغموں کی گونج میں ہے، ان ہی رسیلے سنگیتوں کی لے میں ہے اور ان ہی سرسبز و شاداب وادیوں میں کہیں کسی سربلند پہاڑی کی چوٹی پر چمکیلے مہتاب کی کرنوں کی سیڑھیوں پر رقصاں دوشیزۂ حیات کے ان چھوٹے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح خوبصورت اور شہتوت کی طرح رسیلے ہونٹوں کے ایک طویل بوسے کا تمام کیف، تمام لذت تمام خمار، اس کے انگ انگ میں، جوڑ جوڑ میں، دل و دماغ اور ذہن کے گوشے گوشے میں مصری کی ڈلیوں کی طرح گھل رہا ہے اور یہی کیف، یہی لذت اصلی اور ابدی حیات ہے ـ زندگی کا دوسرا نام ـ تنفس کا محور، جینے کا مقصد

..... لیکن جب یہ احساس سنجیدگی کی صورت اختیار کرنے لگتا اور اس میں وسعت اور سربلندی اور وزن پیدا ہونے لگتا تو یکایک وہ اس جذباتی تلاطم کی جوازی صداقتوں کے اظہار اور اس کے ذہنی ردعمل کے خوف سے گھبرا کر اپنے اردگرد ایک گھبرائی ہوئی نگاہ ڈالتا، تاحد نگاہ اسے نقرئی کرنوں کی مرتعش دھندلاہٹوں کا ایک تسلسل پھیلا ہوا دکھائی دیتا، پھر یکایک مغربی وسعتوں سے طلائی شعاعوں کا غبار پھوٹ پڑتا، دو متضاد رنگوں کے ٹکراؤ سے ایک نیا رنگ، ایک نئی روح ایک نیا ماحول بن جاتا ـ ڈوبا، ڈوبا ـ کھویا، کھویا ـ اداس اور بوجھل پھر ایک لایعنی دباؤ، ایک ناقابل برداشت بوجھ اس کو اپنے کشادہ آغوش میں لیکر بھینچ لیتا ـ نقرئی کرنیں، طلائی کرنوں میں جذب ہو کر دھندلکوں میں تحلیل ہو جاتیں اور دھندلاہٹوں میں گہرائی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی، خیالوں میں ایک طرح کی ناقابل برداشت خنکی، تصور میں لامحدود [illegible] اور امنگوں میں مسکراتی کیفیت چھا جاتی، اور دھیرے دھیرے یہ طلائی و نقرئی کرنوں کا امتزاجی دھندلکا

گہری ظلمتوں کے جال میں پھڑپھڑا کر دم توڑ دیتا، اسے اپنے گوشت میں کوئی نوکیلی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوتی، سانس میں کوئی پتھریلی شے گردش کرنے لگتی، درد، دھڑ، فرط تکلیف سے وہ کراہ اٹھتا، اور جب آنکھیں کھولتا تو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوتا وہ قطعی بے رنگ ادبو ہے، بے نام و نشان، پتھریلا، بے حس، بے روح، جس کا کوئی مقصد نہیں، کوئی مرکز نہیں، کوئی منزل نہیں، کوئی جادہ نہیں۔ بس وہ ہے گرشہ ہونے کے برابر ——— لیکن دوسرے لمحے جب وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے ———؟ تو دھیرے دھیرے اس کے جسم میں سویا ہوا عناصر کا ظہور ترتیب بیدار ہو جاتا آپ ہی آپ اس کے تلخ آلود ہونٹوں پر ایک ناکام سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اسے اپنے جوڑ جوڑ میں ایک میٹھی میٹھی مندی مندی کسک سی محسوس ہوتی۔ اور ایک ایسی لہریلی روانی جیسے سگریٹ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی لکیر بھرو پھولا، بسرا تدو جزر اس کے ذہنی افق پر نمودار ہو کر تھرتھراتا اور ایک پل کے غیر واضح ارتعاش کی مبہم سی یادوں کو لیکر پھر لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جاتا، ڈوب جاتا۔ سو جاتا......

"بھائی جان ——— وہ آپکو خالہ جان نے بلایا ہے ———" فرحت اسکول کی کتابیں شیلف پر بے دردی سے پھینک کر باورچی خانہ کی طرف لپکتا ———

سنو ——— وہ روکتا ——— کیوں بلایا ہے ———؟

معلوم نہیں ——— کہا تھا بھیج دینا۔

"کس نے؟"

"نسرین آپا نے"

اچھا ——— اس کے دل میں گدگدی ہونے لگتی، لیکن فرحت اس طلبی کے پس پشت کار فرما ہاتھ کی چابکدستی اور اس کی جوازی لذت سے بے نیاز اسٹینڈرڈ بیکری کی نفیس پیسٹری اور دارجلنگ کی خوشبودار چائے کی لذت میں گم باورچیخانہ کا رخ کرتا ——— معاً اس کے ذہن میں ہندستانی عورت کی سوشل اہمیت اور حیثیت کا مبہم سا خاکہ اُبھرتا اور عورت کو سماجی احتساب کے غیر مساوی اور آہنی سلاسل میں جکڑا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں عورت کے لئے ایک موہوم ہمدردی لیکن سماج کے اس خودغرض اور اجارہ دارانہ فعل کے لئے نفرت اور غم و غصہ کی شدتناک لہریں تندی کے ساتھ پھیل جائیں ——— اور جب وہ خالہ جان کے یہاں پہنچتا تو وہی سکڑاؤ، وہی لجاجت، وہی شرماہٹ اور رخساروں سے پھوٹتی ہوئی وہی تمتماہٹ، شفق کی لالی، آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلے، چھلکتی ہوئی شراب اور ماتھے پر جھلملاتی ہوئی بوندیں، باریک باریک موتی، جھپ جھپ جھپکتی ہوئی پلکیں..... سکوت، اجتناب، گریز، خاموشی..... وہ چوری سے نسرین کی طرف دیکھتا اور نسرین اس کی طرف نگاہوں کے ٹکراؤ سے پہلے ہی وہ دوسری طرف رخ کر لیتی، اور وہ دوسری طرف، ——— نسرین کی نرگسی آنکھیں دور کہیں، افق سے بھی پرے، دھندلکوں کی خلاء میں کسی چیز کی جستجو میں کھو جاتیں، ——— وہ دل میں سوچتا ——— تو پھر ———؟ اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ نہیں جان پاتا ——— بلکہ ایک لایعنی دباؤ، ایک مبہم سا خوف، ایک نامعلوم سا خدشہ، ہمیشہ کی طرح اس کے دل میں شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتا ——— بیٹھے بیٹھے کبھی تنہائیوں میں اپنی ان نمایاں تبدیلیوں کو محسوس کر کے وہ سوچتا کہیں نسرین کی آنکھوں نے اسے تخیل کے عمیق سمندر تو عطا نہیں کئے، جن میں ڈوب کر وہ زندگی کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہے کہ صداقتوں کی جواں سال کلیاں محض اسی کی خاطر مسکرا رہی ہیں ——— سچائی کے گیتوں کی لے میں اس کی روحانی شادمانی کا خلوص ناچ رہا ہے، کہیں نسرین کی پلکوں کی پیہم جھپکن نے تو

س کے دل کو دھڑکنا نہیں سکھلایا، کہیں اس کی یادوں کی بدولت تو اس کی راتیں پرتبسم اور دن تابناک نہیں ——
ں اس کے خوابوں کے لئے تو اسے نیند نہیں آتی —؟؟؟ پھر آپ ہی آپ اس کے جسم میں اونگتا ہوا انڈ بال جھیں
ار ہوکر کہتا ـ ہشت ـ ہونہہ نسرین، کوئی کوہ قاف کی پری ہے، یا جنت کی حور ـ جو اس کی وجہ سے وہ ․․․․․
نہہ! لیکن ایک روز جمیل نے بڑی طرح شکست کھائی ـ یقیناً نسرین کے دم خم سے اس کی دنیا آباد
ی ـ اس کے تنفس میں صحت مند خوشبو، اور تخیل میں حیات آفریں وسعت تھی، تب ہی تو ․․․․․ اس نے کہا ——
ں ؟ چور کہیں کی —" اس کی آواز میں تازہ دم امنگیں ناچ رہی تھیں، ایں —؟ اوں —؟؟
براہٹ میں وہ کوئی جواب بھی نہ سوچ سکی ـ کیا —؟ وہ امید اور مایوسی کے دوراہے پر ٹھٹھکا کھڑا تھا،
سرین نے اس کی طرف دیکھا، اف ـ! ایک سرخ سی خونی لکیر اس کے دل میں تیر بن کر اترتی چلی گئی، حسین
ان، امنگیں، تمنائیں، شوق، التجا اور ایک غیر معروف سی گلابی چمک تھی جیسے برف کی قاش سے جھانکتی ہوئی شفق
لالی، وہ تڑپ اٹھی، اس کے سینہ میں مدوجزر پیدا ہوگیا اور معاً اسے محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں کسی نے زور سے
ی بھری ہے ․․․․․ وہ جلدی میں دوپٹہ کا پلو سنبھالے بغیر کمرے سے بھاگ گئی ـ

جمیل کے دل کی انتہا گہرائیوں میں چھپی ہوئی صدیوں کی برفیلی سانس، اٹکتی ہوئی، کھٹکتی ہوئی، سینے میں چمک کی
راکرتی ہوئی ابھری اور ابھر کر فضا میں غیر مرئی ابخرات کی طرح تحلیل ہوگئی ․․․․․ لیکن یہ رکتی، کھٹکتی ہوئی سی سانس
د رنج و غم، افسوس اور اضمحلال کی پیداوار نہیں تھی اور نہ ہی کسی افسردگی کے اظہار کا ذریعہ تھی بلکہ یہ ایک ایسا لہریلا آئینہ
ی چمکتی ہوئی، چمکاتی ہوئی، ایک لبریز پیمانہ تھی چھلکتی ہوئی، چھلکاتی ہوئی، اور ایک ایسا ناتمام کیف، ایک ایسا ابدی
ـ اور لافانی خمار جیسے رم جھم بوندیں پڑ رہی ہوں، جیسے شبنم میں نہائی ہوئی کلیاں مسکرا رہی ہوں ——
—— جیسے چوری چوری، چپکے چپکے آنکھیں لڑانے والا چاند دل میں اتر آیا ہو ․․․․․

اس روز کے بعد، اس کے دل و دماغ اور ذہن میں ہر وقت ایک ہیجان سا برپا رہنے لگا، کائنات کی ہر ایک شے میں نسرین
پرتو، نسرین کا خیال، نسرین کی یاد، نسرین کی پسند، اس کی شرماہٹ، اس کی مسکراہٹ، اس کی آواز، اس کا رنگ
غیکہ ہر ایک چیز پر نسرین کا قبضہ تھا، لیکن یونہی ذہنی طور پر —— جب وہ اکیلا ہوتا تو اس کے ساتھ نسرین
تی اور جب اس کو تنہا لوگ ہوتے تو وہ اکیلا ہوتا، اس ذہنی تضاد کے افق پر نگاہ ڈالتے ہی اس کے دل میں
طرح کی شادماں کپکپی، رنگین ارتعاش اور ایسی خوشبودار تھرتھری ہوتی جس کو محسوس کرکے وہ اپنے آپکو ساتویں آسمان کی رفعتوں پر
ں بلند دیکھتا۔ بہت سی جھنجھناتی ہوئی گھنگھروؤں سے مشابہ صدائیں رس بھرے، ہونٹوں سے نکل کر اس کے دل کی
ہرائیوں میں امرت رس گھولنے لگتیں ـ نسرین اس کے رنگ میں رچ چکی تھی اس کی تمام جمالیاتی، مشاہداتی،
ور اور ادراکی تمام قوتیں، نسرین کے محور پر تیزی سے گھوم رہی تھیں، ـ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں ایک
ہم ساخدشہ برابر بھڑک رہا تھا، محض اس لئے کہ شاید اس کی محبت نوخیز تھی، اور سماجی اصولوں سے بغاوت کی نشان
تھی، یا شاید اس لئے کہ وہ اپنی پوری یگانیت کیساتھ محبت کرنا چاہتا تھا مگر ایسی بلند و بالا محبت کبھی کی نہیں تھی، یا
رین شاید پہلا ساحل تھی جس سے اس کے جذبات کی موجیں والہانہ طور پر ٹکرانیکے لئے بے چین تھیں، تڑپ رہی تھیں،
—— لیکن بس ٹکرانیکی ہمت نہیں تھی، یا ٹکرانے سے معذور تھیں، یا ٹکرانے
تی تھیں، ساحل کی قربت اور بلندی کو دیکھکر، کہیں ٹکرا کر واپس نہ لوٹ آئیں، کہیں سر نہ پڑ جائیں، کہیں مر نہ جائیں، اور
سند کے تصور سے اسکا دل ڈوبنے لگتا، روح اداس ہوجاتی، دھڑکنیں سوجاتیں، وہ خطرے کی پر الم گہرائی اور خطرناک

شدت سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا، نیچے آوارگی ظلمتوں کا جال پھیلا ہوا تھا، اس کے رستے بے ہوش کبھی تنہا ہو جاتا، لیکن اس وقت جانے کہاں کہاں کے موہن جمالوں کے دستے پھوٹ پڑے اور وہ ...... نشاط اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، گال پر خون چھلک آیا، آنکھوں میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں، اسے خجالت و آب ندامت ہوں۔ سے ادھر ادھر دیکھا اور گال سہلانے لگا۔ "بھائی جان! ذرا جلدی واپس آ جائیے گا، سینما چلیں گے" نزہت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً گال سے ہاتھ ہٹا لیا "ہیں؟"

"ہاں ذرا جلدی، ڈاکٹر کوٹنس، دیکھنے چلیں گے۔" "ڈاکٹر کوٹنس؟ ہاں ضرور ضرور، مگر نزہت، وہ بات یہ ہے کہ میں نہیں جا سکوں گا۔" "کیوں؟" "یونہی ... بس ... یونہی، دراصل ہمارے ہندوستان میں ایسے ڈاکٹر کوٹنس بکھرے پڑے ہیں، مگر ان کی کوئی قدر نہیں، کوئی وقعت نہیں، وہ گندی نالیوں میں رینگتے ہوئے کیڑوں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں، کوئی نادار حکیم ہے، کوئی پوسٹ ماسٹر، کوئی اخبار بیچ رہا ہے، کوئی نرس، نادو نسرین، کوئی جوتوں پہ ..." "توبہ ... پھر آپ نے شروع کر دی اپنی افسانہ نگاری، آپ سے کوئی بات کرنا قیامت ہے، نہیں جانا ہے تو مت چلئے، آپ کے ہاتھ کون جوڑتا ہے، وہ تو نسرین نے کہلوایا کہ اگر آپ بھی چلیں تو اچھا ہے، ٹکٹ لینے میں آسانی ہو جائیگی۔ خیر اب ... اور یوں بھی احمد عباس کی کہانی ہے ... ورنہ میں بھی ... آپ چلیں گے یا نہیں؟" ... "نہیں" اس نے بادل ناخواستہ کہدیا، یوں نزہت کی خاطر تو وہ چلا بھی جاتا، مگر نسرین کے تصور سے اس پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو گئی، نیم شعوری ... نزہت برا مان گئی، مگر وہ نہیں گیا اور جاتا کس منہ سے، نسرین تو ... وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہا، کتابیں دیکھتا رہا، افسانہ لکھتا رہا اور ٹکٹکی باندھے تاروں بھرے آسمان کو گھورتا رہا، حتّٰی کہ بارہ بج گئے، اس نے آہستہ سے لیمپ کی بتی مدھم کر دی، اور چپ چاپ مضمحل پریشان، اداس بستر پر لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں، چہرے کو بازوؤں میں چھپا لیا، کوئی ساڑھے ۱۲ بجے دروازے پر آ کر تانگہ رکا، نزہت فرحت اور بھائی جان کی ملی جلی آوازوں میں، ایک باریک سی، جانی پہچانی چہکتی آواز اور بھی تھی، اس چہکتی آواز کو سنکر اس کو اپنے سینے میں اضطراری لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئیں، وہ بستر میں اس طرح دبک گیا گویا بلی کے خوف سے چوہا۔

گرمیوں کی چاندنی رات، مالوے کی خنک ہوا، تنہائی، اداسی، سناٹا، گرگ، نیچے صحن میں سب محو خواب تھے، ایک وہی تن تنہا مکان کی کشادہ چھت پر پڑا کروٹیں بدلتا ہوا سوچ رہا تھا، نسرین اور اس کا عمل، پھر ردعمل ... اس کی سوچ کا پھیلاؤ برابر پھیل رہا تھا، حتّٰی کہ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ آنکھوں کی پتلیاں چکرانے لگیں، اعضاء ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑنے لگے ... اچانک نیچے کمرے میں لگی کلاک چیخی، جیسے احتجاج کر رہی ہو اس سکوت اور پُر الم ماحول کے خلاف، پھر اسے اپنی پیشانی پر مدھم سی خنکی کا احساس ہوا اور ایک بے نام سا لمس جو بڑھتا گیا اور ہلکے سے دباؤ میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور چونک کر ایکدم اٹھ بیٹھا، تم ... تم ... نسرین ...؟ نسرین ایک نئی نویلی دلہن کی طرح سکڑی سکڑائی کھڑی تھی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اسکی جھکی جھکی پلکیں جھپک رہی تھیں ... دل میں دھڑکن عرق آلود جبیں، اور نیچے صحن میں سب لوگ محو خواب تھے۔ "جی ..." اسنے بہزار دقت کہا۔ "کیا آپ ہم سے ناراض ہیں" اس کی آواز میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی جھنکار تھی اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں کا شور۔ "لیکن اسوقت" لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتا ہوا گال پر رک گیا۔ "کوئی دیکھ لے تو ..." "دراصل میں ... میں بہت شرمندہ ہوں" یکایک اس کے دل میں ایک لہر سی اٹھی ... خدایا کیا یہ وہی نسرین ہے غارتگر ہوش و حواس، بے مہر، بے وفا، جس نے اسکے گال پر طمانچہ مارا تھا، جسنے اسکی محبت کو ٹھکرایا تھا، جس نے اس کے خلوص کو گالی دی تھی۔ "میں ... میں معافی مانگنے آئی ہوں" اسکی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

وہ چپ رہا ... اور اس کی آرزوؤں کا مرکز، اسکی تمناؤں کا چاند، اس کے تخیل کی ملکہ اسکے سامنے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی، منتظر حکم کی منتظر، اف، اسنے بڑھ کر اس کا گرم گرم اور ریشم کی طرح ملائم ہاتھ تھام لیا اور جذبات کی شدت سے گھٹی ہوئی آواز میں بولا ... نسرین ...؟ جواب میں ٹپ سے ایک بوند اسکے ہاتھ پر گری، نسرین کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور خوشبودار سانسوں کا تموج لہرا رہا تھا ... اس نے دیکھا وسعت آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کہکشاں کی لڑیاں کانپ رہی تھیں اور افق کے بعید کناروں سے سنہرا غبار پھوٹ رہا تھا ...

جائزے

سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!۔

انجم صہبائی

سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل

اس نظام کی قدروں اور اس کے مستقبل سے متعلق پچھلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے بعد سے انسانی دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور ان شکوک و شبہات نے شدید صورت اختیار کرلی جبکہ اشتراکیت کے علمبردار لینن اور ٹراٹسکی کی کوشش رنگ لائیں اور ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہوا جس میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ قریباً ۳۶ ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے اور اشتراکیت کا نظام روسی سرزمین پر سانس لینے لگا، سلگتی سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ، نصرام جنگ کے سلسلہ میں حکومت خاص جنگی اغراض کی بجاآوری کے لئے ملک کی صنعت و حرفت، تجارت و زراعت پر اپنا اقتدار قائم کرلیتی ہے اور اسی سے آگے چلکر اشتراکی نظام کی داغ بیل پڑتی ہے، حکومتیں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ جنگ کے خاص حالات نے جس شکل و صورت سے انھیں دوچار کر دیا تھا (یعنی ہر چیز پر حکومت کا تسلط کلی)۔ کیا اس زمانہ میں بھی اسی طریقۂ کار سے کام چلایا جا سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے تحت ذرائع پیداوار سوسائٹی کے ایک قلیل التعداد طبقہ کے تحت ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے کثیر التعداد افراد کا انحصار اجرت پر ہوتا ہے، ان کی زندگی کا دار و مدار Day to day wages پر ہوتا ہے۔ آجر اور مزدور کا طبقہ خود بخود ابھر آتا ہے، آجر ہر حیثیت سے طاقتور ہوتا ہے اور مزدور اس کے مقابلہ میں کمزور اور بے بس ہوتا ہے اور غیر یقینی عناصر گھل مل کر ہر وقت اس کی زندگی اجیرن کئے رکھتے ہیں کیونکہ جو چیزیں پیدا کیجاتی ہیں وہ مقامی بازاروں کے لئے نہیں بلکہ بین الاقوامی بازاروں کے لئے ہوتی ہیں، خود کفیل پیداوار کا دور دورہ نہیں ہوتا۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ان حالات میں معیشت بین الاقوامی بازاروں کے تحت ہوگی، دنیا کے کسی ملک یا کسی چپہ پر جنگ ہو تو اس سے سب یکساں متاثر ہوتے ہیں، بین تجارتی حالات بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح مزدور کی زندگی بین الاقوامی تغیرات کی چکی میں پستی رہتی ہے۔ اس نظام میں بڑے بڑے کاروبار چند اشخاص کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں اور اس طرح "ٹرسٹ" اور "کرٹیلز" کا قیام عمل میں آتا ہے اور ان کی حیثیت اجارہ کی سی ہوجاتی ہے نتیجتاً کسی چیز پر "مونوپلی" حاصل کرنے اور انفرادی منافع کی حرص و ہوس پر رینگنے سے سوسائٹی کی مشین میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور دنیا کو کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے "امپیریلزم" بھی "کیپٹلزم" کے ایک رفیق کے طور پر ترقی کرتا ہے اور آگے چل کر بیرونی ممالک میں "کیپٹل ایکسپورٹ" کے ساتھ ساتھ "پولٹیکل ڈومینیشن" بھی رفتہ رفتہ زور پکڑ جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نظام کے تحت لوگوں میں پس اندازی کی عادت بڑھتی ہے۔ آزاد مسابقت کی وجہ سے کمزور اپنی موت آپ مرجاتے ہیں اور انفرادی صلاحیتوں کو ابھرنے اور اجاگر ہونے کے اکمل ترین مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کارخانے، فیکٹریاں، بنک اور دولت سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے طبقہ کے ہاتھوں میں آجاتی ہے اور مزدور اور کسان اپنی قوت و محنت بیچ کر ان کے زر خرید غلام بنجاتے ہیں اور زندگی بھر سرمایہ دار طبقہ کی بنی بنائی ظالم دنیا کے ارد گرد کولھو کے بیل کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ بس اس نظام کی بنیاد پر دولت اور یہ حلقہ کی

ٹیشن' پر رکھی جاتی ہے، دولت کی انفرادی ملکیت ہونے سے تمام حلقوں میں دولت مساویا
نتیجتاً، افلاس، نکبت، بیروزگاری اور جہل سوسائٹی کے ایک بڑے حصہ پر پھیلائے ہوئے ہیں
ذرائع پیداوار دولت کی انفرادی ملکیت پر قائم کئے جاتے ہیں اس لئے عدم مساوات اور
حد تک یہی سرمایہ دارانہ نظام ہے جو عوام کا خون جونک کی طرح چوسے اور دیمک کی طرح چاٹے
اشیا کی پیداوار کے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ عوام کی ضروریات کو کس حد تک پورا کرینگے بلکہ
سرمایہ داروں کے ذاتی منافع کا جذبہ ناچار رہتا ہے اور اس طرح اس نظام کی مشین ذاتی منافع
ہے، دولت، ذرائع پیداوار، سیاسی اقتدار اور معاشی قوت ان سب پر سرمایہ دار پیر پھیلائے
اور دوسری طرف عوام کے ہاں صرف ان کی زندگی کا سہارا قوت، محنت ہوتی ہے اور جس کو
ں ٹکے کے داموں فروخت کر ڈالتے ہیں، پھر بھی ان بدنصیب انسانوں کو ایک وقت کے لئے
، سر چھپانے کو ٹوٹی پھوٹی چھت نہیں ملتی اور جسم ڈھانکنے کو دو گز کفن میسر نہیں آتا ۔!
میں خانگی ملکیت افراد کی ہوتی ہے اور افراد کو اپنی ملکیت 'اکوائر' اور 'ڈسپوز' کرنے کا پورا
کے علاوہ دوسرا 'انسٹی ٹیوشن' وراثتی نظام کا ہے، وراثتی نظام کی بنیاد پر جائداد اور ملکیت
دیگرے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ تنظیم، اصل، سرمایہ اور دیگر عاملین پیداوار پر بھی خانگی ملکیت
تمام ذرائع پیداوار پر چند افراد کا اختیار ہوتا ہے تو آگے چلکر 'اسٹیٹ کیپیٹلزم' کی شکل وجود
علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادانہ مسابقت ہوتی ہے 'فری کامپیٹیشن'، مختلف پارٹیاں
چلانے کی ممکنہ سعی کرتی ہیں، کارخانہ دار دوسروں کو میدان سے ہٹانے اور اصل دار مختلف
کی کوشش کرتے ہیں اور مختلف، غلط اور خطرناک پہلوؤں اور زاویوں کا سہارا لیکر ان اشیاء کی
ش کرتے ہیں ۔ اسی مطابقت کی دوڑ دھوپ میں بعض دفعہ یہ لوگ اندھا دھند دوڑ کر بہت کم
تے ہیں اور —— ناقص اشیاء دیتے ہیں ۔ علاوہ ازیں ادنیٰ اجرتوں اور دیگر سیاسی ذرائع
پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اور اس طرح کمزور مقابلے کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں
مقابلہ کرکے تباہ و تاراج ہو جاتے ہیں، یا پھر اپنے آپکو بڑے کاروباروں میں 'امل گیمیٹ'
دوڑ میں فرسودہ طریقوں کو چھوڑ چھاڑ کر نت نئے میکانی ایجادات سے کام لیا جاتا ہے اور
یفوں کو میدان جنگ سے ہٹانے کی سعی کیجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس وقت
عامل پیرا ہیں کہ "محبت اور جنگ میں ہر ایک چیز جائز ہے" سرمایہ دارانہ نظام میں آجر اور مزدور میں
جو ہر حیثیت سے مزدور کے مقابلہ میں طاقتور ہوتا ہے مزدور کو حشرات الارض کی طرح کچلنے اور
ہے اور مزدور اقبال کے اس شعر کی تفسیر بنکر رہجاتا ہے ؎

بس میں محکوم و مجبور ری ⁂ میری دنیا میں تیری پادشاہی

ا سودمار اس کی اپنی اجرت پر ہوتا ہے اور اس کا سرمایہ اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں، کساد بازا
تو فاقے کے کالے کالے بھوت، نکبت و افلاس کی چڑیلیں اسے آدبوچتی ہیں ۔ مشین کی ترویج
ٹوٹ پڑتے ہیں، اور مزدوروں کا ایک بڑا حلقہ بیروزگار ہو جاتا ہے، گو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز
ہے اور عبوری دور کے گذر جانے کے بعد خود 'مشین انڈسٹری' میں ہزارہا مزدور کھپ جاتے ہیں ۔

لیکن بہرحال مزدوروں کا ایک دائرہ بہت پرشکوہ ' بیروزگار بن کر رہ جاتا ہے، مزدوروں والی پوزیشن یا در کھ ہوتا ہے کیونکہ اب سرمایہ دار ملکوں میں مزدور بڑی حد تک ترقی کر چکے ہیں اور انھوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ٹریڈ یونینیں قائم کر لی ہیں جن کا ایک جال کرۂ ارض پر پھیلا ہوا ہے لیکن پھر بھی پورے طور پر مزدور آج بھی مطمئن نہیں۔ ورنہ آج تک ان کے تمام دکھوں کا علاج ہی ہو سکا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ چونکہ طاقتوں کا مخزن ہوتا ہے اس لئے وہ جلد ہی حکومت پر بھی اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح معاشی میدان جیتنے کے بعد وہ سیاسی میدان پر بھی اپنا پنجۂ گرفت مضبوط کر لیتا ہے، غیر مساوی قوت رکھنے والے حلقہ میں مسابقت کا دور دورہ ہوتا ہے اور نتیجتاً اقتدار اور قوت رکھنے والا طبقہ پاسپرز ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس طبقہ کو ظلم و استبداد کی پوری پوری آزادی حاصل رہتی ہے غرض اس نظام کے تحت مجبوروں کی ایک ایسی دنیا جنم لیتی ہے جس کے شمال جنوب مشرق اور مغرب پر سرمایہ دار گروہوں کا راج ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ایک عرصہ دراز تک حکومت نے 'لیسی فیئر' کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کی وجہ سے سوسائٹی کو بہت نقصان پہنچا، علاوہ ازیں نظریۂ انفرادیت نے بڑی تباہیاں پھیلائیں، اس نظریہ میں اس بات کا پرچار کیا جاتا ہے کہ دولت کی تقسیم کو قانون قدرت کے تحت چھوڑ دیا جائے۔ گلاڈسٹن اس نظریہ کا حامی تھا اور اس نظریہ کو پیش کرنے والا آدم اسمتھ تھا۔ اس نظریہ کے نتیجہ کے طور پر دولت سمٹ سمٹ کر تیس فیصدی آبادی کے پاس جمع ہوگئی اور قریباً ۷۰ فیصدی آبادی بھوک، پیاس، نکبت اور افلاس کے کفن میں لپٹی لپٹائی سڑنے لگی، ایک طرف بڑی بڑی عالیشان فلک بوس عمارتیں کھڑی ہوگئیں اور دوسری طرف سلمپس' ابھر آئے، جہاں فاقے اور بھوک اور آہ وزاری ہر وقت اپنا وحشی ناچ ناچتی رہتی ہے، جہاں دنیا بھر کی بیماریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا قبضہ جماتی ہیں، جہاں گندگیاں پلتی ہیں، جہاں آنسوؤں کے سوتے ابلتے ہیں اور سیکڑوں لاشوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کی کالی کالی گھاٹیوں تک بہا لیجاتے ہیں۔

۱۹ ویں صدی سے ایک اور نظریہ پیدا ہوا جس نے شد و مد سے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ نظام ہماری سوسائٹی کو گھن لگا رہا ہے، ہماری سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہا ہے اس نظریہ کو اشتراکیت کہتے ہیں۔ "کارل مارکس" نے ایک کتاب لکھی ہے "Das Capital" جس کو "Bible of Socialism" بھی کہا جاتا ہے، یہ اشتراکیت پر بنیادی اور مشہور عالم کتاب ہے۔ اس طرح اشتراکیت کا پرچار چار دانگ عالم میں ہونے لگا۔ کارل مارکس سے ایک صدی پہلے Gold Smith نے تقریباً یہی نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا تھا:۔

Ill fares the land, to
hast'ning ills a prey,
where wealth accumulates
and men decay.

اس نظام کو پیش کرنے سے اشتراکی خیال و تصور کے پرچار کے لئے کئی 'International' یا بین الاقوامی ہو چکے تھے، انھوں نے بتایا کہ انفرادیت اور آزاد مسابقت کی وجہ سے سوسائٹی تباہ ہو رہی ہے اور اس نظام کے تحت جمہوریت اور عمومیت کا جو راگ الاپا جا رہا ہے وہ ایک سراب اور دھوکہ کی ٹٹی ہے، چنانچہ جمہوریت کے متعلق

شہور ... فلسفی نطشے کہتا ہے کہ " یہ اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے" اور مفکر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں " یہ دیو استبداد ہی ہے جو جمہوری قبا میں رقصاں ہے "

اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تمام خرابیوں کو دور کیا جائے، اس طرح کہ حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع ہو، خانگی ملکیت (Private Property) کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے۔ عاملین پیدائش ایک قاعدے کے تحت جکڑ دیئے جائیں، کارخانوں کے لئے قوانین بنائے جائیں، اور کاشتکاروں کے حقوق کا قانونی تحفظ کر دیا جائے، دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آئے، کوئی بھوکا نہ مرسکے، کوئی شخص کسی کو 'ایکسپولائٹ' نہ کرسکے معاشی، سیاسی، علمی اور اخلاقی میدان جو صرف سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھے ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ان گنت خرابیاں تھیں جس نے حقیقت میں طبقہ داری جنگ ـــــــ میں شدت پیدا کر دی، انسان اور انسان کے درمیان خلیج حائل کر دی۔ موجودہ زمانہ میں اشتراکی نظام کی تصویر آپ کو اشتراکی روس میں ملیگی جس میں بڑی حد تک سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو دور کیا گیا ہے۔ یہاں اشتراکی بنیادی قوانین کے تحت زمین، کارخانے، بینک، ریلیں اور کانیں اہل روس کی مشترکہ ملک ہیں چنانچہ اس " سوشل " نظام کے تحت ریاست اور حکومت عوام کی ہے۔ عوام کی پوری دولت کی نگرانی اور تقسیم حکومت اور ریاست کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس میں جب یہ نظام قائم ہوا تو خود بخود جاگیردار اور مہاجن بٹ گئے۔ پرولتاریہ طبقہ کی حکومت قائم ہوگئی اور بڑی حد تک سرمایہ دارانہ نظام کے تاریک و مہلک اجزاء بیروزگاری۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم۔ Exploitation، عصمت فروشی وغیرہ کا سدباب ہوگیا، اس طرح سرمایہ دار ممالک جو اپنی جمہوریت اور عمومیت پسندی کا رونا روتے ہیں وہ صحیح معنوں میں اس نظام کے تحت قائم ہوئی ہے ابراہیم لنکن کے الفاظ میں 'Government of the people for the people by the people' دنیا کے دو زبردست سرمایہ دار ممالک امریکہ اور انگلستان ہیں جو اپنے آپکو Arsenal of Democracy کہتے ہیں، لیکن حقیقت کا پردہ تار تار کیا جائے تو انگلستان کی چھ فیصدی آبادی اس ملک کی ۸۰ فیصدی آبادی کے سرمایہ پر قبضہ جمائے عیش منا رہی ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ حکومت، پارلیمنٹ، سیول سروس اور ریاست پر انہیں کا طوطی بولتا ہے۔ اور ادھر امریکہ کو دیکھئے جہاں دو فیصد آبادی امریکہ کی ۵۰ فیصد دولت پر قابض ہے، اور کانگریس سنات، مالیہ، صنعت و حرفت بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکہ میں اس وقت ۱۰ لاکھ آدمی بیروزگار ہیں اور موجودہ جنگ کے اختتام پر ہر ہفتہ انکی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

انیسویں صدی کے بعد خیالوں نے اپنا رخ بدلنا شروع کیا۔ ایک طرف اشتراکیت وجود میں آئی۔ اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام پر جب بہت سے دے ہونے لگی تو (Eyewash) کے طور پر سرمایہ دار ممالک سرمایہ دار نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کی جانب مائل ہوئے۔ اور اس طرح اجتماعیت Collectionism ملکتی اشتراکیت، State Socialism پیشہ سری Syndicism۔ گلڈ اشتراکیت Guild Socialism نے جنم لیا۔ ان نظاموں پر ہیں ایک طائرانہ نظر ڈالونگا کیونکہ انکی تفصیلات پر تبصرہ کرنا میرے اس مضمون کا مدعا نہیں ہے۔ اجتماعیت کے تحت عاملین پیدائش کو قانون کے پنجہ میں جکڑ دیا جاتا ہے، یہ ایک اعتدالی طریقہ کار ہے اس میں دولت کی تقسیم ہموار کرنیکی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جاتی ہے۔ اس پر آج کل برطانیہ عمل پیرا ہے۔ یہ اعتدالی پیش نامہ سو سال پر پھیلا ہوا ہے، جس کے بعد یہ خیال کہ

دولت رفتہ رفتہ عام طبقات میں مساویانہ منقسم ہوجائیگی، حالانکہ اس میں سرمایہ دار بہرحال سرمایہ دار ہی رہتا ہے اور مزدور مزدور ہی رہتا ہے، ذہنیتوں کو بدلنے کے لئے انقلابی عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرا نظام مملکتی اشتراکیت کا ہے۔ اس پر فاسسطی اور نازی جرمنی اور اٹلی عمل پیرا تھے۔ اس نظام کے تحت نہ صرف عاملین پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جاتا بلکہ ایک پروگرام بنا دیا جاتا ہے۔ اور تقسیم کار اور تقسیم دولت بہتر معنوں میں ہوتی ہے۔ ان فاسسطی حکومتوں کا تصور تھا کہ افراد، مملکت کے جزو ہیں، مملکت کا ایک دماغ ہے اس لئے افراد کو مملکت کے بنائے ہوئے پروگرام پر چلنا چاہئے اسی کو کلی مملکت یا مملکتی اشتراکیت کہتے ہیں۔ یہ اجتماعیت کے مقابلہ میں ایک انقلابی چیز ہے اس نظام کے تحت اٹلی اور جرمنی میں ہر قسم کا ظلم روا رکھا گیا۔ اور اتحادیوں کے ہاتھوں موجودہ جنگ عظیم میں اس نظام کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ تیسرا طریقۂ کار پیشہ سری کا نظام ہے، اس نظام کے تحت پیشہ داری یا طبقہ واری تقسیم کی گئی، مثلاً صنّاع، کاشتکار، لوہار، سنار، پریس مین وغیرہ اور سرمایہ دار دل سے زبردستی دولت کھینچ کر ان کے سپرد کی گئی کہ سنڈیکیٹس یہ دولت مساوی طور پر آپس میں تقسیم کرلیں۔ اور حکومت کی باگ ڈور بھی خود ہی سنبھال لیں، جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے۔ یہ ایک اہم کام ہے۔ اس کو سنڈیکیٹس انجام نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے اعلیٰ دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نظام جس پر فرانس میں عمل کیا گیا ناکام ثابت ہوا۔ چوتھا طریقۂ کار گلڈ اشتراکیت کا نظام نامہ ہے جو انگلستان کے اشتراکین پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قرون وسطیٰ سے انگلستان میں جو گلڈس صنّاعوں نے قائم رکھے تھے صنعتی انقلاب کے بعد ان کا زوال ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی قائم ہیں، پیدائش دولت کا کام ان گلڈس کے سپرد کردیا جائے کارخانوں کے قیام سے بیروزگاری بڑھتی ہے۔ اس طرح اس نظام کے تحت گھریلو صنعتوں کو فروغ پہنچانے کے پورے پورے مواقع ہوں گے۔ ہر گلڈس کے اراکین اپنے نمائندے منتخب کریں۔ ہر گلڈ ایک حلقہ تصور کیا جائیگا، اور ان کو مسلکی درجہ دیا جائیگا، حکومت، پیدائش دولت کے کام میں مداخلت نہ کرے بلکہ وہ گلڈ کے ان منتخبہ اراکین پر یہ کام چھوڑ دے اور صارفین دولت کا کام مملکت اپنے ذمہ لے ان دونوں طبقوں کے درمیان وفاق قائم ہو مملکت صارفین دولت کا کام کریں اور گلڈس پیدائش دولت کا کام کریں۔ دونوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہوکر ایک مشترکہ جماعت بنالیں۔ اس نظام پر عملدرآمد نہ ہوسکا گلڈ ٹوٹ گئے، وہ فضا غائب ہوگئی۔ گلڈ کے سپرد پیدائش دولت کا کام کیا جائے تو پیدائش آہستہ ہوگی۔ اگر تمام دنیا اس نظام نامہ پر عمل کرے تو شاید یہ نظام چل نکلے، لیکن آج دنیا اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ لوٹ کر اس پرانے نظام کو اپنا نہیں سکتی، اس طرح ان نظاموں میں بہرحال سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں جوں کی توں موجود ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہڑبونگ مچانے والوں کا منہ بند کرنے کے لئے کیپٹلزم کو نئے نئے نام اور نئے نئے روپ دیکر قائم رکھا گیا ہے۔!

ایک مفکر لکھتا ہے۔ مادہ فنا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے سائنس کی پکار تھی۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا میں منطق و فلسفے ہی عقل کے سپرد سارے عالم کی حکومت کردی تھی یہ عقلیت انتہا پسندانہ ہوئی اور پھر پر خود غلط ہوکر رہ گئی، فرانس میں فیورباش، جرمنی میں کانٹ اور مارکس اور انگلستان میں اسٹوارٹ مل وغیرہ نے سارے فلسفۂ حیات کی بنیاد مادیت پر رکھی، اگرچہ ہیگل اور برگسن کو حقیقت مطلق اور روحِ وجدان کے جلوہ گریزاں کا احساس ہوگیا تھا۔ تاہم مغربی تمدن پر مادہ پرستی چھائی رہی اور بے مقصد شتر بے مہار سائنس انسانوں کی نکیل پکڑے ان سے بادیہ گردی کراتی رہی، رفتہ رفتہ مغربی تہذیب کا سالار کاروان

مارکس بن گیا۔ مارکسیت اور اشتمالیت افادیت اور سرمایہ داری کی ترقی یافتہ صورت ہے اور بس۔ مارکسیت اور اشتمالیت کی روح وہی سرمایۂ مادّی ہے۔ صرف قالب بدلا ہوا ہے، اور ہیئت زیادہ منظم، زیادہ وسیع۔ زیادہ عظیم اور زیادہ جابرتی جارہی ہے لیکن عین اسی وقت مشیّت فطرت اور دست قدرت نے مادہ کی خود غارتگری کو عالم آشوب طور پر ظاہر کردیا۔ ایٹم بم صرف ایک تجربہ ہی نہیں بہت بڑی تنقید بھی ہے۔ اٹیمک بیماری کے مادّی نتائج تخیل عالم میں جاپان کے لرزہ خیز واقعات کے ذریعہ مضروب کئے گئے ہیں۔ اس کے ممکنہ روحانی نتائج اس سے کہیں زیادہ اثرخیز ہونگے، ایک معنی میں مادیت نے مادیت کو ہلاک کردیا۔ مارکسیت کے فلسفہ کی بنیاد مادہ کی ابدیت پر قائم تھی۔ اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ مادہ فانی ہے اور قوت حاصل کا ئنات ہے۔ آج تہذیب اس مقام پر آکھڑی ہوئی ہے جب خود سائنس کو زندگی کی غیر مادی وجدانی اور روحانی قدروں اور معیاروں کی تلاش، جستجو اور تحقیقات کرنی پڑیگی۔ مارکسیت کی بنیادیں ہل گئیں، مارکسیت کا نظریۂ تاریخی بھی اسی مادّی تشریح وتغیر کے سہارے پروان چڑھا تھا۔۔ اور مارکسی اشتمالیت کے اعتقادی نظام کی جڑیں بھی مادّی قدروں اور معیاروں کی زمین میں پیوست ہیں۔ آج انسانی تمدن دوراہے پر کھڑا ہے یا تو سے مادیت کی غلامی پناہ دیکر برباد کردیگی یا اسے روحانیت اور مادیت میں مفاہمت کرنی پڑیگی۔

اور بالآخر یہ کہنا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل بھیانک ہے اور انجام کار اشتراکیت اس کی جگہ لیگی، اس کے متعلق کوئی تیقن کے ساتھ قطعی رائے نہیں دیسکتا۔ کیونکہ انسانی زندگی سے ہمیشہ عجیب، غریب غیر یقینی عناصر چمٹے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرمایہ دارانہ نظام جو ڈیڑھ سو صدی سے قائم ہے مستقبل قریب میں ختم ہوجائیگا۔ اور فلاں نظام اس کی جگہ لے لیگا۔ اشتراکیت کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ دنیا میں پہلے جاگیردارانہ نظام تھا اس کے بعد کیپیٹلزم نے جنم لیا اور اب اس کی جگہ اشتراکیت لے لیگی۔ لیکن مختلف نظاموں کے تصادم سے 'سوشلزم' بھی جنم لے سکتا ہے اور 'باربرزم' بھی وجود میں آسکتا ہے۔ قرائن ضرور اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ اشتراکیت اپنے اچھے اصولوں کی وجہ سے ممکن ہے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سانس لینے والے لوگوں کے دماغوں کو 'کیپچر' کرلے۔ علاوہ ازیں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو کنٹرولڈ کیپیٹلزم کے ذریعہ بھی دور کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ اشتراکیت بہرحال سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لیگی غلط ہے۔ کیونکہ یہ کوئی صحیفۂ آسمانی تو نہیں ہے کہ تمام نظاموں کے آخر میں، اپنے آپکو نعم البدل کے طور پر پیش کرسکے، یہ ممکن ہے کہ انسان "گولڈن ایج" کو جنم دے یا "باربرک ایج" کو واپس بلائے۔ کیونکہ "سوشل سائینس" کے تحت عقلی اور غیر عقلی عناصر ہمیشہ انسانی زندگیوں اور ذہنیتوں میں انقلاب پاکرتی رہتی ہیں۔

ادارہ

نقد و نظر

ہفتہ وار "رباب"

مدیر:۔ محمد عثمان (علیگ) پتہ:۔ چارکمان حیدرآباد دکن۔ ندسالانہ عہ۹ فی پرچہ ۴ر

"رباب" ایک نیا ہفتہ وار رسالہ ہے جو ۲۳ مئی ۱۹۴۶ء سے معرضِ وجود میں آیا ہے، اس وقت تک رباب کے کئی شمارے شائع ہو چکے ہیں، رباب کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں، اٹھا آتشیں "رباب" مضراب بیخودی سے بجا ساز انقلاب

جو حقیقتاً رباب کے ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ رباب اگرچہ ایک ہفتہ وار رسالہ ہے مگر رسالہ کی ضخامت، مضامین کا تنوع ترتیب کی خوش سلیقگی، کتابت وطباعت کی پاکیزگی اُسے اچھے اچھے ماہناموں کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے، رباب افکار کی طرح صالح اور ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے میدانِ ادب میں آیا ہے اور یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ حیدرآباد کے اس رسالہ نے ملک کے عام ادبی رجحانات کے پیشِ نظر گو کچھ تاخیر سے تاہم نہایت مناسب اور وقت کی ضروریات کے مطابق قدم اُٹھایا ہے۔ ابتدائی نمبروں میں بعض مضامین نظم و نثر مطبوعہ شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ ادارہ رباب آئندہ ایسے مضامین کی مکرر اشاعت سے احتراز کریگا۔ کیونکہ یہ عمل پرچہ کی ترقی میں سدِ راہ ہوگا۔ ہم خلوصِ دل سے رباب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اُس کی ترقی کے خواہ ہیں۔

سالنامہ "آجکل"

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "آجکل" راجپور روڈ نئی دہلی۔ قیمت عہر۔

دہلی سے ایک مشہور اور معیاری رسالہ آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے جسے آغا محمد یعقوب دواشی کی خدمات بحیثیت مدیر اعلیٰ حاصل ہیں۔ حال ہی میں اس رسالہ نے اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے سالنامہ کو سات عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے ذیل میں بہترین مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ترتیب میں ادبی سلیقہ اور علمی شعور نمایاں ہے۔ حصہ تاریخ میں ترکی میں صحافت، چین میں سائنس کی ترقی، سائنس میں قدیم عرب و ہند کا اشتراک نہایت قیمتی معلومات پیش کرتی ہیں۔ تنقیدی ادب میں خلط مبحث، پرندوں کے احسانات اردو ادب پر اور احمد شاہ ابدالی کی پشتو شاعری مضامین نگار حضرات کی وسعتِ معلومات اور بلندیٔ فکر کا ثبوت ہیں۔ عالمگیر مسئلہ خوراک، جزائر بحرالکاہل کا تیل بہترین اقتصادی معلومات کے حامل ہیں افسانوی ادب میں تسنیم سلیم چھتاری اور راجیندر سنگھ بیدی کے افسانے قابلِ داد ہیں۔ بقیہ افسانوں کے انتخاب میں ادارہ کو زیادہ وقتِ نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔ حصۂ نظم میں بھی بعض ایسے گمنام حضرات موجود ہیں جو معیاری رسائل میں نظر نہیں آتے تصاویر تاریخ کا ایک وسیع اور خاموش باب نگاہوں کے سامنے رکھدیتی ہیں: بحیثیت مجموعی یہ سالنامہ ۱۹۴۶ء کے ادبی سرمایہ میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ہفتہ وار "الحمرا"

ایڈیٹر:۔ خلیل بدبی، ٹی ایچ۔ پتہ:۔ دفتر الحمرا۔ بھوپال۔ ندسالانہ:۔ عمعر فی پرچہ ۳ر

"الحمرا" جتنا حسین نام ہے اتنا ہی حسین یہ ہفت روزہ پرچہ ہے جو خلیل بدبی جیسے ہونہار نوجوان ادیب کی زیرِ ادارت حال ہی میں بھوپال سے شائع ہوا ہے، ترتیب و تدوین کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور مضامین نظم و نثر میں کافی تنوع پایا جاتا ہے مقامیات اور اسلامیات کے علاوہ عام سیاست پر آزاد اور بے لاگ تبصرے الحمرا کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ الحمرا ہندستان کے علاوہ بیرونِ ہند میں بھی اپنا وسیع حلقۂ اشاعت رکھتا ہے۔ سرورق بھوپال کے بہترین آرٹسٹ ظفر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہم قارئین افکار سے اس ہفتہ وار پرچہ کی سرپرستی کی سفارش کرتے ہیں۔

نمائندۂ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے

فلمستان

ہندوستانی فلم بیرونی ممالک میں

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ہندوستانی فلم بیرونی ممالک میں بتدریج غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے جارہے ہیں، امریکہ میں "ڈاکٹر کوٹنس" کے انگریزی زبان میں ریلیز کئے جانے کے انتظامات قریب قریب مکمل ہو گئے ہیں۔ "دھرتی کو لال" کی نمائش بھی عنقریب امریکہ میں ہونیوالی ہے۔

"ہمراہی" کا سنگم

فلمی دنیا میں اس خبر سے استعجاب کی لہر دوڑ گئی ہے کہ "ہمراہی" کی ہیروئن بنیتا بوس اور اس فلم کے افسانہ نگار جیوترموئے رائے زندگی کے راستے پر حقیقی معنوں میں "ہمراہی" بن گئے ہیں۔ ایک ادیب اور اسٹار کے اس مسرت ناک ملاپ پر شاید ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں گی۔

اشوک کمار اور کانن

ایک غیر مصدقہ اطلاع مظہر ہے کہ اشوک کمار نے کلکتہ میں ایک فلم میں بھارتی کے ساتھ اور دوسری میں کانن کے ساتھ کام کرنے کے لئے معاہدہ کرلیا ہے۔

"فٹ پاتھ" پر

ڈائرکٹر بوس نے اپنے تازہ شاہکار کا نام "فٹ پاتھ" تجویز کیا ہے۔ جس میں فلمستان نوکھے انداز میں "فٹ پاتھ" کا حقیقی نقشہ پیش کریگا۔

انفرمیشن فلمز

انفرمیشن فلمز آف انڈیا اور انڈین نیوز پریڈ کو حکومت کے ہاتھ سے بمبئی کی پرائیویٹ فرم کو منتقل کر دیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے زیر سایہ انفرمیشن فلمز کی نمائش کی عمر اور بڑھ گئی ہے۔

شوالہ

کلدیپ پکچرز لمیٹڈ لائل پور کے مینجنگ ڈائرکٹر دیوان کلدیپ چند اور جنرل مینجر مسٹر لیکھراج پروڈکشن کے سلسلہ میں بمبئی پہنچ گئے ہیں۔ آپ وہاں اپنے اولین شاہکار "شوالہ" کے لئے مشہور "فلمی پجاریوں" کا انتخاب عمل میں لائیں گے۔ آپ کی کوشش یہ ہے کہ "شوالہ" میں بہترین کاسٹ پیش کریں۔ ناموں کا عنقریب اعلان کیا جائیگا۔

"نرگس" کی بے نوری

بیان کیا جاتا ہے کہ اے، آر پروڈکشنز لاہور اور پربھات کے درمیان ناموں کی یکسانیت پر تنازعہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دونوں کمپنیوں نے اپنے آنے والے فلموں کے نام "نرگس" مشتہر کئے تھے۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔

مرزا جی بمبئی میں

اطلاع ملی ہے کہ مشہور ادیب و افسانہ نگار مرزا ادیب کسی اہم فلمی کام کے سلسلے میں آجکل بمبئی میں براجمان ہیں۔

پاپولر انڈیا کی "کامیابی"

پاپولر انڈیا پروڈکشنز لمیٹڈ نے اپنے پہلے فلم کا نام "کامیابی" رکھا ہے، اس کے کاسٹ میں مشہور اداکاروں کے نام شامل ہیں۔

بُت تراش

پنجاب کی مشہور کاروباری شخصیت ملک اے۔ ایچ خان مالک ادارہ بتکدہ اپنی اولین تصویر "بُت تراش" میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اسے گارگا اور فضل بیک وقت دو ہدایت کار غلمار ہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "بُت تراش" ہندوستان کا پہلا شاہکار ہوگا، جسے غیر ممالک کے لوگوں کے سامنے فخریہ پیش کیا جا سکیگا۔ ہرش۔ مس شیریں، زبیدہ وغیرہ اس میں کام کر رہے ہیں۔

"پت جھڑ" کی فلمبندی

پنچولی آرٹ پکچرز کی آنیوالی فلم "پت جھڑ" کی کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، چند دنوں میں اسکی فلمبندی کا کام شروع ہو جائیگا۔ مسٹر رام نرائن دوبے اس فلم کی

مشرقی دواخانہ

بھوپال میں عرصے سے ایک ایسے طبی دواخانہ کی کمی محسوس کی جا رہی تھی جس میں تمام طبی مرکبات صحیح اوزان کے ساتھ جدید سائنٹفک طریقوں سے کسی مستند اور ماہر فن طبیب کی نگرانی میں تیار کئے جائیں۔

چنانچہ اس غرض سے **زبدۃ الحکماء حکیم سید قمر الحسن صاحب** کے زیر نگرانی قمر منزل بھوپال میں "**مشرقی دواخانہ**" بھوپال کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، اس دواخانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھوپال کے مشہور نامور حاذق دہر دلعزیز طبیب استاذ الاطباء حکیم مولوی حاجی نور الحسن صاحب مرحوم و مغفور اور **فخر الحکماء حکیم حاجی مولوی سید ضیاء الحسن صاحب** افسر الاطباء ریاست بھوپال مستند طبیہ کالج دہلی و تلمیذ خاص عالیجناب مسیح الملک رحمۃ اللہ علیہ کے خاص اور صدری مجربات جو انمول جواہر کی حیثیت رکھتے ہیں تیار ملیں گے۔

تفصیلات کا انتظار کیجئے!

مہتمم مشرقی دواخانہ بھوپال

شکریہ

آرٹی کرال مینوفیکچر ورکس (انڈیا) کے ارباب حل وعقد ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے کئی سالوں مسلسل تجربہ کے بعد

آرٹی کرال مرہم

جیسی لاثانی دوا ایجاد کرکے نوع انسانی پر احسان عظیم کیا اور عوام وخواص کے موذی امراض مثلاً خارش، پھوڑے، پھنسی اور داد وغیرہ کا قطعی سدباب کر دیا۔ ہم نے سیکڑوں مریضان خارش (خشک وتر) پر علی الخصوص آرٹی کرال مرہم کا تجربہ کیا اور ہمیں یہ تصدیق کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ نتیجہ میں ہم نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔

آرٹی کرال مرہم ہر قسم کے مضرت رساں اجزاء سے قطعی مبرا ہے اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرہم دور حاضر کی ایک فقید المثال ایجاد ہے ہر قسم کی خارش، پھوڑا، پھنسی اور داد کے لئے صرف تین شیشیوں کا استعمال کافی ہے۔ سول ایجنٹ سے طلب فرمائیے!

دستخط

ڈاکٹر رام نرائن - ایم ، بی ، بی ، ایس
ڈاکٹر اصغر علی
ڈاکٹر شمشاد علی
ڈاکٹر بشیر الدین فاروقی

دستخط

محمد مختار صاحب صدیقی پروفیسر آصفیہ طبیہ کالج بھوپال
محمد ابراہیم صاحب سابق طبیب ڈیوڑھی اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ
محمد اکرام حسین صاحب طبیب گورنمنٹ پنشنر
علی حسین صاحب طبیب کامل (آصفیہ)

سول ایجنٹ :- سید ذاکر حسین عبد الحسین، چوک بھوپال

قابلِ مطالعہ کتابیں!

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	جھلکیاں	رہبر ٹپیالوی	۲/۴/
۲	گھروندے	عرش تیموری	۱/۸/
۳	دل کے آنسو	رئیس احمد جعفری	۱/۴/
۴	میر صاحب	عادل رشید	۳/-/
۵	اپنا گھر	مائل ملیح آبادی	۱/۸/
۶	سیالکوٹی کے گناہ	حکیم یوسف حسن	۱/۸/
۷	رات کی رانی	״ ״	۲/-/
۸	خوابوں کے ویرانے	حسن عزیز جاوید	۲/۰/
۹	زلزلے	قدوس صہبائی	۲/۱۲/
۱۰	روسی ظرافت	ضیائی	۲/۴/
۱۱	کیلے کا چھلکا	سندباد جہازی	۲/۰/
۱۲	گفت و شنید	بشیر احمد	۲/۰/
۱۳	گرد و پیش	عبداللہ بٹ	۳/۰/
۱۴	افسانہ زریں	اسماء	۱/۸/
۱۵	جرم و سزا	عبداللہ بٹ	۱/۴/
۱۶	دکھ سکھ	اعظم کریوی	۲/۸/
۱۷	خندۂ دل	کوثر چاندپوری	۲/۸/
۱۸	گل و لالہ	״ ״	۲/۸/
۱۹	لیل و نہار	״ ״	۱/۰/
۲۰	دنیا کے عظیم ترین افسانے	گوپال متل	۲/۰/
۲۱	کنول	اعظم کریوی	۲/۸/
۲۲	نئی فضائیں	قمر تسکین	۲/۸/
۲۳	نئی قندیلیں	״ ״	۲/۰/
۲۴	سبز شعائیں	ریاض جنیوی	۱/۶/
۲۵	فاؤسٹ	ریاض بی، اے	۱/۸/
۲۶	روسی افسانے	منٹو	۱/۸/
۲۷	موپاساں کے افسانے	نصیر حیدر	۱/۸/
۲۸	عجیب	قاضی عبدالغفار	۱/۸/
۲۹	چوراہا	قیسی رامپوری	۲/۱۲/
۳۰	زرینہ	عبدالرحمٰن سورتی	۱/۸/
۳۱	سماج کے ستون	قیسی رامپوری	۰/۱۰/
۳۲	دھنک	صادق الخیری	۲/۰/
۳۳	آرسین لوپن چالسوس	تیرتھ رام	۳/۸/
۳۴	مغرب کی عیش پسند عورتیں	״	۱/۸/
۳۵	زندگی	ملا رموزی	۳/۰/
۳۶	ہما خانم	سجاد حیدر یلدرم	۲/۸/
۳۷	شاعرات اردو	جمیل احمد	۵/۱۲/
۳۸	منتخب داغ	احسن مارہروی	۵/۰/
۳۹	جذبات قیس	قیس آروی	۲/۸/
۴۰	مضامین مالک	عبدالمالک آروی	۲/۸/
۴۱	الہامات شاد	شاد عظیم آبادی	۰/۸/
۴۲	رعنائیاں	شکیل بدایونی	۳/۰/
۴۳	نغمے کی موت	کرشن چندر	۲/۴/
۴۴	الطاف کے گیت	الطاف مشہدی	۱/۸/
۴۵	یہ دنیا ہے	بدر شکیب	۲/۰/
۴۶	۴۳ء کے بہترین افسانے		۲/۰/
۴۷	اقبال آرٹ	لطیف فاروقی	۱/۸/
۴۸	پگڈنڈی	افضل عابدی	۲/۸/
۴۹	پھانسی	منٹو	۱/۸/
۵۰	حسن و شباب	ماہر القادری	۲/۰/

نوٹ :- تاجروں کو معقول کمیشن دیا جائے گا

ملنے کا پتہ: عتیق الرحمٰن اینڈ سنز تاجران کتب چوک بھوپال

آئندہ پرچے

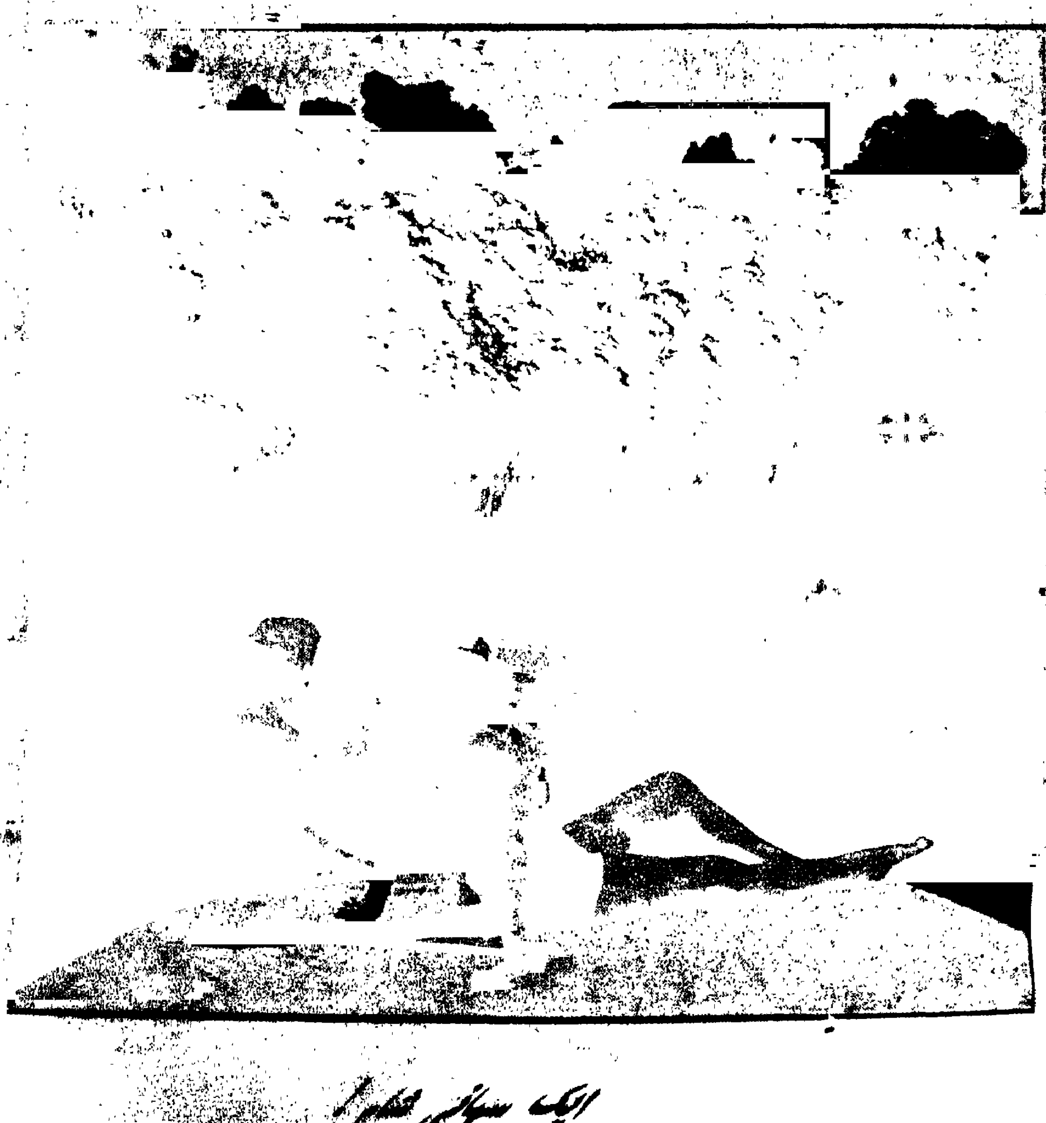
چند فنکار!

احمد ندیم قاسمی — عزیز اثری
شور (علیگ) — جلال ملیح آبادی
مکین احسن کلیم — مضطر اکبرآبادی
وجد الحسینی — بانکے بہاری لال فرحی
احسن طباطبائی — لطیف انور
فدا شاہجہاں پوری — شورش صدیقی
شاہر لکھنوی — کنول پرشاد کنول
سلیمان اریب — عرشی بھوپالی
ساقی صدیقی — عزیز جاوید
منیر پرویز — انجم سلطانی

——— وغیرہ ———

THE "AFKAR" MONTHLY
BHOPAL.

AUGUST 1946.



ایک سہانی منظر


The
MONTHLY
AFKAR
BHOPAL



ماہنامہ

بھوپال

دسمبر ۱۹۳۶ء

ادارہ

صہبا لکھنوی - رشدی بھوپالی

سالانہ چندہ

ششماہی

فی پرچہ

بمبئی آفس

۲۶۴ - بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸

...روڈ، لاہور

شمارہ ۱۰

سرخیاں

| ۱

اداریہ

[illegible] تعلیم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ہے [illegible]
[illegible] [illegible] زبان کی شکل میں جان [illegible] [illegible]
[illegible] روشن ہو گئی کہ اردو زبان [illegible] ہماری تعلیم کے لئے نہایت [illegible] ہے۔

[illegible] ہے کہ [illegible] آباد میں اعلیٰ ثانوی جماعتوں تک ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے دوسری زبانوں کو بنایا جائے گا۔ [illegible] [illegible] بھی تشویش انگیز ہے کیونکہ اس سے اردو کی اہمیت پر اثر پڑتا ہے اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے [illegible] [illegible] کی آئندہ ترقی میں ناقابل بیان رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت [illegible] [illegible] جلد کوئی واضح اعلان کرے گی اور اردو زبان کی تعمیر کے منافی کوئی اقدام کرنے سے احتراز کرے گی۔

[illegible] کی [illegible] میں بھی نزاکت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں آئندہ سال سے ذریعہ تعلیم انگریزی کے بجائے [illegible] اس طرح [illegible] اسکیم کو نئے انداز میں بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ [illegible] [illegible] کی [illegible] ہندی اور مرہٹی کو لازمی بنانے کی حمایت کی ہے، ہندی کو مڈل اسکول سے بی اے کے امتحان تک لازمی [illegible] حیثیت سے چلانے کی اسکیم بنائی جا رہی ہے تا کہ کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی اور رابرٹسن کالج جبلپور میں آرٹس کے طلبا [illegible] [illegible] کر دیا جائے اور سائنس پڑھنے والوں کی اکثریت کی وجہ سے مرہٹی اور ہندی کو یہاں بھی لازمی کر دیا جائے۔ اردو [illegible] [illegible] زبان تسلیم کیا [illegible] بین الاقوامی حیثیت بھی قائم ہو گئی ہے۔ ایسی صورت میں سی پی کی کانگریس وزارت کی یہ [illegible] پالیسی نہایت خطرناک اور غیر روادارانہ ہے۔ وسط ہند کے اردو ورکرز کو اب اپنی تنظیم کر کے اردو کے لئے کام شروع کر دینا چاہئے۔

[illegible] رسائل اور عوام کا ذوق" آجکل موضوع بحث بنا ہوا ہے، لیکن اس سلسلے میں ابھی تک کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا۔ اردو کے معیاری رسائل کو چاہئے کہ کوئی واضح لائحہ عمل پیش کریں اور ایک مرکز پر جمع ہو کر "فکری تعاون" سے متعلق کوئی [illegible] عوام کی پست مذاقی کو دور کرنے، گھٹیا، بیہودہ اور سستے لٹریچر سے ملوث رسائل و جرائد کی اصلاح کا پروگرام چلانے، پاکیزہ اور صحت مند لٹریچر [illegible] کرنے کا خاکہ مرتب کرنے کی جلد از جلد ضرورت ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن سستے فلمی رسائل کی [illegible] سے عوام اور بڑی حد تک خواص بھی مسلسل پست مذاقی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور ملک کے سنجیدہ و معیاری رسائل کے مارکٹ محدود ہو رہا ہے۔ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" سے ادبی ذوق کو تسکین دی جا رہی ہے جس [illegible] کی قسمیں بہ لحاظ تعداد [illegible] ہیں۔ اس سلسلے میں مدیر "شاعر" آگرہ نے ادبی برادری کو توجہ دلانے کی پہل کی ہے وہ [illegible] ہے۔ امید ہے کہ ملک کے سنجیدہ رسائل کے مدیران کرام کو اپنے تفصیلی و عملی پروگرام سے [illegible] کے [illegible] آل انڈیا میگزین ایڈیٹرس ایسوسی ایشن کا قیام [illegible] ہے۔ اگر مدیران جرائد ہماری اس تجویز [illegible] [illegible] کریں تو بہت کچھ عملی کام ہو سکتا ہے۔ ہم ڈاکٹر [illegible]، شفیق [illegible]، [illegible] [illegible] [illegible] الدین قادری [illegible]، [illegible] نجیب آبادی، [illegible] [illegible] کام [illegible] [illegible]

[illegible]

اس شمارہ میں ...شکیل الرحمٰن ... آبادی کا افسانوی عنوان "سمجھوتا" کس قدر
"معنی خیز" ہے کہ انھوں نے اس سے ... کی ہے — سرمایہ داری اور زمینداری کی دیواریں گر گئی
ہیں مگر ... نے "سمجھوتے" کے ... منظر بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے —! "جنگ کے بعد" ہندوستان کو کیا ملا؟
بھوک ... اور فساد — ... رہے ہیں کہ ان میں ترقی کے جراثیم ہیں —
"دھرتی" ... کر رہے ہیں۔ ... کی ایک المناک کہانی ہے۔ جس میں اس کے خون کا آخری قطرہ ...
گیا ... بابر ترقی کر رہے ہیں۔ "بھلا کی ... " میں ... نے دلکش پیرائے میں اس لڑکے کی مجبوری کا نقشہ
کھینچا ہے جو اقتصادی اور معاشرتی مشکلات کے باعث جنسی طلب فطری طور سے پوری نہیں کر سکتا۔ اور تسکین نفس کے لئے ...
درجہ کی چیزوں پر اکتفا کرتا ہے! اختر جمال نے "دل گرفتی یہ صورت ایک بار" کے نغمہ سے جو افسانوی تاثر پیدا کیا ہے وہ
بڑی حد تک قابلِ ستائش ہے۔ اگر اختر نے اپنی اس ترقی کو برقرار رکھا تو وہ مستقبل میں اچھی افسانہ نگار بن سکیں گی!۔

...کے سائنسی مضامین دلچسپی سے پڑھے جا رہے ہیں۔ اب "ارتقاء" کی آخری قسط ملاحظہ فرمائیے۔ ... اور ...
... کے نظریے سے بحث کی گئی ہے۔ "فراق اور تنقید نگار" حفیظ مالیگانوی نے اُن غلط فہمیوں کو دور
کرنے کی کوشش کی ہے جو فراق کی شاعری کے بارے میں پیدا کی جا رہی ہیں۔ حقیقت کی رو میں تنقید کے اصول تو نظر انداز نہیں کرنے چاہئیں
اور فراق کو اس کے اصلی رنگ میں ہی دیکھنا چاہئے۔ "ادب اور اقتصادیات" اختر رومی نے موضوع کا انتخاب اچھا کیا ہے، اگرچہ
مضمون تشنہ معلوم ہوتا ہے، پھر بھی انھوں نے محنت سے لکھا ہے۔

آئیے — آئیے! اس بار آپ کو چند نئے فنکاروں سے تعارف کرائیں۔ یہ ہیں نکہت تونسوی جدید ادب کے علمبردار شگفتہ کے روپ میں ... فکری
صلاحیتیں داد طلب ہیں۔ شاعر ماضی کی اقدار سے بغاوت کرتے ہوئے شگفتہ کو ایک نئے اسلوب سے پیش کر رہا ہے۔ ...
یال یقیناً حیرت انگیز ہے۔ ... — ... کاشمیری بھی پہلی بار ... کو زینت دے رہے ہیں۔ امیدوں کے خاک ... تو ... ہی رہتے ہیں
لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ ہماری زندگی کے حسین و رنگین خواب کیا ہمیشہ منت کشِ تعبیر بھی ہوتے ہیں — اسی انداز سے شاعر ...
اور یہ ہیں اشعر ... آبادی ملک کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر، "نئی منزل" کے تصور میں ہمارے مستقبل کی درخشانی کا راز مضمر ہے۔
اشعر کے لب و لہجہ کا خلوص انسان دوستی کا آئینہ دار ہے۔ جی اور یہ ہیں سلیمان اریب "بے بسی کا انتقام" ... والے ... و ...
کی آہنی دیواریں اس نوجوان شاعر کی نفسیاتی ضرب سے لرز اٹھی ہیں —
"شعلہ و تاب کا فرسودہ سہارا لیکر ساؤں اپنی بہنوں کی تذلیل کا بدلہ لے لوں" کاش انسانیت کے علمبردار اس مسئلہ پر سنجیدگی سے کچھ سوچ سکیں!
"منبع انتقام" ... والے عبداللہ مضطر گجراتی ہیں۔ انقلاب اور حیات آفریں انقلاب ہی اس غلام آبادی کی خونیں
شاموں کو سرخ سویروں سے بدل سکتا ہے۔ "نوبل پرائز" اور "جھلکیاں" بھی تلخ و شیریں تاثرات کی آئینہ دار ہیں جنھیں
ہمارے نئے فنکاروں ... شاہدی اور سالک الہاشمی نے پیش کیا ہے۔ شاطر غزنوی کے ... بھی داد طلب ہیں۔

اس شمارہ کا رنگ تغزل حسب سابق بہار آفریں ہے۔ جس محفل میں بہ یک وقت شہری، ... سنگھ ..., انور،
خلیق ... اور ... جیسے ترقی پسند غزل گو شاعر جمع ہو جائیں اس کی کامیابی پر کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔

اعلان! — ہمیں افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کے باعث اس بار ہم افکار کو سفید چکنے کاغذ پر شائع
نہیں کر سکے۔ حالات کے سدھرتے ہی افکار حسب معمول شائع ہوگا۔

ادارہ

مدوجزر

آزاد انڈونیشیا

آخر آج وہ دن آہی گیا جب ولندیزی حکومت نے انڈونیشیا کی جمہوریت کو آزاد اور خود مختار تسلیم کر لیا انڈونیشی باشندوں نے سب سے پہلے جاپانیوں کی غلامی کا جوا اُتار پھینکا تھا اور اس کے بعد سے برابر ہالینڈ کے حلقۂ حکومی سے باہر نکلنے کی سر توڑ جدوجہد کر رہے تھے۔ اگرچہ ہالینڈ اور برطانیہ کی فوجوں نے بہت زور مارا، مگر انڈونیشی محبانِ وطن کی سرفروشانہ جدوجہد، جوشِ جہاد اور حریت پسندی کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی، رجعت پسند اور استعماری قوتوں کو شکست ماننا ہی پڑی۔ شروع شروع میں ولندیزی حکومت نے جمہوریہ انڈونیشیا کو خود ساختہ حکومت قرار دیا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کو غیر نمائندہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں انڈونیشیا میں سخت خونریزی اور معرکہ آرائی ہوئی۔ یہ دو پی طا[illegible] ایشیائی ممالک کی آزادی کو دبانے کے لئے جو شاطرانہ چالیں چلتی ہیں، یہاں بھی ان کو استعمال کیا گیا۔ لیکن تمام انڈونیشیا میں آزادی کی جو چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں انھوں نے استعماری طاقتوں کے قلعوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ڈچ شہنشاہیت نے جمہوریۂ انڈونیشیا کی [illegible] کو تسلیم کرتے ہوئے جو معاہدہ کیا ہے اس میں ضابطۃً پر انڈونیشیا کو ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ولندیزی جزائر شرق الہند کو [illegible] مشتمل "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" کی تشکیل وفاقی اساس پر عمل میں آئیگی اور جاوا سماترا۔ اور [illegible] پر آزادانہ اقتدار حاصل ہوگا۔ [illegible] ڈچ شہنشاہیت سے ایک یونین کی شکل میں مربوط کر دیا جائیگا۔ خیال ہے کہ یہ یونین برائے نام ہوگی، ہو سکتا ہے کہ ڈچ شہنشاہیت [illegible] بعد میں نفاق اور پھوٹ پیدا کر کے اپنا مقصد نکالنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر انڈونیشی باشندے متحد ہے اور انھوں نے ولندیزی [illegible] کی چالبازیوں پر نظر رکھی تو پھر کسی طرح بھی ان کے معاملات میں بیرونی دخل اندازی نہیں ہوگی اور ہالینڈ سے جو ان کا تعلق [illegible] وہ بھی ان کے اتحاد، حب الوطنی اور اتحاد سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا۔ اطلاع ملی ہے کہ انڈونیشیا سے برطانوی ہندستانی فوجیں واپس بلالی گئی ہیں۔ حصولِ آزادی پر ہم مجاہدینِ انڈونیشیا بالخصوص ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو [illegible] شہریار کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سیاسی خلفشار

مرکز میں عارضی حکومت بن جانے کے بعد یہ امکان پیدا ہوگیا تھا کہ اب ہندستان بہت جلد [illegible] کی منزل پر پہنچ جائیگا۔ مگر ملک میں جس قدر شدید قسم کے فرقہ وارانہ ہنگامے ہوئے اُن سے [illegible] تہذیب اور انسانیت کی روح تک کانپ اٹھی۔ ابھی اُن ہولناک فسادات کی آگ پوری طرح دبنے بھی نہ پائی تھی کہ پھر [illegible] اختلافات رنگ لانے لگے، کانگرس مسلم لیگ کو "سرکاری پارٹی" کا الزام دے رہی ہے اور مسلم لیگ کہہ رہی ہے کہ کانگرس [illegible] دیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ مسلم لیگ نے نمائندہ اسمبلی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں گروپ بندی کا فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ یہ اختلافات بڑھتے ہی جا رہے ہیں، عارضی حکومت کی ناؤ بیچ بھنور میں ڈوبتی نظر آرہی ہے لیکن یہ اختلافات ختم نہیں ہو سکتے، اس پھوٹ اور نفاق سے پہلے بھی انگریزوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور اب بھی یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لیڈروں اور جماعتوں کی جنگ سے ہندستان پھر اب سے سو سال پیچھے کی دنیا میں پہنچ جائیگا۔ جب تک فرقے کسی حیثیت سے ایک مرکز پر نہیں آسکتے اور اس کے بجائے بے گناہ انسانوں کو اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دینا پڑتی ہے تو زیادہ بہتر ہے کہ دونوں اپنے اپنے منتہائے مقصود کے مطابق راستہ اختیار کر لیں۔ اے کاش ـــ اس نازک وقت پر ہمارے قائدین، تقابلِ بیاں مصائب میں مبتلا عوام کا خیال کریں اور انھیں آنیوالی بھیانک تباہی سے بچانے کی کوشش کریں۔

یارانِ تیزگام نے منزل کو جالیا　　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے۔

(ادارہ)

آبگینے

شکنتلا
دامانِ آرزو
ٹمٹماہٹ
سہارے
نئی منزل
تاثیرِ دعا
کرمِ ناخدا
انتقامِ بےبسی
ذکر و فکر
صورِ انتقام
زندگی
دردانے
نوبل پرائز
جھلکیاں

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

شکنتلا

"— اسے دیواروں میں چن دو، اسے سنگسار کرو!
اسے نیزوں پہ چڑھا دو، اسے چھلنی کر دو
دھڑ دھڑاتے ہوئے شعلوں میں جھلس دو اس کو
ہڈیاں پیس دو، کتوں سے اسے نچوا دو
اس نے توہینِ شہنشاہِ معظم کی ہے!!
ایک ذرے نے تمنائے دو عالم کی ہے —"

*

راج دربار کی ناموس پہ یہ وار ترا
اتنا کاری ہے کہ لرزاں ہیں طلائی مینار
کتنی گستاخ ہے، بے شرم ہے، بے ننگ ہے تو
ویشیاؤں سے بہت ملتے ہیں تیرے کردار
یہ مہاراج، یہ پنڈت، یہ حکومت کے ستوں
ان کی نظروں میں ہے آبائی روایت کا وقار
سوچ اے بنتِ بیاباں! کہ تری نسل نہ رنگ
اور ترے ہاتھوں مہاراج پہ تہمت کا غبار —!؟

ترے اشکوں میں دمکتے ہیں تپوبن کے سنہری سپنے
تری آہوں میں لرزتے ہیں نم آلود ہوا کے جھونکے
مست جھرنوں کے کناروں پہ، چناروں کے تلے، مست غزالوں کا خرام
حُسن کے شیشۂ بلور میں غلطاں وہ محبت کی شراب گلفام ــــ!
وہ کلیلیں، وہ اُڑانیں، وہ ترنگیں، وہ نکھار
ٹوٹتے خواب کے ذرّوں کا بکھرتا ہُوا ہار
سرد آہیں نہ بھرو، کانپتے آنسو روکو؛
یاد کے تارے نہ چھنکاؤ، اندھیرا کردو!
اور اندھیرے میں بھٹکتی پھرو، چلّاتی پھرو
جسم کے ساز پہ مست رُوح کے نغمے گاؤ
رُوح نے صدیوں سے انساں کو اندھیرے بخشے
ان اندھیروں میں کئی جنگلی دوشیزائیں
جب ستونوں کی طرف لپکیں، تو جھلسائی گئیں
ہڈیاں پیسی گئیں، کتّوں سے نچوائی گئیں
اور وُہ عشق ــــ؟ وہ احساس کا مستانہ فریب
وُہی بے منزل و ناکام پڑا ناراضی؛
جانے کب رہ گیا، کیوں رہ گیا رستے میں کہیں۔؟
کہ تپوبن سے مہاراج کے دربار تلک ــــ
وقت و تقدیر کا اک کوہِ گراں حائل ہے ــ!

فکر تونسوی

دامانِ آرزو

نظریں ملائیں، چپ ہوئے، شرما کے رہ گئے
رازِ شکستِ حسن وہ سمجھا کے رہ گئے

اِک موجِ دردِ دل سے اُٹھی، اُٹھ کے دب گئی
آنکھوں تک اشک آئے مگر آ کے رہ گئے

اکثر اُنھیں سے جرأتِ شکوہ ہوئی مگر
اکثر اُنھیں کے سامنے گھبرا کے رہ گئے

کوئی نیا فریب نہیں ان کا التفات
ایسے ہزار خواب نظر آ کے رہ گئے

میری نگاہِ شوق کا دیتے وہ کیا جواب
مُنھ سے تو کچھ نہ کہہ سکے شرما کے رہ گئے

تیرے نثار اُن کی طرف بھی کوئی نگاہ
دامانِ آرزو کو جو پھیلا کے رہ گئے

دل سے غبار اُٹھے مگر آنسو نہ بن سکے
بادل تو گھِر کے آئے مگر چھا کے رہ گئے

اللہ رے اعتمادِ تمنا کہ آج وہ
میری محبتوں کی قسم کھا کے رہ گئے

شعریؔ کسے سناتے محبت کا واقعہ
اپنا فسانہ آپ ہی دُہرا کے رہ گئے

صغر شعریؔ

...ماہٹ

اَن گنت حسرتوں کی ایک اُمید
ذہن ہر آن بنتا جاتا ہے ـــــ
مصر کا مقبرہ عریض و طویل
جس میں عصرِ کہن کی لاشوں پر
تھرتھراتی ہو، تابشِ قندیل

بحر کے منحنی کناروں پر
موتیوں کے چراغ جلتے ہیں
موج اِن کو مگر بجھا دیگی
تندیٔ سیل میں بہائے ہوئے
ظلمتِ بحر میں چھپا دیگی

اِسی انداز سے شعاعِ امید
دیر تک ٹمٹما نہیں سکتی
ایک طوفانِ سرد آئیگا
پھر وہی رات، پھر وہی آہیں ـــــ
کلفتوں کا غبار چھائیگا

ظہیر کاشمیری

سہارا

رنج و غم کب تک سہارے جائیں گے
عشق میں سب قول ہارے جائیں گے

زندگی میں جب رہے ناکام ہم
کام کیا مر کر سنوارے جائیں گے

بے حجابی ہو۔ کہ نیرنگ حجاب
طالبانِ دید مارے جائیں گے

زندگانی کام آ ہی جائے گی
ہم ترے صدقے اتارے جائیں گے

دیدنی ہو گا تمہارا پیچ و تاب
حشر میں جب ہم پکارے جائیں گے

زندگی کے چار دن تیرے بغیر
جانے کس صورت گذارے جائیں گے

بجلیوں کو آشیاں سے لاگ ہے
یا قفس تک یہ شرارے جائیں گے

موج میں جب آئے گا بحرِ کرم
ڈوبنے والے ابھارے جائیں گے

قبر تک تو موت لے آئی ہمیں
آگے اب کس کے سہارے جائیں گے

اے خوشا قسمت کہ ان کے ہاتھ سے
بے سبب کچھ لوگ مارے جائیں گے

ناخدا محکم کوئی ہو یا نہ ہو
ڈوب کر ہم اس کنارے جائیں گے

نئی منزل

کفن میں نور کے لپٹی ہوئی سہاگن رات
یہ دور دور تلک منظروں پہ اضمحلال
کسی عمیق تفکّر میں سرنگوں اشجار
لٹے ہوئے ہیں کسی دُکھ بھری ہنسی کا نکھار
یہ رات دن، یہ زمیں آسماں یہ ماہ یہ سال
ابھی نصیب کہاں ہے ان الجھنوں سے نجات

سفید ابر کے ٹکڑوں سے جھانکتا مہتاب
اداس رات دکھاتی ہو جیسے داغ جگر
یہ لہلہاتے ہوئے کھیت مست رعنائی
تمام حسنِ مجسّم، تمام انگڑائی
ابھی ہے گیسوئے محبوب میرے شانوں پر
ابھی نصیب ہے مجھ کو حسین جام شراب

مگر سنوں تو ذرا دور کی صدا ہی سہی
یہ میرے چار طرف دُکھ بھری پکار ہے کیوں؟
یہ میرے دیس کے ساتھی اسیر حال خراب!
ہٹاؤ گیسوئے مشکیں، اٹھاؤ بادۂ ناب
میں سوچتا تھا کہ غمگینیٔ بہار ہے کیوں؟
مری نگاہ میں منزل ہے آج ایک نئی

اشعر ملیح آبادی

تاثیرِ دُعا

اے ذوقِ نظر بجھ کو وہاں لیکے نہ جا دیکھ
پچھتائیگا یہ قیدِ تماشہ نہ اُٹھا دیکھ
پھولوں کی ہنسی دیکھ نہ غنچوں کی ادا دیکھ
یہ راہ کے جلوے ہیں نظران سے بچا دیکھ
امید وفا اپنی دعاؤں کے صلہ میں
خود عشق کی توہین ہے او ننگِ وفا دیکھ
اک اُن سے بس اک انکی محبت سے غرض رکھ
آغازِ ستم دیکھ نہ انجام وفا دیکھ
دیکھا ہے بہت جلوۂ نیرنگیٔ عالم
اے پست نظر اپنی طرف بھی تو ذرا دیکھ
تھا عذر تجھے پیروی راہِ نما پر
اب حیرتِ نقشِ قدم راہ نما دیکھ
خود اُن کو عزیز اب ترا پندارِ جنوں ہے
تیرے لئے ہر عجز محبت ہے خطا دیکھ
کہتی ہے یہ اب جراءتِ دیوانگیٔ شوق
انکی بھی طرف دیکھ تو اپنی ہی ادا دیکھ

افسوں یہ نہیں ہے روشِ اہلِ محبت
ہو جائے کہیں زہر نہ تاثیرِ دُعا دیکھ

افسوں بھوپالی

کرمِ ناخدا

رازِ جور وجفا نہیں معلوم
دردِ دل کی دوا نہیں معلوم
اے مسیحا تری عنایت سے
درد کیوں بڑھ گیا نہیں معلوم
عشق کی ابتدا تو میں نے کی
عشق کی انتہا نہیں معلوم
ہائے! اُس شوخیٔ نظر کا عتاب
کیا غضب ڈھائیگا نہیں معلوم
میرا اللہ پر بھروسہ ہے
کرمِ ناخدا نہیں معلوم
اُن کی بیگانگی عظیمِ آخر
رنگ لائے گی کیا نہیں معلوم

انتقامِ بے بسی

کس لئے دور سے یوں دیکھ رہے ہو مجھ کو!
بڑھ کے پوچھو کہ مرے حُسن کی قیمت کیا ہے؟
چند سکّوں میں تو شاید میں نہیں ہوں مہنگی
اِک کھلونا ہے فقط مرد کا عورت کیا ہے؟

خیر! آجائیگا کل تم کو بھی سودا کرنا ——!
تو گرفتارِ ہوس ہو جبھی گھبراتے ہو
پھر بھی شاباش کہ اِس کوچہ میں رکھا تو قدم
بولتے کیوں نہیں کیا سوچ رہے ہو، بولو

دیکھو! تم اپنے گریباں کی طرف کیوں دیکھو
رہ گئے ہیں ابھی کچھ تار مرے دامن میں
تم مری زلفوں سے کھیلو مجھے چومو، بھینچو
لذّتیں اور بھی پوشیدہ ہیں میرے تن میں

ایک قحبہ ہوں مرے پاس تو کیا ہو گا بھلا
آؤ میں کچھ تو بہر حال تمھیں نذر کروں
عشوہ و ناز کا فرسودہ سہارا لے کر
ماؤں کی بہنوں کی تذلیل کا بدلہ لے لوں

سلیمان اریب

ذکر و فکر

نغمہ پریشاں کیا ہوگا یا نالۂ گرداں کیا ہوگا　　　عشق سے بڑھکر کوئی جہاں میں خستہ و حیراں کیا ہوگا
دن کا سورج رات کے تارے زخم جگر پر ہنستے ہیں　　　میری طرح اب کوئی شکارِ گردشِ دوراں کیا ہوگا
طور کو تابِ ضبط نہیں ہے پردہ اُٹھا تو دیکھ لیا　　　تیرا ٹھکانا دل کے سوا اے جلوۂ جاناں کیا ہوگا
چاک ہوا کلیوں کا سینہ صحنِ چمن میں پھول کھلے　　　سوچتا ہوں اے دستِ جنوں معیارِ گریباں کیا ہوگا
کشمکشِ غم کی عظمت آسودۂ راحت کیا جانے　　　ساحل جسکی حدِ نظر ہو قائلِ طوفاں کیا ہوگا
رفتہ رفتہ بامِ حرم سے اونچا ہوگا ذوقِ نگاہ　　　عشق کی کفر انگیزی میں مستقبلِ ایماں کیا ہوگا

ہائے وہ دن جب پیمانے سے پیمانے ٹکراتے تھے
ساقی مجھ سا صدر نشینِ مجمعِ رنداں کیا ہوگا

ساقی صدیقی

نہ کیوں ہو اِس رُخِ نو سے نقاب وابستہ　　　کہ حُسن سے ہے تمہارے شباب وابستہ
متاعِ عشق ہے سرمایۂ محبت ہے　　　وہ اک نظر کہ ہے جس سے حجاب وابستہ
میں اِن ہزار سوالوں کی قسمتوں کے نثار　　　کہ جن سے آپ کا ہے اک جواب وابستہ
تمہارے دل کو ہے صبر و سکوں سے ربطِ دوام　　　ہمارے قلب سے ہے اضطراب وابستہ
نہیں نہیں مجھے تعبیرِ خواب کی تشویش　　　ہے میرے خواب سے تعبیرِ خواب وابستہ
نہیں تمہاری تلون مزاجیوں کا گلہ　　　ہر ایک چیز سے ہے انقلاب وابستہ

مری غزل کو نہ وہ گنگنائیں کیوں یکتاؔ
مری غزل سے ہیں چنگ و رباب وابستہ

صورِ انتقام

...خودی کے متوالو! خوب کی وفا تم نے　　اک خدا کے کر ڈالے سینکڑوں خدا تم نے
...خود پرستی کو ۔ زرگری و مستی کو　　ہر گناہِ ہستی کو کر لیا روا تم نے
...دم پہ میراثِ ارض کا ہے ہنگامہ　　امن بزمِ عالم سے سلب کر لیا تم نے
...سیاست میں تم نے کی ہوس رانی　　وعدۂ تحفظ میں لوٹ لی فضا تم نے
...ں کے رہ گئے کتنے طائر آشیانوں میں　　ہر طرف سے گلشن کی روک دی ہوا تم نے
...ں ہیں افسردہ ۔ گلکدے ہیں پژمردہ　　خشک و تر پہ پھیلا دی قحط کی وبا تم نے
...ہوائیں فریادی بر بنائے آزادی　　مجھ کو سر بسر سمجھا درخورِ سزا تم نے

اب تمہارے وعدوں پر صبر ہو نہیں سکتا
اب مرے عزائم پر جبر ہو نہیں سکتا

...ں میں اٹھا ہوں لے کے شمعِ ایمانی　　اب مری نگاہوں میں وسعتیں ہیں مکانی
...رے اشارے کے منتظر زلزلے ہیں　　اب مری جلو میں ہے قدسیوں کی طغیانی
...سلام تو میرا زندگی کو پہنچا دو　　اب مری ہر اول ہے موت کی رجز خوانی
...دیا عشرت میں حشر رونما ہوگا　　فیصلہ سنائے گی جھونپڑوں کی ویرانی
...وہ دورِ تاریخِ گلستاں میں آتا ہے　　رعد بن کے گرجیں گے ہر قدم پہ زندانی
...دسِ فطرت ہے اب یہی نمائندہ　　اب مرے تصرف میں ہے نظامِ انسانی
...م اپنی آنکھوں سے عنقریب دیکھو گے　　ٹھوکروں میں آوارہ تخت و تاجِ سلطانی

تیغِ بے نیام اپنی اب کریگی کام اپنا
شش جہت میں [illegible] صورِ انتقام اپنا

عبداللہ مضطر گجراتی

زندگی

فضائے رنگیں گھُٹی گھُٹی ہے، بہارِ تازہ جلی جلی ہے
چمن میں ہر سو نہ جانے کیسی یہ زہر آگیں ہوا چلی ہے

ہزار ہوش و خرد سے پوچھا، مگر کسی نے نہ یہ بتایا
یہ اضطرابِ نظر ہے کیسا، یہ کیسی سینے میں بےکلی ہے

نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل، بتا مجھے اس قدر تو اے دل
یہ تیری بے رہروی مجھے کس کی جلوہ گاہوں میں لے چلی ہے

کبھی تو وہ زندگی بھی آخر بہار سے ہمکنار ہو گی
خزاں کے سائے میں جو بڑھی ہے جو موت کی گود میں پلی ہے

نہ دور رہ کر مجھے ستائے، ہو کیا ہی اچھا کہ جلد آئے
وہ بھولی بھالی حسین صورت جو میرے افکار میں ڈھلی ہے

چمن میں کس نے اداس لے میں وفا کا پُرسوز گیت گایا
گلوں پہ چھائی ہے مردنی سی، فسردہ خاطر کلی کلی ہے

وہ دن گئے جب حیات واماندہ فسردہ تھی، مضمحل تھی
کہ وقت کے ساتھ اب رگوں میں نئی حرارت سی آچلی ہے

جمیلؔ وہ دن بھی تھے کہ ہم کو لگاؤ تھا اپنی زندگی سے
مگر یہی اب تو سوچتے ہیں حیات سے موت ہی بھلی ہے

جمیلؔ ملک

دُردانے

—: ایک مزار پر :—

مزارِ حضرت داتا پہ اک حسین لڑکی
اُداس — دیکھ رہی ہے سفید سا فانوس
بجھا بجھا سا ہے چہرہ پھٹی پھٹی آنکھیں
نہ جانے کس لئے معصوم حُسن ہے مایوس

—: ملاپ :—

شام نے سُرمئی آنچل اوڑھا
ایک چرواہے نے چھیڑی بانسی
اوٹ میں بوڑھے سے اُس برگد کے
ہولے سے ایک حسینہ کھانسی

—: ایک دریچہ :—

بادلوں میں ہے اک دریچہ سا
جھلملاتے ہیں جس سے مہ پارے
غم کے روزن سے جیسے پھوٹ پڑیں
مسکراہٹ کے [illegible] دھارے

تنہا طارق غزنوی

نوبل پرائز

راگ چھیڑا جہاں ٹیگور کی شہنائی نے
مدھ بھرے گیت محبت کے رسیلے نغمے
جام چھلکائے کئی ٹوٹتی انگڑائی نے

نقرئی گونج سے لبریز کتابوں کے ورق
کاغذی پیروں میں الفاظ کے گھنگھرو باندھے
ناچتی جاگی اٹھائے ہوئے ماتھے پہ شفق

فلسفہ اور یہ حکمت کے فسوں کار اصول
تھپکیاں دے کے غلاموں کو سلا دیتے ہیں
ایسی آیات کے منشور غلاموں کے رسول

آہ گیتانجلی ساحر مشرق کا پیام
کھا کے افیون مرے اہل وطن سو ہی گئے
اور خندق سے پکارا گیا نذر الاسلام[1]
بھوکے بنگال کی تصنیف ہزاروں چیخیں
کاش ان گیتوں پہ ملتا اسے "نوبل انعام"
اور اس درد کا کچھ دیر مداوا ہو جائے

نشاط شاہدی

[1] بنگال کا انقلابی شاعر قاضی نذر الاسلام

جھلکیاں

گو مصلحتِ وقت نہیں ہے یہ فسانہ — لیکن مری فطرت نہ غمِ زلف نہ شانہ
آزادیٔ افکار سے ہے جدتِ مضموں — حسنِ چمنستاں ہو کہ مزدور کا ہو خوں
آغوشِ جہاں طفلِ مناظر کو لئے ہے — یہ قصرِ کہن تازہ عناصر کو لئے ہے
اک سمت ہیں فردوسِ مسرت کے نظارے — اک سمت ہیں آتشکدۂ غم کے شرارے
اک سمت عروسِ مے و مینا کی جھلک ہے — اک سمت مباحث میں غمِ آب و نمک ہے
اک سمت فراوانیٔ ملبوسِ درخشاں — اک سمت سلامت ہے نہ دامن نہ گریباں
اک سمت ہے سکوں کے ترنم سے تبسم — اک سمت ترنم، نہ تبسم، نہ تکلم ؟ ؟
اک سمت شرافت پہ گراں زعمِ امارت — اک سمت غریبی میں بھی اخلاق کی جرأت
اک سمت ہیں زینت کے لئے سنبل و ریحاں — اک سمت مشقت سے جوانی بھی ہے لرزاں
اک سمت نگاہوں میں خوشی رقص کناں ہے — اک سمت لرزتے ہوئے ہونٹوں پہ فغاں ہے
اک سمت حکومت ہے عناں گیرِ محبت — اک سمت بلندی پہ ہے معیارِ شرافت
شاید یہ شرافت ہی حکومت کا نشاں ہو — شاید اسی معیار پہ تعمیرِ جہاں ہو

دنیا دلِ مجبور کو بیدار نہ کر دے
مظلوم بھی ظالم پہ کبھی وار نہ کر دے

سالک الہاشمی (دھیگ)

آبشار

جھروکا
آزادی کے بعد
وحشی
بھوکی امنگ
دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

اختر ملیح آبادی

جھروکا

سامنے ایک جھروکا تھا ——— ! قدیم بوسیدہ، ٹوٹا پھوٹا، جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑا ہوا، ویران، اداس اداس ہر دیکھنے والے کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا — ! جب سے " وہ " بیمار ہوکر سامنے والے مکان میں آیا تھا ان میں کئی کئی بار جھروکے کی طرف دیکھتا کبھی کسی خاص ارادے کے تحت کبھی بلا کسی ارادے کے اُس کی نظریں جھروکے پر اٹک جاتیں۔ جھروکے سے اُسے اب اتنی دلچسپی باقی تھی کہ قدیم، پرانا جھروکا ایک پرانی وضع کی قدیم عمارت کا جھروکا تھا، وہ عمارت ایک خاندانی نواب کی میراث تھی اور آجکل بھی انقلابات زمانہ کے باوجود عمارت نواب ہی کی ملکیت تھی۔ نواب اُس قدیم، خاندانی میراث پر بہت نازاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ اُسے جھروکے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ جھروکے پر پڑی ہوئی چلمن کو آجتک جنبش تک نہ ہوئی تھی، نہ چلمن کے پیچھے آجتک اُسے کوئی سایہ ہی نظر آیا تھا، نہ کبھی اُس نے چوڑیوں کی جھنکار ہی سنی تھی، نہ رنگین دوپٹہ کا آنچل چلمن کے باہر دکھلائی دیا اور نہ حنائی انگلیاں ہی کبھی چلمن کے باہر نکل سکیں، بلکہ اکثر جھروکہ کی طرف دیکھکر اس پر اداسی چھا جاتی، ٹوٹا، پھوٹا جھروکا تھا، کہیں سے چند اینٹیں پلاسٹر نہ ہونے کی وجہ سے باہر کھسک آئی تھیں، نہ جانے کب سے وہ بلا مرمت کے پڑا تھا، جھروکے پر لکڑی سے بنے ہوئے نقش و نگار جو عہد رفتہ میں بنائے گئے تھے یا تو مٹ چکے تھے یا دھندلے پڑ چکے تھے، لکڑی تک سیاہ ہوگئی تھی، دور سے اس پر لوہے کا گمان ہوتا تھا.! دھندلے مٹے مٹے نقش و نگار اور پرانی ساخت دیکھ دیکھ کر اکثر اُس کا جی گھبرانے لگتا۔!

لیکن اِدھر اُس کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا تھا، ملازم نے اُس سے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا اُس کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی ——— آج سے بارہ سال پہلے کا واقعہ ہے، جھروکے پر سے موجودہ نواب کی بہن نے جھانکنا شروع کیا، نواب کی بہن کی عمر کافی ہوچکی تھی، لیکن نواب اُس کی شادی نہیں کرتا تھا۔ اُس کو ایک نوجوان سے محبت ہوگئی۔ نواب کو آخرکار پتہ چل گیا اور چراغ پا ہوگیا، ایک دن موقعہ پر نواب نے اپنی بہن کو پکڑ لیا ——— گردن پکڑ کر جھروکے کے اندر لے گیا۔ نواب زادی پھر کبھی جھروکے پر نظر نہ آئی، اس پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے، کیونکہ نوابزادی نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دینے کی کوشش کی تھی۔ نواب کی نگاہ میں یہ گناہ ناقابل معافی تھا ——— کچھ دن بعد نوابزادی مرگئی اور اس طرح نوابزادی دنیا سے ناشاد گئی اور خاک میں ملا دی گئی !۔

عبرت ناک واقعہ تھا ——— نوابزادی کا تصوّر اس کے دل و دماغ پر چھا گیا، اب جب کبھی وہ جھروکے کی طرف دیکھتا تو اُس سے کوفت سی ہوتی۔ ایک سایہ منڈلاتا ہوا نظر آتا، کبھی کبھی گہرے سناٹے میں اُسے سسکیوں کی آواز سنائی دیتی اُسے جھروکے، قدیم محل، نواب اور ساکنانِ محل سے نفرت ہوگئی تھی !۔

اُس نے جھروکے کو مختلف زاویوں سے دیکھنا شروع کیا، اُسے محسوس ہوا سامنے والا جھروکہ کسی محل کا جھروکا نہیں بلکہ ایک زنداں کا جھروکا ہے ——— یہ خیالات اُس کے دل و دماغ میں پرورش پاتے رہے، جھروکے سے دھیرے دھیرے اُس کی نفرت بڑھ رہی تھی ۔

جھروکا

تاریکی بڑھ رہی تھی اور وہ دیر سے جھروکے کی طرف دیکھ رہا تھا، وہاں ایک گرد آلود چلمن پڑی تھی جسے نہ معلوم کب سے جنبش تک نہ ہوئی تھی، چلمن پر ایک چڑیا مکڑی کا شکار کر رہی تھی، اندھیرے میں جھروکا کس قدر بھیانک ہوگیا تھا، ایک کبوتر نہ جانے کہاں سے آیا، جھروکے کے گرد منڈلایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ وہ کبوتر شاید نوابزادی کی روح ہے جسے اس الزام میں مار ڈالا گیا تھا کہ وہ جھروکے پہ آگئی تھی، مر کر بھی نوابزادی کی روح جھروکے کو فراموش نہ کر سکی تھی اُس کی روح کو ابتک قرار نہ آیا تھا۔ پھر یکایک کبوتر اُڑ گیا۔ نوابزادی کی روح کہیں اور چلی گئی تھی — !

اُس کی نظریں چلمن پر اٹکی تھیں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چلمن کے پیچھے کیسا ماحول ہوگا، اُس کا خیال اُسے چلمن کے پیچھے لے گیا وہاں تاریکی، بھیانک تاریکی تھی جو عام طور پر پرانے عہد کی عمارتوں میں پائی جاتی ہے، پھر وہ سوچنے لگا اُس محل میں پرانے تاریک سیلے ہوئے کمرے ہونگے —— اُن تہہ خانوں میں نہ جانے کتنی روحیں قید ہونگی، نہ جانے کتنے قیدی مر چکے ہونگے کتنے سسک رہے ہونگے اور نہ جانے ابھی اور کتنے قیدیوں کو جان دینا پڑیگا —— وہ نوابزادی بھی ان ہی تہہ خانوں میں سے کسی ایک تہہ خانہ میں سسک سسک کر مرگئی ہوگی جس کی روح آجتک جھروکے کے اردگرد منڈلایا کرتی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا اُن تہہ خانوں کے مقید قیدیوں میں بھلا اتنی ہمت کہاں کہ وہ تمام روایتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے تمام رکاوٹوں اور بندشوں کو توڑتے ہوئے آگے بڑھیں، تاریکیوں کو چیرتے ہوئے چلمن تک آجائیں، چلمن اٹھا کر جھروکے پر —— لیکن قیدی ایسا کیونکر کر سکتے تھے، وہ سب خاندانی قیدی تھے، برسہا برس سے یونہی قید میں رگڑ رگڑ کر مرنے کے عادی بن چکے تھے۔ ان کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ جھروکے پہ آئیں اور وہاں سے لامحدود فضا میں چھلانگ لگا سکیں۔

دوسری طرف اس نے اس پر بھی غور کیا کہ اس جھروکے کی اب کیا ضرورت ہے؟ جھروکا شاید اس مقصد کے لئے بنوایا گیا ہوگا کہ کبھی کوئی نوابزادی زنداں میں رہتے رہتے اگر اُکتا جائے تو جھروکے پہ آکر بیرونی دنیا کا نظارہ کر سکے، خود دیکھے اور خود کو دکھلا بھی سکے —— لیکن ایک نوابزادی نے جرأت کی تھی کہ وہ جھروکے پر آگئی تھی جس کی اُسے عبرتناک سزا بھگتنی پڑی تھی، جھروکے کا جو مقصد تھا اب ختم ہو چکا تھا اس لئے اب جھروکے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

جھروکے کی عمر اب پوری ہو چکی تھی، اَب اُسے گر جانا چاہئے تھا، ایک طرف جھروکا قدرے نیچے لٹک بھی آیا تھا —— جھروکا نواب کی خاندانی عزت اور وقار کی طرح پرانا ہو چکا تھا، جگہ جگہ ٹوٹ بھی گیا تھا، لیکن اس پر بھی نواب کی نام نہاد مٹی مٹی عزت کا اب بھی محافظ تھا —— لیکن اس کے نظریہ کے مطابق جھروکے کو اب گر جانا چاہئے تھا، کیونکہ جب بھی کوئی نوابزادی جھروکے تک آتی، چلمن کے نیچے۔ تاریکی میں سے ایک ہاتھ نمودار ہوتا، نظارہ کرتی ہوئی نوابزادی کی گردن پکڑتا اور پھر تاریکیوں میں ڈوب جاتا، جھروکے کی زندگی میں نہ جانے کتنے ہی ایسے مظالم ہو چکے ہونگے، نہ جانے کتنی بار تاریکیوں میں سے ہاتھ نکلا ہوگا اور پھر تاریکیوں میں ہی ڈوب گیا ہوگا۔ اتنے مظالم سہتے سہتے جھروکا وقت سے پہلے ہی کمزور ہوگیا تھا نہ جانے اس قدیم جھروکے کو اب کس گھڑی کا انتظار تھا اور وہ گھڑی اب کب آئیگی؟۔

لیکن ایک نہ ایک دن جھروکا گر جائیگا —— تھکے ہوئے ناتواں مزدور کی طرح ٹھوکر کھا کر جھروکا بھی گر جائیگا —— اور اَب اُسے گر بھی جانا چاہئے تھا، جب جھروکا گر جائیگا تو نواب کی نام نہاد عزت کی چولیں ہل جائینگی۔ نوابی وقار کا محل آناً فاناً ٹوٹ کر ڈھیر ہو جائیگا اور شاید اس صدمہ کو خاندانی زنداں بھی برداشت نہ کر سکے۔ قدیم زنداں کی دیواریں بھی ڈھ جائینگی —— اور ایک دن وہ بھی آئیگا جب یہ قدیم محل جو نواب کی آخری میراث ہے، جو عہدِ رفتہ کی آخری یادگار ہے گر جائیگا اور اس قدیم خاندانی زنداں کو گر بھی جانا چاہئے —— محل کی جگہ پر کھنڈر ہوگا اور ان گنت قیدیوں کی روحیں جو زنداں میں سسک سسک کر دم توڑ چکی ہیں اس کھنڈر کے اردگرد منڈلایا کرینگی —— اُن روحوں میں اُس نوابزادی کی

روح بھی شامل ہو گی جسے صرف اس قصور میں سزا دی گئی تھی کہ جھروکے سے جھانکنے لگی تھی ـــــ اُسے جھروکے سے انتہائی نفرت ہو گئی تھی اور اس کی یہی کوشش تھی کہ گرتے ہوئے جھروکے کو اب وہ نہ دیکھے ـــــ!

جھروکے کی لمبی زندگی میں نہ جانے کتنے ڈرامے کھیلے گئے ہونگے، ممکن ہے اس کی بقیہ زندگی میں کسی اور ڈرامے کے کھیلے جانے کا اُسے انتظار ہو۔ وہ ڈرامہ کب ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس ڈرامہ کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ کون بتا سکتا تھا ـــــ لیکن تاریخ خود کو دہراتی ہے آخر وہ وقت بھی آ گیا جب جھروکے کی زندگی کا آخری ڈرامہ بھی کھیلا گیا ـــــ!

اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ایک شام کو دھندلکے میں جھروکے پر پڑی ہوئی چلمن کو قدرے اٹھا ہوا پایا ـــــ اس نے غور سے دیکھا، ایک رنگین آنچل چلمن کے باہر تھا وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ پڑی ہوئی چلمن اُٹھ جائے اور یہی ہوا بھی، ایک حنائی ہاتھ نے چلمن اُٹھا دی۔ سامنے پرانے جھروکے پر ایک لڑکی گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، مدت کے بعد اجڑے ہوئے جھروکے پر زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ آ گئی تھی۔ خوبصورت لڑکی تھوڑی دیر کھڑی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، حنائی اُنگلیوں کو جنبش ہوتی رہی۔ رنگین آنچل اُڑتا رہا، حسین آنکھیں نظارہ کرتی رہیں۔ پھر وہ لڑکی چلی گئی۔ چلمن گر پڑی۔ جھروکا سونا ہو گیا تھا ـــــ آج جھروکا مدت کے بعد پھر ہنس رہا تھا ـــــ!

جھروکا اپنی پچھلی زندگی کو پھر دہرا رہا تھا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی جو آج جھروکے پر نظارہ کرنے آئی تھی موجودہ نواب کی لڑکی تھی ـــــ یہ سُن کر اسے نوابزادی کی ہمت پر حیرت ہوئی اس نے بڑی جرأت سے کام لیا تھا۔ وہ تہہ خانے سے اوپر جھروکے تک تمام بندشوں، رکاوٹوں کو توڑتی ہوئی آئی تھی، نوابزادی نے خاندانی بھاری زنجیروں کو توڑ دیا تھا، اس نے سسکتی ہوئی خاندانی عزت پر ایک اور ضرب لگائی تھی ـــ ابھی تہہ خانے کے ایک قیدی میں اتنی ہمت باقی تھی، ـــــ اس میں زندگی موجود تھی یہ دیکھ کر اُسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی ـــــ! نوابزادی روز آتی رہی، دن بدن اس کا خوف کم ہوتا گیا، لیکن خود اسکے خوف میں اضافہ ہوتا گیا، خوبصورت نوابزادی کو جھروکے پر دیکھکر وہ سہم جاتا، ایسا نہ ہو نواب کو خبر ہو جائے، پھر جھروکے کے پیچھے تاریکی میں سے ایک ہاتھ نکلے، نوابزادی کی گردن پکڑ لے اور پھر تاریکی میں کھو جائے ـــــ اور .... اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا!!۔

صبح اُس کی آنکھ کھلی تو سڑک پر غیر معمولی چہل پہل تھی، پھر اُس کی نگاہ خود بخود جھروکے کی طرف اٹھ گئی ـــــ وہاں دیوار میں بڑا سا شگاف تھا، رات جھروکا گر پڑا تھا، نوابزادی نے رات جھروکے پر سے چھلانگ لگائی اور پھر لاپتہ ہو گئی جھروکے کا ملبہ نیچے سڑک پر ڈھیر تھا ـــــ!

جھروکا گر چکا تھا، نوابزادی کہیں چلی گئی تھی، پرانے خاندانی محل میں بڑا سا شگاف ہو گیا تھا، نواب کی گردن جھک گئی تھی ـــــ نواب کی نام نہاد، خاندانی سسکتی ہوئی عزت پر یہ آخری اور بھاری ضرب تھی، جھروکا گرنے سے دیوار میں جو شگاف ہو گیا تھا وہ ہنس رہا تھا، بُری طرح سے اُس کی ہنسی میں تلخی تھی ـــــ وہ شاید نواب پر ہنس رہا تھا نواب کی دم توڑتی ہوئی خاندانی عزت پر، پرانے رسم و رواج اور خاندانی قدیم روایتوں اور بندشوں پر۔ شاید ہم پر ہنس رہا تھا ـــــ ـــــ شاید دنیا والوں پر بھی!!۔

شریف عنایت اللہ

آزادی کے بعد

سورج کی آخری کرنیں دنیا پر حسرت کی نگاہیں ڈالتی ہوئی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جا چھپیں۔ ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی۔ دن بھر کی تپش کے بعد اس وقت قدرے خنک ہوا کے چند جھونکے اپنے ساتھ ایک فرحت بخش اثر لئے گذرے۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی اور سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ کا دھواں بل کھاتا ہوا اوپر اٹھنے لگا اور میری نگاہیں نہ جانے کیوں ہوئیں کے ان چھوٹے چھوٹے حلقوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ ماضی کا دھندلا دھندلا نقشہ آنکھوں تلے پھرنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تخیل کے پردوں پر اڑا جا رہا ہوں۔ ایک آزاد پنچھی کی طرح۔ میری روح اس مادی دنیا کی بندشوں کو توڑ کر یہاں کی فرسودہ روایتوں اور ڈھکوسلوں کو روندتی ہوئی ایسی دنیا کی طرف اڑی جا رہی ہے، جیسے دھوئیں کے ان حلقوں کی دوسری طرف ایک نئی، خوبصورت اور آزاد دنیا آباد ہے، جہاں کے عناصر کسی کے محکوم نہیں، جہاں انصاف پائندہ باد ——— اور "انقلاب زندہ باد" ——— کے جھوٹے نعروں کے پردے میں تڑپتی ہوئی انسانیت کا گلا نہیں گھونٹا جاتا، غلاموں کے حقوق کے پرخچے نہیں اڑائے جاتے، سیاہ قوموں کو پیروں تلے نہیں روندا جاتا ——— اور پھر مجھے دھوئیں کے ان حلقوں میں ظلم اور دنیا کے اداس چہرے نظر آنے لگے۔ وہ میری طرف حقارت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی بے نور آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی، جو میری روح کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ میرے اردگرد تاریک دائرے رقص کرنے لگے۔ میرے دماغ میں کیڑے سے رینگنے لگے۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں میں غنودگی آنے لگی اور مجھ سے وہاں بیٹھا نہ گیا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھندلا سا سایہ میرے دماغ میں رقص کرنے لگا۔ غیر واضح ——— مبہم ——— اور پھر فوراً فوجی بینڈ کی گونج نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ مجھے اسی دنیا میں لا کھڑا کر دیا جہاں سے نجات کی تلاش میں، میں نے ایک سال تک خاک چھانی تھی، دربدر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ سکون کی تلاش میں سارے جہاں کی ٹھوکریں کھلانے کے بعد میری قسمت مجھے دوبارہ یہاں واپس لے آئی تھی۔ وہی سمندر کا ساحل تھا اور وہی تفریحگاہ کی گہما گہمی دن بھی تو وہی تھے ——— اگست کی ایک شام ——— آج ایک سال کے بعد فوجی بینڈ پھر فتح کے ترانے بجانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہاں کی حالت میں بہت کم تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ ملک کے اکثر حصوں سے عجیب عجیب خبریں آ رہی تھیں۔ کلکتہ میں ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ بمبئی کا بھی یہی حال تھا، جنگ کو ختم ہوئے ایک سال ہو گیا تھا، لیکن امن کی کانفرنسیں اب ہو رہی تھیں۔ دنیا کے مستقبل کا نقشہ اب تک تیار نہ ہوا تھا۔ انسانیت اب تک سسک رہی تھی۔ موت کی اب بھی سلطنت تھی غلامی کا اب بھی بول بالا تھا۔ آزادی نہ جانے کہاں منہ چھپائے خاموش بیٹھی تھی۔

سمندر کے نشیبی ساحل پر آج پھر چہل پہل تھی اور میں ایک طرف خاموش بیٹھا پانی کی مضطرب لہروں کو دیکھ رہا تھا ہر گھڑی ہر آن بڑی بڑی طاقتور موجیں رقص کرتی ہوئی آ کر ساحل سے مستانہ وار ٹکراتیں اور پھر چھوٹے چھوٹے دائروں میں منقسم ہو کر نہایت سست رفتار سے واپس لوٹ جاتیں۔ سامنے سورج غروب ہو چکا تھا، کچھ دیر میں جھومتے ہوئے بادلوں کی سرخی سیاہی سے بدل گئی۔ افق کے درخت اندھیرے میں چھپ گئے، پانی میں صرف ننھے منے تاروں کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ پاس ہی دو کتے ایک ہڈی کے لئے جھگڑنے لگے ——— اور ملٹری بینڈ پھر سمندر کے ساحل پر فتح کے

نغمے سُلنے لگا۔ آج پھر فتح کا دن تھا تا ــــــــ وکٹری ڈے !! نازسی جرمن کا گلا گھونٹا جاچکا تھا۔ دنیا کو مٹھی بھر جنوں کے پنجے سے آزادی دلوائی گئی تھی، جمہوریت کی پھر جیت ہوئی تھی۔ آج گورے آزادی کا سانس لے رہے تھے، یعنی دنیا آزادی کا سانس لے رہی تھی۔ آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دور تک نیچے آتا ہوا دکھائی دیا، گھڑی نے سات بجائے۔ سرد ہوا چلنے لگی ــــ خیالات پھر منتشر ہوگئے۔ آج مجھے بہت سی بھولی ہوئی باتیں اور صورتیں نہ جانے کیوں یاد آنے لگیں ــــ اسلم ــــ میرا روم میٹ، قائد اعظم کا پرستار، ہند کا ایک جگمگاتا تارہ ــ اُس نے ایک حادثہ میں جان دیدی۔ نیلی آنکھوں والی دینا بھی اسلم کے ساتھ ہے۔ کامریڈ دینا ہماری زندگی کی خاموشیوں میں ایک طوفان بنکر آئی اور ہم پر چھاگئی۔ وہ یہاں کے ہر نوجوان کے دل میں دھڑکن بنکر سماگئی، ایک سرد رات، لرزتے ہوئے فانوسوں کی روشنی میں اُسے تقریر کرتے دیکھ کر اسلم نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا ــ " ندیم ! جانتے ہو کائنات پر کس کی حکومت ہے ؟ صرف ایک چیز کی ــــ اور وہ ہے عورت اور مرد کی ازلی دوستی۔ عورت کے بغیر عالیشان ایوان بھی ویران دکھائی دیتے۔ کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں ندیم ! اگر مرد کے دل کے قریب عورت کا دل نہ دھڑکتا تو کتنی پھیکی ہوتی ہماری زندگی ــــــــ " اور فلسفی ندیم کی زبان اب خاموش ہوچکی ہے۔ اس کی دینا جس نے اپنے اصولوں کی خاطر ماں باپ کو ٹھکرایا تھا، جس نے لاؤ بالی اسلم کو صحیح راستے پر لا کھڑا کیا تھا۔ آج کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں میں نہ جانے کہاں روپوش ہے، کاش وہ یہاں ہوتی۔ کاش آج اسلم زندہ ہوتا آج پھر فتح کا دن ہے۔ دنیا پھر خوشیاں منا رہی ہے اور میں یہاں مُنھ چھپائے خاموش بیٹھا ہوں۔

"کیوں بابو صاحب ! آپ کا وقت کیا ہے ؟ " مدراسی آیا نے پوچھا، وہ شام سے ایک چھ سالہ بچی کے ساتھ میرے قریب بیٹھی سمندر کی تیز لہروں سے دل بہلا رہی تھی ــــ

" سات " میرے مُنھ سے نکلا۔ میں اب بھی اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

" پاگل معلوم ہوتا ہے !" ــــ کسی نے کہا اور پھر ایک زوردار قہقہہ۔ تصور کی لڑی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ ایسا محسوس ہوا گویا کوئی دنیا کے دوسرے سرے سے بول رہا ہو۔ میں پاگل ؟ یا معبود ! باغی کہلایا گیا۔ کُفر کا فتویٰ ملا ــــــ لیکن پاگل ؟ کون ہے یہ نامعقول ؟ ــــ ایک چھ سالہ بچی تھی، وہ اب بھی ہنس رہی تھی ـ " میں پاگل ہوں ؟ " میں نے پوچھا ـ " پاگل سے تو نظر آتے ہو، سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گریباں کھُلا ہوا ہے۔ شام سے ہی بیٹھے نہ جانے کیا بڑبڑا رہے ہو۔ امّی کہتی تھیں۔ پاگلوں سے دور رہنا چاہئے " اُس نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ " تمھاری امّی ؟ " ــــ میں نے پوچھا۔

" ہاں میری امّی، وہ بہت دن ہوئے ابّا سے ملنے چلی گئیں۔ جاتے وقت بہت سی باتیں کہہ گئی تھیں وہ یاد آ رہی ہیں۔ وہ کہا کرتی تھیں مجھے بڑی ہو کر بہت کچھ کرنا ہے۔ تم نے رضیہ کا نام سنا ہے ؟ وہ بہت بڑی تھیں اُنھوں نے ہزاروں لشیروں سے جنگ کی تھی، امّی کہتیں میں بھی بڑی ہو کر رضیہ جیسی بنونگی " وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، سمندر کی تیز ہوا اس کے باغی بالوں کو اور اس کے سفید فراک کو اڑائے جا رہی تھی، اس کی معصوم باتوں سے نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے عرصہ کے بعد میں نے سکون کا سامان پالیا ہو۔ مجھے خاموش دیکھکر اس نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا ــ " لو، پھر تم بڑبڑانے لگے اسی لئے تو میں نے تمھیں پاگل کہا تھا " وہ دوبارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ــ " اوہ۔ تم نے پھر مجھے پاگل کہا۔ گھبراؤ نہیں میں پاگل نہیں ہوں ــــــــ آؤ گی میرے پاس ؟ " ــــ میں نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ؛ اس نے اپنی معصوم نگاہوں سے حیرت کے ساتھ مجھے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی ــــ یہ ہے کون ؟ " مائی نیچے کھسک آئی ہے، کوٹ کاندھے پر ہے، پاگل سا نظر آتا ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں ــــ وہ مسکرانے لگی۔ اس نے آیا کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ ہنستی ہوئی شرماتی میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھالیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" ——— "روحی" اس نے جواب دیا۔

"امّی نہیں یاد آتیں تمھیں؟" ——— میں نے پوچھا۔

"یاد تو آتی ہیں لیکن کیا کروں، وہ مجھ سے دور جو ہیں، کبھی کبھی رات کو میں امّی، امّی پکارتی جاگ اٹھتی ہوں لیکن ان کے بجائے چچی میرے پاس ہوتی ہیں۔ چچی بھی بڑی اچھی ہیں۔ آپا بھی بڑی اچھی ہے" یہ کہکر وہ چپکے سے میرے گلے لگ گئی اور میں نے اُسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ گھبرائی ہوئی معصومیت کو محبت کے دامن میں پناہ مل گئی ——— "آپا! کون ہیں اس کی امّی؟" میں نے آپا سے پوچھا۔

"یہ پرتیما دیوی کی لڑکی ہیں بابو صاحب، نام تو سنا ہوگا آپ نے؟ ——— وہی کمار پکچرز ———" اور اس کی افسردہ آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے، میں نے تعجب سے روحی کو دیکھا، شہر کی مشہور ایکٹرس کو کون نہیں جانتا تھا۔ بمبئی کی سب سے بدنام ایکٹرس ——— جو اپنی بچی کی خاطر اپنے ظالم شوہر کو چھوڑ آئی تھی۔ ایک سال ہوا ایک موٹر کے حادثہ میں وہ چل بسی تھی!۔

"اور کیا کہا کرتی تھیں تمھاری امّی؟" میں نے پوچھا، وہ کچھ دیر خاموش میرے سینہ سے لگی رہی جیسے ایک عرصہ کے بعد اُسے سکون ملا ہو، پھر اس نے آہستہ سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا ——— "امّی؟ وہ بہت سی باتیں کہا کرتی تھیں۔ اللہ ایک ہے، محمدؐ اس کے رسول ہیں، ہندستان ایک دن ضرور آزاد ہوگا۔ مجھے بڑی ہوکر چاند سلطانہ اور فلورنس کی طرح بننا ہے۔ تم فلورنس کو جانتے ہو؟ یہ بہت بڑی عورت تھی ——— میری امّی سے بھی بڑی، یہ جنگ میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کرتی تھی" وہ خاموش ہوگئی۔

فوجی بینڈ نے ایک نیا نغمہ چھیڑا اور کُتّے پھر سے جھگڑنے لگے اور پھر مجھے اس کی ماں کا خیال آگیا۔ ایکٹرس، شہر کی بدنام ہستی، آج وہ اس دنیا میں نہ تھی، آلم کی طرح اس نے ایک حادثہ میں دم توڑ دیا تھا۔ اس کی بدنام زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ یہاں نہیں، لیکن یہاں سے جاتے وقت وہ ایک بچی چھوڑ گئی جو بڑی ہوکر چاند سلطانہ جیسی نڈر، سلطانہ رضیہ جیسی بہادر فلارنس نائٹ انگیل جیسی رحمدل بننا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی امّی کی یہی آرزو تھی۔ اس عورت کی یہی تمنا تھی جو دنیا کی نظروں میں ایک حقیر ایکٹرس تھی، ایک بدنام عورت تھی ——— آج جب فوجی بینڈ پھر فتح کے نغمے سنا رہا ہے اور جب ساری دنیا ہٹلر کی موت پر خوشیاں منا رہی ہے اور جب اس ایکٹرس کی اکلوتی بچی میرے سینے سے لگی خاموش ہے، مجھے نہ جانے کیوں اُس بدنام عورت کا خیال بار بار آ رہا ہے ———

پرتیما ——— اے دنیا کی بدنام ہستی، تو آج دنیا میں نہیں۔ آج جہان تیرے وجود سے پاک ہے، ورنہ شاید فتح کی خوشیاں تیری موجودگی سے کانپ اُٹھتیں، تیرا یہاں سے غیر حاضر رہنا ہمارے لئے اللہ کی رحمت سے کم نہیں۔ او کمزور عورت! بدقسمت ہے تو ——— کاش تو آج یہاں ہوتی، اپنی بچی کو تو دیکھ سکتی جو امّی کی امیدوں کی ایک کلی ہے۔ جو فلورنس بننے کے لئے بیقرار ہے ——— پرتیما! تجھ میں برائی ضرور تھی، لیکن تو آجکل کی تتلیوں سے کہیں اچھی تھی، ان تتلیوں سے جن کے لئے بناوٹ سب کچھ ہے، اسنو، پاؤڈر اور حسن کی نمائش جن کی زندگی ہے۔ تو اُن سب سے بڑی ہے کیونکہ تو نے سماج سے بغاوت کی، خود بُری زندگی گذاری، لیکن یہاں سے جاتے وقت تو نے ایک ایسی ہستی چھوڑی ہے جسکی رگ رگ میں تیری آرزوئیں، تیرے ارمان، تیری نصیحتیں بسی ہوئی ہیں، جو بڑی ہوکر تتلی بننا نہیں چاہتی، بازارِ حسن کی پری بننا نہیں چاہتی، پردۂ سیمیں پر چمکنے والی ایکٹرس بننا نہیں چاہتی جو فلورنس نائٹ انگیل بننا چاہتی ہے، جو سلطانہ رضیہ بننا چاہتی ہے، چاند بی بی بننا چاہتی ہے۔

——— لیکن یہ کل کی باتیں تھیں۔ آج فتح کا دن ہے، فوجی بینڈ اب تک فتح کے نغمے گا رہا ہے، نازی جرمنی کا گلا

گھونٹ دیا گیا ہے ۔ دنیا ظالم ہٹلر کے پنجے سے آزاد ہے ۔ آج فرانس آزاد ہے ، یونان آزاد ہے ، سارا یورپ آزاد ہے ۔ جمہوریت کی جیت ہوئی ۔ آج گورے آزادی کا سانس لے رہے ہیں ، یعنی دنیا آزادی کا سانس لے رہی ہے کیا ہوا جو کالے ابھی غلام ہیں ـــــ کیا ہوا جو انسانیت ابھی تڑپ رہی ہے ، کیا ہوا جو چالیس کروڑ غلاموں کا مستقبل ـــــ ان کے رنگ کی طرح سیاہ ہے ۔ غیر مہذب جنگلیوں کا غلام ہی رہنا بہتر ہے ـــــ انقلاب زندہ باد ـــــ جمہوریت کی جے ہو ـــــ آج خوشی کا دن ہے ، کل کی باتوں پر کیوں روؤں ، گذرے ہوئے زمانے سے اب کیا حاصل ۔ اب پچھلی ساعتوں کا غم کرنے سے آخر فائدہ ہی کیا ـــــ جو گذرا سو گذر گیا ، جو آج ہے وہی زیادہ اہم ہے آج یورپ ہم سے خوش ہے ، روس ہم سے خوش ہے ، ساری دنیا ہم سے خوش ہے ۔ ہم نے مصر کی لڑائی جیتی ہے برما میں فتح حاصل کی ہے ، ساری دنیا کی لڑائی جیتی ہے ۔ یہاں تیس لاکھ بنگالیوں کا گلا گھونٹا ہے ، غریبوں کا خون چوس کر خزانے بھرے ہیں ـــــ پھر غم کیسا ؟ ـــــ " اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو " ـــــ جھوٹ ـــــ فریب ـــــ شاعر پاگل تھا ـــــ " غریبوں کو جگا دو " ـــــ جیسے غریب جاگنے کے لئے تڑپ ہی تو رہے ہیں ۔ دنیا امیروں کی ہے اور امیروں کی رہیگی ـــــ انقلاب پائندہ باد ـــــ زندہ باد سرمایہ پرست !!

فوجی بینڈ اب تک فتح کے ترانے سنا رہا ہے اور لڑکی اسی طرح میری گود میں خاموش لیٹی ہے اور دو کتے اب تک ایک ہڈی کے لئے جھگڑ رہے ہیں ـــــ اندھیرا ہو گیا ، لوگ واپس ہو رہے ہیں ، ساحل کے مکانات ، دور پہاڑی پر درختوں کے جھنڈ سب آہستہ آہستہ تاریکی میں غائب ہو رہے ہیں ، بالکل اس طرح جیسے میری امیدوں کے شجر ، زندگی کی روشنی ، تمناؤں کا شور ناامیدی کے اندھیرے میں رفتہ رفتہ تحلیل ہو جائے ـــــ ڈوب جائے ـــــ !

ـــــ اور ملٹری بینڈ اب تک فتح کے نغمے سنا رہا ہے ـــــ آج پھر وکٹری ڈے ہے نا !!!

اکالی گُربچن سنگھ

وحشی

وہ لڑکی جو بڑے دلار پیار سے پالی گئی ہو۔ وہ لڑکی جو جوانی تک ماں باپ کے سر کا بار بنی رہی ہو اور پھر اپنے سسرال کی شوبھا بن جائے، یہ باتیں عجیب ہو کر بھی عجیب نہیں لگتیں، لیکن پھر بھی ایک ایسی ہی لڑکی کے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ جب کبھی وہ سسرال سے کچھ دنوں کے لئے میکے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس گھر میں پھر سے بہار آگئی ہے، گھر کے لوگوں کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے اُجڑی ہوئی دنیا دوبارہ آباد ہوگئی ہے۔ ماں باپ، عزیز و اقارب اور گھر سے دور چلی جانیوالی لڑکیوں کے دل بھی کتنے قوی اور مضبوط ہوتے ہیں، وہ ہر قسم کے حسرت و آلام کو سہنے کی زبردست طاقت رکھتی ہیں: بچپن زندگی کی ہر کروٹ کو بڑے استقلال سے بدلتی رہتی ہیں۔ یہ بھی کچھ عجیب سی باتیں ہیں۔

ایک وہ گھر ہے جس میں کہ ایک زمانہ ہوا وہ پیدا ہوئی تھی، پروان چڑھی تھی، کھیلی کودی اور پھر ایک دن اُس گھر سے علاوہ کہیں دوسری جگہ ایک اور ہی دنیا بسانے کے لئے بھیجدی گئی۔ یہ جو کچھ بھی ہے سب عجیب سا لگتا ہے۔ ازدواجی زندگی کی یہ کیفیتیں، یہ رسم و رواج، یہ سب ایسے کھیل ہیں جن میں تقریباً ہر ایک کو شامل ہونا پڑتا ہے۔ پھر موہنی کی کہانی لوگوں کو پیاری لگے گی بھی تو کیسے ..... اسے کیسے بیان کیا جائے، وہ بھی شادی بیاہ ہی کی بات ہے۔ اس نے ایک دن ماں باپ کے گھر جنم لیا، بچی تھی، بچی سے جوان ہوئی اور شادی کے بعد عورت ..... عورت ......!

عورت کو جنم سے لیکر موت تک نت نئے روپ بدلنے پڑتے ہیں، نئی نئی باتیں سیکھنی پڑتی ہیں، دنیا دیکھنی ہوتی ہے اور پھر شادی ..... شادی ہی تو اُس کی عزت ہے، اُس کی زندگی، اُس کی رہبری اور اُس کی پاک زندگی قرار دیجاتی ہے زندگی اسی منزل پر پہنچ کر اُسے بننے سنورنے یا برباد ہوجانے کا موقع ملجاتا ہے کیسی عجیب باتیں ہیں یہ .....! پھر موہنی ..... موہنی بیچاری کی کہانی کسی کو پیاری لگے گی بھی تو کیسے؟

ہاں تو جس دن وہ سسرال سے میکے واپس آئی، بجائے لوگوں سے مل کر خوش ہونے کے ایک خاموش سی اداسی اُس پر چھائی ہوئی تھی، ایک بیکراں سناٹے کی سی کیفیت، ایک ویرانی اُس کی چنچل آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی .....! اور جس طرح چند ایک لڑکیاں میکے آکر پہلے سے کچھ زیادہ سیانی باتیں کرنے لگتی ہیں، وہ ولولہ، وہ جوش اور وہ چلبلاپن جو ہر ایک نیا روپ اختیار کرلیتا ہے .... وہ بھول چکی تھی، موہنی بیچاری جیسے اُسے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ ایک مرجھایا ہوا پھول جس میں خوشبو اور خوبصورتی کے آثار نمایاں تھے، لیکن تازگی یا زندگی کی حرکت فنا ہوچکی تھی۔ کسی فکر میں کھوئی ہوئی کچھ اجڑی سی نظر آتی تھی جیسے اُس نے تاریکی میں، دنیا کے دُکھ اور درد کے اندھیرے میں، کسی ٹمٹمانے والی اُس شمع کی طرح جنم لیا ہو جسے کلفت اور پریشانی کا ہر ایک جھونکا گل کر دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

موہنی کی بوڑھی ماں سوچا کرتی تھی ـــ بیٹی کی زندگی اتنی سوگوار..... بیٹی کا دل اس قدر بیزار ـــ آخر یہ سب کس کی بدولت؟ کیوں ..... یہ سب کیوں ہوتا ہے.......؟ پھر بھی اُسے تقدیر کا لکھا منظور تھا، اُس پر اُسے اعتماد تھا، وہ سوچتی تھی مقدر میں لکھا تو پتھر کی لکیر ہے، مٹائے مٹ نہیں سکتا، اس کے سوا دنیا میں جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہتا ہے۔

لوگ اس پر زیادہ سوچ نہیں سکتے، اس سے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ بھی نہیں سکتے، کیونکہ خود بوڑھی ماں صرف اتنا ہی سمجھ سکتی تھی۔

آج بنارس سے آئے موہنی کو پانچ دن بیت چکے تھے، اس عرصہ میں پتی دیو نے اُسے تین خط روانہ کئے تھے، خطوں میں شکایت تھی شکوہ تھا، جیسے انہیں اس سے بےحد محبت ہے، دل سے چاہتے ہیں، قربان ہوئے جاتے ہیں، ایک پل بھی موہنی کے بغیر کٹنا دوبھر ہو گیا ہے، دن کو چین نہیں، رات کو آرام نہیں، تین خط آ چکے تھے، جن میں شکووں کا حشر بپا کیا گیا تھا، لیکن موہنی ان خطوں کو پڑھنا تک نہیں چاہتی ...... وہ موجودہ دور کے اس فیشن کو جانتی تھی۔

ماں نے ایک دن دبے لہجہ میں پوچھا "آجکل اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے موہنی؟"

"طبیعت کو کیا ہوگا ماں ......" موہنی صرف اتنا بولی، بے اختیار اُس کی نظریں اپنی مرجھائی اور سوکھی انگلیوں پر جا پڑیں، کچھ دنوں پہلے انہیں انگلیوں اور اس کلائی کی رنگت کیسی تھی، جسم میں لہو کی نالیاں سوکھ چکی ہیں۔ ان میں اب کوئی طاقت نہیں، جسم کی چربی پگھل پگھل کر تن کی خوراک بنتی جا رہی ہے، اس طرح خوبصورت جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے..... جو ہونا ہے مجھے ہوگا، کسی کی طبیعت کو کیا ہوگا، وہ زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ ماں نے اُس سے ایک سوال کیا تھا، اُس نے اس کا جواب دیدیا..... بس!۔

لیکن ماں نے آج سے پانچ سال پہلے موہنی کی شادی ایک ایسے گھرانے میں رچائی تھی جو کہیں دور کے رہنے والے تھے قریب ہی کے ایک شہر میں اُنھوں نے ایک دو مکان کرایہ کے لے رکھے تھے، گھر میں گذارہ کے لئے سب کچھ تھا، ایک ایسا گھر جسے لوگ کھاتا پیتا گھرانہ کہتے ہیں۔ لوگ ایسے گھرانوں کی بڑھ چڑھ کر تعریف کیا کرتے ہیں، تو موہنی کے گھر والوں نے بھی کچھ ایسی ہی تعریفیں سنی تھیں۔ لوگ کہتے تھے اُن کا گھرانہ ہی ملنسار ہے، بڑے ہی حلیم الطبع لوگ ہیں وہ۔ پاس پڑوس کے لوگ اُن کے گن گاتے ہیں، تعریفیں کرتے ہیں۔ لڑکا سیانا ہے، کام کاج کا ستھرا، ہنرمند، مہینہ میں ڈیڑھ دو سو کما لیتا ہے باپ کی کمائی علحدہ۔ گھر کے سب لوگ اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ ایک دن انہیں تعریفوں کو سنکر بیچاری موہنی اُنکے حوالے کر دی گئی تھی۔ پھر اب ایک دن خود موہنی اُس گھر کی تعریفوں سے خود واقف ہو گئی، پتہ چلا۔ لڑکا جاہل ہے، بمشکل خط لکھ سکتا ہے، جواری ہے، شرابی ہے، کوٹھوں کی ہوا کھاتا ہے، نت نئے بھید کھلنے لگے۔ بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا تھا وہ، پھر یہ سب تو تعریفیں تھیں۔ تعریفیں بھی بہت طرح کی ہوتی ہیں نا.....!

بیاہ کے بعد گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ کچھ دن سسرال رہ کر جب موہنی گھر واپس آئی تو اُسے اپنا یہ پرانا گھر بہت اُس سے اچھا محسوس ہوا۔ وہ گھر جو کہ جہنم سے بدتر تھا، یہ گھر، یہاں تو وہ پیدا ہوئی تھی، پروان چڑھی تھی، یہاں کے ہر ذرہ سے اُسے اُنس و محبت تھی ..... رہ رہ کر بہانے تراشتی تھی، وہ اُس گھر میں نہیں جانا چاہتی تھی ..... وہ جہنم تھا، جہنم!۔

ایک دن وہ گھر والوں سے چیخ کر بولی "میں زہر کھا کر مر جاؤنگی، لیکن بھول کر بھی اُس گھر میں قدم نہیں رکھونگی" سبھوں کو حیرت ہوئی، سمجھانے لگے، اس طرح خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے، یہ بُری بات ہے، بڑی بدنامی ہوتی ہے اس حرکت سے، کچھ عقل سے کام لو کہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں گے ہم سب۔

بدنامی سے زیادہ اُسے اپنی بےبسی پر دُکھ تھا، اپنی حالت پر، اُسے خاوند کے روپ میں شیطان نصیب ہوا تھا شیطان بہت برا ہوتا ہے، پھر وہ شیطان جو کہ انسان کے روپ میں ہو، وہ شیطان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی، وہ مرنا چاہتی تھی، وہ ہمیشہ کی کشمکش سے چھٹکارا پا جانا چاہتی تھی۔ موہنی کہتی رہی "میں مر جاؤنگی لیکن اس گھر میں قدم نہیں رکھونگی، وہ بیوقوف ہے، جاہل ہے، شرابی ہے" سُن سُن کر گھر والے حیرت میں پڑ گئے...... وہ ساری باتوں کو نہ سمجھ سکے۔ وہ

بول رہی ہے کس دکھے ہوئے دل کی آواز ہے یہ ...... کیوں ایسا بول رہی ہے وہ ..... سب سنتے رہے ...
...... وہ بولتی رہی ...... ! لیکن ماں اُن دنوں کو نہیں بھول سکی، اُسے موہنی کی زندگی کا تلخ تجربہ حاصل نہیں، پھر وہ بھی عورت تھی، ایک عورت جو کہ بیاہی گئی ہے، اُسنے بھی دنیا دیکھی تھی، جوانی کے دن بتائے تھے، بڑھاپا سر پہ رہا تھا، ماں کو وہ دن اب بھی یاد ہیں جبکہ بڑی شکلوں کے بعد موہنی کو اُس کے سسرال والوں کے پنجہ سے بچا کر سینکڑوں یم خرچ کرنے کے بعد آخر اُسے گھر ہی میں رکھ لیا گیا تھا، یہ ایک بغاوت تھی، دنیا داری کے قابل تردید رسم و رواج کے ن، جھوٹی تعریفوں اور غلط حرکتوں کے خلاف، لوگوں نے اسے بہت بُرا سمجھا تھا۔ ماں کو یاد ہے اپنے رشتہ داروں میں ہور کر دیا گیا تھا کہ لڑکی بیوہ ہوگئی ہے، اُس کا خاوند ریل کی ٹکر کے حادثہ میں بے موت مرا ......!۔

پھر ایسی بیوگی کے دو سال بعد اُسے ایک ایسے نوجوان کے ساتھ سونپ دیا گیا جس کی تعریف میں سنا تھا کہ وہ ایک ہزار روپے ا ہے، بڑا آزاد خیال آدمی ہے، پہلے ایک شادی کر چکا ہے، پہلی بیوی ابھی تک زندہ ہے۔ لیکن اُس بیوی کو چھوڑ چکا ہے ہ وہ جاہل تھی گنوار تھی اور بے سلیقہ، اب اُسے ایک عورت کی ضرورت تھی، جو خوبصورت ہو تعلیم یافتہ ہو، گھر کے سارے جانتی ہو، سلیقہ شعار ہو، ہر اچھی عورت کے سے اوصاف اُس میں پائے جاتے ہوں، ماں کو یاد ہے موہنی ایک دن پھر دلہن بنا کر دی گئی تھی، اس شہر سے دور بنارس ......!۔

بنارس سے آئے اُسے آج پانچ دن بیت چکے تھے، ان پانچ دنوں کے عرصہ میں تین خط آ چکے تھے، خط میں بار بار نی کو واپس چلی آنے کو کہا گیا تھا، ماں دولہا کے اس تقاضے پر حیران تھی، وہ آخر لڑکی کو اتنی جلد پھر سسرال کیونکر روانہ ے، موہنی اپنے دل میں کیا سمجھتی ہے، وہ کیا سوچتی ہے۔

ماں نے کچھ اُسی انداز میں کہا گویا وہ موہنی کے دل کی ٹوہ لے رہی ہے "بیچارہ اکیلا ہوگا....."

"ہوں ....!"

"بغیر تمہارے اُس بیچارے کا دل بھی تو نہیں لگتا....."

اب موہنی امنڈتے ہوئے طوفان کو کیونکر روک سکتی تھی۔ اُس غم و اندوہ کے طوفان کو جو اُس کے دل میں امنڈتا چلا تھا کتنی رُکھائی سے وہ بولی "ہاں موم کا دل ہے نہ بیچارے کا"

"تم اُسے لکھ بھیجو کہ یہیں آ جائے"

پھر کس قدر حقارت سے منہ پھیرتی ہوئی موہنی بولی "اور یہ بھی کہوں کہ ساتھ ایک درجن کے قریب بچے اور ن مکوڑوں کی خوراک بھی لیتا آئے"

ماں کچھ سمجھ نہ سکی "کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہ پہلی بیوی اور بچوں کو بھی یہیں لے آئے تو ہاں اچھا ہی ہوگا"

"پہلی بیوی...." ماں کو کچھ تعجب ہوا "کیا جسے وہ چھوڑ چکا ہے؟"

"ہاں ایک درجن بچے پیدا کرنے کے بعد، اب اُس میں کیا رہ گیا ہے، دمہ کا شکار بنکر رہ گئی ہے، قدم قدم پر ڈولتی ہے ٹھتے بیٹھتے ہانپتی ہے، بیٹھے بیٹھے اوندھے منہ گر پڑتی ہے، اُسے کس کے سہارے چھوڑ آئے، کہو تو اُسے بھی ساتھ لیتا آئے"

کے خیالات کی اونچی مینار چشم زدن میں مسمار ہوتی نظر آئی، وہ کیسی باتیں سن رہی تھی بیٹی کے منہ سے "کیسی باتیں کر رہی ہو ی اور اب تو...... تمہارے بھی پورے دن ہونے کو آئے"

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

افسانہ
رحمٰن مذنب

بھوکی اُمنگ

رحیم نے خط بناتے بناتے استرا روکا، چہرہ پیچھے موڑا اور آواز دی، "بھابی!"

"کیوں؟"

"۵ بج چکے ہیں، آپ جھٹ تیار ہو جائیے، ورنہ پکچر رہ جائیگی!"

"صبر کرو! ابھی وہ بھی آتے ہونگے۔ انھیں بھی ساتھ لے چلیں گے"

"اونہہ، پھر تو ہم جا چکے! بھائی جان نہ خود پکچر دیکھنے جائیں گے، نہ ہمیں جانے دینگے، وہ سب کو اڈورڈ پارک لے جائیںگے"

"نہیں، میں انھیں پکچر کے لئے منا لونگی"۔

"بس منا لیا آپ نے!"

رحیم نے چہرہ سیدھا کیا اور اپنے پروگرام میں گڑبڑ دیکھکر ہلکی سی آہ بھری، پھر وہ پھرتی سے حجامت بنانے لگا، ہنگامی پریشانی کے سبب اس کے ذہن میں خلا پیدا ہوگیا، بھابی نے اسے مایوس کر دیا۔

جوان اور ناز کی انتہا فیروزہ میں بلا کی جنسی جاذبیت تھی اور رحیم اس سے اندرونی طور پر بری طرح متاثر تھا، رشتے کی نزاکت، سماج کا رواج اور اخلاق کا کڑا ہاتھ اس کے جذبات کی بیباک راہیں مسدود کئے رہتا۔ اس سے جہاں تک بن پڑتا، دل کی بھڑکتی آگ کو دبائے رکھتا، لیکن کبھی کبھی شعلے باہر لپک آتے۔ سماجی درندہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے نفس پر پوری طرح قابو پانے سے معذور تھا، تجرد اور شباب کی بے پناہ ضرورتوں کو یکسر مسترد کرنا کم از کم اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ شرم و حیا اور کم فرصتی کے باوجود بھی اس کے دل کی تیز دھڑکن مدھم نہ پڑتی، اکیلے میں اس کی للچائی ہوئی نظریں اکثر فیروزہ کے دلربا سراپا پر پھیل جاتیں، ایسے میں اس کی زبان سے بے اختیار تعریف کے کلمات نکل جاتے:

"آپ پر یہ زردیں ساڑھی بڑی پھبتی ہے"۔

"آج مانگ نئے انداز سے نکالی ہے"

"دیکھوں، ذرا؟ آپ نے کونسا سنٹ لگایا ہے؟ بڑی نفیس خوشبو ہے اس کی"

"آپ کی گول کمرے والی تصویر مجھے بڑی پسند ہے"

"لائیے، میں کلائی پر گھڑی باندھ دوں!"

فیروزہ یہ سب باتیں سنتی اور دل ہی دل میں ہنس دیتی۔ ان باتوں سے جلتی ہوئی روح کی بو آتی تھی، وہ خود پیاسی نہ تھی، اس لئے اسے رحیم کی پیاس سے ہمدردی نہ تھی، وہ رحیم کی پیاس کا سبب جانتی تھی، لیکن کیا کر سکتی تھی، اب وہ زمانہ نہ رہا جب آریا قوم کا قانون اس ملک میں رائج تھا۔ فیروزہ بے بس تھی۔

رحیم کو کسی حد تک یقین آگیا کہ اسے تنہا پکچر دیکھنے جانا پڑیگا، وہ تنہا نہ جانا چاہتا تھا، اس کی دلی خواہش تھی کہ فیروزہ اس کے ہمراہ چلے، کیونکہ ایسی صورت میں رحیم کے لئے قدرے جنسی تسکین کا موقع تھا، ویسے بھی ایک سے دو بھلے، اس سے فیروزہ بھی معترض نہ ہوتی، کیونکہ اس مہذبانہ اختلاط کو اس کی فطرت بخوشی قبول کرنے کے لئے آمادہ تھی۔ ہاں، اسکی توجہ

خانگی امور کی طرف بھی ضرور رہتی؛ وہ صرف عورت ہی نہیں بلکہ بیوی بھی تھی۔

رحیم کے اعصاب میں غصے کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی، اس نے عجلت کے مارے استرے کی رفتار پہلے سے دگنی کر دی، ابھی دو چار ہی ہاتھ مارے تھے کہ استرا کھٹ سے ٹھوڑی کی دائیں نوک پر بیٹھ گیا، خون کی گرم گرم بوندیں ٹپکنے لگیں۔

فیروزہ نے دیکھا تو وہ بے دار ہو کر چلا اٹھی "ارے، خون!"

"جی ہاں، خون!"

فیروزہ غیر نہ تھی، پتھر کی مورتی نہ تھی، انسانیت کے عام تقاضوں سے بے بہرہ نہ تھی، وہ عورت تھی، اس کے کمزور دل پر چوٹ لگی، رحیم کو مجروح دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر کے کمرے میں گئی اور ڈیٹول کی شیشی اٹھا لائی۔

"یہ لو، اسے لگا لو!"

فیروزہ نے ہمدردی کے طور پر شیشی آگے بڑھا دی۔

"اوہ شکریہ!"

کتنی تسکین کا سامان تھا، فیروزہ کی اس ذرا سی ہمدردی میں! جیسے کسی نے جلتے ماتھے پر برف رکھ دی، درد غائب ہو گیا البتہ خون کی بوندیں ٹپکتی رہیں، رحیم نے ڈاٹ گھمایا اور شیشی کھولی، تیز تیز بو اس کے نتھنوں میں سرایت کر گئی لیکن اس نے اسے فیروزہ کا عطر سمجھا۔ اس نے ڈیٹول کی دو تین بوندیں انگلی پر ٹپکائیں اور زخمی ٹھوڑی پر مل لیں۔

فیروزہ اپنی نرم نرم انگلیوں سے رحیم کی ٹھوڑی اٹھا کر بولی "معمولی سی خراش ہے"

"جی ہاں، معمولی سی خراش ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں"

رحیم کی ٹھوڑی فیروزہ نے زخمی کی تھی؛ وہی اب اسے اچھا کرنے میں پوری ذمہ داری سے امداد پہنچا رہی تھی، رحیم نے فیروزہ کو مائل کرم دیکھ کر ایک بار پھر سینما جانے کی دعوت دی۔

"رحیم! انھیں آ لینے دو! پھر سب کام ٹھیک ہو جائیگا"

"بھابی! یہ کہیئے کہ پھر سب کام بگڑ جائیگا!"

"تم تو بلا کے بے صبرے ہو"

بھابی رحیم کے پاس سے چلدیں اور باورچی خانہ میں جا کر کام کرنے لگیں۔ انھیں بالو شاہیاں اور چائے تیار کرنا تھی، رحیم اس جوڑ توڑ میں تھا کہ بھابی ایکدم ہاں کر لیں، اس کے ہمراہ سینما جانے کے لئے، ابھی تک دلی دور تھی!۔

رحیم نوجوان تھا اور بن بیاہا؛ ایک کریلا، دوسرے نیم چڑھا۔ اسے آوارگی کا عارضہ تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا۔ اس بنا پر بھابی اور بھائی جان اسے اکثر ٹوکتے، لیکن بے سود۔ آندھی کی زد سے پیڑ نہیں بچتے۔ رحیم وقت کے بیڈھب تقاضوں سے مجبور تھا، حسب معمول وہ ہر صبح منھ اندھیرے جمنا کی سیر کو نکل جاتا۔ اس سیر سے طبی اصول کا کوئی تعلق نہ تھا، وہ صرف دل اور آنکھوں کی پیاس بجھانے اور اپنی بھوکی امنگوں کی پرورش کے لئے ایسا کرتا۔ سیر سے واپس آکر ۹ بجے دفتر جاتا۔ شام کے وقت سینما یا کناٹ پلیس کے چکر کاٹتا۔ اور اگر کبھی بھابی اور بھائی جان کی پکڑ میں آجاتا تو اسے اڈورڈ پارک جانا پڑتا۔ اسے چلنے پھرنے کی بڑی مشق تھی اور وہ ہمیشہ اسی میں خوش رہتا۔

رحیم، گھر پر، کچھ نہ کچھ وقت بھابی کی صحبت اور ریڈیو سننے میں ضرور گزارتا۔ اس کی خوش قسمتی سمجھئے کہ بھابی سینما کی بڑی شوقین تھیں لیکن ان کا یہ شوق رحیم کی طرح بیماری کی حد تک بڑھا ہوا نہیں تھا، وہ بالعموم رحیم کے ساتھ سینما چلی جاتیں، لیکن وہ ہمیشہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ رحیم تو سینما کا عاشق تھا؛ وہ سردی، گرمی، دھوپ، بارش، دن رات، ہر وقت سینما چلا جاتا۔

[illegible] کر اس وحشت کا ساتھ دیتیں، وحشی کے ساتھ وحشی بننا سہل نہیں نہیں رحیم کا شوق پورا کرنے کی خاطر وہ اپنی خانگی مصلحتوں اور ازدواجی مطالبوں کو یکسر بالائے طاق رکھنے کے لئے تیار نہ تھیں، یہ لازم نہیں آتا کہ وہ رحیم کے ساتھ سینما چلنے انکار نہ کریں، یہ صرف انکی اپنی مرضی پر موقوف تھا کہ وہ جب چاہیں "ہاں" اور جب چاہیں "نہیں" کردیں۔ ان کی مرضی پر رحیم کو اختیار کا حق نہ پہنچتا تھا۔

رحیم آج پکچر دیکھنے کے لئے بیقرار تھا، اس کی جیب تنخواہ کے نوٹوں سے بھری تھی۔ اگر بھابی جائیں، تو غم نہیں، آج وہ دو چار نوٹوں کی قربانی کردے گا ـــــــ اپنی خاطر نہیں، بھابی کی خاطر۔ انھیں جی بھر کے آئس کریم کھلائیگا، دمشو اور رس بھری پلائیگا، باکس میں، اپنے ساتھ بٹھائیگا۔

آج بھابی خواہ کتنی ہی ضد کرتیں اور وہ رحیم کے اللدار بھائی کی بیوی ہی کیوں نہ تھیں، لیکن وہ انھیں آج ایک پائی بھی خرچ نہ کرنے دیتا، مگر افسوس کہ اس کے دل کا ارمان دل ہی میں رہتا دکھائی دے رہا تھا۔ بانس نہ ہو تو بنسری کہاں بجے۔

رحیم کو اندازہ ہوگیا کہ بھابی کی نیت ڈانواڈول ہے، ہاں اگر وہ ایک دم حامی بھر لیتیں تو پھر معاملہ صاف تھا، لیکن انھوں نے جو بھائی جان کے آنے اور انھیں ہمراہ لیجانے کی شرط نکالی ہے تو یہ جھوٹی بات ہے، بھائی جان سینما کی اسکیم تلپٹ کردیں گے کیونکہ انھیں اس سے چنداں دلچسپی نہیں۔

رحیم کے لئے اکیلا سینما جانا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بھابی کا ساتھ چاہتا تھا، لیکن وہ اسے ٹال گئیں، ان کا بھی کیا ٹھکانا! وہ اس کے بڑے بھائی کی چہیتی بیوی تھیں۔ بیوی کی ذمہ داریاں، بھابی کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ تھیں۔

فیروزہ نے محسوس کیا کہ اس کے انکار سے رحیم کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے، اسے رحیم کی پُرملال کیفیت پر ترس آگیا۔ بھابی کے مقابلہ میں رحیم کی زندگی کتنی تشنہ اور کتنی کھوکھلی تھی!۔

رحیم سینما جانے کے لئے اس وقت بری طرح فیروزہ کا محتاج تھا۔ بھابی کو اس کا احساس تھا۔

"رحیم! تم شادی کرلو! میں تمھیں اچھی سی دلہن لا دونگی"

"دلہن؟"

"ہاں، دلہن ـــــــ بڑی خوبصورت، بڑی سلیقہ والی اور پڑھی لکھی، وہ تمھیں خواہ مخواہ اپنا کرلیگی"

"بھابی! تجویز تو آپ کی بڑی پیاری ہے، لیکن ناقابل عمل ہے"

"کیوں، یہ کس لئے؟"

"میری تنخواہ لے دے کے ۸۰ روپے ہے، مہنگائی اور کنوینس شامل ہے، اس میں بیوی کی گنجائش نہیں"

"یہ تم نے غلط کہا"

"کیسے؟"

"کفایت شعاری سے میاں بیوی گزارہ کرسکتے ہیں"

رحیم کو اس بات پر ہنسی آگئی، اس نے پالش لگاتے لگاتے بوٹ کو ذرا نیچے رکھ دیا اور وہ پوری طرح فیروزہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بھابی چراغ تلے اندھیرا"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ آپ اور بھائی جان، ماشاءاللہ، بڑے کفایت شعار ہیں، ان کی تنخواہ ۳۰۰ روپئے ہے، عنقریب ہی وہ سپرنٹنڈنٹ ہو جائیں گے۔ نہ موٹر ہے، نہ تانگا، سائیکل ہے، سو وہ بھی بادۂ دم کے وقتوں کی، گھر میں نہ نوکر ہے، نہ ماما، ایک چھوکرا ہے اوپر کے کاموں کے لئے، اتنا ہاتھ کھینچنے پر بھی آپ کا صرفہ اڑھائی سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں بیٹھتا۔ ابھی میرے ۵۰ روپئے الگ ہیں؟"

"رحیم! تم فلسفی ہو، عملی آدمی نہیں"

"شاید"

"شاید نہیں، بیشک، سوچتے زیادہ ہو کرتے کم ہو۔ یہ بزدلوں کی نشانی ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، اسے مذاق نہ سمجھنا، ہم چاہیں تو دونوں مل کر ۸۰ روپئے میں گزارہ کر سکتے ہیں"

"کیسے؟ اڑھائی سو تو ہر مہینے آپ کے اٹھتے ہیں"

"یہ اس لئے کہ ہماری آمدنی ساڑھے تین سو کی ہے۔ ویسے ہم ۸۰ روپئے سے کام چلالیں گے"

رحیم قائل نہ ہوا، اس نے بوٹ اٹھایا اور مخمل کے ٹکڑے سے چمکانے لگا۔

"رہنے دیجئے، بھابی! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں"

"یہ محض تمہارا خیال ہے، ۸۰ روپئے میں پورا پڑ سکتا ہے"

"اگر آپ مجھے ایسا کر دکھائیں تو میں ضرور شادی کر لوں گا"

"منظور"

"مجھے بھی سولہ آنے منظور ہے"

"رہی؟"

"ہاں، رہی"

"پھر سوچ لو!"

"خوب سوچ لیا"

"یہ شرط ہے"

"ہاں، شرط ہے"

"زبان سے پھر نہ جانا!"

"ہرگز نہیں"

"اچھا تو پھر آنے والے مہینے میں ہم تمہیں ایسا کر دکھائیں گے"

"دیکھیں گے"

"دیکھ لینا"

رحیم کو دلہن کی ضرورت تو تھی، لیکن اس کے ۸۰ روپلی میں، اتنی سکت نہ تھی کہ وہ یہ وبال اپنے سر لیتا۔ اس کے ۱۹۴۶ء کے ۸۰ روپئے ۱۹۳۹ء کے ۲۰ روپئے سے بھی بدتر تھے، چوربازار اور قلت نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہاں! اگر اس کی آمدنی اس سے کم از کم دوگنی ہوتی تو اسے لمحہ بھر کے لئے کنوارا رہنا گوارا نہ تھا۔ اس کے نزدیک شادی کا مفہوم راحت فراغت اور نشاط تھا، تنگی ترشی، بک بک جھک جھک، بیماری آزاری نہیں، اسے اپنی ناکافی مالی استطاعت کا علم تھا۔

تھی وہ پیار کرنے سے گریزاں تھا۔

رحیم نے بوٹ اچھی طرح چمکائے اور انھیں ایک نظر دیکھا، اس میں آئینے کی سی چمک آگئی تھی، عکس دکھائی دیتا تھا، بوٹ ایک طرف رکھ کر غسلخانہ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی سب کپڑے اتارے، بدن پر پانی ڈالا، صابن ملا، میل اتارا، پھر پانی ڈالا، تولیے سے بدن کو پونچھا اور اسی کو باندھ کر ، منٹ کے اندر باہر نکل آیا، بالوں میں تیل ڈالا، کنگھی کی، کپڑے پہنے اور تیار ہو گیا۔

رحیم کو آج جنون سا ہو رہا تھا، فلم کا بھوت بری طرح سر پر سوار تھا، اگر آج نہ گیا تو پھر یہ فلم ہاتھ سے گئی، کیوں کہ یہ اس کا آخری دن تھا۔ پرستان کے اڈیٹر نے اس کی تعریف کے پل باندھ دیئے تھے، رحیم نے جاتے جاتے پرستان کی تنقید پڑھنا شروع کی :

"...... چمپا کی گداز گداز پنڈلیاں ہیں کہ جوانی کا رسیلا بھار ؟ دیکھتے ہی
دل مچل جاتا ہے۔ چمپا سراپا شعلہ ہے، جو بھڑک کر ہر طرف آگ لگاتی ہے
یہ شوخ معشوقہ حسن کا وہ بےمثال شاہکار ہے، جسے شاعر، مصور
اور بت تراش کی آرزوؤں کا حاصل کہنا چاہیئے ـــــ"

رحیم کا دل بے تحاشہ مچلنے لگا، اس کا شوق اور بھی بڑھ گیا، بھلا ایسی تصویر دیکھنے سے وہ کیونکر چوکتا جس میں کوئی خوبصورت چہرہ موجود ہو، جس میں کوئی ہوش ربا حسینہ جلوہ آرا ہو، جس میں حسن اور جوانی کی فراوانی ہو۔ یہ اس کی پُر خلا زندگی کا سرمایہ تھا، اس سے اس کی آنکھیں بیدار رہتیں، اس کا دل زنگ آلود ہونے سے بچ جاتا۔ مہ رخوں کا دیدار اس کا فرض اولین تھا۔

رحیم نے حتمی طور پر فیصلہ کیا کہ وہ پکچر دیکھیگا اور ضرور دیکھے گا۔ اب وہ بالکل تیار ہو چکا تھا، جانے کے لئے ـــــــ اکیلا، بھابی کے بغیر۔

عین اسی وقت بھائی جان دفتر سے آگئے۔ انھوں نے اپنی رج ایک طرف پٹکی جسے بھابی نے بڑھ کر سنبھال لیا اور وہ فائلوں کا بنڈل اٹھا کر کمرے میں چلے گئے۔

"رحیم!"

"جی"

"تم کہیں جا رہے ہو؟"

"جی ہاں"

"کہاں؟"

"پہاڑ گنج"

"کہاں ہے پہاڑ گنج؟"

"نہ جانے کہاں"

"کیسے جاؤ گے؟"

"پوچھ پوچھ کر"

"کیوں جا رہے ہو؟"

"فلم دیکھنے"

"ارے، واہ، میرے یار! تم اور تمھاری بھابی نے تو فلم دیکھنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے"

"جی ہاں"

"چھوڑو، کیا کرو گے فلم دیکھ کر۔ اڈورڈ پارک چلیں گے"

"جی نہیں۔ مجھے آج فلم دیکھنے جانا ہے"

"اور تمھاری بھابی کو بھی؟"

"نہیں تو۔ ہم اڈورڈ پارک جائیں گے، اور رحیم بھی جائیگا"

"معاف کیجئے! رحیم کو اڈورڈ پارک نہیں جانا۔ لیجئے، بندہ چلا!"

"اماں، ٹھیرو تو!"

لیکن رحیم یہ جا وہ جا۔ اس نے چا بھی نہ پی۔ بھابی نے بڑی محنت سے بالوشاہیاں تیار کی تھیں، اس نے انھیں بھی ہاتھ نہ لگایا۔

کہاں دریا گنج اور کہاں پہاڑ گنج۔ کافی فاصلہ تھا۔ لیکن رحیم کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، چلنے کے معاملہ میں وہ بالکل سپاہی تھا۔

رحیم تازہ وارد تھا، ہزاروں پردیسیوں کی طرح صرف ملازمت کے سلسلہ میں دلی آیا تھا، اسے مطلق خبر نہ تھی کہ پہاڑ گنج کدھر ہے، فوارے کی طرف یا کناٹ پلیس کی طرف۔ ۶ مہینے کے قیام میں آج وہ پہلی مرتبہ پہاڑ گنج جانیکا ارادہ رکھتا تھا، توکل بخدا وہ سڑک پر آیا، کنجڑوں کی دکانوں کے قریب تانگے کھڑے تھے۔

اس نے ایک سے دریافت کیا، "پہاڑ گنج کا کیا لوگے؟"

"اڑھائی روپئے"

"۲½ روپئے؟"

"میاں یہ بھی تو کتنی دور یہاں سے! جاتے جاتے جانور کے پاؤں پک جاتے ہیں"

"اماں! اٹھنی چونی کی بات کرو!"

"میاں! فقیر کو دیدینا، ثواب ملیگا۔ امریکنوں سے اتی دور کے ہم نے ۱۰-۱۰ روپئے لئے ہیں، ہمیں تو دوسری سواری بٹھانے میں مزا ہی نہیں ملتا"

"خیر، تم جانو!"

رحیم مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے خفیف سا اندازہ ہوا کہ پہاڑ گنج ضرور دور جگہ ہے، لیکن کہاں اور کدھر ہے، یہ ابھی تک معلوم نہ ہوا تھا، چوک پر جا کر اس نے سپاہی سے پوچھا کہ پہاڑ گنج کدھر ہے۔

"پہاڑ گنج؟" سپاہی نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا "یہاں سے چاندنی چوک، وہاں سے فتحپوری، آگے کھاری باؤلی، پھر قطب روڈ اور اس کے بعد پہاڑ گنج۔ جامع مسجد سے ٹریم پکڑلو، قطب روڈ سے تانگہ! بآسانی پہاڑ گنج پہنچ جاؤ گے۔ کل ۵ اکنیاں لگیں گی"

"۵ اکنیاں؟"

"اور کیا؟ کمبخت تانگے والے ۲ - ۳ روپئے سے کم نہیں لیتے"

"۲½ روپے تو اس بڈھے نے مانگے ہی تھے"

"کاٹھ مارو تانگے کو!"

"ہاں، یہی ارادہ ہے - شکریہ!"

رحیم کی تسلی ہوئی، اسے اپنی منزل کا کچھ نہ کچھ سراغ مل گیا، وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ایک تو جگہ دور، دوسرے ناواقفیت اور تیسرے بھابی کا انکار، ان سب نے ملکر مشکل پیدا کر دی تھی، وقت تنگ ہو رہا تھا، فلم کے ہاتھ سے نکلنے کا خدشہ بڑھنے لگا تھا تاہم امید کی جھلک مفقود نہ ہوئی تھی، اس نے پھرتی کی اور جامع مسجد پہنچا، ٹریم پہلے سے کھڑی تھی لیکن رحیم کے پہنچتے پہنچتے چل پڑی، رحیم نے اسے بھاگ کر پکڑ لیا؛ صرف پائیدان پر لٹکنے کے لئے تھوڑی سی جگہ ملی، اندر لوگ کھچا کھچ بھرے تھے؛ ہوا تک کے لئے داخل ہونا دشوار تھا۔

ٹریم رکتی رکاتی، بھیڑ بھڑکے سے ہوتی ہوتی چلی، رحیم کا دل اور دماغ پریشان ہوا جا رہا تھا، اگر سے بات معلوم ہوتا تو وہ پیدل ہی بھاگ پڑتا۔ ٹریم سے ضرور پہلے پہنچتا۔

خدا خدا کر کے ٹریم قطب روڈ پہنچی، کنڈکٹر نے آواز دی - "قطب روڈ" اور رحیم کود کر زمین پر آ رہا۔ یہاں پہنچکر رحیم نے پھر سپاہی سے پہاڑ گنج کا راستہ پوچھا۔

"ہاں! یہ سامنے کیا ہے - تانگہ پکڑ لو، سیدھا پہاڑ گنج لے جائیگا"

رحیم نے لپک کر تانگہ پکڑا جو چوک سے ہٹکر ذرا دور، ایک سواری کے انتظار میں کھڑا تھا، اس کے بدن سے پسینہ چھوٹ گیا اور سفید ماتھے پر پانی کے قطرے بکھر گئے، اس نے رومال نکال کر گال اور ماتھا پونچھے، فلم کو دیر ہو گئی تھی، دراصل وہ آیا ہی دیر سے تھا۔ اسے بھابی اور بھائی جان کے جھنجھٹ میں ناحق وقت گنوانا پڑا۔

رحیم نے گھوڑے کو دیکھا، بڑا پلا ہوا جانور تھا، ریس میں دوڑانے کے لائق اور ریل موٹر کے برابر بھاگنے والا تھا۔

"ارے خاں! تمہارا گھوڑا تو بڑا اچھا ہے"

"میاں! میرا اپنا ہے، کسی دوسرے کا نہیں"

"تبھی تو ماشاءاللہ اتنا موٹا تازہ ہے"

"میاں! اسے میں آپ جوتتا ہوں، کسی کو اس کی لگام تک چھونے نہیں دیتا"

"چال بھی خاصی ہے"

"میاں! اسے چال نہیں کہتے، یہ تو چہل ہے، چال تو اسے کہتے ہیں"

تانگہ بان نے ہوا میں چابک سٹر سٹرایا، راسیں ڈھیلی کر دیں اور گھوڑا ہوا ہو گیا۔

"واہ، واہ، کیا بجلی کی رفتار ہے"

تانگہ بان نے پورے جوش میں آ کر، ایک بار پھر چابک سر سٹرایا، گھوڑا آندھی بن گیا، دور تک سڑک کشادہ اور صاف تھی، آمد و رفت اتنی زیادہ نہ تھی، اس سڑک پر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی، البتہ بازار میں سے گذرتے وقت راہگیروں کے ہجوم سے گھوڑے کی رفتار، رفتار نہ رہی، اب وہ رک رک کر چلتا تھا۔

سفر ختم ہوا، پہاڑ گنج کے اڈہ پر جا کر تانگہ رکا، سامنے سینما تھا جس کی فراخ پیشانی پر آئل پینٹ کی بہت بڑی تصویر آویزاں تھی؛ دراز قد، پھول سا چہرہ، گوری باہیں، ننگی رانیں اور گداز پنڈلیاں ——— حسن اور شباب کا دلفریب پیکر تھا

([illegible])

آنسہ اختر جمال

دِل مگر دیتی ہے عورت ایک بار!

اس نے رضا کو یونہی دیکھا تھا، ایک سرسری سی نظر سانولی رنگت —— وہ مسکراتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں جن میں عجیب سی چمک تھی، رضا کا چہرہ بڑی دیر تک اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہا، اس دن اس سے کام بھی نہ ہوا، بس سارے دن بستر پر پڑی پڑی رنگین محل بناتی رہی اور سلونے سے اشعار گنگناتی رہی، دل میں ایک عجیب سی خلش ہو رہی تھی، کوئی نامعلوم راستوں سے دل کی گہرائیوں میں اترا جا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو بالکل ناچار اور مجبور محسوس کر رہی تھی برآمدے میں سے ایک کھردری سی آواز آئی "شمو بہت شرماتی ہے" اس کے چہرے پر حیا کے سُرخ سُرخ ڈورے پھیل گئے، اسے خود پر غصہ آگیا، آخر وہ خواہ مخواہ کیوں شرما گئی تھی، بھلا گھبرا کر بھاگنے کی کیا ضرورت پڑی تھی، وہ کیا اسے کھا جاتا۔ اس نے ہمت کی کہ اُٹھکر باہر جائے مگر وہ بستر پر پڑی رضا کی بھولی آواز سنتی رہی اور —— رضا چلا گیا۔

رضا معمولی سا نوجوان تھا مگر اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور گلابی مسکراہٹ شمسہ کو ستانے لگی، اس نے رضا کو دیکھ کر بھاگنا چھوڑ دیا، وہ اس کی آنکھوں میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، وہ چاہتی تھی کہ رضا اس سے بے انتہا محبت کرے اسے رضا کا گونگا پن ذرا بھی نہ بھاتا تھا، مگر محبت کے خیال سے اسے ڈر لگنے لگتا تھا، محبت ہندستانی معاشرت میں بڑی گندی سمجھی جاتی ہے، لوگ نہ جانے کیا سمجھنے لگتے ہیں، بیہودہ قسم کی باتیں کرتے ہیں اور پھر خواہ مخواہ بدنام کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے رضا کی خاموشی کو وہ پسند کرنے لگی، وہ خاموشی کو شرافت سمجھکر اپنے دل کو تسکین دے لیا کرتی تھی، مگر رضا کی آنکھیں —— وہ اس سے کچھ کہا کرتی تھیں، اس نے خاموش محبت کا جواب خاموشی سے دیا۔ اکثر وہ اس گونگی محبت سے اکتا بھی جاتی تھی، اکثر اس کا دل چاہتا تھا رضا اس سے کہے "شمو! چاند تاروں کے خالق کی قسم تم چاند سے زیادہ حسین ہو" مگر رضا نے کچھ نہ کہا، بس وہ دیکھا کرتا تھا عجیب نظروں سے ——

رضا جا رہا تھا —— وہ اس کی زندگی میں زبردستی آگیا تھا اور پھر اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ رضا کی جدائی کے خیال سے اسے تکلیف ہو رہی تھی، وہ سوچنے لگی اگر رضا جا رہا ہے تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کر رہا ہے، رضا نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ محبت کرنا شروع کر دے۔ اور پھر اس کی محبت میں آنسو بہلئے، مگر محبت کی نہیں جاتی، ہو جایا کرتی ہے۔ وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ درد سر مول لے، مگر رضا اس کے تصورات کی دنیا پر چھا گیا۔ رضا اس سے ملنے آیا۔ وہ بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا، اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، چہرہ زرد سا تھا، وہ کہنے لگا "شمو تم بہت یاد آؤ گی" شمو کو یقین سا ہو گیا کہ رضا اس سے محبت کرتا ہے، مگر وہ روٹی سی ہو گئی۔ آخر وہ یہ کیوں نہیں کہتا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔

رضا کہہ رہا تھا "شمو ایک گیت سنا دو"

"گیت —— !" شمو نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں، جیسے رضا کوئی عجیب و غریب بات کہہ رہا ہو، وہ سوچنے لگی رضا بھی کتنا عجیب انسان ہے، بھلا وہ گیت کیسے گا سکتی ہے، برابر والے کمرے میں امی جان اور رضو جی

اگر وہ مل گئی تو کیا کہیں گی۔ اس نے کوشش بھی کی کہ وہ رضا کی آخری درخواست سن لے، مگر باوجود کوشش کے اس کی آواز نہیں نکلی، اسے بڑی حیرت ہوا کرتی تھی کہ فلموں میں ہیروئن کس طرح ہیرو کے ساتھ گا لیتی ہے۔

"نہیں گاؤ گی ——— ؟" رضا نے مایوسی سے پوچھا۔

"رضا! دیکھئے ——— " اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"اچھا رشو اب اجازت دو ——— ؟" رضا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ——— ؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"جی کیا ——— ؟ ہاں کہو" رضا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"خدا حافظ!" اس نے نہ جانے کس طرح کہا ——— رضا چلا گیا، وہ بڑی دیر تک خلا میں کچھ گھورتی رہی، پھر آنسوؤں کا سمندر اُمنڈ آیا، روتے روتے اس کا تنفس بے ترتیب ہو گیا ——— ہمیشہ کے لئے۔

رضا کو گئے ہوئے عرصہ ہو گیا، شروع شروع میں اس نے رضا کو بہت یاد کیا، اکثر تو رات کو اسے نیند بھی نہیں آتی تھی، رضا کی چمکتی ہوئی آنکھیں اس کے سامنے گھوما کرتی تھیں، مگر پھر رفتہ رفتہ نقش دھندلے ہوتے چلے گئے اور پھر مٹ گئے، رضا کی محبت اسے بیوقوفی معلوم ہونے لگی، اکثر وہ سوچا کرتی تھی اس نے رضا کی محبت میں ناحق دو تین سال برباد کئے، رضا کی آنکھوں کی چمک اور گلابی چہرہ کونسی عجیب و غریب چیزیں تھیں، قیصر کی آنکھوں میں بھی تو ویسی ہی چمک ہے اور اس کی مسکراہٹ تو رضا سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ قیصر کے بال کتنے خوبصورت ہیں اور قیصر رضا کی طرح گونگا اور بزدل بھی نہیں ہے، وہ کتنی بار اظہار محبت کر چکا ہے۔ رضا ——— رضا تو بزدل تھا۔ اور قیصر ——— قیصر دل سے اسے چاہتا ہے، وہ کتنی بیوقوف تھی۔ رضا کی محبت میں وقت برباد کرتی رہی، اسے رہ رہ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس ہوتا تھا۔

قیصر بہت باتونی تھا، کتنی رنگین ہوتی تھیں اس کی باتیں، وہ کہا کرتا تھا "تمہارے رخسار اس گلاب سے پیارے ہیں اور تمہاری نگاہیں ——— نہ جانے ان میں کیا ہے، مجھے رات کو سونے نہیں دیتیں" قیصر کی باتیں سن کر اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگتے تھے، نگاہیں زمین پر گڑ جاتی تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی۔

قیصر اس کے قریب آتا چلا گیا ——— بہت قریب مگر جب قیصر اس کے قریب آیا تو اسے قیصر کی بےبسی کا احساس ہوا، قیصر کی رنگین باتیں اسے تھرڈ کلاس ناولوں کے رٹے ہوئے جملے معلوم ہوئیں۔ قیصر بالکل کھوکھلا تھا۔ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا، وہ فضول سی رومانی دنیا میں رہنا چاہتا تھا ——— ایک خیالی دنیا میں رہنے والا انسان کیا کر سکتا ہے۔ صرف ہوائی قلعے بنانے سے تو کچھ نہیں ہوتا، آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دشوار راہوں سے گزرنے میں تو مدد نہیں کر سکتی ——— اسے قیصر سے نفرت ہو گئی، کتنی نادان تھی وہ قیصر سے محبت کرنا شروع کر دیتی تھی، مگر اب وہ نادان نہیں رہی تھی وہ حساس اور سمجھدار ہوتی جا رہی تھی وہ سمجھنے لگی تھی کہ

جو خود نہ زندگی ہے نہ بیعت ز زندگی
وہ حسن قہر ہے وہ محبت عذاب ہے

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب آئندہ وہ کبھی کوئی حماقت نہیں کرے گی ——— اسے ایسے انسان کی

ت دکھائے ـــــ جو زندگی کی دشوار گھاٹیوں سے گذرنے میں اس کی رہنمائی کرے جو وقت کی پکار سن سکے اور اُسے
ہی سنا سکے جس کے بازوؤں میں طاقت ہو ـــ جو زمانہ کی تیز آندھیوں سے مقابلہ کرنا جانتا ہو، جو اپنی کمزوریوں پر
الب ہو کہیں ایسا انسان ـــ ؟ وہ اسے کہاں ڈھونڈے اور پھر اسی لئے اس نے محبت کا خیال دل سے نکال دیا
س نے سوچا محبت کچھ نہیں ہے، غلام ملکوں میں محبت نہیں ہے، صنعت ہی ہے، بھوک اور پیاس کا گھر ہوتا ہے۔ محبت
ـــــ محبت تو دور بھاگتی ہے، اکثر وہ اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھی " محبت کا دوسرا نام حماقت ہے اور
شادی کا دوسرا نام غلامی ہے " اس کی کئی سہیلیاں اس کی باتوں پر بگڑتی تھیں، کیونکہ وہ رنگین محلوں کے خواب
دیکھ رہی تھیں۔ اسے اکثر اپنی سہیلیوں پر ترس بھی آجاتا تھا ـــــ بیچاریاں ـــــ

ایک دن اس کی سہیلیوں میں بڑی دلچسپ بات چھڑ گئی، ہر ایک لڑکی سے پوچھا گیا کہ وہ کس قسم کا شوہر پسند کریگی
رشیدہ نے کہا " وہ شاعر چاہتی ہے جو اس کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دے " اسے رشیدہ پر
بہت ترس آیا۔ نفیس نے کہا کہ " وہ ایک دولتمند بوڑھا چاہتی ہے " رشو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ رضیہ بولی " میں کسی
ترقی پسند ادیب سے شادی کرونگی "۔ " ہنہ ـــــ یہ منہ اور مسور کی دال " اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا رضیہ لڑنے والی تھی
مگر وہ خاموش ہوگئی، وہ جانتی تھی کہ سب ملکر اسے تنگ کر ڈالیں گی۔

جمیلہ نے کہا " ایک بہت ہی حسین نوجوان۔ جس کی آنکھوں میں نشہ ہو اور ہونٹوں پر گلابی مسکراہٹ " جمیلہ
آنکھوں کی چمک اور گلابی مسکراہٹ کا نام سنکر رشو کی رنگت زرد ہوگئی، اسے قیصر اور رضا یاد آگئے۔ دونوں بیوقوف
انسان ـــــ اس نے چاہا کہ وہ جمیلہ کا رنگین جال توڑ کر دکھائے کہ دھاگے خوبصورت تو ہیں مگر بالکل کچے اور بودے ـــ
مگر اس نے خاموش رہنا ہی ٹھیک سمجھا، لڑکیاں اس کا منہ تک رہی تھیں " رشو اب تمھاری باری ہے "

" ارے ـــــ " وہ چونک پڑی اور کچھ کہنے لگی " بہنو! میں تو ایک انسان چاہتی ہوں بہادر اور خوددار "

جمیلہ کہنے لگی " مشتاق کی طرح ـــــ! "

" مشتاق ـــــ " اس کے کانوں کے پردوں سے کوئی لفظ ٹکرایا۔

" مشتاق کون ـــــ ؟ " رشو نے پوچھا۔

" ارے تم نہیں جانتیں ـــــ ہم تو نظروں کے تیر پھینک پھینک کر تھک گئے مگر اس کمبخت پر اثر ہی نہیں ہوا "
نفیس نے ہنسکر کہا اور رضیہ اپنے دونوں ہاتھ مٹکا کر بولی " بالکل گھُنّس ہے "

رشو نے دھیرے سے کہا " بہت عقلمند ہے "

نفیس منہ بنا کر بولی " مگر رشو وہ ذرا بھی خوبصورت نہیں ہے، موٹے موٹے ہونٹ ـــــ جنگلیوں جیسے بال "

" پھر تم سب کیوں مری جا رہی ہو " اس نے پوچھا۔

" یہی تو ایک معمہ ہے " نفیس نے کہا

رشو نہ جانے کیا سوچنے لگی جب نفیس نے اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز دی تو وہ چونک پڑی " یہ کس کی تصویر ہے "

" مشتاق کی ـــــ "

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا پریشان بال ـــــ بالکل جنگلیوں جیسے ـــــ معمولی سا نقشہ ـــــ
اداس سی آنکھیں جن میں خودداری تھی، اور موٹے موٹے بھدے سے ہونٹ ـــــ اسے یاد آیا اس نے مشتاق کو کہیں
دیکھا ہے مگر کہاں ـــــ ؟؟؟ اوہ ـــــ بھیّا کا وہ عجیب دوست جو ایک بار آیا تھا، دھن لگا سا ہو رہا تھا

ایک بھاری سی آواز سنکر وہ باہر گئی تھی، ٹارچ کی روشنی میں اُسے بالکل ایسی ہی حیران آنکھیں نظر آئی تھیں، قیصر و غیرہ بیٹھا ہوا تھا، شمو نے سوچا اس موٹے موٹے ہونٹوں والے جنگلی انسان کو بھی اندر بلا لے" آئیے تشریف رکھئے بھیا آتے ہونگے"

"جی نہیں شکریہ ——" وہ ہر کھائی سے لیکر تیزی سے چلا گیا تھا اور اس کے بعد —— ہاں ایک سینما میں وہ ٹکٹوں کے لئے پریشان کھڑی تھی قیصر اور سلیم وغیرہ بھی بھیڑ سے گھبرائے ہوئے کھڑے تھے، وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا تھا، قیصر نے کہا تھا "یار ذرا ٹکٹ تو لا دو"

"اچھا کتنے —— ؟ کونسے ؟"

"فرسٹ کلاس کے چار ——"

اور پھر تھوڑی دیر میں وہ بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ٹکٹ لئے ہوئے چلا آ رہا تھا ——

"آؤ مشتاق —— تم بھی چلو" قیصر نے ٹکٹوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔

"نہیں —— میں سیکنڈ کلاس میں بیٹھا کرتا ہوں" اس نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا تھا اور وہ بڑی دیر تک اس عجیب و غریب انسان کی حرکات دیکھتی رہی تھی۔

"کس سوچ میں ہو —— ؟" رشیدہ نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"نہ جانے کیا سوچنے لگی تھی"

"سمجھ گئی —— مشتاق ——" نفیس نے بدتمیزوں کی طرح کھانس کر کہا۔

وہ ان کے فقروں سے بچنے کے لئے کہنے لگی "اچھا اب اجازت دو مجھے ایک جگہ جانا ہے"

"ابھی کیا جلدی ہے بیٹھو تو —— آج تم اس جنگلی کو بھی دیکھ لینا سلیم نے وعدہ کیا ہے کہ وہ زبردستی پکڑ کر مشتاق کو لائیں گے"

اور پھر کسی نے اس کے پیر پکڑ لئے —— اسے بیٹھنا ہی پڑا۔ مشتاق کے لئے وہ دروازہ کے باہر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی "انتظار کی گھڑیاں بہت سخت ہوتی ہیں" نفیس نے نقرہ چست کیا۔

"چپ لگی —— میں کوئی —— شاید تم انتظار کی تکلیفیں سہہ رہی ہو"

"شمو مست نہ جانے کس عالم میں تو پہنچ گئی تھیں —— اور نام سنکر ہوش بھی آیا تو اس جنگلی کا ——"

وہ پریشان سی ہوگئی، عجیب لڑکیاں ہیں اور پھر اس نے ان کے فقروں سے بچنے کے لئے ریڈیو کھول —— بار

پھر لیجو ذرا" وہ سب ریڈیو سننے لگیں اور —— شمو سوچنے لگی وہ کس طرح مشتاق سے ملیگی —— اندر ——

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مشتاق کے پیروں پر گر پڑے اور کہہ دے

"مرتا —— مجھے تمہاری ضرورت ہے"

[illegible] —— مشتاق بہار —— خود —— مشتاق کی

—— [illegible]

[illegible] ہر گل پر [illegible]

[illegible] صورت ایک [illegible]

جائزے

ارتقاء

فراق اور تنقید نگار

ادب اور اقتصادیات

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!۔

اسلم فریدی

ارتقاء

(گذشتہ سے پیوستہ)

دراصل ڈاروِن نے سوچا کہ جو باتیں پسندِ فطرت کے اصول پر سمجھ میں نہ آئیں انھیں پسندِ جنس کے اصول پر کھپا جائے حالانکہ گئے تھے روزے بخشوانے وہاں نماز بھی گلے پڑ گئی۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس سے چوگنا مواد پیش کرتے اور ان فریب کاریوں کا پردہ چاک کرتے جو تقریباً اسی برس سے تمام دنیا کو گمراہ کئے ہوئے ہے۔

اس تمام بحث سے تین نتائج نکلے :۔

(۱) لیمارک کا عقیدہ اصل النوع غلط ہے۔

(۲) ڈارون کا عقیدہ اصل النوع غلط ہے۔

(۳) لیمارک اور ڈارون کے نظریات کا اوّلین نہیں بلکہ ثانوی درجہ ہے۔ اوّلین درجہ کسی اور شے کا ہے۔

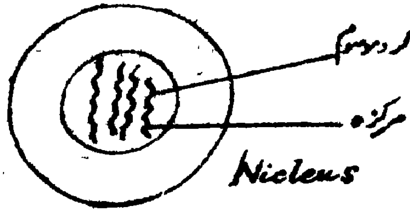
Theory of De Vries. تغیر (Mutation) ۔ ڈی ورائز کا نظریہ

جیسا کہ ہم نے پیشتر بتایا ڈی ورائز، لیمارک اور ڈارون سے منکر ہے۔ موجودہ سائنس کی عملی اور تجرباتی تحقیقات نے اسی کو درست مانا ہے، کیونکہ یہ خلیائی سائنس (Cytology) کی رو سے ارتقاء کے تقریباً تمام مسائل کی تشریح پیش کر دیتا ہے۔

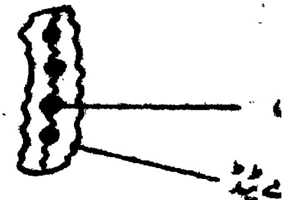
ڈارون اور لیمارک کا نظریہ یہ تھا کہ وہی خصوصیات جو آبا و اجداد میں موجود ہوتی ہیں۔ کم و بیش ہو کر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ڈی ورائز کے خیال میں وراثتی خصوصیات نئی نوع کی تخلیق نہیں کر سکتیں، بلکہ کسی کیمیائی یا طبیعاتی وجہ سے کسی بچے میں بالکل نئی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کے آبا و اجداد میں نہیں ہوتیں۔ یہ نظریہ ذرا دقیق ہے۔ اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے بالکل ابتدا سے چلنے کی ضرورت ہے۔

جسم خلیوں (Cells) سے بنا ہے۔ خلیئے بہت چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری ایک انگلی میں لاکھوں خلیے ہوتے ہیں۔ خلیئے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جسمانی اور دوسرے جنسی (Sexual)۔ جنسی خلیے تولید کے کام میں آتے ہیں، جہاں تک خلیوں کی ساخت اور بناوٹ کا تعلق ہے دونوں قسمیں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ (دیکھئے تصویر)

ہر ایک خلیئے کے بیچ میں ایک مرکزہ ہوتا ہے اس مرکزہ Nicleus میں کچھ چھوٹے چھوٹے دھاگے سے ہوتے ہیں۔ جنھیں کروموسوم (Chromosomes) کہتے ہیں۔ ہر کروموسوم کے دو حصے ہوتے ہیں جنھیں ہم کروموٹڈ (Chromatids) کہتے ہیں۔ ہر کروموسوم کے اوپر ایک لائن ہوتی ہے۔ اسی لائن پر جین ہوتے ہیں۔ جین Genes



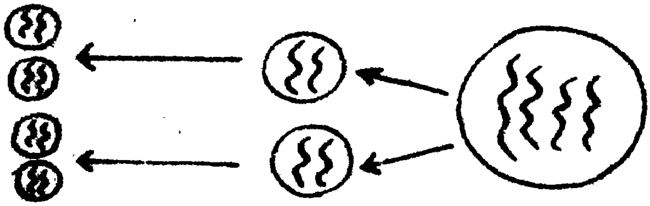
یہ خوردبین کی مدد سے بھی نظر نہیں آتے۔
یہ خیالی طاقتیں ہیں جن کے اندر وراثت کے منیب
(Factors) بند ہوتے ہیں۔



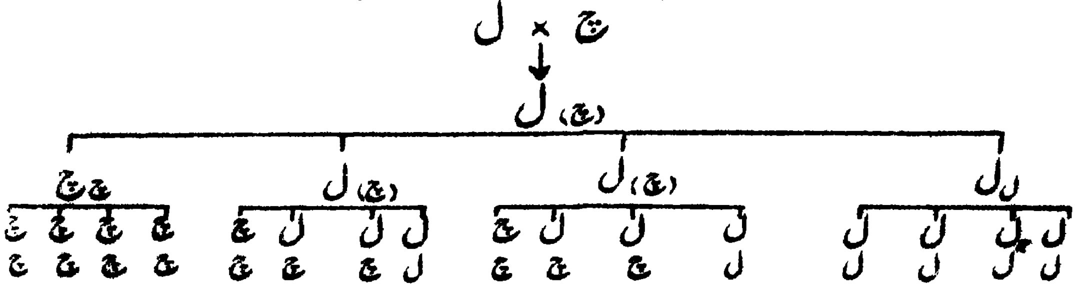
کروموسوم

یک جین میں ایک یا بعض حالتوں میں ایک سے زیادہ منیب (Factors) بند ہوتے ہیں۔
ں ایک خصوصیت کا حامل ہوتا ہے، ایک کروموسوم کے اوپر چند سے لیکر ہزاروں تک جین ہوسکتے ہیں۔
یہی جین ہیں جو وراثت کا سبب ہیں۔ اگر کسی وجہ سے جین یا کروموسوم میں تبدیلی ہوجائے تو بچے بھی
یدا ہونگے۔ ہر نوع میں کروموسوم کی تعداد ہر خلیہ میں مقررہ ہوتی ہے اور اس طرح سے جین کی تعداد بھی ہر
م پر مقررہ ہے۔ یہ تعداد مختلف انواع میں مختلف ہے مثلاً مکئی میں ۱۲، اور ایک قسم کی مکھی درسوفلا میں ۴،
ے مادۂ انثیہ میں ۴۸، اور مرد کے مادۂ منویہ میں ۴۷ یا $47\frac{1}{2}$ ۔ یہ کروموسوم ہمیشہ جوڑے کی صورت میں
ں، گویا دو کروموسوم ملکر ایک توام کروموسوم بناتے ہیں۔ ہاں نر اور مادہ میں ان کی تعداد میں اختلاف ممکن ہے
پر کی مثال سے واضح ہوا ہوگا۔
کروموسوم نہ صرف تعداد بلکہ شکل، صورت، وضع، کیمیائی اور طبیعاتی لحاظ سے ایک نوع کے دوسرے سے
تے ہیں، اگر کسی وجہ سے کیمیائی اثرات، طبقاتی اثرات مثلاً عکس ریز، حوادث، زہر، گرمی، سردی وغیرہ
ت کے جنسی خلیئے کے کروموسوم کی تعداد بجائے ۴۸ کے کچھ اور کردی جائے تو اُن کے بچے انسان نہیں
ر ہونگے۔ ان کروموسوم کی تبدیلیوں کو ہم تغیر کہتے ہیں یعنی Mutations ۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں:-
(۱) ادنیٰ تغیرات، جو عموماً جین کی کمی بیشی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً کسی انسان کی پیشانی پر چند بال نکل آئیں۔
(۲) اعلیٰ تغیرات، یہ عموماً کروموسوم کی کمی بیشی کی وجہ سے ہوتے ہیں، جیسے جراف کی گردن بجائے چند سوت کے کئی انچ
ے، یا آپ کا ایک ہاتھ چھوٹا سا پیدا ہو۔
جیسا کہ ہم نے بتایا وہی تغیرات کارآمد ہیں جو جنسی خلیوں میں نمودار ہوں۔ کیونکہ ذی روح کا تعلق اپنی نسل سے صرف
لیوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لئے جو تبدیلیاں ان میں ہونگی وہی بچے میں ہونگی۔ ابھی تک آپ یہ سوچ رہے ہونگے کہ
نے بڑے تغیرات ہوتے کیوں ہیں۔ سائنس کے تجربوں نے ثابت کردیا ہے کہ عکس ریز، حرارت، کیمیائی اجزاء، بیماریا
ہیں کے اور اثرات یہ تغیر پیدا کرسکتے ہیں، چنانچہ درسوفلا جو ایک قسم کی مکھی ہوتی ہے اس کی ۹ ہزار سے زیادہ اقسام
یبی لیبریٹری میں پیدا کرلی گئی ہیں۔
کچھ لوگوں کو ان جین کی حقیقت پر شبہ ہے، کیونکہ یہ آجتک دیکھے نہیں گئے، ہم آواز کو دیکھ نہیں سکتے مگر محسوس
ہیں۔ ہر چند جین دیکھے نہیں گئے مگر ان کے عمل سے ان کا وجود قطعاً تسلیم کرلیا گیا ہے، حد یہ ہے کہ ان کی جگہ تک
ا ہے کہ کروموسوم کے کس حصہ پر کس قسم کا جوہر ہوگا۔
انسانوں اور اعلیٰ حیوانوں اور ان درختوں میں جہاں نر اور مادہ الگ الگ ہوتے ہیں، جب اختلاط جنسی کا وقت ہوتا ہے
ی خلئے کے کروموسوم دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور ایک خلئے کے دو بن جاتے ہیں۔ ان ثانوی خلیوں میں

اوّلین خلیوں سے آدھی تعداد ہوتی ہے، اس کے بعد اس ثانوی خلئے کے بھی دو دو خلئے بنتے ہیں، مگر ان خلیوں میں تعداد اتنی ہی رہتی ہے۔ (دیکھئے تصویر)



یہ عمل نر اور مادہ دونوں کے تمام جنسی خلیوں میں ہوتا ہے، جب اختلاط جنسی ہوتا ہے تو مادہ اور نر کے جنسی خلئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بچہ وجود میں آتا ہے، چنانچہ بچہ میں آدھے ماں کے آدھے باپ کے اجزا ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں کا کوئی جین باپ کے اسی صفت والے جین پر حاوی ہو جاتا ہے، مثلاً ماں کا لمبائی کا جین باپ کے ——— چھوٹائی کے جین پر چھا جاتا ہے اور تمام بچے لمبے پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ جب ان بچوں کی نسل پیدا ہوتی ہے تو ان میں تین لمبے اور ایک چھوٹا ہوتا ہے۔ ان تینوں لمبوں میں سے ایک خالص ہوتا ہے یعنی اس کے تمام بچے لمبے پیدا ہوتے ہیں اور دو مخلوط یعنی ان کے تمام بچوں کی شرح وہی تین لمبے اور ایک چھوٹا والی ہوتی ہے۔ البتہ جو چوتھا چھوٹا ہوتا ہے وہ خالص ہوتا ہے، اس کے تمام بچے چھوٹے ہوتے ہیں، یہ چیز آپکو شکل سے واضح ہو جائیگی۔



ل سے مراد لمبا اور چ سے مراد چھوٹا ہے۔ یہ بات سب سے پہلے ایک پادری نے دریافت کی تھی جسے باغبانی کا شوق تھا، اس کا نام مینڈل (Mendel) تھا۔ وہ آسٹریلیا کا رہنے والا تھا۔ دراصل یہ مینڈل ہی کا طفیل ہے جو ہم اس قابل ہیں کہ اپنی مرضی کے مطابق بچے پیدا کر سکیں۔ بشرط فرصت آپکو اس مسئلہ سے بھی روشناس کیا جائیگا۔

ڈارون کا ایک بھتیجا تھا جس کا نام گالٹن تھا، اس نے یہ معلوم کیا ہے کہ بچے میں جتنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ان میں آدھی ماں باپ کی چوتھائی دادا دادی نانا نانی اور آٹھویں پردادا پردادی، پرنانا پرنانی ——— بسلسلہ ——— ہوتی ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ وہ تبدیلیاں جو جسمانی خلیوں میں ہوتی ہیں توریثی نہیں ہوتیں جیسا کہ ڈارون اور لیمارک مانتے ہیں۔ بلکہ جنسی خلیوں کی تبدیلیاں توریثی ہوتی ہیں اور انھیں کو ہم تغیر کہتے ہیں۔ بعض بیماریاں مثلاً آتشک، سرطان جنون، سوزاک وغیرہ جنسی خلیوں میں ادنیٰ تغیرات پیدا کر دیتی ہیں۔ امکانات ہیں کہ ایسے مریضوں کے بچے ناقص ہوں مثلاً آتشک کے مریض کی تمام اولاد سو فیصدی بدصورت ہوتی ہے۔

لوٹسے (Lotsy) | لوٹسے کے متعلق اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ وہ بہت خوش فہم ہیں، اور نئی نوع کی

Hybridisation یا Cross Polluiation ۔ جسے اختلاط باہمی کہتے ہیں یعنی
کے نزدیک جب ایک ہی نوع کے دو افراد اختلاط کرتے ہیں تو اسی ایک نوع کے بچے پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر
لف نوع افراد اختلاط کریں تو بچے بھی نئی قسم کے پیدا ہونگے ۔ جیسے گدھے اور گھوڑی سے خچر پیدا ہوتا ہے ، مگر
لیا ہے کہ ایسی دوغلی نسلیں اولاد پیدا کرنے کی اہل نہیں ہوتیں ۔ تجرباتی طور پر ان کے نظریہ کی محدودیت آشکار
ہے ۔

اب ہم ارتقا کا تجزیہ کرتے ہیں ۔

(۱) جین کے تغیرات ۔　　(۲) گرد وسوم کے تغیرات ۔

(۳) جنس ۔　　(۴) پسند فطرت ۔

نی یہ کہ پہلے جین میں تبدیلی ہوتی ہے ۔ ان تغیرات کی وجہ سے یا بعض دفعہ اچانک گرد وسوم میں تغیرات ہو گئے
ہیں ، یہ تغیرات نئی نسل کو عطا ہوتے ہیں اور بچوں پر پسند فطرت اپنا عمل دکھاتی ہے ، جو فطرت کی پسند ہوئے محفوظ ہو
۔ اس سے ثابت ہوا کہ نوع کی تخلیق محض ڈی ورائز کے نظریہ کی رو سے ہوتی ہے ۔ البتہ جب تخلیق ہو جاتی ہے
ن اور لیمارک کے نظریئے اپنا عمل دکھاتے ہیں ، جو اصلح ہوتے ہیں باقی بچتے ہیں جو ناقص ہوتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں
سے اعلیٰ مخلوق اعلیٰ تر ہوتی چلی جاتی ہے ۔

چنانچہ حیات سب سے پہلے کیچڑ میں وجود میں آئی اس ذی روح کا جسم ایک خلیہ کا تھا ۔ ایک خلیہ سے دو بنے ۔ آہستہ
اعضاء کی تخلیق ہوتی رہی ۔ ایک شاخ نباتات کہلائی ، دوسری حیوانات ۔ اب حیوانات میں ارتقا ہوتا رہا ۔
نی کے کیڑے اور جانور وجود میں آئے جیسے مچھلیاں ۔ اس کے بعد خشکی کے ۔ خشکی کے جانوروں کے دو شاخیں
۔ ایک واپس پانی کی طرف لوٹ گئی ۔ دوسری خشکی پر رہی ۔ جیسے چھپکلیاں ، سانپ وغیرہ ۔ ان کی بھی دو شاخیں
۔ ایک نے اڑنا سیکھ لیا تو پرند کہلائی اور دوسری پستان والے جانور ۔ پستان والوں کی شکل ہم اور آپ ہیں
پودوں میں ارتقا ہوتا رہا ۔ اور سورج مکھی کے خاندان کے پودے اعلیٰ ترین کہلائے ۔

اب سائنس یہ حل کرنا چاہتی ہے کہ انواع میں قرار اور انضباط کیوں پیدا ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ انسان میں
بیس ہزار برس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ نہ جسم میں نہ دماغ میں ۔

ڈارون اور ڈارونیت کا جو تجزیہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ، وہ استاد گرامی ڈاکٹر رفیق احمد خاں صدر شعبۂ نباتیات
یونیورسٹی علیگڑھ کا ہے اور موصوف نے بکمال شفقت مجھے اس کے اظہار کی اجازت عطا فرمائی ہے ، جسکے لئے
ف کا شکر گذار ہوں ۔

یہ وحشی " ماں نے دنیا دیکھی ہے ، وہ سمجھ گئی ۔ میری بیٹی کو اب دوسری مرتبہ ایک کمینے کے بجائے ایک وحشی نصیب ہوا ہے ایسا
جو کہ حسن سے دل بہلانا جانتا ہے ، عورت کو ایک مشین سمجھتا ہے ، یہ بھائی تو پڑھ لکھکر بھی جاہل بنگیا ہے ، جانوروں کو بدتر ہے ۔
اور اسکے پیٹ کا خزانہ کیسی کھلی حقیقت ہے ، اس حالت میں وہ بارہ بچوں کی پرورش اور دمہ کا شکار ہ موت کی خدمت کیونکر سرانجام دیکتی
۔ ان ہی ایسے وقت دیکھے ہیں ، ایسی گھڑیوں سے دوچار ہو چکی ہے کیونکہ وہ عورت ہے ، عورت پیدا ہوتے ہی موت کے آخری لمحے
اپنی نظروں کے سامنے اپنی کائنات کا رنگ بدلتے دیکھتی رہتی ہے کیا گھر میں اور کیا باہر اسکی فکر دنیا کے عظیم ترین افکار کہیں زیادہ
بار ہے ، ماں سوچ رہی تھی اب موہنی کو بھی خود اپنے بچوں کا جن کی تعداد ایک درجن کے قریب ہو سکتی ہے ، پرورش کا بار اپنے سر
وگا ۔ جب وہ بھی دمے کا شکار ہو کر موت کے لئے ایڑیاں رگڑیگی ۔ یہ کسقدر کربناک خیالات ہیں کتنی اداسی ہے انکے تصور میں ۔

حفیظ مالیگانوی

فراق اور تنقید نگار!

پچھلے دنوں نظام کے عید نمبر میں ایک تنقیدی مضمون "روح کائنات" کے عنوان سے نظر آیا جس میں فراق صاحب کی شاعری کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جسے پڑھ کر ضروری معلوم ہوا کہ میں بھی کچھ عرض کر دوں۔ اگرچہ فراق صاحب کے متعلق کچھ کہنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس دور میں جو شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے اس کا تقاضا ہے کہ انھیں نہ چھیڑا جائے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ کچھ لوگ انھیں اس روپ میں پیش کر رہے ہیں جس سے فراق صاحب کی شخصیت پر غلاف چڑھ رہا ہے اور حیران محسوس ہوتا ہے، کہیں غلط پروپیگنڈا ان کی شعری زندگی کو تباہ نہ کر دے یہ امر بات ہے کہ پروپیگنڈے کے بل بوتے پر حاصل کی ہوئی شہرت پائیدار نہیں ہوتی۔ لیکن فراق صاحب اب اس منزل میں ہیں جہاں اس طرح کی باتیں خود بخود دم توڑ دیتی ہیں اور نداتی سطحیت ذہنی گہرائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

فاضل تنقید نگار نے ان باتوں پر بہت زور دیا ہے، جس میں لسیاتی شاعری قابل ذکر ہے۔

۱۔ فراق۔ جوش زدہ یا اقبال زدہ نظمیت سے ماورا ہیں۔
۲۔ فراق کی ہندوانہ قلندری۔
۳۔ فراق کی لسیاتی شاعری۔
۴۔ فراق اور ان کا لہجہ۔

اس میں شک نہیں کہ فراق صاحب بہت مشاق شاعر ہیں اور ان کی جگہ اردو ادب میں اونچی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال و جوش سے وہ بلند ہیں جبکہ فاضل تنقید نگار کی نظر میں:

"زندہ رہنے اور زندگی کو پائیدار و حسین بنانے کی لگن جو اقبال و جوش کے یہاں ملتی ہے یہاں بھی (فراق صاحب) از اول تا آخر چھائی ہوئی ہے"

حالانکہ ابتدا میں وہ کہہ چکے ہیں:

"جوش زدہ یا اقبال زدہ نظمیت کا سراغ کہیں نظر نہیں آتا"

گویا وہ ایک ہی سانس میں فراق صاحب کو اقبال و جوش سے اوپر اٹھا لیجاتے ہیں اور پھر انھیں دونوں کی سطح سے خود ہی گرا بھی دیتے ہیں اور یہ ایک ایسی حرکت ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اقبال و جوش جس درجہ کے شاعر ہیں اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے نقادوں نے ان کے متعلق جس حوصلہ اور دلیری سے رائے ظاہر کی ہے، اسے پڑھ کر صاحب تنقید کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ انھوں نے کسی کو خوش کرنے کے لئے وہ باتیں کہدی ہیں جو ان کو شایان شان نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال فکری طور پر ایک علیحدہ شخصیت کے حامل ہیں۔ حضرت جوش ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں، فراق صاحب ایک جدا کردار کے مالک ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دونوں کے حریف کس طرح ہوسکے اور ان سے بلند کس صورت میں، کیا اس وجہ سے کہ اقبال و جوش فراق صاحب کی طرح "کا جواب دل" کے نمونے

نہیں جچتے۔ کیا اقبال اس وجہ سے نچلی سطح پر آگئے کہ انھوں نے عشقیہ شاعری کو قومی تباہی سے تعبیر کیا۔ کیا جوش اس لئے قابل اعتنا نہیں کہ انھوں نے علانیہ ذہنی عیاشی کی داد نہیں دی اور فراق صاحب اس وجہ سے بلند و بالا ہیں کہ انھوں نے ہندو مذہب اور ہندو کلچر کی روح ان "وصلی" اشعار میں سمو دی جسے کوئی بھی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے پسند نہیں کرتا۔

جدید ادب اور اس کے مصطلحات جس شدید تقاضے کے تحت وجود میں آئے اور اس کی تعمیر و ترقی جس فضا میں ہوئی رفتہ رفتہ جو گندگی اس سے دور کی گئی اور اب جس ماحول میں وہ سانس لے رہا ہے محسوس ہوتا ہے کہ وہ عریانی، وہ ننگا پن، وہ بھونڈا پن جو ابتدا میں پیدا ہو گئی تھیں مشاہیر ادب کی مسلسل کوششوں سے مفقود ہو گئی ہیں۔ غالباً تنقید نگار کی نظر سے ترقی پسند تحریک کے ممتاز ارکان کے افسانے، غزلیں اور نظمیں نہیں گذریں ورنہ فراق صاحب کی اس طرح بے حرمتی نہ کرتے انھوں نے جمالیاتی شاعری کے تحت میں جو کچھ کہا ہے اسے نظر انداز کر دیتے اور انھیں کسی اور صورت میں پیش کرتے۔ فراق کے لئے یہی کیا کم ہے کہ نیاز فتحپوری جیسا نقاد انھیں تمام شاعروں سے بلند سمجھ رہا ہے اور دوسرے نقاد بھی انھیں اُردو ادب کے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ پھر انھیں ایک عریاں نگار کی حیثیت سے پیش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اسی سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید نگار صاحب متعصب ذہنیت اور فراری رجحانات کے مالک ہیں۔ آخر حسب ذیل شعروں سے اُردو ادب میں کیا اضافہ ہوا جس سے فراق صاحب کو خواہ مخواہ تمام شاعروں سے بلند سمجھا گیا۔

۱۔ ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

۲۔ قبائے تنگ نے بیسوں جگہ سے لَو دے دی
زفرق تابہ قدم اک دبی سی آگ ہے تو

۳۔ تجھے بھینچتے وقت نازک بدن پر
وہ کچھ جامۂ نرم کی سرسراہٹ

۴۔ پس خواب پہلوئے عاشق سے اُٹھنا
ڈھلے ستا وہ جوڑے کی وہ ڈھلکاہٹ

۵۔ نکھری سحر اپنی لہلہاہٹ، جھولے
بیخود رُوح ہو کر سینہ پہ جھولے ہو
ہنگام وصال وہ سرکتا ملبوس
زریں کمر اور جگمگاتے کولے ہو

۶۔ پہلو کی وہ کہکشاں وہ سینے کا ابھار
ہر عضو کی نرم لو میں مدھم جھنکار ہو
ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم
سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار ہو

۷۔ تا کمر جسم کچھ رہیں ڈھیلے ہو
اور پیڑو سے یوں بھینچے پیڑو
سر کو سر سے ملا کے دوائے
جس طرح زور آزماتے ہوں
پھر وہ چشموں کا ل کے لہرانا
کرشن کا رقص ناگ کے پھن پر

اور وہ مخرب اخلاق اشعار جنھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے اُردو ادب کے لئے کس طرح بیش قیمت سرمایہ ہو سکتے ہیں، جبکہ ان کے مطالعے سے ایک طرح کی بو محسوس ہوتی ہے۔ گو، میں نے اس لئے کہا کہ فراق صاحب نے کامیاب وصل کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ تنقید نگار کی نظر میں اس لئے قابل اعتنا ہیں کہ ان کا معشوق گوشت پوست رکھتا ہے اور حسرت موہانی کے علاوہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ دور کے متغزلین بھی اسی ذیل میں شمار کئے جا سکتے ہیں، مگر چونکہ وہ اس قدر "کھلم کھلا کھیلنے" کے شائق نہیں اس لئے رجعت پسندوں کے زمرے میں شامل ہیں اور فراق صاحب اس قسم کے شعروں کی وجہ سے اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں کم سے کم ان شعروں کو پڑھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔ کوئی صاحب مجھے دقیانوسی کا الزام نہ دیں، کیونکہ میرا اعتراض دقیانوسی نہیں ہے، بلکہ ترقی پسندانہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ

میں پچھلے دور کی شاعری کو بھی اس لئے صرف قابل سمجھتا ہوں کہ اس میں اسی طرح کے خیالات بیان کئے گئے ہیں اور جنسی عیاشیوں کا اشتہار دیا گیا ہے۔ اور میں کیا ہر سلیم الطبع اس سے اجتناب کریگا۔ جب یہ معاملہ ہے تو بتائیے ایسی کی شاعری کون پسند کریگا جس میں لمسیاتی عنصر غالب ہو۔

یہ وصال کے بعد دوشیزگی کا نکھر آنا۔ یہ قبائے تنگ کا جگہ جگہ سے مسک جانا۔ کسی کو بھینچتے وقت جامۂ نرم کی سرسراہٹ کا محسوس ہونا۔ یہ سینہ چھو لینے کی خواہش اور پیڑو سے پیڑو ملانے کی تمنا شاید اردو ادب میں اضافہ کا باعث ہے، یہ نہ کہتے ہوئے کہ یہ "کوک شاستر" ہے۔ کتنی بھدگی سے تنقید نگار نے اضافہ کا لفظ استعمال کیا ہے پہلے پہل تو میں نے ان شعروں کو "صالحانہ جذبہ" کے ماتحت پڑھا مگر جوں جوں ان کی تنقید پڑھتا گیا یہ حقیقت واضح ہوکر رہی کہ محض اِن شعروں کی وجہ سے فراقؔ صاحب کو ایسے رنگ میں پیش کیا جارہا ہے جس سے ان کی شاعری پر ضرب پڑتی ہے اور بہت وزنی دھچکا معلوم ہوتا ہے۔ بتائیے جب ہم جدید ادب کے نقطۂ نظر سے اس قسم کے اشعار کو پس پشت ڈال چکے ہیں اور اس کے مقابلہ میں "عوامی ادب" کا پرچار کر رہے ہیں تو ایسے شعروں کو کیوں اچھال رہے ہیں جن سے عوام کے مذاق پر بُرا اثر پڑنے کا خطرہ ہے۔ عوام کی ذہنیت بدل جانے کا اندیشہ ہے۔ عوام کو پستی میں گرانے کی دعوت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی موٹی بات کس طرح تنقید نگار کے ذہن سے اتر گئی اور انھوں نے جذبات کی رو میں غلط نظریوں کا اظہار کیا

ہندوانہ قلندری بھی خوب رہی۔ فراقؔ صاحب کیا ہیں ایک قلندر ہیں۔ ان کے اشعار قلندری کے آئینہ دار ہیں اور ان کی قلندری اقبالؔ سے علٰحدہ ایک نئی قلندری ہے۔

سچ سچ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔ فراقؔ صاحب کو میں ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا اور جہاں کہیں ان کے اشعار ملتے تھے ضرور پڑھتا تھا (عریاں اشعار نہیں)۔ "روح کائنات" بھی سرسری طور پر دیکھی ہوئی ہے۔ افسوس کہ تنقید نگار نے ان کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ورنہ مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ تنقید نگار نے "ہندوانہ قلندری" کے ضمن میں یہ شعر نقل کیا ہے ؎

بن تارکِ دنیا بھی دنیا کی طلب بھی کر
ملتے ہوئے دنیا سے بچتے ہوئے دنیا سے

اوّل تو اس شعر میں کوئی خاص پیغام نہیں، دورِ اوّل کے صوفی شعراء نے اس سے بہتر خیال کی ترجمانی کی ہے، موضوع بہت پامال اور سوقیانہ ہے۔ عام خیال بھی اسے قبول نہیں کرسکتا۔ ترقی پسندی کچھ اور تقاضا تھا یہ تو

"چیست دنیا از خدا غافل بدن"

کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔

فراقؔ صاحب اگر قلندر ہیں تو ان کی قلندری کے لئے اس سے زیادہ اونچائی کی ضرورت تھی، خواہ مخواہ لفظوں کے تانے بانے میں پھنس کر ایسی بات نہیں کہنی چاہئے جو موضوع کی بلندی کو نہ چھو سکے اور ہدفِ ملامت بننے کا موقع دے۔ دوسرے یہ کہ اس ایک شعر سے یہ قیاس کرلینا کہ فراقؔ صاحب قلندر ہیں یا اقبالؔ کی قلندری (نعوذ باللہ) سے انکی قلندری ممتاز ہے، اچھی بات نہیں مضحکہ خیز ہے۔ اقبالؔ نے کہیں نہیں لکھا کہ دنیا چھوڑ کر کچھ بننے کی کوشش کرو۔ ان کا پیغام تو عالمگیر اور بہت ارفع و اعلیٰ تھا، ان کی خودی آجتک مشہور ہے، ایسی خودی نہیں جو دنیا سے علٰحدہ رکھے اور دنیا میں بھی رہنے پر مجبور کرے، یہ تو فراقؔ صاحب کی قلندری ہے جس میں عریاں اشعار کا مطالعہ بہت ضروری ہے

ورنہ ہم کیا جانتے کہ یہی فلسفیانہ نکات ہیں اور اقبال کی حکیمانہ بصیرت سے بلند و بالا ہیں۔

اس تنقید میں فراق صاحب کے لب و لہجہ پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور وہ ذاتی طور پر وہی باتیں لکھی گئی ہیں، جو اور نقادوں نے تحریر کی ہیں۔ عام طور سے ان کی ہندی آمیز اردو کو خوب اچھالا گیا ہے اور اسے رنگین نقش نگار کے ساتھ "البیلی" بنا دیا گیا ہے، مگر یقین جانئے ہر جملہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محض جوش عقیدت کی بنا پر لکھا گیا ہے، ورنہ جدید اسلوب کے تحت انھیں نہیں پیش کیا سکتا۔

نیا اسلوب بیان بھی ایک فطری اور وہبی چیز ہے زبردستی نہیں اختیار نہیں کیا سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کی مرصع نثر اور علامہ اقبال کی نظم دیکھئے، کوئی لاکھ کوشش کرے کہ ان کے حریف بن کر کمال حاصل کریں مگر "نیاز فتحپوری" سے آگے نہیں بڑھ سکتے، سارا زور بیان پٹے ہوئے ٹوٹ کی طرح کھیسیں نکال دیتا ہے۔ چنانچہ جب اس ضمن میں پیچھے تنقید نگار کے لفظوں پر غور کیا جاتا ہے تو فراق بالکل کورے نظر آتے ہیں اور پورا ہوائی قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔ ایک شعر جس کی بہت تعریف کی گئی ہے ؎

مدبھری آنکھوں کی السائی نظر پچھلی رات — نیند میں ڈوبی ہوئی چندر کرن کیا کہنا

اس شعر میں ہندی کے تین لفظ ہیں :- مدبھری۔ السائی۔ اور چندر کرن۔ تنقید نگار صاحب نے اسے جیتا جاگتا جادو تعبیر کیا ہے۔ ان کا ایک اور شعر پڑھئے ؎

دل کے آئینے میں اس طرح اترتی ہے نگاہ — جیسے پانی میں لچک جائے کرن کیا کہنا

دونوں شعر سامنے ہیں ذرا خدا لگتی کہئے کونسا شعر اچھا ہے اور کس میں نامانوس لہجہ اور اجنبی پن محسوس ہوتا ہے اور کس شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فراق صاحب خالص اردو زبان کے شاعر ہیں اور انھیں خواہ مخواہ ہندی الفاظ کی کثرت پیوند کی وجہ سے بدنام کیا جا رہا ہے۔

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے رگ و ریشے میں اردو رچی ہوئی ہے، انھوں نے اردو کو نہیں بلکہ خود اردو نے انھیں جذب کر لیا ہے، اس لئے انھیں تمام شعراء سے ممتاز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے اور کسی طرح نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ تمام سچائی پسندوں کا اس پر اتفاق ہے۔ کیونکہ تنقید نگار نے ہندو شاعر و ادیب کی حیثیت سے جن لوگوں کا نام پیش کیا ہے فراق صاحب ان سب کے خوشہ چیں ہیں اور انھوں نے سبھوں سے استفادہ کیا ہے۔ محض اپنی بزرگی اور برتری کے لئے کسی کو نیچا دکھانا عوامی نقطۂ نظر سے مستحسن فعل نہیں اسے ذاتی بغض و عداوت کہتے ہیں اور ادبی طور پر یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

غرض کہ یہ تنقید نظر ثانی کی محتاج ہے۔ امید ہے کہ آئندہ فراق صاحب کے متعلق اس طرح کی باتیں نہ کہی جائیں گی۔ جس سے ان کی شاعری غلط فہمی کا شکار ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ یہ طریقہ فراق صاحب کی بلند شخصیت کے لئے مناسب نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۰) - اس نے گھبرا کر ریڈیو بند کر دیا، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوب زور زور سے چیخے چلائے ——— اپنا سر دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پھوڑ دے۔۔ دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار ——— نہیں ——— نہیں عورت بیوقوف ہوتی ہے، جو نوجوان بھی اسکی زندگی میں پہلی بار آتا ہے وہ اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے۔ مشتاق، سلیم اور قیصر کمرے میں داخل ہوئے اور وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہاں سے اٹھ کر بے تحاشا بھاگی۔ راستہ میں وہ مشتاق سے ٹکراتے ٹکراتے بچی "شمو ٹھہرو" نفیس اور قیصر کی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں، وہ بے تحاشا بھاگے جا رہی تھی۔ مگر اچانک ——— مشتاق کے مضبوط بازوؤں نے اسے بری طرح جکڑ لیا، وہ بے بس سی ہو گئی۔ بہت سی دیویاں اس کو منہ چڑا رہی تھیں ——— دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار" !!۔

اختر رؤفی

ادب اور اقتصادیات

ادب اور اقتصادیات پر غور کرنے اور دونوں کے باہمی رشتے کو واضح کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اس چیز پر غور کریں جس نے آج ہمیں اس موضوع پر سوچنے کے لئے مجبور کیا۔ آخر کیوں آج سے قبل صدہا سال کے ادب میں اس پر اظہار خیال نہیں کیا گیا؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارے ادیب اس معاملے میں خاموش رہے ہیں؟۔

ہزارہا سال کی آرین تہذیب و تمدن اور اس کے بعد کی اسلامی معاشرت نے ہندوستانی دماغوں کی ایک مخصوص اور معین طریقہ پر تربیت کر دی تھی۔ تمام کرۂ ارض اور دیگر اقوام سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے ہمارے معاشرہ کی راہیں بالکل محدود ہو گئی تھیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ابتدا سے لیکر جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد تک کا زمانہ ہندوستانی دماغوں میں ترقی، تجدید اور نئے پن کے احساس پیدا کرنے کا زمانہ تھا۔ سو سوا سو سال کا عرصہ کسی ملک و قوم کی ترقی میں، بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے امتزاج نے آہستہ آہستہ ذہن کی ساخت پر کیمیائی عمل جاری رکھا اور اس کے عمل کو انتہائی قدامت سے اعتدال کے درجہ تک پہنچا دیا۔ جنگ عظیم کے بعد گویا ہندوستانی دماغ اس قابل ہو گیا کہ کسی محرک کا اثر قبول کر سکے۔ اسوقت مغرب کے اثر اور اقتصادی مشکلات نے ایک دم جھنجھوڑ ڈالا اور انسانی شعور بیدار ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء کی تباہ کن جنگ اور اس سے قبل تین چار سال کے زمانہ میں خطرات سے آگاہی نے ذہنوں کو تہہ و بالا کر دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آئندہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے، اسوقت اس کے سامنے انسان کی مختلف حالتیں، مختلف قدریں اور اس کے نئے نئے بندھن تھے۔ سوچنے والے دماغوں نے انھیں رشتوں اور بندھنوں کو ڈھونڈھ کر نکالا ہے۔ اس طرح مادی اور دنیوی زندگی کا خاکہ پیش کر کے انسان کو اس کے اصلی روپ میں دکھایا ہے۔

جب ادب کا زندگی کے ساتھ لگاؤ تسلیم کر لیا گیا ہے تو انسان کے دوسرے تعلقات کے ساتھ بھی ادب کا وابستہ ہونا ضروری ہوا اور بعض معاملات میں یہ وابستگی بہت گہری اور نمایاں نظر آتی ہے، لہٰذا اس کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں، خصوصاً جب کہ اس کو بیان کرنے سے ادب کی مختلف قدریں ظاہر ہو کر خیال کی نئی راہیں متعین کی گئی ہیں۔

اگر بہ نظر تحقیق دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ہمارا تمدن، ہمارا اخلاق اور ہماری ساری تہذیب صرف اقتصادیات کے تار و پود سے گھری ہوئی ہے۔ سماج کا سارا نظام اسی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ انسان کی ضرورت صرف درختوں کے چند پتوں پر منحصر تھی۔ یہ اس زمانے کے ابتدائی ماحول اور تمدن کا نمونہ ہے۔ اسکے بتدریج انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی رفتار سے اس کی دماغی اور تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آتی گئیں۔

ادب کا اقتصادیات سے لگاؤ کیوں اور کس طرح ہوا، یہ صرف ادب کے بدلتے ہوئے تخلیقی نظریوں پر گہری نظر رکھنے سے باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ وہ ادب جو کبھی محض ہمارے ذوق جمالیات اور حس لطیفہ کی تسکین کا باعث تھا، اب کسی طرح بھی ہمارے خشک اور پریشان دماغوں کی تسلی نہ کر سکا۔ اس وقت اس کا منشا یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے تاکہ ٹھہرے ہوئے اور تھکے ہوئے احساسات کو تفریح حاصل ہو، لیکن آج زندگی کی ترجمانی، ہمارے دماغوں اور ہمارے جسموں کے فطری مطا

اپنے لئے جگہ پیدا کر چکے ہیں۔

عام زبانوں کے قدیم ادب کی طرح اُردو میں بھی وہی جذبہ غالب آیا جو دیگر زبانوں کے لٹریچر میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ہمارا ادب حسن و عشق کے تخیلی کارناموں پر قانع ہونا چاہتا تھا کہ زمانہ کی کروٹوں نے اسے بیدار کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم ادب میں بعض ایسے رجحانات بھی ملتے ہیں جنھوں نے ہمارے ادب کی راہوں کو تبدیل کیا، لیکن ان کو دوامی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ مثلاً جنسی محرکات کے بیان اور اس کے بعد صوفیت کا رنگ۔ شکر ہے کہ یہ طوفان انھیں لوگوں کے ہاتھوں سلامتی سے ساحل آشنا ہو گیا۔ جنھوں نے اس کو راہ دی تھی۔ اس کے بعد میدان صاف تھا اور ادیب و شاعر کی جولانی اور زورِ افتادِ طبع پر منحصر تھا کہ "حالات زندگی ہیں مگر کچھ عجیب سے" گنگناتا ہوا اُٹھے اور اپنی راہ الگ بنا لے۔

سرمایہ داری کی لعنت، زر و مال کی غیر مناسب تقسیم، بھوک کی تڑپ اور ذہن کا تجسس، ایسی چیزیں ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہمارے ادیب اور شاعر ان منازل سے گزرتے ہیں، ان حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور نہ صرف اپنے دل کی دھڑکنوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں بلکہ ان کے علل و اسباب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں اور یہی چیز ہمارے دور کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اقبالؒ جیسا مفکر اور فلسفی شاعر بھی اقتصادی بدحالی پر اظہار خیال کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اُسے تو خصوصاً کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ اس کا سب سے زیادہ حق اسی کو پہنچتا ہے:۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس شعر میں ہماری مفلسی، ہماری غربت اور ہماری بھوک نے آخری مدارج پر پہنچ کر سے انقلاب کی دعوت دی ہے۔ اس لئے اگر کسی عالم میں تمام پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کے بعد کوئی منزل طے کرنے کو باقی نہ رہ جائے تو پھر ٹھہراؤ کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھتا تھا اور اسی کے پیشِ نظر یہ دعوت دے کر چلا گیا۔ اس کا یہ سبق بیکار نہیں گیا، بلکہ اس کے بعد کے شعرا کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا اور انھوں نے اس پر زیادہ پختگی سے روشنی ڈالی۔ انسان ہمیشہ متضاد رہا ہے۔ غم اور خوشی ساتھ ساتھ ہیں اس کے علاوہ نفرت و محبت، غصہ اور مہربانی بھی اس کے خمیر میں شامل ہیں، لیکن آج سارے ماحول پر اداسی اور غمگینی چھائی ہوئی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ خوشی بھی ہوتی ہے تو اس میں غم جھلکتا ہے۔ چہرے اداس، آنکھیں بے رونق اور عزائم پست، ہمارے شاعر ان تمام چیزوں کی جڑ بنیاد کی تحقیق کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مشینی دور میں ایک ایسی ہی حقیقت کا اظہار جذبی نے بھی کیا ہے:۔

جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

دیکھئے کس خوبصورتی اور انوکھے انداز میں ہمارے ماحول کی ساری شگفتگی اور تمام مسکراہٹ، عالم کی غمگینی اور بے پناہ اداسی کا سبب بتایا ہے۔ ہمارے ذہن بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ ساری زندگی کا حاصل ہی پیسہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارے جذبات اسی اصول کے زیرِ فرمان ہیں۔

جدتِ خیال اور تلخ حقیقت کا اظہار ایک جگہ اور دیکھئے، سارے بندھن، سارے تعلقات اور تمام رجحانات کس طرح ہمارے پیٹ، ہماری بھوک اور ہماری چند بے نام ضرورتوں کے ماتحت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا اندازہ ان الفاظ میں کیجئے:۔

یہ حسیں کھیت پٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے (فیض)

زر و مال کے بھاری قدموں نے زندگی اور اس کی خوشی کو پیس کر رکھ دیا ہے، سارا بنگال چیخ چیخ کر رہ گیا، لیکن وہ ہلاکت

جو غلامی کے علاوہ سرمایہ داری، بلیک مارکیٹ اور نفرت کی لائی ہوئی تھی، وہ رنہ ہوئی۔ لاکھوں نفوس موت کے گھاٹ اتر گئے اور کچھ بھی نہ ہو سکا مگر ان کی آوازیں، ان کی آہیں، دبی دبی چیخیں ہمارے ادب کی جان ہو کر رہ گئی ہیں :-

یہ در پہ کتی ہوئی مہوشان نیم فرنگ　　　بساط سبزہ پہ ہوتی ہیں عصمتیں نیلام

الٰہی کیا یہ وہی خطۂ زمیں ہے جہاں　　　ترس کے مر گئے روٹی کو چار لاکھ غلام

یہی وہ ارض ستم دیدہ ہے جہاں اب بھی　　　ہے کارگر پہ مشقت روا، اناج حرام

غریب ہے اسی صورت رہین فاقۂ و غم　　　امیر کو وہی حاصل فراغ عیش مدام

سسکتی ہوئی لاشیں، ہڈیوں کے ڈھانچے بدن، کمر سے لگے ہوئے پیٹ اور روٹی روٹی کو چلاتی ہوئی نحیف اور کمزور آوازیں....... یہ ہیں آج ہمارے ادب کے موضوع اور ہمیں فخر ہے کہ ہم زندگی کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج ہماری آوازوں میں کوئی زور نہ ہو لیکن جلد ہی یہ آوازیں قوت حاصل کرینگی اور ہمارے عمل ان میں تاثیر بھی پیدا کرکے پوری قوم اور تمام سوسائٹی کا نقشہ بدل دینگے۔ اس ساری کشمکش، تمام تگ و دو اور آلام و مصائب کی بنیاد کا ذمہ دار ایک دانۂ گندم ہے۔ اگر یہ ہر فرد کو حسب ضرورت حاصل ہوتا رہے تو دنیا کی چیخ پکار آدھی رہ جائے۔ یہ ہنگامۂ قتل و خون، یہ بددیانتی اور دھوکہ و فریب کا طوفان نوح ٹھنڈا پڑ جائیگا، اس دانہ کا کرشمہ بھی دیکھئے :-

دھوئیں کے جنباں پروں کے جھولے پہ ایک شعلہ اتر رہا ہے
وہ ایک شعلہ وہ ایک گندم کا دانہ زرنگار........ جسنے
ادائے عشوہ سے میرے آبا کی جنتوں کو جلایا.........
وہ ایک دانہ وہ ایک شعلہ..............
جو اپنی تقدیر ہے ازل سے، جو اپنا مقصود ہے ابد تک۔
ابھی ہے ان ترکشوں میں وہ تیر آزمودہ........ وہ نان گندم
دھوئیں کے جھولے پہ جس کو دیوتا، زمین پر اتارتے ہیں　　(ذکر تونسوی)

(بقیہ بھوکی امنگ) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوالا مکھی کا سینہ شق ہو گیا ہے اور شعلوں کی جھڑی لگ گئی ہے۔

رحیم نے وقت معلوم کیا۔ ۷ بج ۳ منٹ باقی تھے۔ رحیم کے سر میں زور کا گھونسہ لگا۔ ہال اور ٹکٹ گھر بند تھے کمپاؤنڈ میں کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اس کی محنت اکارت گئی کھیل شروع ہو چکا تھا

اسے بڑا ملال ہوا، اس نے بلاوجہ بھابی سے بحث کرنے میں وقت گنوایا، فضول بھابی کو سینما کی دعوت دی۔ اس نے پہلے خود کو کوسا اور پھر اسے دل ہی دل میں بھابی پر طیش آیا۔ بھابی کا اپنا دل سینما دیکھنے کو چاہے تو وہ دو گھنٹے پیشتر تیار ہو جائیں اور رحیم کو بھی تیار کرا لیں اور تنہا رحیم کی مرضی ہو تو پھر بھابی بڑی بے پروائی سے کام لیں رحیم کا فیروزہ پر بس نہ چلتا تھا، وہ بھائی جان کی چہیتی بیوی اور اس کی صرف بھابی تھی۔ کاش! رحیم کی بھی بیوی ہوتی، اس کا کہنا مانتی اور ہر طرح اس کا ساتھ دیتی۔

اس نے آئل پینٹ کی تصویر کو دیکھا۔ اس کے دل میں گدگدی اٹھی اور اس نے شدت اضطراب میں محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا ایک خلا پر کرنے کے لئے ایک فیروزہ کی سخت ضرورت ہے... وہ یہ بھول گیا کہ اس کی تنخواہ صرف اسی (۸۰) روپئے ہے۔

(نمائندۂ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے)

فلمستان

فلم کانفرنس

بمبئی میں آل انڈیا فلم کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم بمبئی مسٹر کھیر نے فلم سازوں سے اپیل کی کہ وہ تعمیری نوعیت کے فلم بنائیں جن سے قومی تصورات کا پرچار کیا جا سکے، اس کانفرنس کی صدارت موشن پکچر سوسائٹی آف انڈیا کے صدر مسٹر چنی لال نے فرمائی، میسور مدراس، دہلی، بنگال اور پنجاب کے نمائندوں نے شرکت کی ۱۹۳۹ء کے بعد صنعت فلم سازی کی یہ پہلی نمائندہ کانفرنس تھی مسٹر کھیر نے پروڈیوسروں سے کہا کہ انھیں اس کا احساس ہونا چاہئے کہ فلمی صنعت کے دو مقاصد ہیں۔ تعلیم اور تفریح۔ مسٹر کھیر نے کہا "عوام میں فلموں کے ذریعہ اعلیٰ تصورات اور نصب العین کا پرچار کیا جا سکتا ہے۔ اور صنعت کو ملک کی قومی زندگی میں اپنی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے"

مسٹر چنی لال نے اپنے خطبہ میں کہا کہ فلم انڈسٹری پر آج کل فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے تعطل و جمود طاری ہے" آپ نے اپیل کی کہ بیرونی کمپیٹیشن سے ملکی صنعت کا تحفظ کیا جائے!

"رشید دلہن" کی مہورت

:- ۸ر نومبر کو لکھنؤ میں سائن ٹون لمیٹڈ کے پہلے شاہکار "رشید دلہن" کی مہورت کی رسم نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی کے دست مبارک سے نہایت شاندار طریقہ سے عمل میں آئی، تقریباً چھ سات سو مہمانوں نے شرکت کی جن میں مشہور ادباء شعراء اور صحافی بھی شامل تھے، پروڈیوسر ڈائرکٹر نسیم سندیلوی "رشید دلہن" میں ایک حسین افغان شہزادی مس شہناز کو پیش کر رہے ہیں۔ مہورت کی رسم کے بعد مہمانوں کی پر تکلف تواضع کی گئی، مسٹر خلیل بھائی جان نے خاص نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ "رشید دلہن" سے ہندوستانی صنعت فلمسازی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا!

مہندرا پکچرز لاہور

پروڈیوسر مہندرا اپنی اولین فلم

"موہنی" کو وقت کی سب سے اہم سماجی ضرورت کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ یہ فلم سینکڑوں دیگر فلموں سے قطعی جداگانہ رجحانات کے تحت فلمائی جا رہی ہے۔ ہدایت کاری کے فرائض ڈائرکٹر نرنجن انجام دے رہے ہیں۔ موسیقی بھائی لال جیسے ماہرِ فن موسیقار کی مرہون منت ہے۔ گانے راز ہاشمی اور بیکل نے لکھے ہیں۔ ستاروں میں چاند برق۔ شیو کمار وشال۔ ردنی اور نرنجن جیسے اداکار شامل ہیں فلم اپر انڈیا سٹوڈیوز میں نصف کے قریب مراحل طے کر چکی ہے۔

کاہن آرٹ پروڈکشنز کا "ماہیا"

مسٹر کے، ایل کاہن نے اپنا رومانی شاہکار "ماہیا" تقریباً نصف مکمل کر لیا ہے۔ اس فلم کے حقوق پنجاب کے لئے بک ہو چکے ہیں۔ اس میں کندن لال، نواز، گلزار، ہری موہن کے علاوہ جذبات کی ملکہ راج رانی نمایاں کرداروں میں نظر آئیں گی۔

شباب صبا کی سرگرمیاں

چار زلیخہ کے پروڈیوسر مسٹر شباب "دھتکار" اور "وحشی شکار پوری" عنقریب ختم کر رہے ہیں۔ لیکن "شکار پوری" اور "وحشی دہار" مسٹر اے شاہ ڈائریکٹ کر رہے ہیں جن کے سو فیصدی شکار پوری ہونے کا ثبوت اس فلم سے مل سکے گا اور جو کچھ کمی مسٹر کاردار سے پوری نہ ہو سکی۔ مسٹر اے، شاہ اُسے بھی پورا کئے دم نہیں لیں گے۔ شمیم اور کمل زمیندار اس کے نمایاں اداکار ہیں۔

ہندوستان کلا مندر لمیٹڈ کی خاموشیاں

سنا گیا ہے کہ مالکان ہندوستان کلا مندر نے ایک طویل عرصہ سے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ اور آیندہ کب کام شروع ہوگا اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کمپنی کے شاعر اور ادیب حضرات اپنے گھروں کو تشریف لیجا چکے ہیں۔

سریش کی نینا سے شادی

بمبئی اور لاہور کے فلمی حلقوں میں یہ خبر کافی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ بمبئی ٹاکیز کا [illegible] لڑکا سریش جس نے بندھن فلم میں "چل چل رے نوجوان" والا گیت گایا تھا۔ اور آج کل پنچولی آرٹ پکچرز کی فلم "برسات کی ایک رات" میں بطور ہیرو کام کر رہا ہے۔ اس نے پنچولی کی ہیروئن مس نینا سے شادی کر لی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے نینا نے الناصر سے علیحدگی کے بعد نئے ہیرو رضا میر سے گٹھ جوڑ کیا تھا۔ اور یہ اس کا چوتھا شوہر ہے۔

مگر ہمارا نامہ نگار مقیم لاہور اس افواہ کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ نینا فی الحال اپنے شوہر رضا میر کے ساتھ ہے۔ اور اس افواہ میں ذرہ بھر بھی سچائی نہیں کہ اس نے سریش سے شادی کر لی ہے۔

افضل کاردار پروڈکشن میں

فلم اسٹار افضل جو بھوپال کے ایک شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جینت ڈیسائی پروڈکشن کی تصاویر مہارانا پرتاپ اور رینوکا میں نمایاں کام کرنے کے بعد اب کاردار پروڈکشن میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور کاردار پروڈکشن کی آنے والی تصاویر میں بطور ہیرو آپ کو نظر آئیں گے۔ اس ہونہار نوجوان فلم اسٹار سے فلمی صنعت کو بہت کافی توقعات ہیں۔

مہابیر سنگھ کی جھڑپ

فلمی دنیا میں یہ خبر یونہی پھیلی ہوئی ہے کہ مسٹر [illegible] جو آج کل "مقدر" بنانے میں دن رات مصروف ہیں۔ انہیں "مقدر" بنانے والے حبیب صاحب سے کچھ ناراضگی ہو چکی ہے۔ مگر مسٹر حبیب اطلاع دیتے ہیں کہ اس خبر کی ذرہ برابر بھی صداقت نہیں۔ بلکہ "مقدر" بنانے کا کام بڑی تیزی سے شروع ہے۔ بلکہ صداقت اس بات میں ہے کہ ایک کیریکٹر ایکٹر اور سنٹرل انڈیا پکچرز کے جنرل منیجر مسٹر مہابیر سنگھ میں کچھ چپقلش سی ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی ان کی ذاتی چیز تھی جسے کمپنی کے کاروبار سے کوئی لگاؤ نہیں۔

"دلی کی ایک رات"

"دلی کی ایک رات" کی [illegible] کا آغاز بہت جلد ہونے والا ہے۔ اس کی کہانی اور مکالمے مرزا [illegible] تیموری کے خود نوشتہ ہیں۔ گانے ساغر نظامی، مرزا نظام شاہ لبیب مرحوم اور حضرت یزدانی جالندھری نے لکھے ہیں۔ موسیقی کی ذمہ داریاں استاد جھنڈے خان کو سونپی گئی ہیں اور ہدایت کاری کے فرائض فاضل ہدایت کار مسٹر سام انجام دے رہے ہیں۔

"انجم" ایک نیا چہرہ

ڈائرکٹر [illegible] نے پنجاب فلم پروڈکشن کی دوسری سوشل تصویر "دیکھو جی" کی مہورت رنجیت اسٹوڈیوز میں ادا کر دی ہے۔ اس میں "دیکھو جی" کا ہیرو مسٹر انجم ممتاز شانتی کے ساتھ ہیرو کا رول ادا کر رہا ہے۔ یہ انجم آسمان فلم میں بالکل نیا اور تابندہ انجم بن کر چمکنے والا ہے۔ جن لوگوں نے "دیکھو جی" کا ٹرائل دیکھا ہے انھوں نے انجم کی فطری صلاحیتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔

طفیل فاروقی نے "دیکھو جی" کا میوزک دیکھا [illegible]

مسٹر چرچل کی لڑکی ایکٹریس گروپ میں

[illegible] اطلاع ہے کہ [illegible] کو [illegible] کے [illegible] تاکہ وہ چست اور خوبصورت نظر [illegible] کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ [illegible] پہلے [illegible] چربی بڑھائے۔ وہ ایک اطالوی فلم [illegible] سارا چرچل ایک باذوق اور [illegible] ایکٹریس [illegible] ہی میں ایک فلم میں اہم کردار ادا کر رہی [illegible] ہے۔ لیکن اطالوی کارپوریشن [illegible] ابھی شامل نہیں ہو سکتی کیونکہ ابھی [illegible] کا [illegible]

بھوپال میں فلم کمپنی

[illegible] سے بھوپال کے چند خوش ذوق [illegible] لاکھ کے سرمایہ سے ایک لمیٹڈ [illegible]

اس بار!

زیر تبصرہ دو کتابیں ہیں "شہید حق" اور "دوشالہ"۔ "شہید حق" کا موضوع تاریخی اور مذہبی ہے اور "دوشالہ" کا خالص ادبی۔ احتشام حسین رضوی اور جمیل ثاقب نے ان کتابوں کا علی الترتیب جائزہ لیا ہے۔ ان تبصروں کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک کے باکمال مشہور اور لائق فخر مصنفین اور مؤلفین کی کوششوں کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور ان کی قابل قدر حوصلہ افزائی ہو اور بس! امید کہ آپ ہماری اس مخلصانہ کوشش کو ادبی نقطۂ نگاہ سے پسند فرمائیں گے۔

(ادارہ)

شہید حق

مؤلفہ:- پروفیسر سید نواب علی ایم اے۔ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ (۱۹۴۶ء) قیمت مجلد ۸/۱۰ غیر مجلد ۸/۸
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ "افکار" بھوپال۔

واقعۂ کربلا اور شہید کربلا، ایسے موضوعات ہیں جن کے متعلق فلسفی، مصلح، شاعر، ادیب، مورخ اور زندگی سے کام لینے کا ڈھنگ سمجھنے والے تیرہ سو سال سے غور کر رہے ہیں اور جب تک باطل حق کو آنکھیں دکھلاتا رہیگا، جب تک حریت کا گلا گھونٹا جائیگا جب تک سچائی کے گلے پر تلوار رکھی جائیگی اس وقت تک ہر حساس انسان اس واقعہ پر غور کرتا اور اس سے سبق لیتا رہیگا۔ "شہید حق" ایک ایسا ہی مطالعہ ہے جس میں فلسفی کی فکر اور شاعر کے احساس، مورخ کی نظر اور مصلح کی اصلاح جوئی نے واقعۂ کربلا کو افادیت کے ایک نئے زاویہ سے پیش کیا ہے۔ سید نواب علی صاحب کے علم اور فضل سے جو لوگ واقف ہیں وہی جان سکتے ہیں کہ تقریباً سوا سو صفحوں کے لئے مواد جمع کرنے میں انھوں نے کتنی کتابیں دیکھی ہونگی۔ کتنے کتبخانے چھانے ہونگے اور کتنا وقت غور و فکر میں صرف کیا ہوگا۔ مستشرقین یورپ کی محنت اور علم دوستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اسلامی مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی کمی روح انھیں ایسی جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں تاریخ اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی انکی غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں پر ہنس سکتا ہے۔ مؤلف شہید حق سے زیادہ اور کون اس کا مستحق ہو سکتا تھا کہ وہ سچے مذہبی درد اور مورخانہ خلوص کے ساتھ ان کے علم کا پردہ چاک کرے۔ شہید حق کے ہر صفحہ پر مجھے ایک ایسی تاریخی بصیرت اور فلسفۂ تاریخ سے کام لینے کی ایک ایسی صلاحیت نظر آئی جو کم کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب نہ تو واقعۂ کربلا کی تاریخ ہے اور نہ امام حسینؑ کی سوانح عمری بلکہ واقعۂ کربلا کے ان پہلوؤں کی تشریح ہے جن سے اسلام کے نظریۂ حکومت اور جذبۂ حریت کی تاریخ مرتب کیجا سکتی ہے۔ یہ کتاب علمی حیثیت سے تو ہر زمانہ کی کتاب ہے لیکن آج جب ہماری فکر کا بڑا حصہ آزادی اور حکومت کے صحیح نقطۂ نظر کی جستجو میں صرف ہو رہا ہے اس وقت یہ کتاب "وقت کی چیز" بھی معلوم ہونے لگی ہے۔

ان میں جن اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں واقعۂ کربلا کے مختلف ماخذ کا تجزیہ، مستشرقین یورپ کی دروغ بافیوں کی تشریح، ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں روایات کی تنقید اور واقعۂ کربلا کی توضیح، بیعت کے لئے اصرار اور امام حسینؑ کے انکار کے وجوہ، امام حسینؑ کے خطبہ کی تشریح، امام کے اصول کی تشریح، واقعۂ کربلا اور منافقین اور واقعۂ کربلا کے غیر فانی اثرات بیحد اہم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کو تاریخ اسلام سے کچھ بھی لگاؤ ہے وہ اس کتاب کو دلچسپ پائینگے۔ اور جن لوگوں کا مطالعہ وسیع ہے وہ پروفیسر نواب علی صاحب کے ترتیب واقعات اور اخذ نتائج سے متاثر ہونگے۔

کتاب کا انداز بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ ادب کے شیدائیوں کو اس کی خالص ادبی حیثیت بھی متاثر کئے بغیر نہ رہیگی میں نے اس تصنیف سے کئی حیثیتوں سے اثر لیا ہے اور یقین رکھتا ہوں کہ جو شخص بھی اس کا مطالعہ کریگا وہ کسی نہ کسی پہلو سے اسے مفید پائیگا۔

احتشام حسین رضوی - لیکچرار لکھنؤ یونیورسٹی۔

دُوشالہ

"دوشالہ" محترمہ آمنہ نازلی کے تیرہ مختصر ڈراموں اور مناظر کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اُردو ڈرامہ کے "ریگستان" میں ایک سرسبز "نخلستان" کی حیثیت رکھتا ہے اور مصنفہ کو ایک بلند مرتبہ دنیائے تمثیل میں دیتا ہے۔ ناول اور ڈرامہ کے عناصر ایک ہی ہوتے ہیں یعنی خاکہ، کردار، مکالمے، زمان و مکان، اسلوب اور مقصد یا تنقید حیات۔ مگر ترتیب میں فرق ہوتا ہے مثلاً مکالمہ ڈرامے کے لئے جتنا ضروری ہے، ناول میں اتنا لازمی نہیں، اس کے علاوہ ان عناصر کو ناول نگار اور ڈرامہ نگار دوسرے طریقوں سے برتتے ہیں چنانچہ Hudson لکھتا ہے:- "خام مواد اور عناصر ناول و ڈرامہ میں جداگانہ طریقے سے برتے جاتے ہیں"

دوشالے کے تمام ڈراموں کی کامیابی کی پہلی وجہ یہی ہے کہ آمنہ نازلی نے "ڈرامہ کے فن پر عبور کے بعد ان عناصر کو ناول سے جداگانہ طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ ناول اور افسانے محض پڑھنے کے لئے لکھے جاتے ہیں، لیکن ڈرامہ نگار ڈرامہ لکھتے وقت خیال رکھتا ہے کہ اُسے اسٹیج پر بھی پیش کیا جاسکے۔ اگرچہ بعض ادبی ڈرامے ایسے ضرور لکھے گئے ہیں جو روحانی عنصر کی زیادتی یا کسی اور وجہ سے اسٹیج پر نہیں پیش کئے جاسکے، مگر ایسے ڈراموں پر "ڈرامہ" کا اطلاق بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ ڈرامہ اور اسٹیج کا ارتباط ڈرامہ کی تاریخی شرط ہے، ڈرامہ Action (عمل) سے الگ ہوکر اپنا وجود کھو دیتا ہے اسی لئے ڈرامہ کا قدیم نام Stage-play تھا An Introduction to the study of lite-[illegible] nature کا مصنف ڈرامہ کے اس پرانے نام کو پسند کرتے ہوئے لکھتا ہے "There is much to be said in favour of the old good name for drama — Stage play" — یعنی ڈرامہ کے پرانے نام "اسٹیج کا کھیل" کی موافقت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

ڈرامہ کو پڑھ کر ہم کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اگر یہ واقعہ تھیٹر کے پردے پر نہیں تو کاغذ کے پردہ سیمیں پر ضرور [illegible] اچھے ڈرامہ نویس، ڈرامہ میں حسب ضرورت تشریحات زمان و مکان کر دیتے ہیں تاکہ ڈرامہ کو اسٹیج پر پیش کرنے [illegible] برنارڈ شا اور ابسن وغیرہ مشہور انگریزی ڈرامہ نگار تو اپنے ڈراموں میں لہجہ اور حرکات کی تشریح بھی کر دیتے ہیں [illegible] کہ ڈرامہ محض ادب ہی نہیں ہے یہ ایک مخلوط فن ہے جو فنی پابندیوں کے ساتھ Stage سے بھی وابستہ [illegible] اسی لئے ڈرامہ کو جیبی تھیٹر (Pocket Theatre.) Cramford کہتا تھا۔

آمنہ نازلی کے اس مجموعے کے ڈرامے "دوشالہ" - "انا" - "شوہر کی شادی" - "ماں" اور "بھابی [illegible]" طویل اور کئی مناظر کے ڈرامے ہیں مگر انھیں بھی اسٹیج پر آسانی سے پیش کیا جاسکتا ہے "انا" میں سات منظر ہیں [illegible] اسٹیج پر پیش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی، ضرورت کے وقت وہ چابکدست انگریزی ڈرامہ نویسوں کی طرح تشریحات [illegible] بھی پیش کرتی ہیں، مثلاً "دوشالہ" کا پہلا منظر یوں شروع کرتی ہیں -

(ایک پتلی سی گلی کے آخر میں ایک چھوٹا سا مکان ہے، جس کے دروازہ پر ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ [illegible] کی تعفن اور ننھی سی انگنائی میں ایک بکری بندھی ہوئی ہے جس کے پاس روٹی کے سوکھے [illegible] سامنے کی کوٹھری میں ایک نحیف اور پچکے ہوئے گالوں کا بوڑھا ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھا چلم پی [illegible]

ڈرونی آنکھیں چاروں طرف پھرا کر کوٹھری کی تاریک چھت پر جما دیتا ہے۔ مکڑیوں کے جالے اور دیمک کے سوراخوں سے عجیب بھیانک سی ہو گئی ہے"۔)

اگرچہ کردار بھی اس تشریح میں شامل ہو گیا ہے مگر تشریح مختصر اور کامیاب ضرور ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ کردار کو کتنے فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے، گویا یہ کامیاب تشریح کردار کی کامیاب "پردہ کشائی" ہے۔

مکالمے ڈرامہ میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں، انھیں کے ذریعہ کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ڈرامہ کی قائم رہنے والی کامیابی اس کے صحیح نفسیاتی عنصر کی موجودگی پر منحصر ہے اور مکالمہ ہی اس عنصر کو پیش کرتا ہے۔ مکالمہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ڈرامہ نگار اس طبقہ کی زبان پر عبور رکھتا ہو جس سے اس کے کردار متعلق ہیں۔ اور یہی وہ مشکل مقام ہے جہاں ہمارے ادب کے اچھے اچھے ڈرامہ نگار ٹھوکر کھا گئے، ہمارے اچھے اچھے ڈراموں کے وہ کردار جو جاہل ہوتے ہیں ایسی صحیح اور بلیغ اردو بولتے ہیں جو نیاز فتحپوری اور ل۔ احمد کی اردو سے ٹکر کھاتی ہے، لیکن "دوشالہ" میں اس قسم کی کوئی غلطی مشکل ہی سے نظر آئیگی۔ آمنہ نازلی کو طبقہ وار زبان اور تلفظ اچھی طرح معلوم ہے مثلاً " اتا " میں ایک گاؤں کا نقشہ پیش کیا ہے، میاں بیوی اپنی مخصوص زبان میں یوں باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

"دھنّو (بیوی) :۔ کے بات ہے کھوندو (لڑکا) کے چاچا! کا کہو سے لڑکے آئے ہو؟

چرنجی (شوہر) :۔ نا بابا ہم کریب کس برتے پر لڑتا۔

دھنّو :۔ آج تو تم تڑکے ہی چلے گئے، کا پھر بھی مجوری نا لی"

"دوشالہ" کے ڈراموں پر اس مختصر فنی بحث کے بعد ان کے موضوع کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔

"دوشالہ" کے بیشتر ڈرامے لطیف مزاح کے بلندترین نمونے ہیں مثلاً "دوشالہ" یا "استانی جی"۔ مزاح کی یہ لطافت آمنہ نازلی کے لئے مخصوص ہے، ان کے مزاح کا انداز ہمارے دوسرے مزاح نگاروں سے قطعاً جداگانہ ہے اور ان کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ مزاح کی اس لطافت کے ساتھ ساتھ آمنہ نازلی کے یہاں مقصد کی جلوہ گری بھی موجود ہے ان کے ہر ڈرامہ میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

آمنہ نازلی کی ہنسی کہیں کہیں زہرخند میں بدل جاتی ہے اور وہ شکر میں لپیٹ کر تلخ دوا پیش کرتی ہیں ان کے بعض ڈراموں کی آغوش میں جنت میں سموئی جہنم کی گرمی بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر دوشالہ کو لے لیجئے، مزاح کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہوئے بھی یہ ڈرامہ بے حد تلخ ہے یعنی مفلسی انسان کی فطرت کو اس قدر پست کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کے مرنے کا انتظار کرتا ہے۔ اسی طرح "استانی جی" اور بعض دوسرے ڈراموں میں نشتر زنی کی گئی ہے۔

آمنہ نازلی ڈرامے کے میدان میں تمام خواتین سے آگے ہیں اُن کی جگہ اس میدان میں مستقل بن چکی ہے۔ وہ اپنے ہمعصروں سے اتنا آگے بڑھ چکی ہیں کہ دوسرے ان کے پیچھے بھی صاف نہیں دکھائی دیتے بلکہ غبار راہ کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔

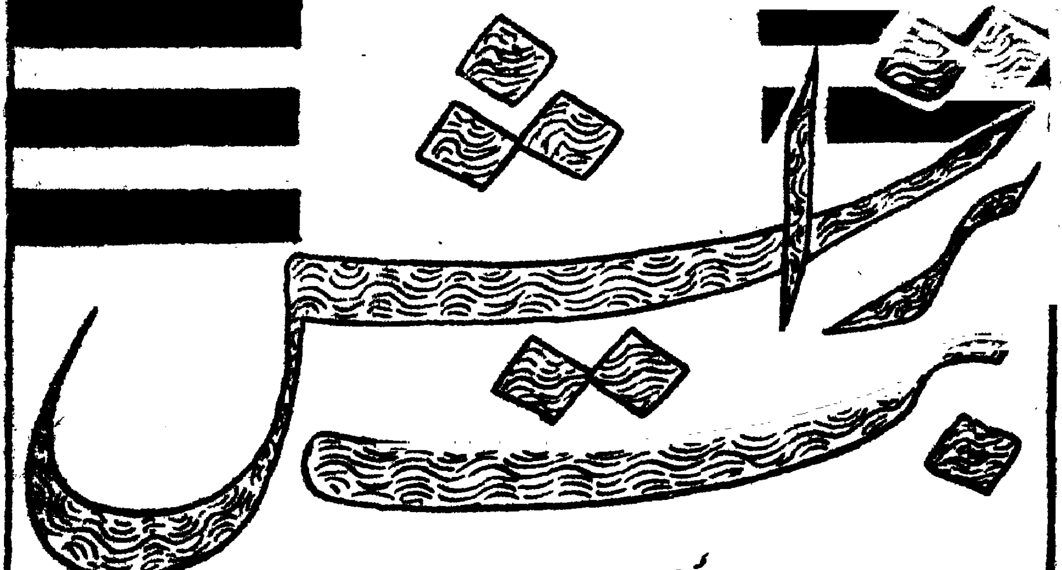
"دوشالہ" بحیثیت مجموعی ایک کامیاب ترین تصنیف ہے، جس کا مطالعہ ادب کے شیدائیوں کے لئے از بس ضروری ہے۔

حمیرا ثاقب

پروڈیوسر

اے، ایچ خان کا

نغمہ بار شاہکار



نمائش کے لئے تیار ہے!

ستارے

شیریں، ہریش، فریدہ

غلام قادر، بیج شرما

حیدری، طاہرہ، نوازش

اور پران

ہدایات

افضل جہانگیر

بی، ڈی، گارگا

موسیقی:۔ غلام حیدر

آرٹ:۔ سوبھا سنگھ

گانے:۔ امین گیلانی

پروڈکشن منیجر

رفیق دلشاد

حقوق تقسیم کے لئے لکھئے:۔

بتکدہ، راوی روڈ، لاہور



نمائش کے لئے تیار —

ستارے

شیریں، ہریش، فریدہ

غلام قادر، بیج شرما

حیدری، طاہرہ، نوازش

اور پران

ہدایات

افضل جہانگیر

بی ڈی گارگا

— حقوق تقسیم کے لئے لکھئے:

بتکدہ، راوی روڈ، لاہور

خوش خبری!

برائے انگریزی دوا فروشان!!

ہم حسب ذیل کمپنیوں کے سول ایجنٹس اور اسٹاکسٹ ہیں۔ ان کمپنیوں کا مال مقررہ نرخ اور کمیشن سے حاصل کیجئے!۔

کمپنیوں کی تفصیل

۱۔ پارک ڈیوس اینڈ کو ڈیٹ رائٹ امریکہ۔
۲۔ شارپ اینڈ ڈھوم فلاڈیلفیا۔ امریکہ۔
۳۔ ایف۔ ہاف مین۔ لاروچی اینڈ کو لمیٹڈ باسل۔ سوئزرلینڈ
۴۔ ہالی وڈ بیوٹی میکرس۔ ۱۰۔ باتھ ویل سٹریٹ گلاسگو (اسکاٹلینڈ)
۵۔ جے، ایل۔ موریسن۔ انڈیا لمیٹڈ بمبئی۔
۶۔ بے۔ اینڈ بیکر انڈیا لمیٹڈ بمبئی۔
۷۔ اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ کلکتہ۔
۸۔ اسٹینڈرڈ فارمی سوٹیکل ورکس۔ لمیٹڈ کلکتہ۔
۹۔ یونین ڈرگ کمپنی۔ لمیٹڈ کلکتہ۔
۱۰۔ پرل کمیکل انڈسٹریز۔ کلکتہ۔
۱۱۔ بنگال کمیکل اینڈ فارمی سوٹیکل ورکس لمیٹڈ کلکتہ۔
۱۲۔ بٹوکرسٹو پال اینڈ کو لمیٹڈ۔ کلکتہ۔
۱۳۔ الیمبک کیمیکل ورکس کمپنی لمیٹڈ۔ کلکتہ۔
۱۴۔ بی، کے براورس۔ پرنسس اسٹریٹ، کلکتہ۔
۱۵۔ پرل اینڈ کو وکٹوریہ گارڈنس بمبئی۔
۱۶۔ فروٹیکو فارمی سوٹیکل پریپریشنس سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی
۱۷۔ کھیتو کر پروڈکٹس۔ لمیٹڈ۔ کراچی

المشتہر

منظور حسن بی۔ اے مینیجر

نادرہ الائیڈ ایجنسیز (رجسٹرڈ)، اختر منزل بھوپال

باؤلین (رجسٹرڈ)



بچوں کی آنکھوں کی لاثانی دوا

بچوں کے پیٹ کے درد، پیٹ پھولنے، مروڑ اور کالی کھانسی وغیرہ کے لئے باؤلین سے بہتر کوئی دوسری دوا نہیں دانتوں کے نکلتے وقت باؤلین کا استعمال حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے۔

تیار کنندہ: دی باب کیمیکل ورکس بمبئی نمبر ۲

نمبر ۲ و ۳ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سول ایجنٹس برائے سی، پی، برار، سی، آئی۔ راجپوتانہ | نادرہ الائیڈ ایجنسیز (رجسٹرڈ) ہیڈ آفس اختر منزل بھوپال

نوٹ:۔ اسٹاکسٹ ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

بلا کی طاقت پیدا کرنیوالی

رستو

اس کے استعمال سے خون میں تازگی جسم میں طاقت اور دل و دماغ میں فرحت پیدا ہوتی ہے

دا تقسیم کنندگان برائے وسط ہند:

میسرز نادرہ الائیڈ ایجنسیز (رجسٹرڈ)

ہیڈ آفس

اختر منزل بھوپال

نوٹ:۔



ریڈ روز ہیر آئل

سے

آپ بالوں میں حیرت انگیز
انقلاب پیدا کر سکتے ہیں



Hazex

کانکریٹ برلنٹائن

بالوں کی
بہترین آرائش کے لئے
استعمال کیجئے



Hazex

سنٹرل انڈیا اور راجپوتانہ کے ایجنٹ :-

میسرز نادرہ الائیڈ ایجنسیز (رجسٹرڈ)

اختر منزل بھوپال ٭

No 3

پہلا انعام ۱۲۰۰
دوسرا انعام ۷۰۰
تیسرا انعام ۵۰۰
چوتھا انعام ۱۰۰
(زیادہ سے زیادہ حل بھیجنے والے کو)

دہلی

اردو انعامی معمے (رجسٹرڈ)

ڈھائی ہزار روپے کے انعامات

Rs. 2500.

۲۵۰۰

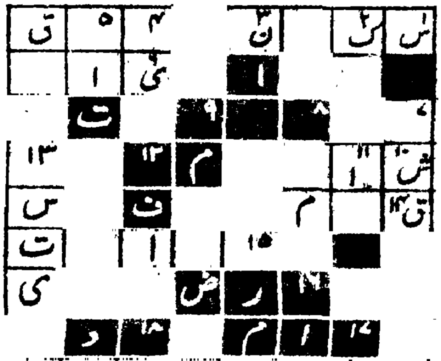
معمّا نمبر ۳

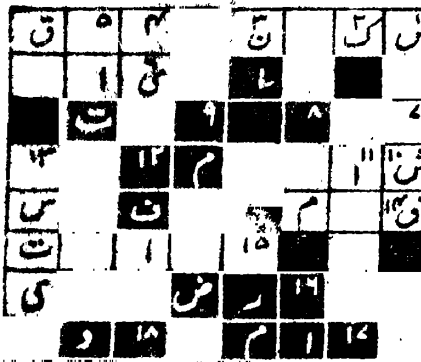
اُردو کا سب سے پہلا معیاری معمّا

اُردو انعامی معمے نمبر ۳ (رجسٹرڈ) جامع مسجد دہلی

اشارے سیدھے

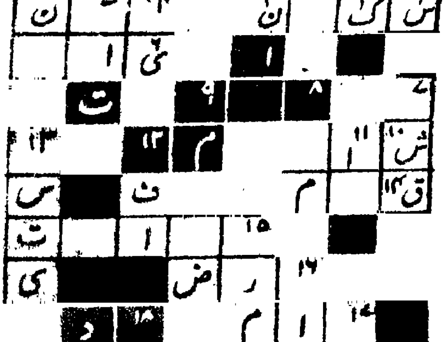
آڑے اشارے





نمبر ۱ عہ ایک روپیہ

نمبر ۲ عہ ایک روپیہ



نمبر ۳ آٹھ آنے

میں نے قواعد و شرائط کو بغور پڑھ لیا ہے اور اس معمے میں شرکت کرتے ہوئے مجھے اقرار ہے کہ ججوں کا فیصلہ ... آخری ...

۱- نام و پتہ (خوشخط)

۲- نمبر رسید منی آرڈر یا کراسڈ پوسٹل آرڈر (براہ کرم ٹکٹ یا نوٹ ملفوف نہ کیجئے) ... کل تعداد کوپن ...

نام اخبار یا رسالہ جس سے معما حاصل کیا ۳- دستخط

... سے کم پُر کرنا چاہیں تو خالی کوپن بھی ساتھ روانہ کیجئے کیونکہ ...

اشارے سیدھے

(۱) ہمارے ملنے آپ سے ذہانت اور یہ دونوں کے طلبگار رہیں۔ (۴) بعض محنتی طالب علم امتحان کو بہت قبل پورا یہ یاد کر ڈالتے ہیں۔ (۶) سچی الفت کرنے والے محبوب کی دی ہوئی اس کو بھی نعمت سمجھتے ہیں۔

(۱۰) زیادہ عرصہ تک آپ اس اِس کو قائم نہیں رکھ سکتے جس کی بنیادیں مصنوعی ہوں۔ (۱۴) حکومت کرنے کے اہل غالباً وہی ہوتے ہیں جو نازک حالات میں اس کو صحیح اُٹھانا جانتے ہیں۔ (۱۵) جاہل طبقے سے بسر آنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ کا نی یہ رکھتے ہوں۔ (۱۶) یہ چھوٹا ہو یا بڑا اکثر دور اندیش لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے میں کبھی دیر نہیں کرتے۔

(۱۷) ہندستان میں کتنے ہونگے ایسے لوگ جو سیاست میں محض اِس کی خاطر حصہ لیتے ہوں۔ (۱۸) بلا سوچے سمجھے یہ کرنا سمجھداروں کا شیوہ نہیں۔

اشارے کھڑے

(۲) آج کے بعد۔ (۳) فلمی دنیا میں غالباً وہی ایکٹریس کامیاب ہو سکتی ہے جسے اچھے گانے کے ساتھ اپنا یہ دکھانے پر پوری قدرت حاصل ہو۔ (۵) بدنصیب شاید سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن محبوب کے ساتھ ایک آخری اِس کو فراموش نہیں کر سکتا۔ (۷) قماربازی کے ساتھ اِس کو وابستہ کرنا برباد ہو جانا ہے۔ (۸) اِس کو ایک بار غلط سمجھ کر تو عرصہ تک قابو میں نہیں آتا۔ (۹) بچوں کو دیکھ کر بالوں والے کی آنکھوں کا یہ ہو جانا کچھ فطری سی بات ہوتی ہے۔

(۱۱) کتنے لائق عزت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اِس کے اکثر مدارج سے گذرنے کے بعد بھی اپنی زندگی کا مقصد خدمت سمجھتے ہیں۔ (۱۲) بدمزاج محبوب کی پشیمانی وہ چیز ہے جو اُسے یہ کرنے سے کبھی باز رکھتی ہے۔ (۱۳) اِس کی حالت میں عبادت کرنا شاید ہی کسی مذہب نے پسند کیا ہو۔ (۱۵) عورتوں کا محض عادتاً یہ کرنا غالباً ان کے موروثی اثرات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

فیس داخلہ

فی کوپن ۸ـ لیکن ہر دو کوپن کیساتھ تیسرا ۸ـ ر لگایا جائیگا یعنی فی تین کوپن دو روپے آٹھ آنے بشرطیکہ تینوں ایک ہی نام بھیجے جائیں۔ جتنے کوپن چاہیں سادے کاغذ پر (معہ اقرار نامہ) نقل کرکے بھیجے جا سکتے ہیں۔ تمام حل یا کوپن معہ فیس داخلہ صرف منی آرڈر یا کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ذریعہ اس پتہ پر آنے چاہئیں: منیجر اُردو انعامی معمے نمبر ۳ (رجسٹرڈ) جامع مسجد دہلی۔ معمولی خط کے ضائع ہو جانے کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی، البتہ جسٹری شدہ بھیجنے پر وصولی کی رسید آپکو مل سکتی ہے۔ لفافہ کی پشت پر صرف تعداد حل خوشخط اور اپنا نام خوشخط لکھئے۔ مختلف دوستوں یا عزیزوں کے حل اور فیس داخلہ یکجا روانہ کئے جا سکتے ہیں۔ آخری تاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۶ء ہے۔ تمام وہ حل یا داخلے وصول شدہ سمجھے جائیںگے، جو اس تاریخ تک معہ کراسڈ پوسٹل آرڈر ملجائیں یا جن کی رسید منی آرڈر ملجائے، خواہ منی آرڈر اس تاریخ کے بعد وصول ہو، لیکن ۶ جنوری ۱۹۴۷ء تک ہمیں وصول ہو جانا چاہئے۔ ورنہ حل شریک مقابلہ نہیں کیا جائیگا۔

تاریخ اشاعت صحیح حل معہ فہرست انعامات روزنامہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۰ جنوری ۱۹۴۷ء میں دیکھئے۔ اگر ۲ر فیس داخلہ کے ساتھ بھیجدیئے جائیں تو صحیح حل اور فہرست انعامات آپکو براہ راست روانہ کر دی جائیگی۔

شرائط و قواعد کے لئے ملاحظہ کیجئے نگار بابت ماہ نومبر ۱۹۴۶ء، یا چھ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر ہم سے براہ راست طلب فرمائیے۔

منیجر اُردو انعامی معمے نمبر ۳ (رجسٹرڈ) جامع مسجد دہلی

جنوری ۱۹۴۷ء کے چند فنکار!

شور علیگ	احمد ندیم قاسمی
مسعود اختر جمال	پریم ناتھ پردیسی
ادا بدایونی	آل رضا
احتصار نیوتنوی	ناہید عالم
کمال احمد صدیقی	اختر ہوشیارپوری
یزدانی جالندھری	منظر سلیم
لطیف انور	روش صدیقی
تحسین سروری	عاتق شاہ
اطہر پرویز	انور سدید
شمس نوید	شفقت رضوی
رئیس امروہوی	اسد بھوپالی

Regd. No. N. 9

…mbay Office :—
…, Bellasis Road,
…OMBAY 8.

THE AFKAR MONTHLY
BHOPAL.

Lahore Offic…
8, McLeod …
LAHOR…

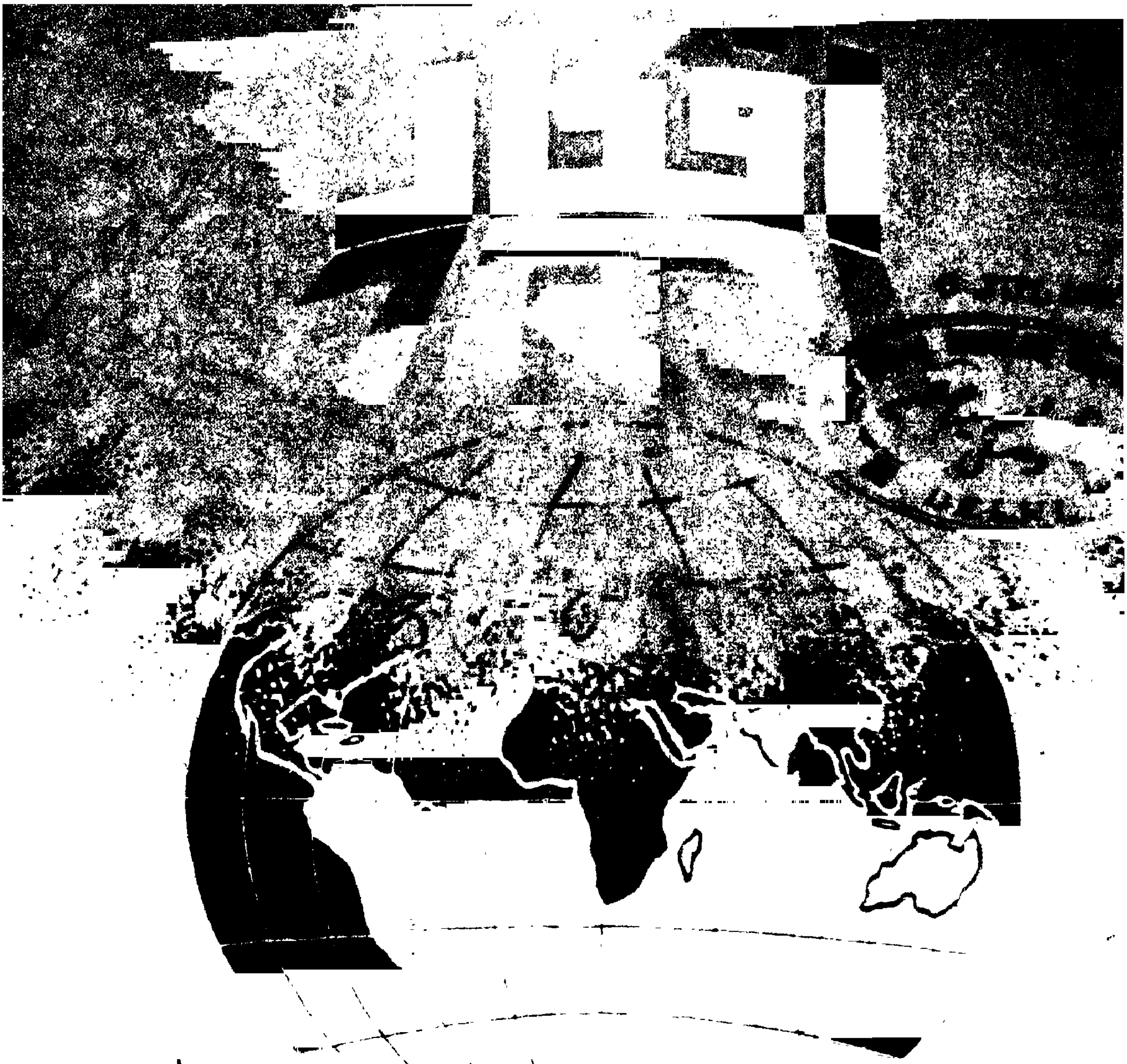
… 4. } DECEMBER 1946. { No.

ایک نیا فلمی ستارہ



نیلا

ONLY TITLE PRINTED AT THE BHANDARI PRESS, BHOPAL.



The

MONTHLY ASKAR

BHOPAL

RICE

ENAS

ماہنامہ بھوپال

افکار

جولائی سنہ ۱۹۴۷ء

ادارہ

رشدی ۔ صہبا

بمبئی آفس — دہلی آفس
۲۶۴، بلاسس روڈ بمبئی — فیاض گنج بہادر گڑھ روڈ، دہلی
ناگپور آفس — حیدرآباد آفس
موہن منزل چھاؤنی ۔ ناگپور — ۳۰۰، رسالہ عبداللہ قدیم حیدرآباد (دکن)

زرسالانہ ۸ — سہ ماہی

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

جلد ۵ — شمارہ ۵

خیابان

نوٹ

خاکے

:از:

صہبا لکھنوی

خاکے۔
زندگی کے رنگا رنگ خاکے ہیں جن میں صہبا نے انوکھے اور اچھوتے انداز سے رنگ بھرا ہے ــــ!

خاکے۔
میں آپ کو سوچ کی نئی راہیں، گرد و پیش کے حقیقت افروز نقوش اور اسلوبِ نگارش کی انفرادی خصوصیات ملیں گی۔!

خاکے ــ صہبا کا تازہ مجموعۂ کلام ہے، جو عنقریب پیش کیا جائیگا!۔

آبشار

:از:

رشدی

افکار کے ایک سالہ افسانوں کا انتخاب

ــ:لکھنے والے:ــ

مرزا ادیب، ابراہیم جلیس، احمد ندیم، صدیقہ بیگم، وجاہت سندیلوی، تسنیم سلیم چھتاری، پریم ناتھ پردیسی، ناہید عالم، پرتھوی ناتھ شرما، رشدی، عاشق شاہ اور قمر جمالی ــــ یہ وہ فن کار ہیں جن کی تخلیقات اردو ادب میں مستقل جگہ رکھتی ہیں۔ "آبشار" ان فنکاروں کے بہترین افسانوں سے ترتیب دیا گیا ہے، ہر افسانہ کی تکنیک، منفرد اسلوب اور اچھوتے پلاٹ کا آئینہ دار ہے

یہ انتخاب

عنقریب پیش کیا جائے گا

اشاریہ

ترقی پسند ادب کی تحریک وقت کی اہم ترین آواز بن گئی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے یہ ننھا منا پودا کافی سرسبز ہو گیا ہے اور باد سموم کے جھونکے جو اس کو جھلس دینے کے لئے غضبناک ہو رہے تھے خود اپنی "آتش شوق" میں جل رہے ہیں۔ ترقی پسند ادب نے فکر و نظر کی ایک نئی راہ کھولدی ہے۔ پڑھنے والوں نے بھی ترقی پسندی کی حمایت کی اور زمانہ نے ادب کے حیات آفریں اور صحت مند عنصر کے حق میں فیصلہ دیا۔ جس ادب نے زمانہ کے ساتھ ساتھ کروٹ لی اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا اور مستقبل کی جھلکیاں بھی دکھائیں آج وہی ترقی کر رہا ہے۔ ادب اور زندگی کا تعلق بہت گہرا ہو چکا ہے، ماضی کی مرثیہ خوانی اور مستقبل کی جد و جہد سے فرار اب صرف رجعت پسندوں ہی کا مطمح نظر بنی ہوئی ہے اور وہ اپنے اس قسم کے تخیلی اور بیمار ادب کے تانے بانے میں معاشرہ کے عفونت انگیز ناسوروں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری تحریک ہر حصۂ ملک میں اپنے مضبوط حلقے قائم کر چکی ہے اور ہندستان کے سربرآوردہ اور ممتاز فنکار اس سے وابستہ ہو چکے ہیں جن کے ترقی پسندانہ افکار تعمیری طور پر مسائل حیات کو سلجھانے، سماجی پستی اور افلاس کو دور کرنے کے لئے عوام کو جگا رہے ہیں۔ چند دنوں سے کچھ شکست خوردہ ذہنیت کے ادیب اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کی آڑ میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر نہایت ہی غیر شائستہ اور رکیک الزامات لگا کر اپنے دلوں کو تسکین دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے مخالفین شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مصائب سے کڑی آزمائشوں میں سے گذر کر عوام اب اپنے اچھے برے کو سمجھنے لگے ہیں، اور مذہب کا نام لیکر انھیں فریب نہیں دیا جا سکتا۔ ادب میں مذہبیت کو غلط طور پر داخل کر کے مخالفین اپنی معصومیت کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، ــــ لیکن کیا کیا جائے کہ عوام اب ایسے ادب کو قبول کر رہے ہیں، جو زندگی کی لئے قابل قدر ہو، سماج کے واسطے تعمیری صلاحیتوں کا حامل ہو اور بھوکوں ننگوں اور مفلسوں کو سہارا دے سکے ــــ ترقی پسند ادب نے صحت مندانہ قدروں کو راہ دی ہے ــــ اور سچی زندگی کی ترجمانی کی ہے ــــ رنگین ترانے الاپنے والے تخیل پرستوں پر یقیناً اس وقت سکرات موت کا عالم طاری ہے اور وہ کشمکش کی حالت میں اپنے کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں ــــ ایسے نادان مخالفین کو محسوس کر لینا چاہیئے کہ وقت کے صحیح تقاضے ابھر آئے ہیں، ہوا کا رخ بدل چکا ہے۔ زندگی اور ادب کے دھارے ایک ہی سمت بہہ رہے ہیں۔ ترقی پسندوں کا محاذ بہت مضبوط ہو چکا ہے، ان کی تنظیم مستحکم ہو گئی ہے اور وہ ایسے ادبچے داروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ــــ وہ خاموشی کے ساتھ عریاں حقائق کے روبرو اپنے ٹھوس عمل سے تاریخی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

اب کے تین طویل افسانے اور ایک مضمون ہے۔ "چکراتے ہوئے" بہار کے ابھرتے ہوئے نوجوان اشتراکی فنکار انور عظیم کا شہپارہ ہے جس میں ترقی پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ "بازگشت" ــ پروین رشدی نے کھانڈیکر کے مرہٹی ناول کا ملخص نہایت ہی شستہ اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے، جو یقیناً پسند کیا جائیگا۔ "یہ ہے ایک گلی" عاتق شاہ کا یہ کامیاب طنز آمیز نفسیاتی تجزیہ ہے۔ "ترقی پسند ادب" ــ ضیا عظیم آبادی نے بڑی محنت سے یہ مقالہ لکھا ہے اور ادب کے موجودہ رجحانات پر محققانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

آبگینے ــــ پہلے کی طرح اس بار بھی بہار آفریں ہیں ــــ جس میں آج کے زندہ شاعروں کا اچھوتا تخیل کار فرما ہے ــــ "اشارے"۔ "سوتے جاگتے"۔ "زبان و مکاں"۔ "سماج کے سائے تلے"۔ "آج"۔ "مشورہ" اور "نیا دور" وغیرہ اس شمارے کی بہترین تخلیقات ہیں، جنھیں آپ کے پسندیدہ اور محبوب فنکاروں نے پیش کیا ہے۔

ادارہ

مدیر

تدبر

ہندوستان اور پاکستان

۳ جون ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس دن آخرکار برطانوی حکومت نے ہندوستان کو اختیارات سونپنے کا فیصلہ کر دیا۔ برطانوی اسکیم کی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان اور پاکستان کی دو ڈومینینیں قائم ہوگئی ہیں اور سیاسی حالات کی کشتی ہیں، ہندوستان کے مستقبل کی تصویر صاف نظر آرہی ہے۔ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان اگرچہ اپنی اصلی حیثیت میں نہیں نقطۂ شکل میں مان لیا گیا ہے — کانگریس نے تقسیم بنگال اور پنجاب کا جو مطالبہ کیا تھا وہ بھی پورا ہو چکا ہے۔ بنگال اور پنجاب اب دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ صوبۂ سرحد میں برطانوی اسکیم کے مطابق استصواب جمہور ہو رہا ہے۔ بلوچستان بھی شریک ہے۔ سندھ پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ دے چکا ہے — ہندوستان کے جو لیڈر تقسیم کے سخت مخالف تھے آج انھیں اس تقسیم سے ہندوستان کے تعطل کے خاتمہ کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے، جہاں تک ملکی تقسیم کا تعلق ہے، یہ ہندوستانی قائدین کی سیاست کا نتیجہ ہے اور اس کی پوری ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت نے بار بار ایسی اسکیمیں پیش کیں کہ باہمی مصالحت سے ہندوستان کی گتھی سلجھ جائے اور دونوں بڑے فرقے رواداری اور خلوص کے جذبے سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ لیکن یہی ایسا نہیں ہو سکا۔ ہندوستانی سیاسی انقلاب کے آخری دور میں کانگریس نے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ مسلم لیگ کو دو قومی نظریہ پوری طرح ابھرانے اور تقسیم کو قطعی بنا دیا — بہرحال اب یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں نے برطانوی پلان بجنسہٖ قبول کر لیا ہے — اور کل جو چیز ناقابل تصور تھی آج وہ ٹھوس شکل میں نظر آرہی ہے۔ انگریز جون ۱۹۴۸ء کے بجائے اگست ۱۹۴۷ء میں ہی ہندوستانیوں کو اختیارات سونپ کر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی تفویض اختیارات کا بل اس ماہ کے آخر تک منظور ہو جائیگا اور ہندوستان و پاکستان کو علیحدہ علیحدہ اختیارات دے دیئے جائیں گے۔

اس وقت ریاستوں کا مسئلہ ضرور تشویش انگیز بنا ہوا ہے۔ بعض ریاستوں نے برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ہے، کانگریس نے ریاستوں کے متعلق بہت ہی غلط روش اختیار کر لی ہے اور وہ اپنے اثر و دباؤ سے ریاستوں کو دھمکیاں دے رہی ہے، برخلاف اس کے قائد اعظم نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ ریاستوں کو اپنی آزادی کا پورا حق ہے۔ اس وقت جبکہ ہندوستانی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے اور تقسیمی کمیٹیاں اپنے کاموں میں مصروف ہیں کانگریس کی جماعت کا ریاستوں پر یہ دباؤ ڈالنا کہ وہ اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اعلیٰ تدبر کی مثال نہیں — یہ درحقیقت [illegible] ہندوستان اور پاکستان کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں بن جائیں گی تو پھر ریاستیں خود آسانی سے [illegible] ساتھ دینا چاہئے — اب ماضی کی تلخیوں کو یاد کرنا فضول ہے۔ ہندوستان دو ہو کر بھی ایک [illegible]

اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے دونوں حکومتوں کی ہم آہنگی بیحد ضروری ہے [illegible]

اپنے علاقوں کے مصیبت زدہ عوام کی حالت سدھارنے کی طرف سب سے [illegible]

فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت کو دور کرنا لیڈروں کا فرض ہے — [illegible]

کھیلی جائیگی — کب تک انسانیت اور تہذیب — [illegible]

افکار بھوپال
جولائی ۱۹۴۷ء

احمد ندیم قاسمی

یہ فنکار ——!

احمد ندیم قاسمی

صبا بک

اگر صرف "بہت پیارا انسان" کہنے سے آپ تمام انسانی خصوصیات کو حاطہ کر سکیں تو مجھے کہنے دیجئے کہ احمد ندیم بھی اُن میں سے ایک ہے اور جو صرف محبت کرنے اور محبت کئے جانے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ ندیم کہنے کو عمر رسیدہ ہے نہ جہاندیدہ لیکن وہ بات جب کہیگا پتہ کی —— آپ اُس کی باتیں سنکر چونک پڑیں گے، اکثر بیٹھے بیٹھے اچھل بھی پڑیں گے —— یقین کیجیے!۔ قدرت کا ہر اقدام بے بے مثل ہے۔ جو کام جس کے سپرد کیا گیا ہے وہ اُس کی تکمیل کر رہا ہے۔ کرتا رہیگا۔ یہ ایک حقیقت ہے —— ناقابلِ انکار —— ! ندیم نے زندگی کے گرم و سرد حالات کو دیکھا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔ صرف سمجھا ہی نہیں پہچانا بھی ہے اور یہی پہچان اُس کا وہ اعلیٰ ادبی شعور ہے جس کے آگے پنجاب کی سرزمین ہی نہیں اور ہندستان کی ادبی قدریں بعد میں سرنگوں ہیں —— کون نہیں جانتا کہ وہ متضاد خصوصیات رکھتے ہوئے بھی ہر جگہ انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ اُس کی طبع رواں اور موئے قلم کی جنبشیں کہیں تھک کر رکنا نہیں جانتیں۔ جب گرد و پیش کے روح فرسا تاثرات ہر مدتک اُس کے ذہن و دماغ کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں تو وہ افسانہ لکھتا ہے —— لکھتا چلا جاتا ہے —— ماحول کی تلخی، پنجاب کی دیہی معاشرت اور ہندستان کے کروڑوں بھوکوں ننگوں اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کی زندگی کی عکاسی اُس کا مشغلہ بن جاتا ہے اور جب کبھی اُس میں سویا ہوا انسان انگڑائی لیکر بیدار ہو جاتا ہے تو وہ سنگھٹ کی صبحوں اور شاموں میں ڈوب کر شعر کہتا ہے۔ کہتا رہتا ہے۔ لیکن ان رومان پرور فضاؤں میں بھی اُس کا قلم زندگی کے بوقلموں گوشوں کو نظر انداز نہیں کرتا —— وہ اپنے قلم سے وہی کچھ لکھتا ہے —— جو دیکھتا ہے —— جسے دیکھنے کے لئے قدرت نے اُسے غلام آباد کے ایک غیر معروف علاقہ میں جنم دیا ہے —— اس غیر معروف علاقہ کو لوگ انگہ کہتے ہیں۔ انگہ جہاں ندیم نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے گذارے ہیں —— جہاں اُس نے شعوری اور لاشعوری کیفیات کو سمجھا اور پرکھا ہے —— جہاں اُس نے گہوارۂ طفولیت سے ہوش کی منزل تک غم و خوشی کے زمانے دیکھے اور بہتر زندگی کی تعمیر کی طرف قدم بڑھایا ——!

ندیم بحیثیت ادیب و شاعر شہرت کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں —— اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُس کی فنی قدریں مسلسل ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہیں —— کرتی رہیں گی ——! یہی وہ اُس کا اعلیٰ شعور ہے جو اُسے دوسرے فنکاروں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے —— یہی وہ اُس کی اعلیٰ ذہنی تربیت ہے جو برابر اُس کے صحیح مقام کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ بڑھا چلا جا رہا ہے —— اور مجھے تو بجز ندیم کی وہ شاعرانہ صلاحیتیں ہی پسند ہیں جن میں اُس کی صحیح اُس کے احساسات و جذبات اور قلب کی دھڑکنیں دھڑکتی محسوس ہوتی ہیں۔ صرف اُس کی ہی نہیں —— ہر پڑھنے والے کی —— ہر حساس انسان کی —— ہر اُس انسان کی جو دل رکھتا ہے —— جس کے دل کی دھڑکنوں میں دھڑکن ہوتی ہے —— جو صرف اس لئے دھڑکتی ہیں کہ دوسرے کے دل بھی دھڑک سکیں —— زندگی بھی تو شاید ایک دھڑکن ہی ہے ——!

اور آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ اب وہ انگہ کی وادیوں سے دور اپنا ادبی [illegible] پہنائیوں میں راتھر کی لہروں پر مست خرام ہے —— کاش یہ خرام اُس کی سیماب صفت طبیعت کو پسند آجائے! اور وہ خود کو زندگی کے [illegible] کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال سکے ——!

سنگ و خشت

دیرش

آجکل کچھ قادریوں، بدایونیوں اور افغانیوں نے معلوم ہوتا ہے کہ "ترقی پسند ادب" کی تابناکیوں کے سامنے اپنے "چراغ خانہ" کو بجھتا دیکھ کر "شمع محفل" بننے کے لئے بحر ہند کے پایاب ساحل پر غوطے لگانا شروع کر دیئے ہیں اور مذہب کا نام لیکر اپنی "سخت جانی" کا ثبوت دیتے ہیں ـــــ معاملہ اگر صرف یہیں تک ہوتا تو اسے "برساتی ٹمیٹے" سمجھکر ٹالا جا سکتا تھا ـــــ لیکن پچھلے دنوں ان "مفکروں" نے بمبئی میں ترقی پسند مصنفین کے جلسہ کی "ریہرسل" تک کر ڈالی

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

"آستانہ" دہلی ـــــ وہ صحیفہ ہے جو نام نہاد ترقی پسندی کے موجودہ دور میں مسلمان نوجوانوں کو الحاد اور بے دینی کے تباہ کن سیلاب سے بچانا چاہتا ہے" ـــــ لیکن اس تبلیغی رسالہ کے اگلے صفحات پر جلی عنوانات سے نوجوانوں کے کان میں یہ مشورہ دیا گیا ہے :ـــ

"جوانی کی واپسی کا ٹکٹ خرید یئے"۔ "پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی" "بغیر آپریشن ـــــ شرطیہ علاج" ـــــ کیا مدیر "مستحسن" اس "صنعت تضاد" پر روشنی ڈالیں گے ـــــ یہ اور بات ہے کہ یہ سب گھر کی چیزیں ہیں ـــــ تبلیغ کے ساتھ ـــــ "اعادۂ شباب" کتنا خوش نما اور ترقی پسندانہ سودا ہے ـــــ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

ہمارے دوست مشہور افسانہ نگار مرزا ادیب لاہور سے لکھتے ہیں :ـــ "مزے سے بھوپال میں بیٹھے ایڈیٹری کر رہے ہو، تمہارے دشمنوں کو خبر لاہور میں کیا ہو رہا ہے ـ ہم غریبوں پر قیامتیں گذر گئی ہیں اور گذر رہی ہیں ـ ہماری مکانات بھی شعلوں کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے! دیواریں گر گئی ہیں سامان کا بہت نقصان ہوا ہے، کتابوں کا ذخیرہ ضائع ہو گیا ہے، کافی عرصہ سے ادبی دنیا کی خبر نہیں ـــــ کیا ہو رہا ہے آجکل ـــــ ہم جانتے ہیں مدہ دلان پنجاب افسردہ ہیں ـــــ مت گھبراؤ خاک و خاکستر میں ایک نئے نظام کی تعمیر نظر آ رہی ہے ـ ان واقعات سے ہماری ایڈیٹری کا سارا مزہ کرکرا ہو رہا ہے ـ

جموں (کشمیر) سے موہن یاور خوش خبری سناتے ہیں :ـ "اگر ہو سکا تو آئندہ ایک افسانہ بھیجوں گا ـــــ جس کے تخیل تک کرشن چندر کے اچھوتے خیال نہ پرواز ہوئے ہونگے ـــــ وہ شاہکار جسے بارش کے دنوں میں لکھنے کا تہیہ کر چکا ہوں، جوں ہی بارش ہوئی ـــــ لکھ کر حاضر خدمت کروں گا ـــــ" مہربان گرامی! آپ کی تخیل پردازی تو قابل داد ہے ـــــ ہاں خوب یاد آیا، پانی پڑتے ہی بہت سی چیزیں خود بخود ابھر آتی ہیں ـ کرشن چندر کا تخیل ـــــ ؟ اب آپ کے سامنے کہاں پرواز کریگا ـــــ وہ تو سلولائڈ میں جذب ہو کر رہ گیا ہے ـــــ ذرا ٹھہریئے آپ کے فقرے میں یہ کیا چھپا ہوا ہے؟ مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے!ـ

اب ذرا دفتر شاہی کی ایک ناقابل برداشت "ترک تازی" ملاحظہ فرمائیے ـــــ دلی کا ایک خط ہے :ـــ

"میری بھائی کی شادی ۲۰ مئی ۱۹۴۷ء کو ہونیوالی تھی میں نے ۶ مئی کو ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹیز کو ٹرک کے عارضی پرمٹ کی درخواست دی تاکہ ایک پرائیویٹ ٹرک آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جا سکے ـــــ" ۵ جون کو یعنی تقریب کے سات دن بعد جواب موصول ہوا کہ پہلے فیس اور اسٹامپ وغیرہ کے لئے ۱۲ھ ار بھیجدیجئے ـــــ کہیئے دفتری کارگذاریوں کا کیسا لاجواب شاہکار ہے!ـ

لارڈ ویول سابق وائسرائے ہند نے کہا: بچہ پیدا ہوتے وقت زچہ کے سخت درد ہوتا ہے ـــــ اس طرح انھوں نے تقسیم ہند کو دو بچوں کی پیدائش سے تعبیر کیا ہے ـــــ اب ہندوستانیوں کو غالب کی زبان میں یہ کہنے کا موقع نہیں ملیگا ـ

درد منت کش دوا نہ ہوا!

آبگینے

سلسلے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

اشارے

نہ دیکھ وقت سے کجلا چکے ہیں کتنے راگ
جواں ہیں دیکھ ابھی کتنے زمزموں کے سہاگ
جو کھلکھلا کے خود اپنے بھی غم میں ہنس نہ سکا   نزاکتِ غمِ خاطر نواز کیا جانے

کسے خبر کہ تلاطم ہیں کس سفینے میں
خرد کے زخم ہیں کتنے جنوں کے سینے میں
جو تر ہی نہ سکا ہو خود اپنے ہاتھوں سے   وہ "خانہ ساز" شرابوں کا راز کیا جانے

غبارِ غم میں جہاں پاؤں ڈگمگاتے ہیں
وہاں ہنسی کے بھی کتنے مقام آتے ہیں
گل و سمن میں الجھ کر جو رہ گئی ہو نگاہ   جمالِ برقِ نشیمن نواز کیا جانے

افق سے جھانکنے والی سیاہیوں کے ہجوم
دیئے جلا چکے کتنے کسی کو کیا معلوم
کھلا ہو چاند کے سائے میں جس کا رختِ سفر   وہ پھوٹتی ہوئی کرنوں کا راز کیا جانے

جہاں سفینے کناروں پہ ڈوب جاتے ہیں
اجالے میتِ نجم و قمر اٹھاتے جاتے ہیں
فریب خوردۂ منزل ہیں کارواں کتنے   یہ رازِ خضرِ مسافر نواز کیا جانے

نہ آفتاب کا غم کر نہ ماہتاب کا غم
نگاہ و فکر کی تو تیز کر قدم بقدم
[illegible] کہ ہے نجم و قمر کی نشانی   ترے ضمیر کی صبحوں کا راز کیا جانے

پروفیسر شور علیگ

سوتے جاگتے

آجتک خستہ و بوسیدہ لبادوں کے تلے — زندگی نیند کی آغوش میں ڈھلتی ہی رہی
۰۰ر حالات کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ — خود مہ و سال کی زنجیر پگھلتی ہی رہی
کتنی صدیوں کے پُر اسرار گھنیری بادل — چیختے اور گرجتے ہوئے گذرے ہیں یہاں
کتنے مفلوک زمانوں کے بھیانک سائے — تلخ افسانوں میں جکڑے ہوئے اٹھے ہیں یہاں
کتنے مبہوت مظالم کی کڑی دیواریں — سرد آہوں کو چھپائے ہوئے آراستہ ہیں
کتنے ناکارہ دماغوں کے تراشے ہوئے بُت — ذہن آدم کے ہر اک گوشہ میں پیراستہ ہیں
تنے تلخاب و ستم گیر حوادث سہہ کر — زندگی درد کو سینے میں دبا کر جاگی
ور پھر جاگ کے دیکھا تو وہی عالم تھا — وہی چیخیں وہی آہیں وہی بیدادگری
ہی حالت تھی تعفن زدہ میخانے کی — وہی ٹوٹے ہوئے ساغر تھے وہی پیمانے
ہی محفل وہی چہروں پہ جمی گرد ہراس — وہی دیپک تھا وہی رقص وہی پروانے
نہیں صدیوں کے پُر اسرار گھنیری بادل — آج بھی سر سے اسی طرح گذرتے دیکھے
نہیں مفلوک زمانوں کے بھیانک سائے — ذہن آدم کے ہر اک سمت بکھرتے دیکھے
۰ر ایسے میں لرزتی ہوئی سہمی ہوئی زیست — سر جھکائے ہوئے یوں سوچ رہی ہو جیسے

ابھی ظلمات کی پہنائی سی ہونگے تاباں
سُرخ شفاف ستاروں کے چمکدار دیئے

…رپوری

زمان ومکان!

خدا نہیں؟ - نہ سہی، ناخدا نہیں؟ - نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں، نہ سہی
تری طلب کا تقاضا ہے زندگی سری
ترے مقام کا کوئی پتہ نہیں، نہ سہی
تجھے سنائی تو دی - یہ غرور کیا کم ہے
اگر قبول مری التجا نہیں، نہ سہی
مرے چمن میں تو برسوں کے بعد پھول کھلے
تری بہار گری بر ملا نہیں، نہ سہی
تری نگاہ میں ہوں، تیری بارگاہ میں ہوں
اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی
میں ابتدائی شکھوں کا سہانے کی
مرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں، نہ سہی
شب سیاہ کی تاریکیوں کا ساتھ نہ تھا
کوئی ستارہ مرا رہنما نہیں، نہ سہی
نہیں ہیں سر دا کبھی حوصلے اڑانوں کے
وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں، نہ سہی

وہی ندیم - وہی حسن کا
ترے حضور اگر

سماج کے سائے تلے

مانا کہ سماج کے سائے تلے　دو روحوں کو آرام نہیں
خود ساختہ آقا کے دل میں　سختی ہے لچک کا نام نہیں

یہ بچے اور یہ عصمتیں　یہ دیوتا ہیں - کیوں دیوتا ہیں؟
ان ایسے دلوں کو کچھ نہ کہو　یہ دونوں جہاں کے مولا ہیں

کیا فکر انھیں گر طوفاں میں　امید کی نیا ڈولتی ہے
آہوں کی نازک شاخوں پر　دکھیا آشا پر تولتی ہے

معشوق و دنیا کی آنکھوں میں　کچھ فرق سفید و سیاہ نہیں
مجبور مگر مجبور رہا　مجبور نہیں مختار نہیں

دوشیزہ اونچے گھر کی کبھی　دیکھی [illegible] کی [illegible] ہیں
سپنے میں سماج کے بندھن بھی　[illegible] ہیں

لیکن میں سماج کی رسموں کو　لیلاؤں کو سولی تیری جدائی پر
روؤں ان ارضی فرشتوں کو　ان کی [illegible] ائی پر

گر ان کی جگہ ہم خود ہوتے　ہم کہتے یہ اپنا کام نہیں
مانا کہ سماج کے سائے تلے　دو روحوں کو آرام نہیں

اختر ہوشیارپوری

آج

یہ کون اداے خاص سے پہلو نشیں ہے آج!!
دُنیائے حُسن و عشق کے زیرِ نگیں ہے آج

پامالیوں کو اوجِ ثریا نصیب ہو
قبضہ میں مُشتِ خاک کے مہرِ مبیں ہے آج

فیضِ قدم تو دیکھئے کافر جمال کا!
کعبہ سی بڑھ کے اوج میں اک نقشِ زمیں ہے آج

مہکے ہوئے ہیں ارض و سما بوئے زلف سے
یوں دوش پر وہ سلسلۂ عنبریں ہے آج

شبنم فشاں عرق سی رُخِ لالہ فام ہے
قشقہ سے گلفروش کسی کی جبیں ہے آج

جیسے کنول کا پھول ڈبو دو شراب میں
چہرہ فروغِ بادہ سی یوں احمریں ہے آج

شہد و شہاب و شعلۂ و شبنم لیئے ہوئے
آلودۂ شراب، لبِ شکریں ہے آج

پڑتی ہے چھوٹ آئینۂ آفتاب پر
تابانیٔ جمال کی کچھ حد نہیں ہے آج

اللہ رے جوشِ حُسن کہ از فرق تا قدم
دیکھو نگاہ بھر کے جہاں دل وہیں ہے آج

تلخابۂ حیات میں ہے چاشنیِ مے
زہرابِ غم میں ذائقۂ انگبیں ہے آج

دل اس نگہ کے ناز اٹھانے میں محو ہے
کہہ دو غمِ جہاں سے کہ "فرصت نہیں ہے آج!"

چھائی ہوئی ہے قربتِ جاناں کی دلکشی
جس شے کو کائنات کی دیکھو حسیں ہے آج

وہ اور دل کے پاس یہ کیا انقلاب ہے؟!
مجھ سے اپنے دور تو دنیا نہیں ہے آج!!

کس راستہ کے موڑ پہ دل ہے کسے خبر؟!
منزل کہیں میانِ گماں و یقیں ہے آج!

آ موت آ اور عشق کو اب جاوداں بنا!
جینے کی اور دل میں تمنا نہیں ہے آج

سرخوش عسکری طباطبائی

مَشْوَرَہ

(اُس ہستی کے نام جس نے مجھے شاعر بنادیا)

(۱) تمہارے ایام ہیں روانہ　　گلابیوں میں، صباحتوں میں
تمہاری راتوں کا آشیانہ　　حسین نیندوں کی راحتوں میں
لطیف جذبات کی حدوں کو فضاءِ ہستی میں تنگ کر دو!
یہ وقت ہے وقت بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کر دو!

(۲) یہ سچ کہ تکتے ہیں چاند تارے　　ہمارے خوابوں کی وادیوں کو
بنے ہیں تقدیر کے سہارے　　اُمید کی شاہزادیوں کو
مگر محبت کے زمزموں کو فغانِ توپ و تفنگ کر دو
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغاز جنگ کر دو

(۳) کبھی یہ سوچا کہ غم کے بس میں　　حیات کی باگ ڈور کیوں ہے؟
جگہ جگہ ہنسنے کے قفس میں　　غلام بھونکوں کا شور کیوں ہے؟
بدل دو ماحول، زندگی کو نثار ناموس و ننگ کر دو
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کر دو

(۴) دلی تقاضے کچل کچل کر!　　ہر اک مصیبت کو جھیلنا ہے
ہر اک ارادہ کا رُخ بدل کر　　دہکتے شعلوں سے کھیلنا ہے
نزاکتوں کو لطافتوں کو حریفِ فولاد و سنگ کر دو
یہ وقت ہے وقت بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کر دو

شمس نوید

پس منظر

تری زمیں سی تری آسماں سی کھیل چکا
تری قسم تری کون و مکاں سی کھیل چکا

تری قسم تری تابانیٔ حسیں کی قسم
ہر ایک جلوۂ حسنِ جہاں سے کھیل چکا

فلک پہ چاند ہے شاہد گواہ ہیں تارے
ترے لئے میں تری کہکشاں سی کھیل چکا

ہے اب تو خواہشِ خوابِ سُبک محبت میں
کہ میں گرانیٔ خوابِ گراں سی کھیل چکا

نہ کارواں ملا نہ میر کارواں مجھ کو
ہزار گردِ پسِ کارواں سے کھیل چکا

نہ ملنا تھا نہ ملا کیس رنگ و بو نہ ملا
ہر اک بہار ہر اک گلستاں سی کھیل چکا

نہیں ہے دعویٔ شعر و سخن مجھے یکتاؔ
میں خود فریبیٔ طبعِ رواں سی کھیل چکا

یکتا امروہوی

افکارِ حکیمانہ

دیندار بھی کچھ ڈھونڈھ رہے ہیں ساقی
کفار بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں ساقی
جب زیست ہی زندگی تو ساغر میں تجھے
میخوار بھی کچھ ڈھونڈھ رہے ہیں ساقی

کافر ہو کہ مفتیٔ زمانہ ساقی
بیٹھے ہیں یہاں برادرانہ ساقی
ہے تیرے کرم سے تیرے رندوں کا بھی دل
وسعت میں ترا شراب خانہ ساقی

ہوں رند ترا زرو نزا دل ساقی
کر دے مرے کیف کو مکمل ساقی
پہنچے ترا فیض اس سے پیمانوں تک
اس دل کو بنا لے اپنی بوتل ساقی

تخلیق پہ اعتبار تجھ کو بھی نہیں
تبدیلیوں میں قرار تجھ کو بھی نہیں
مجبور کو دفعتاً بنا دے مختار
شاید کہ یہ اختیار تجھ کو بھی نہیں

سرمایۂ افکار کہن ہی نکلا
خوش فکریٔ شیخ و برہمن ہی نکلا
حرکت سے تحرک کا اضافی رشتہ
آخر کو دماغوں کی تھکن ہی نکلا

جمیل مظہری

نیا دَوْر

آؤ ہم ایک نئے دور کا آغاز کریں
سوزِ جاوید سے تخلیق نیا ساز کریں

عہدِ ماضی کی ہر اک بات فسانہ بن جائے
نغمہ کے روپ میں ڈھل جائے ہر اک نالۂ دل
خود قدم لینے کو آجائے ہماری منزل
بربطِ غم کی نوا ایک ترانہ بن جائے

حال کا دلکش وضوبار فسانہ چھیڑیں
سرمدی تاروں پہ لہرائے محبت کا سرور
نغمہ و نور سے ہو جائیں وہ عالم معمور
بربطِ شوق پہ اک ایسا ترانہ چھیڑیں

اک نئے رنگ میں ڈھل جائے ہمارا ماحول
دن نئے راتیں نئی، زیست کے سامان نئے
دل کے جذبات نئے روح کے ارمان نئے
نو بہ نو جلووں سے معمور ہو سارا ماحول

رقص کرتی ہوئی مستانہ ہوائیں آئیں
محفلِ شوق میں ہوں ساقیٔ گلفام نئے
خم نئے، رند نئے، بادہ نیا، جام نئے
جھوم کر میکدہ بردوش گھٹائیں آئیں

اپنے بیتے ہوئے لمحے نظر انداز کریں
مئے تقدیر کا اک جامِ گوارا لے کر
شہپرِ حورِ محبت کا سہارا لے کر
رفعتِ کون و مکاں کو تہِ پرواز کریں

یوں محبت کو زمانے میں سرافراز کریں
آؤ ہم ایک نئے دور کا آغاز کریں

فدا شاہجہانپوری

رعنائیاں

بے قراری دل کی فطرت ہو تو کوئی کیا کرے　　روز و شب دھڑکا کرے شام و سحر تڑپا کرے
حسن مختارِ تغافل عشق مجبورِ نیاز　　تا بہ کے کوئی فریبِ آرزو کھایا کرے
دل کو ہے بے اختیاری پر بھی اتنا اختیار　　عشق کو بدنام کر کے حسن کو رسوا کرے
کیا شبِ غم کیا شبِ غم کی قیامت خیزیاں　　تیری یاد آتے ہی مجھ کو نیند آ جایا کرے
ہر گھڑی تسکین دل کو چاہیے حسنِ خیال　　حشر اٹھتا ہے اگر جذبات میں اٹھا کرے
لے اڑیں دل کو خیالِ حسن کی رعنائیاں　　گوشۂ خلوت میں بیٹھا کوئی شرمایا کرے

جوشِ حسرت میں مجالِ جنبشِ لب بھی نہیں
دردمندِ عشق اکرم شکوۂ غم کیا کرے

اکرم دھولیوی

سلسلے

اگر تکمیل ربط و ضبط فرمانے کو جی چاہے　　ذرا خود بھی تڑپ لینا جو تڑپانے کو جی چاہے
سمجھ لیجئے کہ اب دورِ بہار آیا محبت میں　　بکیفِ خاص جب دیوانہ ہو جانے کو جی چاہے
وہیں سے ابتدائے منزلِ مطلوب ہوتی ہے　　جہاں ہر گام پر مایوس ہو جانے کو جی چاہے
اصولِ عشق شانِ ضبطِ غم معلوم ہے لیکن　　میں آخر کیا کروں جب اشک برسانے کو جی چاہے
انھیں اے جذبِ کامل لا تو آ بزمِ محبت میں　　مزا ہے جو واپس لوٹ کر جانے کو جی چاہے
گناہِ توبہ تو پھر بڑھ کے دامن تھام لیتے ہیں　　خطائے شوق پر جب دل ہی پچھتانے کو جی چاہے
مبارک ہو تمہیں چھپنا مری چشمِ تمنا سے　　مگر ایسا نہ ہو پھر سامنے آنے کو جی چاہے

وہی اشعار ہوتے ہیں اسد کچھ زندگی ساماں
جنہیں اہلِ جہاں کا خود بھی دہرانے کو جی چاہے

یہ آگ اور خون

ؤں کی بھڑکتی ہوئی آگ
کو بھارت کے سپُوت
دامن سے ہوا دیتے ہیں
ین کر کبھی ماتھے کی سیاہی ہوگی
تی ہوئی لاشیں
ڈتے ہوئے دل
نخوار گِدوں کے لقمے
قوموں کو ہنسی آتی ہے
کہتے ہیں کہ بھارت کے سپُوت
شی ہیں، درندے ہیں یہ لوگ
کو بھائی سے نفرت ہے، عناد
ھارت کی زمیں خون کے آنسو روئی
تنگ ہے بھارت کے لئے
وارانہ فساد،
ں ہاتھ بڑھاؤ گے حکومت کے لئے ۔۔ ؟
کے خون سے رنگے ہیں جو ابھی!
ز الم کی بلندی ہے یہی ۔۔ ؟
ں رہ گئے مذہب کے اُصول ۔۔ ؟
فنا کے اُصول،
زن کیوں نہ ہوں تہذیب پہ لوگ
نہ تاراج جو بھارت کی زمیں
لاشوں کا تو مدفن ہی تھا بھارت لیکن
ارانہ فسادات کا مرکز بھی بنا ۔۔!!۔

قمر ہاشمی

دُردانے

سحر ہونے تک ــــــ

فضا میں گونج اٹھی دھڑکنوں کی موسیقی
چھلک چھلک گئے پرکیف معصیت کے ایاغ
بتا رہی ہیں سحر کی دبی دبی آہیں
بجھے حسین ستاروں کی عصمتوں کے چراغ

خراشیں ــــــ

کیسے سہوں الٰہی یہ طوفانِ معصیت ؟
آتی ہیں روز دل پہ خراشیں نئی نئی
ہر روز ڈوبتی ہیں شرافت کی کشتیاں
ملتی ہیں سطحِ زیست پہ لاشیں نئی نئی

نغمے کی موت ــــــ

خاموشیوں میں ڈوب کے کشتی حیات کی
کس نے تغیرات کے بہاؤ پہ چھوڑ دی
وہ گاؤں سے پرے کسی مایوسِ زیست نے
اپنی حسین بانسری رو رو کے توڑ دی

خاطر غزنوی

بعد از وقت　　سوچ

گناہ کر کے پشیمان ہو رہا ہوں میں
مرا ضمیر مجھے کوستا ہے رہ رہ کر
دل و دماغ میں جاری ہے اک الجھن سی
گناہگار ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں میں
مری جبیں سے گناہوں کے داغ ڈھل جائیں
دراسکتیں نہ مجھے یہ گناہ کے عفریت
گناہ مجھ سے ہوئے کیوں یہ سوچتا ہوں میں

. . . .

جو کر چکا ہوں اُس کا خیال آئے مجھے
میرا بس دیکھتے جہنم میں جل نہیں سکتا
[illegible]
[illegible]

خیت را

موت کے منہ سے نکل آیا ہے تنہا، اس لئے
بٹ رہا ہے مفلس و نادار میں صدقے کا بھات
سوچ میں گم ہوں کہ ہر انسان کے افعال میں
کارفرما کیوں نظر آتا ہے خود غرضی کا ہات ؟

ایک نظارا

چل رہی ہے بدن میں ڈوبی ترم رو، بانکی ہوا
چاند کی معصوم کرنیں ریت پر بنتی ہیں جال
دور ان کھیتوں میں دو معصوم لغزیدہ [illegible]
سو رہے ہیں سنا نہ خاموشی ہے سدا[illegible]

یاد

سر اٹھاتی ہے تخیل کی تہوں سے ایک یاد
دور اُٹھتی ہے اُٹھ آتا ہے عجب ہلکی سی تان
ڈوبتا جاتا ہوں میں گہری خلاؤں میں [illegible]
سوچتا ہوں کیا ہو گر کوئی آ کے اسے [illegible]

دل کا روگ

بھیگی بھیگی سی نگاہیں [illegible]
کانپتے ہونٹوں پہ دل کا [illegible]
سوچتا ہوں کس قدر [illegible]
جو محبت کا [illegible]

بدلتے مہمان

اب خزاں ہے [illegible]
اب امیدوں [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

آبشار

چڑھتے ہوئے

بازگشت

یہ ہے ایک گلی

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

چکراتے ہوئے

انور عظیم

"راہ چلتے کیچڑ اچھالتی چلتی ہے، تھو تھو، توبہ توبہ ——" نیند اس کی آنکھوں کو چھوڑ کر جانے کیسے ہٹ رہی تھی۔ لیکن اس کے تھکے ہوئے لمس کا احساس اب تک تر و تازہ تھا۔ اس کے کانوں میں دوڑتا ہوا، گرم گرم جلتا ہوا لپٹنے لگا اور اس نے پہچان لیا، اس کی بیوی گلا پھاڑ پھاڑ کر دائی پر برس رہی تھی۔ قریب قریب یہ روز کا دستور تھا۔ جتنا وہ امن پسند تھا، اتنا ہی اس کی بیوی جنگ جو تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ دونوں میں اگر کوئی چیز مشترک تھی تو وہ ان کا افلاس تھا، ان کی آپس کی محبت اور ہمدردی، اور پھر ایک درجن کی چوتھائی پر قابض وہ تین بچے جن کی چیخ پکار سے اس کی نیند اور آرام کا کچھ مر نکلتا رہتا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی سوتا رہے۔ رات گئے تک وہ فائل پر اپنی منڈلائی ہوئی نیند کو قربان کرتا رہا تھا۔ ابھی صبح نے انگڑائی لی تھی اور اتنی شدت سے سائرن بجنے لگا تھا کہ اب اس کا سونا دوبھر تھا۔ اسے اپنی بیوی کی ہمسایہ پر غصہ آیا، لیکن اس نے بیچ ہی غصہ تھوک دیا۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس کے منہ سے بڑا سا لوتھڑا بلغم کا اڑ کر اس کے مغل سینڈل پر پڑ گیا۔ اور جیسے یہ گالی بن کر اس کی روح میں گھل مل گیا۔ اس نے اس مغل سینڈل کو کتنی مشکلوں سے خریدا تھا۔ اس کو اس سینڈل سے پیار تھا۔ چودہ روپئے کا سینڈل! ایک بینک کا کلرک پہننے کی ہمت کرے، کمال کی بات تھی۔ دو روپئے ماہانہ کے حساب سے اس نے آغا کو روپئے ادا کرنے شروع کئے۔ کابلی شریف، تجارتی، بھاری بھرکم بیچارے کسی طرح دوگنی قیمت پر، کلرک اور اوسط درجے کے رونے دھونے لوگوں کو اس طرح کی چیزیں استعمال کرنے کا موقع تو دیتے ہیں۔ کتنی مہربانی تھی۔ لیکن اس کا غل تو مغلوں کا باوا آدم تھا۔ کمبخت ٹھیک پہلی تاریخ کو شام کے وقت اس کے دروازے پر منڈلاتا رہتا اور ادھر وہ چکر کھاتا ہوا، تنخواہ کا حساب انگلیوں پر لگاتا، قرض کی گرہیں کریدتا، مکان پہنچا نہیں کہ ڈنڈا بجنے لگا، سمنٹ کے برآمدے میں۔ بس گردن پر سوار، پہلے پوری سنجیدگی سے اپنے دو روپئے وصول کر لیتا، پھر ذرا مسکراتا، ڈاڑھی میں خلال کرتا اور بال بچوں کی خیریت پوچھ پاچھ کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بھاری قدم کے ساتھ، گلیوں کی پتلی ہوتی ہوئی، سمٹتی ہوئی انتہا پر پہنچ جاتا، اکڑتا، اور جب تک وہ اس کی نظروں سے مٹ نہ جاتا وہ اندر نہ جاتا۔ اور رات ہی کا تو واقعہ تھا کہ اس کی بیوی نے محض اس سینڈل کی وجہ سے اس کو ہزاروں صلواتیں سنا ڈالی تھیں۔

"تمہیں کیا، گھر میں کسی کے پیٹ میں اناج پڑے یا نہ پڑے، بس اپنی للو پتو سے غرض، زیور بچارے بیچ کر رہ گئے مگر کس کے کان پر جوں رینگتی ہے، چودہ روپئے کے سینڈل پہنے چلتے ہیں، روزی ناڑ نہیں، کمبخت جوتا ہی ——، یہاں کھڑاؤں چٹخارتی پھرتی ہوں وہ بھی گت کا نہیں، —— دنیا جہان کے مرد ہوتے ہونگے لیکن ایسے نہیں"

اور کلرک ہونے کے باوجود اس کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں اور خون میں ابال آ گیا تھا۔ آخر اس کی بیوی نے کہا کہ کر اسے طعنہ دیا تھا۔ کسی دوسرے کی کمائی تھوڑا ہی وہ کھاتا پہنتا تھا —؟ لیکن یہ بھی تو واقعہ تھا کہ اس کا ٹیکو بیمار تھا — اسے بخار تھا، کھانسی تھی، ناک دھڑتے سے بہہ رہی تھی، پھر بھی بیوی کو چپ کرنا ہی تھا، اس کی بکواس سے مشکل کا کام

پلٹ پھٹ کرتی جا رہی تھی۔

"اور نہیں تو کیا، میں کماتا بھی تو ہوں، چلو صبح، لڑ آتا ہوں۔ بشاور یکھا ہے تم نے سارے جہان کے مردوں کو، اسے وہ تو کچھ ساشریف تھا کہ نباہ دیا۔ کیا ہے سات دن کی تو تو میں میں۔ ہر وقت کے گلے پھینکتی رہتی ہو —— چڑ مارتی رہتی ہو، وہ تو میں اس وقت قائل ہو گیا تھا جب تمہیں بیاہتے ہی میں فیل ہو گیا تھا اور مشکل سے ایک سال بھی نہیں بیتا، میاں خیر و پھسکنے لگے" اور اس کے بعد ذاتی لعن طعن پر اتر آیا جس میں چپی چپی گالی بھی تھی، وہ ہمیشہ محبت کی تان اسی طرح کی کھلی کھلی باتوں پر توڑ دیتا تھا اور اس کی بیوی اس کی جوابی بجائے اس کی تلخی اور معزی کو دیکھ کر صرف ہد بدانے لگتی۔

اس نے تکیے کے نیچے سر گھسیڑ لیا کہ کان میں چیخ پکار کا گذر نہ ہو، لیکن اس کی بیوی تو قسم کھا کر اس کے پیچھے پڑی تھی اس کی ماں میں یہ بہت بڑی لت تھی، پانی لانے جاتی تو وہ چار ہاتھ محلے والوں سے لڑ کر آتی، کھری کھری سنا دیتی، اور اگر لڑائی کا رُخ گالی گلوچ کی طرف مڑ جاتا تو، پھر اس کی ماں لمبے لمبے ہاتھوں کو پھیرا بنا کر کچھ اس آن بان سے مقابلہ پر آتی کہ دشمنوں کے کشتے کے پشتے لگ جاتے۔ گالی بکنا بھی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اور یہ روگ بالکل اس کے بس کا تھا۔ جہاں دیر ہوتی تو اس کی بیوی کا پارہ گرم ہو جاتا، بس اندر آنے کے بعد پانی پت کی خانہ ساز جنگ شروع ہو جاتی۔ آخر اس میں اچھائیاں بھی تو بہت سی تھیں۔ دو تین مہینے کی تنخواہیں ہمیشہ اس کے یہاں اُدھار رہتیں۔ مگر اس کے منہ پر میل آ جائے کیا مجال۔ اس طرح کی آئے دن کی جنگوں سے اس کی نیند بلبلا اٹھتی۔ اس کے دماغ میں تیزاب دوڑنے لگتا۔ وہ اپنی بیوی سے عاجز تھا۔ بیوی اس سے نالاں تھی، مگر خدا اور رسول کے سامنے دونوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی مان لیا تھا، اور اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ننگے تکیہ کو زور دیکر، موڑ کر اپنے چہرے پر ڈھانپ لیا مگر وہاں تو آواز نہیں تھی توپ کی گرج تھی، اس کا دماغ جھنجھنانے لگا اور آخر اس کی نیند کا میٹھا میٹھا جال، بدن کے جوڑ جوڑ میں ایک کھنچاؤ، سب کچھ مٹ مٹا کر رہ گیا۔ اور صرف ایک خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا کہ اس عورت کو عورت کس جانور نے بنایا۔ اس وقت وہ پوری جھنجھلائی ہوئی کیفیت میں تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں آتا ہوں، آرام کے لئے، چین کے لئے، سکون کے لئے، لیکن یہاں آتے ہی دوزخ کے شعلے لپٹنے لگتے ہیں میری جان کو۔ کماؤ بھی اور طعن تشنیع بھی سہو۔ یہ بھی خوب۔ اور بھی تو میرے ساتھی ہیں —— کیا زندگی ہے ان کی۔ ٹھاٹھ باٹ ہے، صورت پر چمک ہے، رونق ہے، شادابی ہے۔ لیکن یہاں تو چہرے کو دیکھو تو معلوم ہو دیمک چاٹی کتاب ہے۔ اس سے کیا اگر وہ حرام کے پیسے لیتے ہیں، مگر حرامکار بھی تو کہلوانا نہیں چاہتا۔ میں ایسا کر نہیں سکتا اس میں بیوی کا قصور نہیں۔ یہ تو اپنا جرم ہے۔ اس کے دماغ نے اس موڑ پر پہنچ کر اپنی بیوی کو معاف کر دیا، وہ ہمیشہ خاص ذہنی انتشار کی سڑکوں پر ہوتا ہوا اسی طرح کی فیصلے کی سرائے میں ڈیرہ ڈالتا۔

پھر فوراً ہی اس کی نگاہ سینڈل پر جا پڑی۔ اس کا بلغم سوکھ رہا تھا۔ اور مکھیاں وٹامن چاٹ رہی تھیں۔ اسے پھر رات کی بات یاد آ گئی۔ اسے بیوی نے بہت برا بھلا کہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ایک طرف دوسرا پلنگ تھا جس پر اس کی بیوی اور بچے سوتے تھے۔ اس کڑکڑاتے ہوئے جاڑے میں بھی انھیں لحاف نصیب نہیں ہوا۔ ایک کمبل اور دوہر ملا کر رات کٹ جاتی تھی، اور وہ خود تو ایک بوسیدہ کمبل سے نباہ کر رہا تھا۔ جیسے تیسے۔ درمیانی شب میں جب ستارے بھی ٹھٹھر کر شل ہو جاتے، ہوائیں آرے کی طرح چلنے لگتیں اور پھیپھڑوں میں برف کے پھائے بچھانے لگتیں، وہ اس وقت شدت خیال سے کام لیتا اور قوت ارادی کا معجزہ اس کی رگوں سے شعبدہ بازی کرنے لگتا، جاڑا پسپا سا ہو کر اس کے ذہن کو چھوڑ دیتا۔ مگر باقی بدن کے حصوں پر اس کی فسطائیت دوڑتی رہتی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے شل تلوؤں کو رگڑ رگڑ کر بجلی کی ایجاد میں محو رہتا، لیکن برف کی کھال کی تنی ہوئی جرابیں ہزار کوشش کے باوجود اس کے پیروں سے نہ اترتیں۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا، اپنے ٹخنوں کو

بعد از وقت

گناہ کرکے پشیمان ہو رہا ہوں میں

مرا ضمیر مجھے کوستا ہے رہ رہ کر

دل و دماغ میں جاری ہے ایک ہلچل سی

گناہگار ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں میں

مری جبیں سے گناہوں کے داغ دھل جائیں

ڈر ہے مٹ سکیں نہ کبھی یہ گناہ کے عفونت

گناہ مجھ سے ہوئے کیوں یہ سوچتا ہوں میں

. . . .

جو کرچکا ہوں اس کا خیال آئے مجھے

میں اس دہکتے جہنم میں جل نہیں سکتا

میں چاہتا ہوں کہ کردہ گناہوں کو بھول جاؤں کاش!

ڈرا رہے ہیں وہ پھر خوفناک سائے مجھے!

چھپا کے اپنے ذلیل و سیاہ چہرے کو

میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے دور بھاگ سکوں

مجھے یہ ڈر ہے کہ دنیا نہ دیکھ پائے مجھے

جمیل ملک

سوچ

خیرات

موت کے منہ سے نکل آیا ہے تنہا، اس لئے
بٹ رہی ہے مفلس و نادار میں صدقے کی خیرات
سوچ میں گم ہوں کہ ہر انساں کے افعال میں
کارفرما کیوں نظر آتا ہے خود غرضی کا ہات ؟

ایک نظارا

چل رہی ہے رہ میں ٹھنڈی نرم رو، بانکی ہوا
چاند کی معصوم کرنیں ریت پر پھیلی ہیں جا بجا
دور اُن کھیتوں میں وہ معصوم [illegible]
دے رہے ہیں سازِ خاموشی پہ سودائی سی تال

یاد

سر اٹھاتی ہے تخیل کی تہوں سے ایک یاد
دور اک چھم سے آتا ہے عجب بہکی سی تان
ڈوبتا جاتا ہوں میں گہری خلاؤں میں ندیم!
سوچتا ہوں کیا ہو گر کوئی ڈسے اے میری جان!

دل کا روگ

بھیگی بھیگی سی نگاہیں، سہمی سہمی انکھیاں
کانپتے ہونٹوں پہ دل کا مدعا آتا نہیں
سوچتا ہوں کس قدر جانکاہ ہے یہ دل کا روگ
جو محبت کا ڈسا ہو وہ شفا پاتا نہیں

بدلتے مہمان

اب خزاں ہے کارفرما، اب بہاروں کا خروش
اب امیدوں کے چرچے ہیں، اب یہاں یاس حکمراں
اب کوئی آیا ہوا ہے، اب کوئی جانے کو ہے
ایک رونق ہیں جہاں کی یہ بدلتے میہماں

استفسار

میں سوچ میں گم ہوں کہ کوئی مجھ کو بتائے !
کیوں دل قہقہہ معمور ہے اشکوں کی لڑی سے؟
کیوں پھول کے دامن میں ہیں کانٹوں کی قطاریں؟
کیوں سوکھی ہوئی شاخ میں پوشیدہ ہے کونپل؟
کیوں اجڑے ہوئے چمن زاروں سے الفت میں بہاریں؟

جاوید قمر

آبشار

چکراتے ہوئے

بازگشت

یہ ہے ایک گلی

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

انور عظیم

چکراتے ہوئے

"راہ چلتے کیچڑ اچھالتی چلتی ہے، شاتن، توبہ توبہ ——" نیند اس کی آنکھوں کو چھوڑ کر محافظ سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ لیکن اس کے تھکے ہوئے لمس کا احساس اب تک تر و تازہ تھا۔ اس کے کانوں میں دوڑتا ہوا، گرم گرم جملہ پناہ لینے لگا اور اس نے پہچان لیا، اس کی بیوی گلا پھاڑ پھاڑ کر دائی پر برس رہی تھی۔ قریب قریب یہ روز کا دستور تھا۔ جتنا وہ امن پسند تھا، اتنا ہی اس کی بیوی جنگ جو تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ دونوں میں اگر کوئی چیز مشترک تھی تو وہ ان کا افلاس تھا، ان کی آپس کی محبت اور ہمدردی، اور پھر ایک درجن کی چوتھائی پر قابض وہ تین بچے جن کی چیخ پکار سے اس کی نیند اور آرام کا کچومر نکلتا رہتا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی سوتا رہے۔ رات گئے تک وہ فائل پر اپنی منڈلاتی ہوئی نیند کو قربان کرتا رہا تھا۔ ابھی صبح نے انگڑائی لی تھی اور اتنی شدت سے سائرن بجنے لگا تھا کہ اب اس کا سونا دوبھر تھا۔ اسے اپنی بیوی کی اس تیزی پر غصہ آیا، لیکن اس نے سچ مچ غصہ تھوک دیا۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس کے منہ سے بڑا سا ٹکڑا بلغم کا اڑ کر اس کے مخمل سینڈل پر پڑ گیا۔ اور جیسے یہ گالی بنکر اس کی روح میں گھل مل گیا۔ اس نے اس مخمل سینڈل کو کتنی مشکلوں سے خریدا تھا۔ اس کو اس سینڈل سے پیار تھا۔ چودہ روپئے کا سینڈل ایک بینک کا کلرک پہننے کی ہمت کرے، کمال کی بات تھی۔ دو روپئے ماہانہ کے حساب سے اس نے آغا کو روپئے ادا کرنے شروع کئے۔ کابلی شریف، تجارتی، بھاری بھرکم پٹھان سے، کسی طرح دوگنی قیمت پر، کلرک اور اوسط درجے کے روندے ہوئے لوگوں کو اس طرح کی چیزیں استعمال کرنے کا موقع تو دیتے ہیں۔ کتنی مہربانی تھی۔ لیکن اس کا مخمل توشغلوں کا باوا آدم تھا۔ کمبخت ٹھیک پہلی تاریخ کو شام کے وقت اس کے دروازے پر منڈلاتا رہتا اور ادھر وہ چکر کاٹتا ہوا، تنخواہ کا حساب انگلیوں پر لگاتا، قرض کی گرہیں کرتا، ملازمت [illegible] کے سامنے میں بس [illegible] پر سوار [illegible] پوری سنجیدگی سے اپنے دو روپے وصول کر لیتا، پھر ذرا مسکراتا، داڑھی میں خلال کرتا اور بال بچوں کی خیریت پوچھ کر کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بڑھ کر قدم کے ساتھ، گلیوں کی پتلی ہوتی ہوئی، سمٹی ہوئی انتہا پر پہنچ جاتا، رکتا، اور جب تک وہ اس کی نظروں سے [illegible] وہ اندر نہ جاتا۔ اور رات ہی کا تو واقعہ تھا کہ اس کی بیوی نے محض اس سینڈل کی وجہ سے اس کو ہزاروں [illegible] سنا ڈالی تھیں۔

"تمہیں کیا، گھر میں کسی کے پیٹ میں اناج پڑے یا نہ پڑے، بس اپنی فرقت سے غرض [illegible] مگر کس کے کان پر جوں رینگتی ہے، چودہ روپئے کے سینڈل پہنے چلتے ہیں [illegible] یہاں کھڑاؤں پھٹکارتی پھرتی ہوں وہ بھی گت کا نہیں —— [illegible]

اور کلرک ہونے کے باوجود اس کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں اور خون میں ابال آگیا تھا [illegible] اسے طعنہ دیا تھا کسی دوسرے کی کمائی تھوڑا ہی وہ کھاتا پہنتا تھا۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ تھا کہ [illegible] اسے بخار تھا، کھانسی تھی، ناک دھڑتے سے بہہ رہی تھی، پھر بھی بیوی کو چپ کرا دی تھا [illegible]

پھٹ پھٹ کر تی جا رہی تھی۔

"اور نہیں تو کیا، میں کماتا بھی تو ہوں، چلو موج اڑاتا ہوں۔ بڑا دیکھا ہے تم نے سارے جہان کے مردوں کو، اسے وہ تو مجھ سا شریف تھا کہ نباہ دیا۔ کیا ہے رات دن کی تو تو میں میں۔ ہر وقت کے جلے پھپھولے پھینکتی رہتی ہو —— چرخے مارتی رہتی ہو، وہ تو میں اس وقت قائل ہو گیا تھا جب تمہیں بیاہتے ہی میں نیل ہو گیا تھا اور مشکل سے ایک سال بھی نہیں بیتا، یہاں خیر و پھپھکنے لگے" اور اس کے بعد ذاتی لعن طعن پہ اتر آیا جس میں چھپی چھپی گالی بھی تھی، وہ ہمیشہ محبت کی تان اسی طرح کی کھلی کھلی باتوں پر توڑ دیتا تھا اور اس کی بیوی اس کی جوابی بکواس کی گھٹن اور مغزی کو دیکھ کر صرف بدبدانے لگتی۔

اس نے تکیے کے نیچے سر گھسیڑ لیا کہ کانوں میں چیخ پکار کا گذر نہ ہو، لیکن اس کی بیوی تو قسم کھا کر اس کے پیچھے پڑی تھی اس کی عادتوں میں یہ بہت بڑی لت تھی، پانی لانے جاتی تو دو چار ہاتھ محلے والوں سے لڑ کر آتی، کھری کھری سنا دیتی، اور اگر لڑائی کا رُخ گالی گلوچ کی طرف مڑ جاتا تو، پھر اس کی ماں لمبے لمبے ہاتھوں کو پھریرا بنا کر کچھ اس آن بان سے مقابلہ پر آتی کہ دشمنوں کے کشتے کے پشتے لگ جاتے۔ گالی بکنا بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، اور یہ روگ بالکل اس کے بس کا تھا۔ جہاں دیر ہوتی تو اس کی بیوی کا پارہ گرم ہو جاتا، بس اندر آنے کے بعد پانی پت کی خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ آخر اس میں اچھائیاں بھی تو بہت سی تھیں۔ دو تین مہینے کی تنخواہیں ہمیشہ اس کے یہاں دھری رہتیں۔ مگر اس کے منہ پر میل آ جائے کیا مجال۔ اس طرح کی تمام دن کی جنگوں سے اس کی نیند بلبلا اٹھتی۔ اس کے دماغ میں تیزاب دوڑنے لگتا۔ وہ اپنی بیوی سے عاجز تھا۔ بیوی اس سے نالاں تھی، مگر خدا اور رسول کے سامنے دونوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی مان لیا تھا، اور اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ننگے تکیہ کو زور دیکر، موڑ کر اپنے چہرے پر ڈھانپ لیا مگر وہاں تو آواز نہیں تھی توپ کی گرج تھی، اس کا دماغ جھنجھنانے لگا اور آخر اس کی نیند کا میٹھا میٹھا جال، بدن کے جوڑ جوڑ میں ایک کھنچاؤ، سب کچھ مٹ مٹا کر رہ گیا۔ اور صرف ایک خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا کہ اس عورت کو عورت کس جانور نے بنایا۔ اس وقت وہ پوری جھنجھلائی ہوئی کیفیت میں تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں آتا ہوں، آرام کے لئے، چین کے لئے، سکون کے لئے، لیکن یہاں آتے ہی دوزخ کے شعلے لپٹنے لگتے ہیں میری جان کو۔ کماؤ بھی اور طعن تشنیع بھی سہو۔ یہ بھی خوب۔ اور بھی تو میرے ساتھی ہیں —— کیا زندگی ہے ان کی۔ ٹھاٹھ باٹ ہے، صورت پر چمک ہے، رونق ہے، شادابی ہے۔ لیکن یہاں تو چہرے کو دیکھو تو معلوم ہو دیمک چاٹی کتاب ہے۔ اس سے کیا اگر وہ حرام کے پیسے لیتے ہیں، مگر حرامکار بھی تو کہلوانا نہیں چاہتا۔ میں ایسا کر نہیں سکتا اس میں بیوی کا قصور نہیں۔ یہ تو اپنا جرم ہے۔ اس کے دماغ نے اس موڑ پر پہنچ کر اپنی بیوی کو معاف کر دیا، وہ ہمیشہ خاص ذہنی انتشار کی سڑکوں پر ہوتا ہوا اسی طرح کی فیصلے کی سرائے میں ڈیرہ ڈالتا۔

پھر فوراً ہی اس کی نگاہ سینڈل پر جا پڑی۔ اس کا بلغم سوکھ رہا تھا۔ اور مکھیاں وٹامن چاٹ رہی تھیں۔ اسے پھر رات کی بات یاد آ گئی۔ اسے بیوی نے بہت برا بھلا کہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ایک طرف دوسرا پلنگ تھا جس پر اس کی بیوی اور بچے سوتے تھے۔ اس کو اوڑھنے بچھانے جاڑے میں بھی انہیں لحاف نصیب نہیں ہوا۔ ایک کمبل اور دوہر ملا کر رات کٹ جاتی تھی اور وہ خود تو ایک پرانے کمبل سے نباہ کر رہا تھا۔ جیسے تیسے۔ درمیانی شب میں جب ستارے بھی ٹھٹھر کر شل ہو جاتے، ہوائیں آرے کی طرح چلنے لگتیں اور پھیپھڑوں میں برف کے پھالے پھانسنے لگتیں، وہ اس وقت شدت خیال سے کام لیتا اور قوت ارادی کا مجموعہ اس کی رگوں سے شعبدہ بازی کرنے لگتا، جاڑا اپسپا ساہو کر اس کے ذہن کو چھوڑ دیتا، مگر باقی بدن کے حصوں پر اس کی فسطائیت دوڑتی رہتی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے شل تلوؤں کو رگڑ رگڑ کر بجلی کی ایجاد میں محو رہتا، لیکن برف کی کھال کی بنی ہوئی جرابیں ہزار کوشش کے باوجود اس کے پیروں سے نہ اترتیں۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا، اپنے ٹخنوں کو

چھاتی سے لگائے اور برفیلے ہونٹوں کو دانتوں کی چکی میں دبائے، مگر اس کے بچے رات بھر سب سسکیاں لیتے رہتے، روتے رہتے، کراہتے رہتے اور کبھی ماں کے جسم سے چمٹ کر رونے لگتے۔ شاید ان میں شدت خیال اور قوت ارادی کی کمی تھی، شاید ایسا ہی تھا اور ایسا بھی تھا شاید کہ وہ اپنے جسم اور دماغ کو ایک ہی چیز سے دو اثر لینے دینے کے روادار تھے۔

اس نے دیکھا کہ اس کے بچوں کا پیشاب پلنگ کے نیچے گاڑھا گاڑھا نشان چھوڑ گیا تھا۔ آنگن سے اس کے بچوں کی چٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی، اس نے جھک کر اور جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی دھوپ میں بیٹھی تھی، اس کے چہرے پر کھلاہٹ تھی، آنکھوں میں رندھی ہوئی تشنگی کی پرچھائیں، ہاتھوں میں لرزش، وہ اپنے زینو کو بنا سکے باوجود ٹھنڈی ہوا میں سکھے ہوئے تھی، اس لئے کہ وہاں دھوپ تھی، دھوپ میں گرمی تھی، کمرے میں ٹھنڈک تھی، بچھونے میں بچوں کے پیشاب کی کھرانٹ مہک تھی۔ اس کی بیوی کا شلوکہ کہنی پر سے چیرے ہوئے تھا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے ہوا کی تیز بارش اس کے حلق کو ریتا رہی ہو۔ اس کے دل میں ہمدردی کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ جیسے راکھ کو کریدڈالنے سے دھوئیں کے آتشیں بگولے جھپٹ پڑے ہوں۔ اس نے آدھی رات تک اس سے لڑائی کی تھی، اس کی بیوی جو کچھ کہتی تھی اس میں کچھ سچائی بھی تو تھی، سینڈل کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی؟۔ وہ عورت تھی اس کی ساری رعنائی دھواں پھینک رہی تھی۔ اس کی حالت ٹنڈ منڈ سے پیڑ کی ہو گئی تھی۔ اور میں ہوں کہ اپنے ایک دوست کی نقل پہ اتر آیا۔ اس میں اور اس کے دوست میں فرق بھی تو تھا اس کی شادی ایک زمیندار کی لڑکی سے ہوئی تھی جہاں سے ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کی جیب کو تازہ کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اسے اپنی نادانی پر غصہ آ گیا۔ رات اپنی بیوی پر فضول کتنا گرم ہو گیا تھا۔ کوئی ایسی بات بھی تو نہ تھی۔ بیچاری نے کوئی بری بات بھی تو نہیں کہی تھی۔ انسان کی مجبوری اسے کڑوا کسیلا بنا دیتی ہے۔ اسے اپنے سینڈل سے نفرت ہو گئی اس کا بچہ بیمار تھا۔ اس کی بیوی کی کہنی جاڑے کی ٹھنڈی ہواؤں سے چھل رہی تھی۔ مہینہ کی آخری تاریخ تھی اور گھر میں غلہ نہیں تھا، کپڑا نہیں تھا، دوا نہیں تھی۔ کھانا نہیں تھا۔ تو پھر وہ کماتا کیوں تھا؟۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ ننگے رہنا، بھوکے رہنا، بیمار رہنا —— اُف؟۔

وہ اسی ڈھرے پر پوری گرم رفتاری سے سوچنے لگا۔ غور کرنے لگا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں ہمیشہ اس طرح غمگین اور دلدوز باتیں گھنگھرو بن کر اس کے ذہن میں جھنجھنانے لگتیں۔ اور وہ اپنی زندگی، اپنی کلرکی، اپنی بے بسی، اور پھر ہر چیز سے نفرت پر مجبور ہو جاتا۔ اور آخر میں صرف ایک فیصلہ اس کے خیالات کے عروج پر پہنچ کر اس کی زندگی کا راستہ روک لیتا، —— دونوں بانہیں پھیلا کر —— وہ آگے نہ بڑھ پاتا۔ اس کی آنکھوں کو گرم اور نرم تہیں دھندلا دیتیں۔ زندگی کے ہر زاویئے میں، ہر گوشے میں، لاشوں، اسکیلوں اور پنجروں کا انبار لگ جاتا۔ موت کھڑی ہو کر اذان دینے لگتی۔ ایسے وقت میں وہ حد درجہ اندوہگیں اور بوکھلایا بوکھلایا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر بادلوں کے ٹکڑے چپاں ہو جاتے اور شدید قسم کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں سر نہوڑا کر بیٹھ جاتا —— زندگی کی لہر اس کی پلکوں کو چھونے لگتی —— زہرناک نگاہیں خونیں پرچم بن جاتیں۔

زندگی اس روز بھی صبح کے گھوڑے پر سوار کچھ اسی انداز سے اس کے سامنے آئی —— ایسا انداز، جو اس میں احساس کی گھٹن بھر دیتا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی زندگی کا راستہ روک کر تلخی، بدمزگی، افسردگی، قنوطیت اور سب کی ماں، موت کھڑی ہو گئی ہے۔ وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی مدقوق، درد انگیز اور سوالی صورت پر نظر نہیں ٹکا سکتا۔ نہ وہ اپنے بچوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جن کی تیوڑیوں کی آڑ میں اس کی بیوی اس سے لڑا کرتی تھی۔ اور وہ اپنی بیوی کو گنوار، اجڈ، لڑاکو، اور بے حس سمجھ کر اپنے دل کی آگ کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔

وہ کھڑا ہوگیا۔ گرم کوٹ کھونٹی سے اتارا اور پہن لیا۔ کوٹ پہن کر اس نے محسوس کیا کہ اس نے کوٹ نہیں پہنا۔ یہ تو گرد میل، اور پیوند کا ذخیرہ تھا۔ اُون اڑ چکا تھا۔ سوت باقی رہ گیا تھا۔ سات سال کا پرانا جھلنگا کوٹ۔ اس نے کوٹ نہیں پہنا تھا۔ اس نے سات سال کی تاریخ اوڑھ لی تھی۔ اس نے ماضی کو اپنے جسم پر اوندھا لیا تھا، چپکا لیا تھا۔ جس میں اتنی سکت نہ تھی کہ تازہ دم، جوان اور طرار جاڑے کی چبھتی چلی جانے والی ہواؤں کا حملہ سہار سکے۔ یہی کوٹ تھا، کوٹ جو اسے شادی میں ملا تھا۔ یہی کوٹ تھا۔ کوٹ جسے چھو کر بچے ماں کی چھاتی کی ملائمت کو بھول گئے تھے۔ اس کے دماغ میں پرانی باتیں ابھرنے لگیں ابال کھاتے ہوئے دودھ کی طرح۔ اور آہستہ آہستہ اس کا دماغ قسم قسم کی آوازوں، چیخوں اور پکاروں سے بھرا ہوا پنڈال بن گیا کچھا کھچ۔ بڑے بڑے موٹر کے ہارن جیسے لاکھ دھونوں پر بجائے جا رہے ہوں، اسے چڑھانے کے لئے ———

بھونپوں، بھونپوں ——— !

جب سات سال پہلے اس نے پہلی مرتبہ اس کوٹ کو پہنا تھا تو وہ روئیں سے لدا ہوا تھا۔ نرم نرم، گرم گرم۔ اس کی خوبصورت بسنتی چمک کے نشانات کتنے بھلے لگتے تھے اور میٹھی میٹھی زندگی کی آنچ سلگتی گئی ——— اس کوٹ میں اندھا دھند اس کی زندگی کی تاریخ سماتی گئی، اس کی کلرکی، نوکری، بیوی کا چکیلا بدن، مسکراتا چہرہ، گرم بازو، گول گول کلائیاں، سب اس کوٹ میں بس گئے تھے، رومان، محبت، فراق اور قربت، سب کچھ۔ ان بخیوں میں بہت سے جوان قہقہے چھپے ہوئے تھے۔ بہت سی مقدس اور محبت سے بھرپور یادیں۔ مگر وہ قہقہے معدوم ہو چکے تھے۔ وہ گول گول کلائیاں پنکھے کی ڈنڈیاں یا ہڈیوں کی قمچیاں بن گئی تھیں۔ بازوؤں میں جیسے گلیشیر بہتا رہتا ہو۔ اور آنکھوں میں ایک زہرناک شکایت۔ اور غم افزا بغاوت۔ کے سوا کچھ اور رہتا ہی نہیں۔ کوٹ پرانا ہوتا گیا۔ زندگی پرانی ہوتی گئی۔ اس کی بیوی پرانی ہوتی گئی۔ اس کی آرزوئیں، خواہشیں، تمنائیں، جو اس روئیں دار کوٹ کی طرح گدیلی اور لذت کوش تھیں، سب اڑ گئیں۔ کوٹ کے اڑتے ہوئے روئیں کی طرح۔ زندگی ایک اجاڑ ویران کھنڈر سے بلند و بالا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ تسکین، آسودگی اور حیداری کا کہیں وجود نہ تھا۔ بالکل چٹیل میدان۔ تصور اور تخلیقی جذبات کی ساری موشگافیاں وقت کی آتش زنی کی نذر ہو چکی تھی۔ کڑی کڑوی باتیں، سخت کرخت آوازے ——— کوئی حد تھی، اور اب مرنا ہی ایک تمنا۔ اس کے دماغ میں تخیل سکھا رہا تھا۔ کس طرح زندگی کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ موت کی گود میں کیسے پناہ ملیگی؟ جینے کی آخری تاریخوں میں تو یہ تصور اتنا قریب، اتنا حسین اتنا سچا اور اتنا عادی نظر آتا کہ اس کا جی بڑھ کر اسے چھو لینے کو، چمٹ جانے کو چاہتا ——— ؟

اس روز بھی وہ اس تیزابی تصور سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ موت کا لمس اسے سہلا رہا تھا۔ اور کسی خطرناک دباؤ کی سانسیں نغموں کے جنگلی آہنگ کے ساتھ اس کی پیشانی پر جھوم رہی تھیں۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا ——— چپ سادھے!

اس کی جیب میں پیسے تھے، روپئے۔ ساری کی ساری ریزگاریاں تھیں۔ چار روپئے۔ اس کے ساتھی مہندر نے یہ پیسے اس لئے دیئے تھے کہ وہ ایک روز انڈے کا حلوا بنوا کر اسے کھلائے۔ اس کی بیوی بہترین حلوا بناتی تھی اور مہندر کی بیوی اتنی کٹاس اور حب فاد والی تھی کہ اس سے فرمائش کرنا فیوجی یا کی ناک پر سے مکھی اڑانے کے برابر تھا۔ رات اس کے اور بیوی کے درمیان اتنی سنگین جنگ چھڑ گئی تھی کہ اس کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ حلوے کا مسئلہ بیچ میں لا کھڑا کرے، اور مہندر کے چار روپئے مفت میں اس کی جیب میں پڑے پڑے خراٹے بھر رہے تھے۔ اس کے تیز تیز قدم اسے بازار کی طرف کھینچے لئے جا رہے تھے۔ سامنے ہی ایک انگریز کی کوٹھی تھی۔ اس کی

پھولوں کی جھرمٹ سے بنی ہوئی بڑی بس ساطر تھا جس میں رنگ برنگ کے پھول اگائے گئے تھے جو یہاں سے وہاں تک گملوں
کی شکل میں سڑک کے قریب سے لگا گیا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا۔ شبنم پگھلی ہوئی چاندی کی طرح گھاس پر
چمک رہی تھی۔ اس بچھلی سی کوٹھی میں ایک انگریز رہتا تھا، اس کی بیم تھی اور بچے تھے، نوکر تھا، بیرا چپراسی اور مالی،
چاشت کے کپڑوں میں لدے ہوئے صبح سویرے ٹہلنے نکلتے۔ ان کے بچے چھوٹی چھوٹی کالی گاڑیوں میں
بیٹھ کر آیا کے ساتھ فرشتوں کی طرح مسکراتے پھرتے۔ اس نے دیکھا بیم کی آنکھیں، بچوں اور پھولوں کو تول رہی تھیں۔
معائنہ ہو رہا تھا۔ ہوسکتا ہے خطرہ محسوس ہو کہیں اس کا موازنہ وہ ڈیل ڈول والے لانبے تڑنگے صاحب سے نہ کر بیٹھے
——— تو وہ کہاں جا گرے گا، کہاں؟ ۔ زمین کی انتڑیوں میں۔ اس کے ڈھانچے پر ایک میلا پاجامہ تھا، ایک ردی قمیص
اور ہی کوٹ، جو کوٹ بھی تھا اور سات سال کی خاموش تاریخ بھی۔ وہ آگے بڑھ گیا ———

اس کا دماغ بارود سے بھر گیا تھا، حالانکہ ٹھنڈی ہوا کی قاشیں اس کے پھیپھڑے اور حلق میں اترتی جا رہی تھیں
اس کے ہاتھ ٹھٹھر رہے تھے۔ اس نے اپنے پنجوں کو جیب میں چھپا لیا اور اس کی ٹھنڈی انگلیاں ٹھنڈی ریزگاری کو ٹٹو
لنے لگیں۔ جو اس کے دوست کا حلوا تھیں، جو ابھی حلوا نہیں بنی تھیں، اس لئے کہ اس کی بیوی کا موڈ نرسے میں تھا،
لاریٹو کانونٹ ——— !

عیسائی مشن کی عورتیں۔ حوریں۔ فرشتوں کی مائیں بہنیں (وہ بیویاں نہیں ہوسکتی تھیں) ——— وہ اسفید فام
چہروں اور بگلے جیسے کپڑوں کی وجہ سے بے حد تقدس مآب معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی زندگی کے خلا میں یہ موم کی مورتیں
ناچنے لگیں، جو عبادت کی دلدادہ تھیں جو دوسروں کو گرجا کی طرف گھسیٹ کر لے جاتی تھیں اور جن کے ہونٹوں سے
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں رس نہیں، خون نہیں، گرمی نہیں، بس وہ دو زندہ ورق ہیں جو پھڑ پھڑاتے ہیں
تو بائبل کی آواز گونج کر فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے اور مدھم اکساہٹوں میں خدا اور خدا کے بیٹے کا خوف لرزتا رہتا ہے
ان کی نگاہیں کتنی رو پہلی، کتنی گہری۔ آدمی ڈوبتا چلا جائے، پھر بھی جسم کو نہ پا سکے۔ روح اور روح کی گہرائی۔ گہرائی، جو
جسم کے اندر بھی تھی، اور جسم کے باہر بھی۔ ایک ظلمت پھیلتی ہوئی، جھومتی ہوئی، گاتی ہوئی، جو ہر چیز کو اپنے قدم پر سجدے میں
لے لیتی ہے اور جو چیز نہیں گرتی، اس کو روند ڈالتی ہے، روح کی ظلمت اور گہرائی، ان ہمدردں کو اپنے پرواز کا طلسم دکھاتی ہے
ان نیلی آنکھوں کی کائنات، ان کا پندار، ان کا سحر، جس کے خلاف ہر بغاوت بوجھل۔ یہ عورتیں خدا کی خدمت میں اپنی عمر بِتا دیتی
ہیں، یہ شادیاں نہیں رچاتیں، عوام الناس کی خدمت کی شمع ان کے ہاتھوں میں روشن رہتی ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بولتیں
نیکی ان کا راستہ ہے، یہ انسانیت کو جنت کا راستہ بتاتی ہیں۔ یہ جب گرجا میں جاتی ہیں تو اپنے اندر کی طاق میں جلتی ہوئی
موت کو سنکھیا کھلا دیتی ہیں اور صرف ایک پاکیزہ روح کا جنازہ بن کر وہ دوسروں کے لئے جلتی رہتی ہیں ——— جلتی رہتی ہیں
اس لئے کہ دوسرے ٹھوکر نہ کھائیں اور جنت انھیں تھام لے، وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ انسانوں کو فردوس کی گود میں
پھینک سکتی ہیں، ایک مسکراہٹ سے تاریکی پر روشنی کا غلاف ڈال سکتی ہیں، ایک اشارے سے آگ بجھا سکتی ہیں ———
لیکن ——— وہ اس کے جیسے لاچار کلرک کی بے بضاعتی، بے مائیگی اور بے بسی کی پروا نہیں کر سکتیں۔ وہ اپنی آسودگی
مسرت آفرینی اور سکون تنزی سے اس پر طنز کئے بغیر نہیں گزر سکتیں، ———

ان کی مذہبی کتابوں میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جب تم ایک ٹھٹھرتے ہوئے کمزور کلرک کو، سڑک پر کانپتے ہوئے گزرتے
دیکھو، تو اُسے صرف دیکھو مت، اُسے پیار سے پاس بلاؤ، محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکو جن کے اندر خواہشوں اور
بیماریوں کا ہجوم ہے، ——— اور ایک ایسی عبادت سکھاؤ، ایک ایسی عبادت، جس سے وہ کلرک رہتے ہوئے بھی انسان

تی رہ سکے، جاڑے کی قینچیاں اسے کھینچ نہ سکیں۔ بچے بھوک کا درد و اکے بغیر نہ مرسکے، بیوی اچھی ہونے کے باوجود وم نہ ہو۔ لیکن یہ سب ان سفید فام، موم سے بھی زیادہ نرم دل اور ہوا سے بھی زیادہ نازک اور مقدس مورتیوں کی یں نہیں، وہ تو خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتی ہیں اور ان کا کام تو عیسیٰ مسیح کو خدا کا بیٹا ثابت کرنا ہے ـــــ کے سفید چہروں، گہری آنکھوں اور ٹھنڈی مسکراہٹوں سے آئے دن ثابت بھی ہوتا رہتا ہے ـــــ !

ہ سوچتا جا رہا تھا۔ دماغی الجھاؤ طویل ہو گیا تھا، لیکن راستہ کاٹنے کا یہ اچھا بہانہ تھا اور وہ اس کا عادی تھا۔ وہ بل گیا تھا۔ تاڈ اپنا چہرہ اپنے سارے پڑوسیوں سے بلند کئے ہوئے تھا، وہیں پر کافی ہاؤس تھا، وہ اب تک پیسوں کو تھا چار روپئے۔ اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کبھی کسی انگریزی ہوٹل میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے پاس ے تھے کہ وہ ہوٹل میں جاکر کیک، پیسٹری، ٹوسٹ، آملیٹ، چکن کری رائس کا ذائقہ چکھ سکتا تھا۔ مہندر، ان توں کا تذکرہ بڑے جوش و خروش سے کیا کرتا تھا اور اس وقت وہ کہتا " ارے چھوڑو یار، ایک رٹ لگا رکھی ہے ـــ اٹھو بن جاتا ہے ـــ بس پیر فقیر اٹھا بستر چل تکیہ زیارت کو۔ بی جی روزی بھیجو ـــ یہ بھی کوئی تک ہے، رہنے جاؤ بات، میاں کوئی کام کی نئی بات کہو تو ایک بات بھی ـــ ہاں" جیسے یہ ساری چیزیں اس کے لئے جانی پہچانی وڑھنا بچھونا تھیں، لیکن اس وقت یہ سوال بار بار اس کو ٹکّے پر مکّا رسید کر رہا تھا ـــ کیوں نہیں؟ مہندر کے روپئے؟ ہو گیا خبطی جیسا بدحواس۔ اس نے پھر پیسوں کو کرید کر دیکھا، وہ موجود تھے، اس کے پاؤں اکھڑے اکھڑے، ڈھیلے ے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ "رین بار" میں داخل ہو چکا تھا۔

اں کی فضا اسے عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک گہری، دبی ہوئی لہر بڑھ کر جکڑ لیا ہے۔ سر سے پاؤں تک۔ وہ ایک کرسی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیرا مسکرایا بڑی ہمدردی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی مونچھیں جیسے کہہ رہی تھیں ـــ " ادھر کہاں مر رہے ہو، مکی تو بقالی کی دکان ہے۔ سوجھتا نہیں، نچیں ہیں، ٹیبل ہے، جس پر شوربے اور چلسٹے کے بیشمار دھبے جگمگا ر ا۔ وہاں چائے بھی ملتی ہے، گرم گرم سینکی ہوئی تنوری روٹیاں بھی، اور اس وقت نہاری بھی ملیگی "

جی صاحب ـــ؟ " اس کے سامنے طنزیہ سوالیہ نشان کھڑا تھا۔

ہاں ـــ"

کیا لایا جائے؟ "

جو تمہارا جی چاہے ـــ"

جی ـــ؟ "

ہاں، جو تمہارا جی چاہے، ـــ یہی پیسٹری، آملیٹ، کیک، اور جو تمہارا جی چاہے ـــ"

پیسٹری، آملیٹ، کیک ـــ"

ہاں، ہاں لے آؤ ـــ" وہ اپنا سر کھجلانے لگا۔

اروں طرف کمرے میں ننھی کرسیاں اور رنگین میزیں بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے رکھی گئی تھیں۔ سامنے ایک مڑی چاروں شانے چت کراہ رہی تھی۔ بیرے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ منیجر کے پاس ہی کچھ کھانے کی لذیذ چیزیں ت سے سجی گئی تھیں۔ ہوٹل کی اس آرائش و جمال کی کہانیاں تو بہت سنی تھیں، دور سے دیکھی بھی تھیں، لیکن اس کو اس میں بیٹھ کر انہیں چکھانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ نفاست، زیبائش، قرینہ، شیشے کے فانوس، صندلی الماریوں اور

ریسٹ انگریزی، بنگالی اور لکھنوی مٹھائیاں جھانک رہی تھیں۔ رنگین رنگین، سادہ سادہ، رنگ برنگ کی تتلیوں کو جیسے پکڑ کر ان میں بند کر دیا گیا تھا۔ ایک والہانہ خوشبو رقص کر رہی تھی۔ اس خوشبو میں اور پروقار ہوٹلوں کے سونعلاپے میں بالکل ایک کلرک اور سیٹھ دام چند دام کا فرق تھا۔

ٹھیک دروازے ہی کے سامنے ایک قد آدم آئینہ سینہ جھلکا رہا تھا۔ ہر اندر داخل ہونے والا آدمی اپنی چھب آئینے میں دیکھ کر خوش ہو جاتا جیسے آئینے نے چیخ کر کہا ہو "کیا کہنا ہے جناب" بعض ایسے بھی آئے، جنھیں اپنی خوبصورتی ایک ذہنی بھیانک تھی ان کا کڑوا ہو جاتا۔ ان کے چڑھتے ہوئے تیور میں نفرت جھٹک کر کڑی ہو جاتی، جیسے اس نفیس قد آدم آئینے نے کہہ دیا ہو "پیتھو اور یہ ہوٹل" لڑکیاں نرم نرم، حسین دلفریب، لیکن تنہا، اور کہیں ایک ہی شعر کے دو مصرعوں کی طرح میزوں کے آر پار آمنے سامنے، وہ کھاتا جا رہا تھا۔ سبز دیوار پر کلنڈر اور حریاں، نیم عریاں اور ہیجانی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس شاندار ہوٹل میں بھی، دو تین دیوتاؤں کی تصویر بھی تھیں۔ دیویوں کے برف دش مجسمے، متعدد ہاتھ، بطہر سوار کنول کے پھول، ہاتھی کا سونڈ [illegible] ارجن اور ہنومان، نہ جانے تقدیس اور ان چیزوں کا کیا جوڑ تھا۔ اس نے پورا ایک دانتوں میں دبا لیا۔ وہ کھاتا جا رہا تھا۔ [illegible] زبان کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی کھا پی رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں ایک بھوک، ایک مانگ، ایک عجیب سی غیر محسوس تلاش کانپ رہی تھی۔ نہ جانے اس میں چھچھوراپن بھی تھا یا نہیں۔

وہ پاس ہی لڑکی داخل ہوتے ہی، برق جو کر سب کی نگاہوں پر جیسے گر گئی۔ اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ ٹھہری، رکی، پھر سر جھٹک کر ایک میز کی طرف بڑھی۔ وہ بہت حسین تھی۔ اس ہوٹل میں اس سے زیادہ مکمل عورت اور کوئی دوسری تھی، اس کی چوٹیاں دو برابر حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ جڑیں ان کا ایک ہی مرکز تھا۔ ایک سانپ آگے جھول رہا تھا اور دوسرا پشت پر۔ اس کا جی چاہا، کاش یہ سانپ پھن پھیلا کر اس پر جھپٹے، اس کو ڈس لے۔ اس کا زہر اس کی رگ رگ میں گھل جائے اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس نے کبھی اپنی بیوی کو بھی اسی طرح اپنے انتظار میں بیقرار پایا تھا۔ لیکن اس کے پاس [illegible] سانپ نہ تھے جن کی خوشبو پھن پھیلا کر ڈستی پھرتی ہو۔ ایسی ساری، ایسے سینڈل، ایسے بارڈر، [illegible] چشمہ اور سونے کی کلائیاں، زمرد کی اینٹرنگ یہ سب کچھ اس کے پاس کہاں تھا۔ [illegible] بیوی کا خیال [illegible] اس لئے اس نے ہر ممکن کوشش سے اس کی شکل، کانپتی ہوئی کپکپیوں کو زبردست اپنے تصور کی سرحد سے باہر دھکیل [illegible] یہاں اس کا کیا کام تھا۔ اس کے پاس مہندر کے روپئے تھے۔ ہال میں بیرا چمک کھا رہا تھا، نگاہیں ناچ رہی تھیں [illegible] چھوکری تھی اور بھی لڑکیاں تھیں، مگر اس کے مقابلے میں وہ کمزور تھیں۔ مسلح ہونے کے باوجود ان کے حملوں میں [illegible] دیوانہ نہ تھا۔ وہ تو ــــ "بقدر پیمانۂ تخیل" اپنے دل میں سودا کی تو ضرور جگا رہی تھیں، لیکن اس کے [illegible] اور طوائف کے ڈیرے کی بے حجابی کا فرق رکھتی تھیں۔

وہ چکیلی، خوبصورت، حسین، جگمگاتی ہوئی شاخ برق ساماں تھی۔

وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔

وہ اسے کھا رہا تھا۔

اس لئے کہ وہ زینت بازمیں تھی۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔

وہ اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن سات سال کی تاریخ اسے روک رہی تھی جس کا [illegible] مہندر کے روپئے تھے اور ان پر اس کا قبضہ تھا۔

دروازے میں ایک لانبا خوش پوش نوجوان داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان ایک [illegible]

چمک گئی تھی۔ اس کے رخساروں پر خون کی تابیاں منجمد ہو گئیں۔

منیجر اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے روپے کے ٹرے میں نوٹ کے پلندے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی پاس کے روپے بل پر خرچ ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ چندہ کرتے پھر رہے تھے، وہ کالج کے لڑکے تھے " فریڈم، پیس، پروگریس " ایک موہوم امید، کشمکش اور جدوجہد پر چلنے کا نعرہ۔ صرف نعرہ۔ لیکن ملا کیا؟ قربانیاں تو ہوئیں۔ کلکتہ، کراچی، بمبئی کے نعرہ انقلابی گھن گرج نے کیا دیا؟ کیبنیٹ مشن ہی نا؟ وہ تو ۴۲ میں بھی آیا تھا ———— ذرا دیکھو تو، کہتے ہیں، انھیں بنگال اور بہار سے ہمدردی ہے۔ جہاں انسان نے انسان کا گلا کاٹ کر انسانیت کو امر بنا دیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں انسان کے خول میں درندوں کی روح رکھنے والے انسانوں کی کارگذاریاں غیر فانی ہو گئی تھیں۔ انسان کے چہروں پر اپنے ہی ہاتھوں کے نشان تھے۔ اسے ان لوگوں سے ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے پاس جو پیسے بچ رہے تھے ان سے اس نے سگریٹ خرید لی۔ اس کا خیال تھا، خودکشی عام ہو گئی ہے، اس لئے گناہ نہیں۔ نواکھالی اور بہار میں انسانوں نے انسانوں کو مارا۔ انسانیت نے خودکشی کی۔ میں بھی خودکشی کر سکتا ہوں اور خودکشی کرنی پڑیگی۔ وہ جب ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کے ذہن کے پس منظر میں وہ حسین مورتیں چکر کھا رہی تھیں۔ لیکن ان دھندلکوں کی تہہ سے صرف ایک سوال ابھر رہا تھا۔ مہندر کا روپیہ؟

آخر مہندر کا روپیہ کس طرح ادا ہوگا؟ لیکن کوئی بات نہیں۔ تین روز میں تنخواہ مل جائیگی۔ اس نے اپنے دل کی تمنائیں پوری کی تھیں۔ آملیٹ، پیسٹری ——— اور ——— اور، یہ کوئی معمولی بات تھی کیا؟ لیکن زینو بیمار تھا، بیوی کی کہنیاں ننگی تھیں۔ اس کے کمرے میں گندگی تھی۔ اس کی زندگی کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ آخر کب تک اس طرح گذارا ہوگا۔ کب تک بغیر کپڑے اور اناج کے آدمی جی سکیگا، اور اس پر مہندر کے روپے وبال بن گئے تھے۔ اب اس کے جوش کی اتری ہوئی ترنگ نے تلخ احساس کی لو اوپر اٹھا دی، جو اس کے دماغ کو پگھلانے لگی، اور دھواں ہی دھواں اس کی نگاہوں پر چھا گیا۔ اس کی ناک کی باریک گلیوں میں محبوس اکتاہٹ رینگنے لگی۔ دماغ کے اوپری گنبد میں چنڈول بولنے لگا۔ درد اور دھڑکنوں کی تاؤ سینے میں ہچکولے کھانے لگی۔

اس نے ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر بجلی پیدا کی اور یہ دہکتی بجلی چنگاریاں اڑاتی، جسم کی نس نس میں کوندگئی۔ بجلی کے تار سڑکوں پر، یہاں سے وہاں تک سلسلہ وار آگے بڑھتے چلے گئے۔ برقی ستون پر سفید قلفیاں اوندھی ہوئی تھیں اور کالے کالے تار دانتوں میں جکڑے ہوئے تھے اور تاروں کے تناؤ پر اوس کی بوندیں تلوار کی دھار کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنی جیب کی اجڑی ہوئی دنیا میں اپنے ہاتھوں کو گھسیڑ لیا۔ اس میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی، جیب کے اندر بھی ٹھنڈک اور باہر بھی۔ پھر ایک بار مہندر کے حلوے کے تقاضے کی یاد نے اس کے رونگٹوں کو سہما دیا۔ کیا ہوگا؟۔ باتونی تو وہ خود ہے پتے دربے کا۔ باتوں میں آنے سے رہا۔ کیا جواب دوں گا؟ ———

اور پھر اچانک، خود، موت، تنہائی۔ ان تنہائیوں میں کیا رکھا ہے۔ گمنامی، الجھن بجھن، نہیں، نہیں ——— آدمیت سنبھلنے کا نام ہے۔ طوفان میں، دھکے میں، چوٹ سے خوف کھا کر آدمی کا خود اپنے آپ سے دور بھاگنا، رسوائی اور ذلت کی بات ہے۔ ان نیزوں کا مقابلہ کرو جو چھاتی کو تاک رہے ہیں۔ یہی ایک زندگی کا راستہ ہے۔ بھاگ، فرار، پھلانگ، ——— کھسیاہٹ ہے، بزدلی ہے، زندگی نہیں۔ موت ہے موت، موت ایسی جو موت بھی نہیں، بس ایک خلا جس کا مستقبل نہ ماضی۔ آگے پیچھے کھوکھلا پن اور کچھ نہیں۔ زندگی کی اذیتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مر جانا زندگی ہے۔ خودکشی موت ہے۔ صرف موت، جسے زندگی سے لڑنا نہیں پڑا۔

سامنے بینک کا اونچا سا محل اپنی خاصی زمین کی چھاتی پر الٹے منہ پڑا تھا۔ اس عمارت کا ناک نقشہ ہی بہت ڈراؤنا تھا

سُرخ اینٹوں سے بنا ہوا ڈھانچہ۔ کوئی پالش اور چکناہٹ نہیں۔ ساری چکنی ان روپوں میں تھی، جو اس کے اندر چانڈ کرتے رہتے۔ لڑھکتے رہتے ـــــ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں۔ سات سال سے وہ اس بینک میں کلرک تھا۔

اس کی شادی اور نوکری کی عمر برابر تھی۔ اس کی شادی کو تین بچے پیدا ہو چکے تھے، اور اس کی نوکری کو کوئی بچہ پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی تنخواہ بانجھ تھی۔ آغاز میں اسے کتنا مزا آیا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ بینک کی کمائی سے اپنی بیوی کے لئے چپل خریدی تھی۔ سُرخ۔ آسمانی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے نشوں کا آٹا نکلنے لگا، وہ ان رنگینیوں کا مقبرہ تھا۔ آرزوؤں کی ٹہنیوں پر اُلوؤں کا گھونسلہ بن گیا۔ طبیعت کی جولانی افیون کی گولیاں پھانک گئی ـــ بچے کچے۔ پیشاب کی کھرانٹ۔ پھیلوں کا اچار۔ گرم کوٹ کی سات سالہ تاریخ، بیوی کی چڑچڑاہٹ، اس کی ننگی کہنیاں، بچوں کی تپتی ہوئی پیشانیاں، چودہ روپیے کی سینڈل، مٹی کی لاٹھی، مہندی کے پانچ روپیے؟ ـــــــ آخر کیا کرے؟۔

کلرک کی زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ رمیش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تمام ہڑتالیں چلنے لگیں۔ ننگی عورتوں کے مظاہرے ہوئے۔ قومی حکومتیں طلوع ہو گئیں۔ لیکن زندگی افق کے زہریلے تاریک کھڈ اور ڈراؤنے غار سے نہیں ابھری۔ آسودگی، طمانیت اور مسکراہٹ جنم نہ لے سکی۔ رمیش عاجز آ کر ایک روز اپنی بیوی کی ساری باندھ کر آفس چلا گیا۔ لوگ ہنسے ٹھٹھا کے لگے، آتش بازیاں چھوٹیں۔ لیکن اس نے اپنے اونچے عہدے والے حکمراں کی ڈانٹ کی پروا نہیں کی۔ اس نے کہا: "کپڑا نہیں ملتا ہے۔ گھر میں ایک ساری ہے، بیوی بھی پہنتی ہے اور میں بھی۔ اب میں پہن کر چلا آیا ہوں، وہ صرف پیٹی کوٹ پہنے گھر میں بیٹھی ہے۔ جب تک میں واپس نہ جاؤں، تولیہ نہیں باندھوں، وہ دروازہ نہیں کھول سکتی" اور پھر قہقہوں کا بیلون پھٹ پڑا تھا۔ پھٹاک پھٹاک۔ ہی ہی ہی ـــــ! گیدڑ کے گیت اور سبھوں کے دل میں چولہے کی آنچ تیز ہو گئی تھی۔

اور بینک کی گھڑی نے سامنے ساڑھے دس کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ گہری سردی کے باوجود پسینے کی چپچپاتی ہوئی نمی، اس کے جسم پر مل گئی۔ اس کا منیجر اس سے پہلے آ گیا تھا۔ اس نے اس کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سہم گیا۔ اور سوکھتے ہوئے حلق کے ساتھ دربان کی بندوق کے پاس سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے بھی اس کے کابلی سینڈل نے اپنی تشریف آوری کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کر دیا۔

"کیوں ـــــ فائل کا کام ہوا؟"

"حضور ـــــ"

"حضور کہتے ہیں تم سے کام نہیں ہوتا تو جواب لے لو؟"

"کام تو ہوتا ہے حضور"

"کہاں ہوتا ہے، لاؤ فائل"

"وہ تو، وہ تو، غلطی سے گھر پر ہی رہ گیا، ننھے کی دوا جو لانا تھی ـــــ اور دیکھئے"

"بکواس، ـــــ ایک گھنٹے میں پھر آنا، تمھیں آج سمجھ لوں گا"

"لیکن ـــــ" اس کی آواز تھوک کا بڑا ڈھیلا بن کر حلق میں پھنس گئی۔

وہ فائلوں کی جھرمٹ میں آ کر اپنی کرسی پر آ کر دھم سے گر گیا۔ جیسے اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوں۔ اس نے یونہی غیر ارادی طور پر کنارے کی کرسی پر نظر ڈالی، مہندر للچائی ہوئی بھوکی نظروں سے گھور رہا تھا، وہ دنیا جیسے اس کی نگاہیں علوے کے تقاضے کی تاک میں تھیں۔ [illegible] [illegible] وقت سری [illegible] تھا [illegible] وہ ساکت، خاموش [illegible] [illegible] کو

پروین رشدی

بازگشت

یہ افسانہ مشہور مرہٹی ادیب وی ۔ایس کھانڈیکر کی تازہ ترین ناول کا ملخص ہے جسے جدید مرہٹی ادب کا شاہکار کہا جا سکتا ہے ۔کھانڈیکر نے متعدد ناولیں، مضامین اور فلمی کہانیاں لکھی ہیں ۔اس کی کئی کتابیں تامل، کنڑی اور گجراتی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ——— اس کا اسٹائل سادہ، پاکیزہ اور دلکش ہے ۔اسکی تکنیک بے عیب ہے اور تخیلات میں بلند پروازی پائی جاتی ہے ۔

صبح سے سلوچنا غائب تھی، اس کا بوڑھا باپ پروفیسر دادا صاحب بہت حیران و پریشان تھا ۔اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر پڑی، جو کاغذ کے ٹکڑوں سے بھری تھی ۔اس نے سوچا شاید وہ رات بھر کہانی لکھتی رہی ہوگی، جس کا اس نے ذکر کیا تھا اور اب تھک کر باہر گھومنے چلی گئی ہے ۔ ویسے ہی اس نے ٹوکری میں سے چند کاغذ کے پرزے اٹھائے، ایک ٹکڑے پر لکھا تھا "پیارے دلیپ" ——— یہ کہانی کا ہیرو ہوگا ۔اس نے اندازہ لگایا اور شاید ہیروئن نے اسے کوئی خط لکھا ہوگا ...... چائے پینے کے بعد وہ آج کے لیکچر کی تیاری کے لئے اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا ۔اس نے بادابھوتی کی "اتر رام چرتیا" کے ایک صفحہ کے شلوک پر سرخ نشان لگایا تھا، جس کا مفہوم تھا "درخت پر پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا پیار و محبت کر رہا تھا، اتفاق سے ایک بھیل شکاری ادھر آنکلا اور اس نے نر کو مار ڈالا ۔مادہ کی آہ و بکا سے متاثر ہو کر اس کو بھی تیر کا نشانہ بنا دیا، اسی وقت مشہور رشی والمکی، جنھیں پرندوں سے بڑی ہمدردی تھی، نمودار ہوئے اور بھیل کو برا بھلا کہا "وحشی تجھ کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوگی" ۔ اخبار والے کی آواز سنکر دادا صاحب کے خیالات ایکدم منتشر ہو گئے "مجرم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا"

"پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا!" دادا صاحب نے کہا ۔ "کسے پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے کوئی محب وطن ہے یا صرف مجرم ...." کالج کا وقت ہو گیا تھا، چنانچہ وہ فوراً روانہ ہو گیا ۔ کالج میں آج بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی ۔اسے پرنسپل سے معلوم ہوا کہ لڑکے کالج بند کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کے پرانے ساتھی ڈنکر سار ڈیسائی کو رام گڈھ کی عدالت نے اس بنا پر سزائے موت دی ہے کہ "اسنے کسانوں کے ایک ہجوم کو تشدد پر آمادہ کیا جس سے ایک کانسٹبل ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے" "ڈنکر!" دادا صاحب نے تعجب اور گھبراہٹ سے کہا ۔ "ہاں!" پرنسپل نے جواب دیا "یہ وہی لڑکا ہے جس کی آپ نے چار سال تک حمایت کی تھی، کاش یہ خود بیں لڑکا سیاست میں نہ الجھتا، خیر" اسنے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "رام گڈھ کے راجہ صاحب

(بقیہ صفحہ ۲۸) پھینا سے لگا ہوا تھا ۔اس کا سر چکرانے لگا، اس کی آنکھیں پنکھے کے درمیانی لٹو پر جمی ہوئی تھیں، یکایک اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں، پنکھا نظروں میں چکر کھانے لگا، گھن، گھن بجتی کہنیاں، ہانپتی ہوئی کم سن سانسیں ہندو، بینک منیجر پنکھا جنون میں تھا ۔ سگریٹ سلگ رہی تھی، اس کے جسم کو چنگاریاں نوچ رہی تھیں ۔ اس کی پلکوں کا غلاف صندوق کے بھاری ڈھکنے کی طرح گر گیا ———

"صاحب بہت ... [illegible]"

ایک پوری کے وائس پریسیڈنٹ ہیں چنانچہ ہم اُن کے دشمن کی ہمدردی میں کالج بند نہیں کر سکتے ...."

دادا صاحب جب کلاس میں داخل ہوا تو وہاں صرف چار پانچ لڑکے موجود تھے۔ اس نے بادا بھوتی کے شلوک سے لیکچر کا آغاز کیا، مگر اُس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہوگئیں اور اُس کے سامنے یہ نقشہ پھر گیا کہ ڈنکر اور سلوچنا پرندوں کی شکل میں بیٹھے بحث کر رہے ہیں۔ اور وہ بھیل کی حیثیت سے درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ سراسیمہ ہو کر اس نے لیکچر ختم کر دیا اور کالج سے چلا گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو سلو ابھی تک نہیں آئی تھی، پروفیسر نے خیال کیا کہ کہیں جذباتی سلو اچانک اپنے شوہر ---- رانگڑھ کے مشہور سرجن ڈاکٹر بھگونت راؤ سہانے کے پاس تو واپس نہیں چلی گئی؟

تو پھر اُس نے ڈاکٹر کو تار ضرور دیا ہوگا، وہ تیزی سے پوسٹ آفس پہنچا کہ شاید اسے وہاں کوئی تار مل جائے، لیکن تار کے بجائے اسے وہاں ایک لفافہ ملا۔ اس نے بیتابی کے ساتھ لفافہ کھولا تو اُس میں ایک کنجی نکلی اور ایک کاغذ جس پر لکھا تھا "آپ کا اور بھگونت راؤ کا مجھے تلاش کرنا بے سود ہے، یہ میرے دراز کی کنجی ہے" اچھا تو وہ اس کے پاس بھی نہیں گئی پھر؟ - اسے سکتہ سا آگیا وہ سیدھا گھر پہنچا اور دراز کھولی تو اُس میں ایک نوٹ بک نکلی، جس کے پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا "یہ میرا افسانۂ حیات ہے جسے میں لکھتی رہی ہوں" دادا صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑے اشتیاق کے ساتھ ورق گردانی شروع کر دی۔

اب سے پندرہ سال پہلے پتاجی جب ہمارے گھر غریب اور ذہین لڑکے ڈنکر مارڈیسائی کو کالج کی تعلیم کے لئے رانگڑھ لے آئے، اور اُس کو گریجویٹ ہونے میں مدد دی تو مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ وہ میری زندگی کا ایک اہم عنصر بن جائیگا، لیکن پہلے ہی روز میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں اسے برسہا برس سے جانتی ہوں، اور ہم جلد ہی " ایک شاخ کے دو پھل بن گئے" وہ مجھے سنسکرت پڑھایا کرتا تھا۔ ہم نے ایک سبق میں ایک بہادر مگر رحمدل راجہ دلیپ کا ذکر پڑھا، اُس کی رانی کا نام سلوچنا تھا۔ سلوچنا اور دلیپ، اس ہم آہنگی کا مجھ پر بڑا اثر پڑا۔ اسی دن سے میں نے ڈنکر کو دلیپ کہنا شروع کر دیا۔ ایک سال گذر گیا۔ اس کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جا رہا ہے، میں نے کہا میں بھی چلونگی۔

" مگر محترمہ! آپ کو میری، اس کے گھر کا مطلب بھی معلوم ہے؟" - "نہیں تو"

"جیل ہے" دلیپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

خیر تو وہ چلا گیا، ایک ماہ کے بعد واپس آیا اور مجھ سے کہا کہ وہ نمک ستیہ گرہ میں شامل ہونے گیا تھا۔ جو بدقسمتی اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ بہرحال وہ کچھ نمک ضرور لے آیا جو آخری گرفتار شدہ دستہ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے پیش کرتے ہوئے اس نے کہا، "سلو اسکو سنبھال کر رکھنا"

ایک سال اور بیت گیا، اس نے انٹر پاس کر لیا۔ پتاجی کو بہت افسوس ہوا کہ وہ معمولی ڈویژن میں پاس ہوا اور اسی لئے وہ اس کو سیاسیات سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ڈنکر کو جتا دیا کہ وہ کم از کم بی اے میں اس کی تلافی ضرور کرے، ورنہ وہ صرف ایک معمولی اسکول ماسٹر بن کر رہ جائیگا۔

دلیپ خاموشی سے سنتا رہا، صرف میں جانتی تھی کہ اس خاموشی کا مطلب ہے: یہاں کسے پرواہ ہے، میرا پہلا فرض اپنے دیش کی سیوا کرنا ہے؟ - دلیپ نے بی اے کے پہلے سال میں زیادہ ترقی نہیں کی۔ موسم خزاں کی تعطیلات میں وہ اپنی بیمار ماں کو دیکھنے چلا گیا۔ وہاں سے ایک ماہ بعد اس نے لکھا "سلو میں ایک سال کے لئے جیل جا رہا ہوں۔" اس زمانے میں میں میٹرک میں تھی، میں نے دل لگا کر محنت کی اور فرسٹ ---- ڈویژن [illegible]

رہائی کے بعد دلیپ واپس آیا اور پتاجی کی مدد سے بی۔اے فائنل کا امتحان دیا۔ مگر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ پتاجی کی بات سچ نکلی، دلیپ رامگڑھ میں پچیس روپیہ کا اسکول ماسٹر بن گیا۔ اسی سال میں انٹر کے پہلے سال میں فرسٹ پاس ہوئی تھی۔ اوہ! میں اپنے آپ کو کتنا مغرور ——— سمجھ رہی تھی۔ ایک سال اور بیت گیا، میرا انٹر فائنل ختم ہو چکا تھا۔ ان ہی دنوں دلیپ اتفاق سے ہمارے یہاں آیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ چلا آیا تھا اور اب ایک سنیاسی کے بھیس میں شمالی ہند کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے بی۔اے کی تعلیم میں اپنے کو بیحد منہمک کر لیا تاکہ اس کو بھلا دوں۔ اب میں عالم شباب میں تھی۔ مجھ پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ کاش دلیپ بھی مجھے دیکھ سکتا۔ لیکن وہ کہاں؟ فوراً ہی یہ خیال آجاتا "میرا اس سے واسطہ؟ وہ ٹھہرا ایک معمولی پچیس روپیہ کا ماسٹر اور پھر سنیاسی میرا اس کا کیا جوڑ! اس کا راستہ مشرق، میرا مغرب، تو پھر میرا مطمحِ نظر کون ہے ——— کون ہے" میں اس کا جواب پا سکی ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ پتاجی کے کالج کا پرنسپل چاہتا ہے کہ میں کالج کی سالانہ تقریب کی صدارت کروں ——— مقصد یہ تھا کہ ایک عورت کی صدارت میں تقریب میں حسن اور دلکشی پیدا ہو جائیگی، جس سے متاثر ہو کر راجہ صاحب رامگڑھ شاید کالج کو کوئی شاندار عطیہ دے جائیں۔ میری اس دن کی تقریر "بہت کامیاب ہوئی"۔ راجہ صاحب نے میری بڑی تعریف کی اور ان کے خانگی ڈاکٹر بھگونت راؤ نے آگے بڑھ کر، مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی گرم گرفت سے مجھے جھرجھری سی آگئی۔

ان دنوں پتاجی بیمار تھے، چنانچہ میں نے ڈاکٹر بھگونت راؤ کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور اس سے علاج کے لئے مشورہ کیا، جلد ہی ہم ایک دوسرے سے شناسا ہو گئے۔ وہ اور میں اکثر بہت دور تک چہل قدمی کے لئے نکل جاتے ——— جب پتاجی اچھے ہو گئے اور بھگونت راؤ رامگڑھ جانے لگا تو میں نے اس سے فیس دریافت کی، وہ مسکرایا اور بولا: "مجھے سادہ چیک چاہئے"۔ "ٹھہریئے!" میں نے مذاق سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک اس نے مجھے پیار کر لیا، "یہ ہے میری فیس" اس نے کہا۔ "چیک کا خالی حصہ اب بھر چکا" دوسرے ہی لمحے اس نے میری نظروں میں متشکرانہ جواب پا لیا ——— اس نے شادی کی تجویز پیش کر دی اور ہم منسوب ہو گئے ——— پتاجی کو بڑی خوشی ہوئی بھگونت راؤ نے مجھ سے کہا کہ وہ راجہ صاحب کے ساتھ شمالی ہند کے دورے پر جا رہا ہے اور مجھ سے بھی چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں فوراً راضی ہو گئی۔ واپسی میں ہماری ٹرین جاترا کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہری، مجھے ٹرین سے بہت سے سنیاسی اتر کر ایک قطار میں جاتے ہوئے نظر آئے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، ان میں دلیپ بھی تھا۔ میں چیخنا چاہتی تھی، مگر میری چیخ اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ گاڑی روانہ ہو گئی اور دلیپ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ میری زندگی بھی ———

جب میں بھگونت راؤ سہانے کی بیوی کی حیثیت سے رامگڑھ پہنچی تو میں اس کے بنگلے کے خوش منظر سواد سے بہت مسرور ہوئی۔ سامنے ایک جھیل تھی اور چاروں طرف نظر فریب مناظر ——— ! میں نے اوپر کے ایک متصل کمرے کو رہنے کے واسطے پسند کیا۔ میں اسے اپنی خوابگاہ بنانا چاہتی تھی۔ بھگونت راؤ نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا، اور بے دلی کے ساتھ کنجیاں میرے حوالے کر دیں۔ جب میں نے خادمہ کو، اس ویران کمرے کو صاف کرنے کے لئے بلایا تو وہ بھی اس کو خواب گاہ بنانے کے حق میں نہ تھی۔ میری بہت پوچھ گچھ پر بھی اس نے کوئی سبب نہیں بتایا، وہ خواہ کچھ بھی ہو، بھوت ہو یا چڑیل۔ کیا ایک ڈاکٹر بھی وہمی ہو سکتا ہے؟۔

خیر! اگر وہ ایسا ہے تو مجھے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ کمرہ ہماری خواب گاہ بن گیا ———

چند ماہ بعد بھگونت راؤ ایک دن کسی ضروری کام سے دہلی چلا گیا۔ تنہائی سے اکتا کر میں اکثر دلیپ کی یاد میں کھویا رہا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ دلیپ پُراسرار طریقے سے یہاں آنکلا ہے۔ اسی دوران میں مجھے خبر ملی کہ پتا جی بیمار ہوگئے ہیں۔ میں جلد آنے کی امید میں رامگڈھ سے چلی گئی، ابھی مجھے پتا جی کے پاس آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ مجھے ایک تار ملا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ بھگونت راؤ دہلی سے آگیا ہے۔ میں رامگڈھ پھر واپس آگئی۔ گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ جیل گیا تھا چونکہ وہ جیلخانہ جات کا چیف سپرنٹنڈنٹ بھی تھا، اس کے سامان میں مجھے ایک کتاب "بھوتوں کی کہانیاں" ملی۔ مجھے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے کئی جگہ سرخ پنسل کے نشانات ملے۔ میں نے سوچا بھلا ایک ڈاکٹر کو اس کتاب سے کیا کام۔ میں غصہ کی حالت میں فوراً جیل روانہ ہوئی۔ جیسے ہی میں اس کے دفتر کے دروازے پر پہنچی میں نے اندر ایک پہچانی ہوئی آواز سنی "ڈاکٹر صاحب جب تک کھانا اطمینان بخش نہیں دیا جائیگا قیدی اپنی بھوک ہڑتال ختم نہیں کریں گے" مجھے نفی میں اپنے خاوند کا سخت جواب سنائی دیا اور جلد ہی قیدی کو ہٹا دیا گیا۔ میں نے اس کو دیکھ لیا۔ اُفوہ! وہ دلیپ تھا، میرا سر چکرانے لگا ——— تھوڑی دیر بعد ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔

رات کے کھانے پر بھگونت راؤ نے بتایا کہ دلیپ کس طریقہ سے چھپ کر رامگڈھ آیا اور کیسے اس کا پتہ چلایا گیا ——— گرفتاری کے بعد اسے جیل بھیجدیا گیا۔ یہاں اس نے فوراً ناقص غذا کی شکایت کی، اب وہ اور اس کے ساتھی تین روز سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔ یہ سنکر میری آنکھیں چمک اٹھیں، میرا بہادر دلیپ! ظلم و تشدد کے خلاف لڑنے والا مجاہد! اس رات میں نے اپنی ناز و ادا اور اس ضد سے جسے صرف عورتیں ہی جانتی ہیں ——— اپنے خاوند کو قیدیوں کے مطالبات ماننے پر راضی کر لیا۔ ان دنوں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں لرز اٹھی، کیا لڑکا ہوگا؟ دلیپ کی طرح رحمدل اور بہادر، میں نے طے کر لیا کہ اس کا نام دلیپ رکھوں گی۔

چند روز بعد راجہ صاحب کی سالگرہ کے موقع پر تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اب میری توجہ ایک بار پھر اپنے خاوند کی طرف منعطف ہوگئی۔ دلیپ رہا ہو چکا تھا۔

دوسرے دن بھگونت راؤ اور میں "آرٹ ایگزبیشن" دیکھنے گئے، دو تصاویر خاص طور پر بہت خوبصورت تھیں، ایک عمر خیام کی، جس پر فارسی میں ایک رباعی لکھی تھی، جس کا مفہوم یہ تھا "پیو، محبت کرو اور رنگ رلیاں مناؤ کہ شاید پھر کل نہ آئے" اور دوسری تصویر میں پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا، جس میں ایک کمینہ شکاری جو نر کو مار چکا تھا مادہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنا رہا تھا ایک عورت خون آلود، دم توڑتی ہوئی مادہ کو ہاتھ میں لئے تھی اور آنسو بہا رہی تھی اور شہود رشی والمکی اپنا ہاتھ اٹھا کر بھیل کو بددعا دے رہے تھے۔ بھگونت راؤ نے پہلی تصویر کو پسند کیا اور میں نے دوسری۔ ٹھیک ہمارے نظریات میں بھی اختلاف تھا۔ آرٹ گیلری دیکھ کر ہم دروازے پر پہنچے تو وہاں دلیپ سے سامنا ہوا، وہ مسکرایا "کہیئے! نمائش دیکھی" میں نے پوچھا "آپ کو کونسی تصویر پسند آئی"

"مجھے تو پرندوں والی تصویر بہت اچھی معلوم ہوئی" ۔ "دیکھی؟" میں نے بھگونت راؤ سے کہا۔

"اکثریت میری طرف ہے" "مگر اکثریت ہمیشہ عقلمندوں کی نہیں ہوا کرتی ہے" اس نے فوراً جواب دیا "بہرحال میں اس کو تمھارے لئے خرید لوں گا" اور دوسرے دن وہ تصویر میرے کمرے میں تھی، کچھ روز بعد میرے ایک لڑکا ہوا، ——— صرف دس روز زندہ رہنے کے لئے، میری ملازمہ نے اس حادثہ کو "منحوس تصویر" سے منسوب کیا۔

پھر اس نے ——— اس کا سبب بتایا، یہ ایک پُراسرار انکشاف تھا۔ راجہ صاحب کی ایک خوبصورت لڑکی کا انتقال ہوا تھی، وہ اس کو اسی بنگلے (ہماری موجودہ خوابگاہ) میں الگ رکھتے تھے۔ تاکہ وہ تیلی لال سے، جو اُن کی مرضی کے خلاف منگنی

روز روز لڑائی جھگڑے نہ ہوں، یہاں اکا صاحبہ کو اپنے موسیقی کے استاد سے محبت ہوگئی، اور کچھ دن بعد حمل ٹھہر گیا، راجہ صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گئے، اکا صاحبہ نے التجا کی کہ اس کی شادی استاد سے کر دی جائے، مگر یہاں ہز ہائینس کے وقار کا سوال تھا، اس معاملہ کو چھپانے کے لئے راجہ صاحب نے استاد کو گرفتار کروا دیا اور پھر بھگونت راؤ کو حکم دیا کہ وہ لڑکی کے جنین کو آپریشن کے ذریعہ ضائع کر دے، تاکہ راجکماری کی دوشیزگی برقرار رہے؛ اس خطرناک آپریشن میں، جو اوپر کے کمرہ میں ہوا تھا، اکا صاحبہ جانبر نہ ہوسکی۔ اس کا آخری نظارہ اس قدر بھیانک تھا کہ ڈاکٹر آج تک نہیں بھلا سکا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اس کمرہ سے کیوں گھبراتا ہے اور آسیبی کہانیوں سے کیوں دلچسپی ہے۔ لیکن اس نے ایسی وحشیانہ حرکت کیوں کی، میں نے اس سے جواب طلب کرنے کا تہیہ کیا۔

"لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا" اس نے جواب دیا "مجھے ہز ہائینس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی، میں ان کا خادم ہوں"

"لیکن غلام تو نہیں ہو" میں نے فوراً کہا۔ "تمھیں نہیں معلوم انھوں نے میرے لئے کیا کچھ کیا ہے"

"خواہ کچھ بھی سہی، تم اپنے عہدے سے استعفا دے کر دوسری جگہ ملازمت کر سکتے تھے اور ان کا قرض کو اتار سکتے تھے"

"ایسی حالت میں میری وہ حیثیت اور اقتدار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے میں تم جیسی لڑکی سے شادی کر سکا ہوں"

.... تلخ اشارات! لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہیں؟ کیا میں شادی سے قبل واقعی اس سے محبت کرتی تھی؟

ایک دن عام جلسے میں دلیپ کی تقریر ہونے والی تھی، میں بھی پہنچ گئی۔ تقریر نہایت سادہ اور اثر انگیز تھی، تقریر کے بعد طلباء نے "پیغام" کے لئے اس کو گھیر لیا، میں بھی اس کے پاس پہنچی "میرے لئے کوئی پیغام؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور یہ جملہ لکھ دیا "ماں بنو!"

وہ کتنا ستمگر تھا، حالانکہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ حال ہی میں میرا بچہ جاتا رہا ہے۔ میں نے اپنے پر قابو پا کر اس سے وضاحت چاہی تو اس نے جواب دیا "میرے ساتھ گاؤں چلو، تمھیں خود اس کا جواب وہاں مل جائیگا" دوسرے دن وہ مجھے گاؤں لے گیا، اور وہاں دیہاتیوں کے نکبت و افلاس کے دردناک مناظر دکھائے "ان لوگوں کی ماں بنو!" اس نے زور دیکر کہا۔

جب میں گھر واپس آئی تو میرا دماغ بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ چند روز بعد بھگونت راؤ راجہ صاحب کے ساتھ بمبئی چلا گیا اس دوران میں کالرہ وبائی شکل میں سارے شہر میں پھیل گیا، دلیپ اور اس کے ساتھیوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے جان توڑ جد و جہد کی، میں بھی ان کے ساتھ ہوگئی، وبا پر قابو پا لیا گیا۔

جب بھگونت راؤ واپس آیا تو اس نے طنزاً مجھ سے پوچھا "معلوم ہوا ہے کہ تم رضاکارانہ کام کر رہی تھیں"

"یقیناً" میں نے جواب دیا "مشہور ڈاکٹر بھگونت راؤ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے، جو راجہ کے ساتھ ایسے اہم وقت پر چلا گیا تھا جب کہ اس کی شدید ضرورت تھی"

"جی ہاں!" اس نے کہا "یہاں ٹھہرنے کے لئے میں عوام کا نوکر نہیں ہوں۔ میں راجہ صاحب کا ملازم ہوں اور جانِ من! تم یہ سب کچھ اس شوریدہ سر دلیپ کی خاطر کر رہی ہو۔ ورنہ تمھیں عوام سے کیا لگاؤ۔ اب یہ رنگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا ——— سمجھیں" اور وہ تمکنت کے ساتھ چلا گیا۔

میں عوام کا نوکر نہیں ہوں ——— بھگونت راؤ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے، دلیپ اور اس میں کتنا فرق ہے؟ جلد ہی وہ بمبئی چلا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ قریب ہی کے گاؤں میں دلیپ ملیریا میں مبتلا ہے، چنانچہ میں اسے دیکھنے کے لئے گئی، گنمسے اور ان پڑھ گنواروں کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ شراب کے نشے میں شور و غل مچا رہے تھے اور زور شور سے گالی گلوچ کا ہنگامہ برپا تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی، جب میں دلیپ سے ملی تو میں نے کہا خوب!

کیا یہی دیہاتی ہیں جنھیں آپ مثالی آدمی بنا رہے ہیں ؟"

"آدمی پیدا نہیں ہوتے" ، اس نے کہا " وہ بنائے جاتے ہیں ، آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ وہ کس طرح بنائے جاتے ہیں "

مجھے ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں لے گیا ، جو اس نے قائم کیا تھا - میں وہاں کے ننھے ننھے طلباء کے طور طریق ، صوم اور صفائی ستھرائی دیکھ کر بڑی حیران ہوئی -

دیکھا تم نے ! " دلیپ بولا " اسی طرح دوسروں کی بھی تربیت کی جائیگی "

میں اس کی جھونپڑی میں واپس آگئی ، اس نے اپنی نقاہت کے باوجود مجھے گھر تک چھوڑنے پر اصرار کیا ، وہ جانتا تھا کہ راستہ کا نالہ ہلکی سی بارش ہی سے باڑ پر آجاتا ہے ، جب میں نالے کو پار کر رہی تھی تو میرا پاؤں ڈگمگایا اور ...... اور تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے کو دلیپ کی جھونپڑی میں پایا ، اس نے مجھے بچایا تھا ، اس روز مجھے وہیں ٹھہرنا پڑا - کیونکہ دلیپ اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ مجھے دوبارہ نہیں لیجا سکتا تھا - دوسرے دن روانگی سے قبل میں نے اس کی تصویر مانگی ، اپنی تصویر کے بجائے اس نے مجھے گاندھی جی کی ایک تصویر دے دی - گھر پہنچکر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بھگونت راؤ گذشتہ رات بمبئی سے واپس آگیا تھا " کہیئے ! آپ کے دلیپ صاحب کے کیسے مزاج ہیں " - اس نے طنزاً کہا " خوب ! "

" تو محترمہ اس کی تصویر بھی لائی ہیں " یہ کہکر اس نے تصویر میرے ہاتھ سے چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی ، میں دوڑ کر اس کو اٹھا لائی اور اس کے منہ پر دے ماری ، اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ، لیکن ندامت نہیں ....

شام کو باہر جانے سے قبل اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں آج کسان سبھا کے جلسے میں جا رہی ہوں ، جہاں دلیپ تقریر کرنے والا ہے جب میں نے کہا " نہیں " تو بولا کہ " یہ بہت اچھا ہے - کیونکہ میں تمہیں گولی کا تماشہ دیکھنا نہیں چاہتا - تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جلسے پر آج گولیوں کی بوچھار کی جائے گی ———— اور دلیپ ہلاک ہو جائے گا ؟ - میری نظر پرندوں کی تصویر پر پڑی ، میں نے زخمی پرند کو غور سے دیکھا تو اس نے بتدریج دلیپ کی شکل اختیار کر لی اور روتی ہوئی عورت میں بن گئی ! اور میں نے فوراً دلیپ کو اطلاع دی " دل کا بہت سخت دورہ پڑ گیا فوراً آجاؤ " میں نے سوچا جب دلیپ آجائے گا تو میں اسے روک لوں گی ، اس طرح وہ بچ جائیگا ———— اس وقت ہر لمحہ میرے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا ———— کہ اتنے میں نوکر نے دلیپ کے آنے کی خبر دی ، میں ایکدم بستر پر بیمار بن کر پڑ گئی - ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور وہ بتا رہا تھا کہ جو خط میں نے اسے بلانے کے لئے بھیجا تھا ، وہ غلطی سے اپنی ماں کے تکیئے کے نیچے رکھ آیا ہے - میری حیرت کی انتہا نہ رہی ، جب میں نے دیکھا کہ بھگونت راؤ دروازے پر کھڑا ہے - میں گھبرا کر دلیپ کی آغوش میں گر پڑی اور بیہوش ہوگئی ، جب ہوش آیا تو میرے پاس صرف دلیپ ہی تھا -

" تم نے بغیر سوچے سمجھے اپنے کو میری آغوش میں گرا کر مجھے بڑی پریشانی میں ڈالدیا تھا ———— سنو ! " اس نے مجھ سے کہا - میں جانتی تھی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور میں نے شرم سے گردن جھکا لی - میں اپنے خاوند کو اطلاع دیئے بغیر جلد ہی پتاجی کے گھر آگئی اور اس وقت سے یہیں ہوں - اس وقت میرے سامنے ایک تار رکھا ہے ، جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ " عوام کو تشدد پر اکسانے کے الزام میں دلیپ کو پھانسی دیجائیگی ، یہ بالکل غلط ہے ، جلسے کے وقت وہ میرے پاس تھا بھگونت راؤ اس کو اچھی طرح جانتا ہے ، لیکن اس نے عدالت میں اس کا اظہار نہیں کیا اور دلیپ نے عدالت میں اقبال جرم سے صاف انکار کر دیا ہے ، لیکن اس کی کون پرواہ کرتا ہے - اگر میں عدالت میں سچائی بیان کر دوں تو کیا وہ بچ سکتا ہے ؟ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں ! - کیا اس سے میری گھریلو زندگی تباہ نہ ہو جائے گی ؟ پتاجی کے نام پر دھبہ نہ لگے گا اور میرے بچے کا مستقبل برباد ہو جائیگا ؟ اوہ ! دلیپ کے لئے کیا کروں ؟ ———— کیا ———— ؟

دادا صاحب یہ کہانی پڑھ کر ششدر رہ گیا، اس نے پہلی ٹرین سے دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا، جب بھگونت راؤ کے گھر پہنچا تو ایک جوان عورت بھگونت راؤ کے کمرے میں موجود تھی، جو بظاہر بیوہ معلوم ہوتی تھی، اسے علم تھا کہ اس کے داماد کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہے، جو اس سے اس قدر قریب ہو سکے۔

وہ کون ہے؟۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بھگونت راؤ نے اسے ایک سربمہر لفافہ یہ کہتے ہوئے دیا "یہ آپ کے لئے ہے" اور خود باہر چلا گیا۔ یہ ڈاکٹر کا خط تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے پڑھنا شروع کیا:۔

"میرے محترم بزرگ!

اگر میری سوجائیں بھی لے تو بھی آپ کی مہربانی، احسان اور امداد کا بدلہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اس خواب کی تعبیر نہیں بن سکا کہ میں ایک ممتاز اور اعلیٰ درجہ حاصل کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنا پہلا فرض یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے دکھی دیش کی خدمت کروں، اگر میں صرف اپنی ہی فکر کرتا تو یہ بڑی خود غرضی ہوتی۔ بھگونت راؤ اور میں ایک ہی اسکول کے طالب علم تھے۔ ہم دونوں غریب تھے۔ محبت اور افلاس کے احساس نے مجھے سماج اور ملک کی نجات کے لئے ایک جوشیلا کارکن بنا دیا۔ برخلاف اس کے وہ عملی اعزازات حاصل کرنے میں کوشاں رہا اور آخر کار دنیاوی ترقی کا راستہ اس نے اختیار کر لیا، یہی وجہ ہے کہ وہ صرف اپنے مالک کا خیال کرتا ہے اور عوام کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی، اس لئے سلو اس سے نفرت کرتی ہے، اس سے میری زندگی میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

جس دن سے میری سلو سے ملاقات ہوئی، میں نے محسوس کیا جیسے میں اس کو ہمیشہ سے جانتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہماری محبت سے لاعلم نہیں ہو گئے۔ بہر حال میں نے یہ سمجھ کر کہ خوبصورت سلو پُرمسرت زندگی کی مستحق ہے، جو میرے ساتھ ناممکن ہے۔ میں نے دانستہ اپنے آپ کو اس کے راستہ سے ہٹا لیا اور ہر وقت اس سے دور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہر کیف جب بھگونت راؤ سہائی سے اس کی شادی ہوئی تو میں نے خیال کیا اور مجھے یقین ہے کہ سلو نے بھی یہی خیال کیا، اسے صحیح ماحول مل گیا ہے۔ لیکن اسے جلد ہی اس کا احساس ہو گیا کہ دنیاوی مسرت سے وہ کبھی سکون حاصل نہیں کر سکتی، اس کے تحت الشعور میں تصوراتی زندگی کا خاکہ ابھرتا جا رہا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شادی کے بندھنوں کو توڑنا آسان نہیں، اسے اپنے خاوند کی خدمت کرنا لازمی تھا، لیکن وہ ایک چیز بڑی خوبی سے کر سکتی تھی کہ اپنے شوہر کو سچی اور بے لوث محبت سے بتدریج راہِ راست پر لے آئے۔ مگر یہ خط ختم کرنے سے پہلے میں ایک چیز اور کہنا چاہتا ہوں آپ نے سلو کے کمرے میں، پرندوں کی تصویر دیکھی ہو گی۔ مجھے یاد ہے کہ ان پرندوں کی روایت آپ کو خاص طور پر پسند ہے۔ آپ کتنی خوبی اور وضاحت سے اسے سمجھایا کرتے تھے۔ اس بار میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور شاید آپ بھی اس سے اتفاق کریں، یہ پرندے دنیا کے غریب، بے گناہ لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چیل، ظالم اور جابر کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور روتی ہوئی عورت، ان نرم دل جذباتی انسانوں کی عکاسی کر رہی ہے جو مظلوموں کی ہمدردی میں آنسو بہاتے ہیں۔ اور رشی، وہ عالم ہے، جو ظلم اور تشدد کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ تصویر ہمارے ملک کی صورت حال کی ترجمانی کرتی ہے۔ بہر کیف میں اس کو دوسری نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں جذباتی آدمیوں اور عالموں کی جگہ ایک نوجوان مرد مجاہد کو ترجیح دیتا ہوں، جو چیل کو غریب پرندوں کو

نقصان پہنچانے سے قبل اپنے تیروں سے چھلنی کر دے اور صرف یہی کافی نہیں بلکہ نوجوانوں کو ظالم پر اپنی گرفت مضبوط کر لینا چاہیئے، تاکہ اسے ایسی شکست دی جا سکے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکے اور مظلوم انسانیت کو نجات مل جائے۔ میری رائے میں ہم تینوں ——— آپ، سلو، میں اپنی جگہ رکھتے ہیں۔ سلو جذباتی ہے ——— آپ عالم ہیں اور میں نوجوان کے فرائض انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں، ایک جذباتی اور ایک عالم ظلم کو نہیں روک سکتے اور ——— اگر مجھے عملی جدوجہد کے سلسلے میں کل پھانسی پر چڑھا دیا گیا تو میں اس تمنا کے ساتھ خوشی سے جان دوں گا کہ میں سلو کے رحم دل لڑکے کی شکل میں دوبارہ جنم لوں گا۔ آپ سلو کو سمجھا دیجئے کہ وہ میرے لئے آنسو نہ بہائے، بلکہ اپنے فرائض ادا کرے اور اپنے خاوند کو تاریکی میں روشنی دکھائے۔

صد ہا تعظیمات کے ساتھ

آپ کا بدقسمت : ڈنکر سارڈیسائی

دادا صاحب اس انکشاف سے حیران رہ گیا اور اس نے بھگونت راؤ کو یہ خط دکھانے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ سلو کے خلاف اس کے شبہات دور ہو جائیں، اچانک اسے یہ آواز سنائی دی "کملا مجھے تنہا چھوڑ دو" ——— اس کے بعد قدموں کی آہستہ آہستہ چاپ آئی۔ اس نے دیکھا کہ بھگونت راؤ جھیل کی طرف جا رہا ہے۔ دادا صاحب تیزی سے اس کی طرف دوڑا اور جب وہ اس کے پاس پہنچا تو بھگونت راؤ ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے نام کا ڈنکر کا خط کھول لیا تھا، میں نے اس کو پڑھ کر دوبارہ بند کر دیا تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ سلو کے نام یہ اس کا آخری محبت بھرا خط ہوگا" تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا "آپ جانتے ہیں کہ ایک عرصے سے میں یہ دیکھ رہا تھا کہ سلو ڈنکر کی محبت میں پریشان ہو رہی ہے۔ کسان سبھا کے جلسے کے وقت معاملہ عروج پر پہنچ گیا۔ مجھے دلیپ کی ماں کے بستر پر سلو کا ایک خط ملا۔ میں علاج کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سلو نے دل کی شدید تکلیف کا محض بہانہ کیا ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ ڈنکر ان کے پاس ہوگا، اور وہ وہیں موجود تھا۔ سلو نے فوراً اپنے آپ کو اس کی آغوش میں گرا دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس وقت کیونکر گذرتا، خیر ہوئی کہ وہ چلی گئی ——— شاید وہ ہمیشہ کے لئے" دادا صاحب نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں ضرور واپس آئے گی"۔ "مگر مجھے اس کی امید نہیں" بھگونت راؤ نے کہا۔

"ہم میں بنیادی اختلاف ہے، وہ تخیل پرست لڑکی اور میں مادیت پسند، دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ مجھے سمجھنے کے لئے میرے ماضی کو دیکھئے، میں ایک بہت ہی غریب طالب علم تھا، حتیٰ کہ قریبی رشتہ دار تک مجھے غریبی کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ چنانچہ میں نے سخت جدوجہد کی اور امتیازی طور پر میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد میں میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا، وہاں ایک لڑکی کلاس سے مجھے محبت ہو گئی اور وہ بھی مجھے چاہنے لگی، مگر اس نے کسی دوسرے امیر شخص سے شادی کر لی۔ میں نے سمجھا کہ روپے سے محبت کو بھی خریدا جا سکتا ہے، اس وقت سے میرا واحد مقصد یہ اور صرف روپیہ بن گیا۔ مگر سلو نے مجھے بتا دیا کہ نظریات اور تصورات کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ جب وہ واپس گھر آئے دادا صاحب نے اس کو سلو کی نوٹ بک دے دی اور بتایا کہ یہ اس کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ بھگونت راؤ نے اسے فوراً ہاتھ میں لیا اور باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی اور پھر سلو دادا صاحب کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا"۔ "پتا جی، "سلو نے دادا صاحب کے بازوؤں میں گرتے ہوئے کہا" میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اصل حقیقت راجہ صاحب کو بتا کر دلیپ کو چھڑوا لوں گی۔ آپ بھگونت راؤ سے کہہ دیجئے کہ میں انہی کی ہوں اور انہی کی رہوں گی"

: چانک انھیں نیچے ایک موٹر کے رکنے کی آواز آئی اور بھگونت راؤ کسی شخص کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا، وہ اوپر آ گئے دوسرا شخص دلیپ تھا ـــــــــــــــ !

دلیپ نے کہا "آپ نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب ان ڈاکٹر صاحب کو بھی آپ کی تعلیم کی ضرورت ہے ـــ انھوں نے صرف مجھے رہا کرایا ہی نہیں بلکہ اپنے عہدے سے بھی استعفا دیدیا ہے اور عوام کی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ ملیریا کی ریسرچ کے لئے جا رہے ہیں تاکہ اس وبا کے انسداد کے لئے کوئی معقول علاج معلوم کر سکیں، جس سے ہمارے گاؤں میں سیکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں"

دادا صاحب نے اس کو اپنے بازوؤں میں سے لیا اور بھگونت راؤ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "سنو تمھارا اندر انتشار کر رہی ہے"

"ارے!" بھگونت راؤ نے کہا اور ایک ہی جست میں اندر چلا گیا۔

عاشق شاہ

یہ ہے ایک گلی؟

آبادی سے دور شہر کے اس کونے میں اس گلی کا یوں چپکے چپکے سب سے الگ تھلگ رہنا واقعی ایک اجنبیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ نہ مجھے جانتی ہے اور نہ میں اسے پہچانتا ہوں، پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اس سے خوب واقف ہوں۔ ایک نہ ملنے سے اس کی میری دوستی ہے اور ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہم دونوں میں قائم ہے۔ پھر بھی ہم دونوں انجان ہیں نہ جانے کیوں!

یوں تو میں نے بہت سی گلیاں دیکھی ہیں، لمبی لمبی بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح، تنگ و تاریک قبر کی طرح۔ تنگ تنگ، جہاں سے ایک انسان کا گذر بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ اندھیری جہاں سورج کبھی نہیں چمکتا۔ اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی، گندی، بدبودار اور پھر ایسی جہاں انسان چلتے ہوئے یہ محسوس کرے کہ اس کی سانس رک رہی ہے اور اس کا دم جیسے اب نکل ہی جائیگا۔ بند اجن میں ہوا کا کبھی گذر نہیں ہوتا۔ گلیاں پیچ در پیچ عورت کی طرح۔ گلیاں ویران جس میں کوئی نہیں چلتا۔ اور پھر چند ایسی گلیاں، جو رکتی، ٹھہرتی، سنبھلتی، پھسلتی، سکڑتی ہوئی کسی ایک وسیع سڑک پر جاکر دم توڑتی ہیں۔ غرض میں نے سیکڑوں گلیاں دیکھی ہیں، تمام تماشے کیا فائدہ۔ لیکن ایسی گلی۔ جی ہاں ایسی گلی میں نے ابتک نہیں دیکھی۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے پچھلی دیکھی ہوئی گلیوں کو بھول گیا ہوں۔ اب میرے حافظے میں یہی ہے۔ جیسے مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا۔ دس مہینے کے قلیل عرصے میں میں اسے خوب پہچان گیا ہوں اور اب میں اس کی نس نس سے واقف ہوں۔

یہ گلی گھر کی سیدھ میں دور تک جاکر یکدم رک گئی ہے۔ اس میں نہ ٹیڑھا پن ہے اور نہ کوئی پیچ و خم۔ اس کی چال بالکل سیدھی ہے۔ ابتک اس کی چال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا ایک ہی انداز ہے، جس پر وہ ابتک قائم ہے۔ میں نے اسے کبھی رنگ بدلتے نہیں دیکھا، اس میں وہی متانت جو پہلے روز میں نے دیکھی۔ ہاں یہ بلا کی سنجیدہ ہے۔ دن رات کی باتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ ہر وقت خاموش رہتی ہے اور یہ سنگلاخ چٹانوں سے بنائی گئی ہے۔ مسطح اور ہموار ڈھلوان نام کو نہیں۔ سیدھی بالکل سیدھی۔ اس کا یہ پُدنا رنگ ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ سیدھی اور سخت!۔

یہ گلی اپنی آغوش میں کئی گھروں کو چھپائے ہوئے ہے۔ یہ گھر آمنے سامنے ایک قطار میں دور تک چلے گئے ہیں۔ یہ گھر ارشد کا ہے۔ اس گھر میں مولانا رہتے ہیں۔ یہ گھر عاقلہ کا ہے۔ اس گھر میں ایک بڑھیا رہتی ہے اور وہ چنو خاں کا گھر ہے اور اس گھر میں جو گلی کے بالکل سیدھ میں کھڑا ہے ایک عورت رہتی ہے اور اس میں میں رہتا ہوں یہ میرا گھر ہے!۔

یہ سچ ہے کہ میں اس میں رہتا ہوں، لیکن یہ میرا گھر نہیں۔ میرا کوئی گھر نہیں، اور نہ میرے باپ کا کوئی گھر تھا اور نہ دادا نے کوئی گھر چھوڑا۔ سب دوسروں کے گھروں میں رہتے آئے ہیں اور یہ چال مجھے بھی آتی ہے اور اس کی وجہ سے مجھے کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اور ہر وقت مجھے اندھیری اور تاریک گلیوں میں بھٹکتے پھرنا پڑتا ہے، مکان کی تلاش میں، گھر کی تلاش میں۔

لیکن جدھر بھی میں جاتا ہوں، سیٹھ نبی لال اور سیٹھ ہزاری مل کا سامنا ہوتا ہے۔ اور ایک دن جب میں بھٹکتے ہوئے ادھر آیا تو سیٹھ ہزاری مل سے مڈبھیڑ ہوئی اور ساتھ ہی میں سہم کر رہ گیا اور میں نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مجھے ایک مکان کی ضرورت ہے"

سیٹھ ہزاری مل نے اپنی بڑھی ہوئی توند پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "ایک گھر ہے سامنے [illegible]

میں نے کہا " آنٹی تو میری تنخواہ نہیں "

سیٹھ ہزاری مل نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا " تو مجھے کیا ، بھاگ جاؤ یہاں سے ! "

اور اُس وقت میں ہکا بکا ایک بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی مدد کرے ، لیکن کوئی نظر نہ آیا اور گلی خاموش خاموش ، جیسے کسی سوچ میں ہو ۔ اور جب میں بھاگنے ہی والا تھا تو ایک نوجوان نے مجھے روک لیا اور اپنا گھر کرائے پر مجھے ایک نامعلوم مدت کے لئے آوارہ گردی سے بچا لیا ، اور اب اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں ۔

صبح سویرے گلی میں ٹہلنے کی ایک عادت سی ہوگئی ہے ۔ سب سے پہلے جس کی صورت نظر آتی ہے وہ اُس نوجوان کی کے گھر میں رہتا ہوں اور جس کا نام ارشد ہے ۔ ارشد کا پیٹ بڑا ہے اور نہ اُس کی توند ہے ۔ ارشد ایک دبلا پتلا نوجوان ہے یسے دُبلے پتلے آدمیوں سے میری دوستی بہت جلد ہو جاتی ہے اور میرے جتنے بھی دوست ہیں وہ سب کے سب دبلے پتلے بھی دبلا پتلا ہے اور ارشد میرا دوست ہے ۔ ارشد کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ہندستانی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے یتیم ہے ۔ یتیم اس لئے ہے کہ اُس کے ماں باپ اُسے اب مزید تعلیم دلوانے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اس لئے وہ تنگ آ کر چلی گئی سے دور ، اس گلی سے دور ۔ اس شہر سے ، اس زمین سے دور ۔ اس دنیا سے دور ۔ اور اب ارشد اکیلا ہے اور اُس کو ساتھ رجس کے کرایہ سے اس کا حلق بھیگتا ہے ۔ اور روزانہ صبح ایک نئی درخواست تیار کر کے اپنی سند کے ساتھ لیجاتا ہے ، اور نے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے ، اور رات میں آتا ہے ۔ اُس وقت وہ بڑا دلچسپ نظر آتا ہے ، بالکل مجنوں کی طرح ۔ یہی وجہ ہے کہ کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے اور اُسے طرح طرح کی بیماریاں ہو گئی ہیں ۔ دماغ کی بیماری ، حافظہ کی بیماری ، پھیپھڑوں یماری ، معدہ کی بیماری ، گردوں کی بیماری ۔ غرض قسم قسم کی بیماریاں اور ہاں ایک اور بیماری اُسے ہے ، اور وہ ہے دل کی ی ۔ یہ بیماری بڑی خطرناک ہوتی ہے اور وہ ارشد کو ہے ۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ کو دل پر رکھ کر دباتا ہے اور کبھی کبھی اپنے ں ہاتھوں سے دل کو دباتے ہوئے کہتا ہے " یار تم اس دل کو نہیں جانتے ۔ یار تم صفیہ کو نہیں جانتے ۔ تم کچھ بھی نہیں سکتے تمہیں کیا کہتا ہوں ۔ ہائے وہ ظالم ۔ تم نے اُسے دیکھا نہیں ۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کیسی ہے ۔ اس کی وہ نشیلی یں ، اور وہ سُریلی آواز ، جیسے کہیں دور سے ندی گنگناتی بہہ رہی ہو ۔ اور وہ ناگن سی چال اور اس کی لہراتی ہوئی مد لٹیں جیسے سانپ پھن اُٹھائے بیٹھے ہوں ۔ ہائے یار میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کیسی ہے ۔ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ۔ تم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ۔ سچ یار تم صفو کو نہیں جانتے ۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ——— "

اور جب اس کا نشہ بڑھنے لگتا ہے تو وہ کہتا ہے " یار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا ، وہ ے دل پر ، دماغ پر ، روح پر چھائی ہوئی ہے ۔ بتاؤ یار میں کیا کروں ۔ بتاؤ یار ——— "

لیکن میں اس سے کچھ نہیں کہتا ۔ چونکہ ارشد کے پاس ایک شیروانی ہے اور وہ اسے دھو دھو کر مہینوں پہنتا ہے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے صفو کے پاس ان گنت ساڑیاں ہیں اور وہ دن میں کئی بار بدلتی ہے اور سنا ہے کہ کے باپ کی توند سیٹھ ہزاری مل سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے ۔ لیکن کیا کیا جائے کہ میرے دوست میں ابھی بچپن ہے ۔ پھر بھی کی آرزو ہے کہ اُسے کسی طرح اپنا لے چونکہ وہ اس کے بغیر جی نہیں سکتا ۔ اور اُسے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کے پاس کئی شیروانیاں ہوں اور اس کی جیب گرم ہو ۔ اس لئے روزگار کی تلاش میں وہ روز صبح سویرے رات میں تیار ہوئی درخواست کو سند کے ساتھ لئے ہوئے جاتا ہے نوکری کی تلاش میں ۔ اور گلی اونگھتی رہتی ہے ۔

دس بجے چوہدری صاحب کے لڑکے بھنگ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکلتے ہیں ۔ شاید ناشتہ کر کے آ رہے ہیں ۔ ان کی لمبی لمبی زلفیں ہوائیں لہراتی ہوئی ہیں ۔ ـــــ کو دیکھ کر مجھے ڈاکٹر ٹیگور یاد آ جاتے ہیں ۔ اور ان کے مقدس چہرے کو دیکھ کر کئی بار

درود پڑھنے کو جی چاہا۔ واقعی کیا شان ہے، کیا نور ہے اور کیا جلال ہے۔ خصوصاً ان کے اس ڈنڈے میں جو وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے رکھتے ہیں۔ میں انھیں دور ہی سے دیکھ کر آداب بجا لاتا ہوں اور وہ ڈنڈے کو گھماتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی میں کھسک جاتا ہوں!

راتوں میں ان کی آوازیں وہ آوازیں جو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالتی ہیں، گلی کے سرے تک سنی جا سکتی ہیں۔ ان کی باتیں اور ان کے طرزِ گفتگو اور لب و لہجہ سے مجھے اُستاد بیخود یاد آ جاتا ہے جو اسی گلی میں بائیں طرف والے مکان میں رہتا ہے۔ سمجھتا تھا کہ محض بکنے میں اسے جتنی مہارت ہے وہ شاید کسی کو نہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ مرشد کامل چتو استاد سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی نئی نئی ترکیبوں وقتی اصطلاحوں میں ردیف و قافیہ کا توازن کبھی نہیں بگڑتا اور کبھی یہ بہت زیادہ ترقی پسند ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ اصطلاحیں ایک نئی بدعت کے ساتھ آزاد نظم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ساتھ ساتھ بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ روز صبح سویرے ان کے گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز آتی ہے۔ قرأت خوب ہے اکثر اوقات میں نیند سے چونک اٹھتا ہوں اور سات آسمانوں پہ بیٹھے ہوئے خدا کو یاد کرنے لگتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے خود پہ رونا آتا ہے۔ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ سات آسمانوں کے اوپر میرے لئے دوزخ میں ایک گھر تیار ہو رہا ہے اور مولانا کے لئے جنت میں محل۔ اور کبھی مولانا سے جلن سی ہونے لگتی ہے۔ واہ یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوں لیکن قرآن پڑھنے کی آواز ——— اور میں خاموش ہو جاتا ہوں ———

ہمسائی کے مرنے کے بعد، ایک کنواری لڑکی سے شادی رچانا مولانا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ مولانا نے اب تک تین شادیاں کیں اور تینوں کنواری لڑکیاں۔ پہلی کے متعلق روایت ہے کہ مولانا نے اپنے ڈنڈے سے اس بری طرح پیٹا کہ بیچاری پھر زندہ نہ رہ سکی۔ دوسری کی نسبت کہا جاتا ہے کہ باؤلی میں گر کر خودکشی کر لی اور تیسری کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک گبرو لونڈے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اب یہ چوتھی ہے!

اور جب ان کی اس چوتھی نئی نویلی دلہن کو دروازے میں چوکھٹ کے پاس کھڑا دیکھتا ہوں تو اس کی معصومیت اور خاموش حسن پر ترس آنے لگتا ہے۔ جوانی بے کس اور خاموش جوانی۔ مایوسی، بڑھاپے کی گود میں پلنے والی یہ کلبلاتی ہوئی جوانی جو اپنی پوری نہ ہونے والی خواہشوں کی فریاد کرنے والی جوانی۔ جی میں آتا ہے ——— جی میں آتا ہے کہ ———

لیکن ایک فٹ کی داڑھی اور ڈھائی فٹ کا ڈنڈا میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے!۔ جب مولانا اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اپنے موٹے ڈنڈے کو بجاتے ہوئے چلے جاتے ہیں تو گلی میں پہلی سی اداسی تیرنے لگتی ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک رکشا گلی میں رینگتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اس رکشا سے واقف ہوں۔ جب سے یہاں آیا ہوں، اس رکشا کو روز اسی گلی میں دیکھتا ہوں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ رکشا نہ آتا ہو۔ روز آتا ہے۔ لیکن کہاں سے آتا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ میری معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ یہ رکشا آتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کو بٹھائے ہوئے، اس لڑکی کا نام عاقلہ ہے اور یہ عاقلہ کا گھر ہے۔

لیکن عاقلہ کون ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ اس گلی میں کیونکر آ گئی یہ بھی نہیں جانتا، لیکن یہ کہ اس لڑکی کا گھر ہے، جس کا نام عاقلہ ہے اور جس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں اور ایک بیوہ ماں اور جس کا باپ ایک طویل بیماری کے بعد، سب کو اس گلی میں چھوڑ کر چلدیا۔ جہاں سے کہ وہ آیا تھا۔ اور اب عاقلہ اپنے دو بھائیوں اور بیوہ ماں کو لئے اسی گلی میں رہتی ہے۔

پہلی بار جب میں نے عاقلہ کو اس گلی میں دیکھا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کوئی چیز کھو دی ہے۔ کوئی چیز جو مجھے یاد نہیں۔ جس وقت عاقلہ کے سانولاتے ہوئے چہرے پر چمک تھی اور اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پہ امرت تیر رہا تھا

اور اس کا جوبن ایک چڑھتی ہوئی ندی کی طرح امڈتا ہوا آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے حسین خوابوں کی جھلک تھی۔ اس وقت میں نے عاقلہ کو دیکھا تھا۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ عاقلہ کا باپ زندہ تھا۔

لیکن آج عاقلہ کا باپ زندہ نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اس کے چہرے کی چمک غائب ہو گئی اور امرت چوس لیا گیا اور چڑھتی ہوئی ندی یکدم سوکھ کر رہ گئی۔ حسین سپنے بکھر کر رہ گئے۔ اور آنکھوں میں رات کی خوفناک سیاہیاں تیرنے لگیں۔ اس کی اس تبدیلی سے گھر میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کی بوڑھی بیمار ماں کو دوائی ملنے لگی، اور وہ بھلی چنگی ہو گئی۔ ننھے ننھے بھائیوں کے میلے پھٹے کپڑوں میں یکدم اجالا ہو گیا۔ اور ٹھنڈے چولھے میں ٹانگیں پھیلا کر سونے والی بلی بھاگ کر چلی گئی۔ نہ جانے کہاں! غرض پورا گھر بدل گیا۔ اور یہ سب اس کی وجہ سے اور یہ عاقلہ ہے۔ میری پڑوسن! اور یہی وہ رکشا ہے جو میری پڑوسن کو لے آتا ہے، نہ جانے کہاں سے۔ روز اسی وقت۔ گلی ایک زمانہ سے اس رکشا کو دیکھ رہی ہے لیکن خاموش!

اس وقت گلی میں کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن بوڑھی بیٹھی رہتی ہے۔ اس بوڑھی کا کوئی وقت نہیں۔ اس کو ہر وقت ہر لمحہ اس گلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ان سب گھروں کی اور اس گلی کی رکھوالی کرتی ہے اور کبھی ایک بھوکے کتے کی طرح ادھر ادھر ٹہلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی میں اسے دیکھ کر سوچتا ہوں کہ یہ چل پھر کیسے سکتی ہے۔ یوں بیہ کی طرح زخم کھاتی ہوئی کمر اور یوں ہوا سے ہلنے سے جھونکے پر ہلنے والی گردن کیا یہ ممکن ہے کہ اس میں پہلی سی اکڑ پیدا ہو جائے۔ اس کے ایک پھوڑا بھی ہے، بائیں طرف کی چھاتی سے لیکر نیچے پسلی تک زخم پھیلتا جا رہا ہے۔ اور یہ دن بدن گہرا اور خطرناک ہوتا جا رہا ہے اور یہ زہر بہت ممکن ہے کہ جسم کی بوٹی بوٹی میں سرایت کر جائے۔ خون اور پیپ تو روز ہی بہتا رہتا ہے۔ باوجود ان ساری مصیبتوں کی یہ گلی سے نہیں ہٹتی۔ جاڑا۔ برسات۔ سردی۔ گرمی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور وہ ہر وقت گلی میں بیٹھی رہتی ہے۔ اس کو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دیوانی ہے!

سچ مچ یہ دیوانی ہے اور یہ دیوانی اس وقت سے ہو گئی ہے جب سے کہ اس کے جوان ہٹے کٹے بیٹے کو مار ڈالا گیا۔ اس کا کیا جرم تھا یہ بات میں نہیں جانتا۔ نہ اس نے کسی کے گھر ڈاکہ مارا تھا، نہ کسی شریف زادی کو اڑا کر لے گیا تھا اور نہ اس نے کوئی ایسی خاص سازش کی تھی اور نہ اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادھا ہنس مکھ نوجوان تھا اور جس کے قہقہوں سے گلی کا ذرہ ذرہ گونج پڑتا تھا۔ لیکن اسے مار ڈالا گیا۔ اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ہندو تھا۔ اور مسلمانوں نے اسے مار دیا۔ اور اگر وہ مسلمان ہوتا تو ہندو اسے مار ڈالتے۔ غرض اس کا مارا جانا ضروری تھا۔ اٹل تھا۔ اور وہ مارا گیا۔ اور اس کا فولادی جسم مردہ پڑا تھا اور اس کے چوڑے چکلے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ اور گولی اس کے اندرونی حصوں کو چھلنی کر چکی تھی اور وہ خاموش پڑا تھا۔

اور اس کی بوڑھی ماں اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور وہ گلی کے ایک ایک آدمی کو پکڑ کر پوچھ رہی تھی کہ "بتاؤ! تم نے میرے لال کو کیوں مار ڈالا۔ بتاؤ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے کیوں چھوڑتے ہو۔ میں بھی اپنے بیٹے کے ساتھ چلی جانا چاہتی ہوں۔ اب اکیلی رہ کر کیا کروں۔ اب کسے اپنا لال کہہ کر پکاروں اور اب بڑے چاؤ کے ساتھ کس کا بیاہ رچاؤں۔ اب کون ہے جو مجھے ماں کہکر پکارے گا۔ اب کون ہے جو میرے گلے میں باہیں ڈالیگا بوسے، لاڈ کریگا۔ اب کون ہے جو چاند سی دلہن لاکر یہ کہیگا کہ ماں! یہ تیری بہو ہے۔ اب کون ہے ——————؟

بتاؤ میں کیا کروں۔ بتاؤ —————!

وہ چھاتی پیٹ رہی تھی۔ اور مولانا کی داڑھی پر مسکراہٹیں جھل مل کر رہی تھیں!

لیکن گلی خاموش تھی!

اب بڑھیا بھی خاموش ہو گئی ہے۔ نہ کسی سے بات کرتی ہے اور نہ کچھ بولتی ہے۔ نہ آنکھوں میں آنسو ہیں اور نہ ہونٹوں پہ

ہیں۔ صرف خاموشی بیٹھی رہتی ہے اور یہ گلی میں ہر وقت نظر آتی ہے۔ گویا گلی سے اس کا ابدی ناتا ہے۔ ایک ... کی ... گلی کے ساتھ چپکے چپکے ونگھا کرتی ہے۔

کھڑی دھوپ میں یہاں کوئی نہیں آتا۔ بعض بعض وقت کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر آ جاتا ہے، مکان کی تلاش میں کسی تلاش میں۔ مگر تلاش کرنا واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ ہر چیز تلاش کر لی جا سکتی ہے، ہر چیز کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر سات آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کو بھی ڈھونڈ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن مکان کو نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کوئی گھر نہیں۔ چونکہ سارے گھروں پر سیٹھ ہزاری مل جیسے فرشتوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اب مکان کیسے ملے؟۔

اس لئے یہاں جتنے بھی آتے ہیں انھیں مکان نہیں ملتا۔ چونکہ یہاں ایک ایک کمرہ کا کرایہ ساٹھ روپیہ، ستر روپیہ، سی روپیہ ہے اور یہ آنے والے مسافر بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے، وہ گڑگڑا کر کہتے ہیں کہ "سیٹھ صاحب کم کیجئے!"

سیٹھ صاحب کی توند ہلنے لگتی ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور انھیں وہی جواب ملتا ہے جو انھیں ملتا تھا "چلو — بھاگ جاؤ یہاں سے!" اور وہ بھاگ جاتے ہیں! — ایک عرصہ سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ لیکن گلی خاموش ہے۔

کچھ دیر تک گلی اکیلی رہتی ہے اور یہاں کوئی نہیں آتا اور چاروں طرف خلا ہی خلا رہتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ بڑھیا ہے یا نہیں۔ لیکن بڑھیا بیٹھی رہتی ہے — اونگھتی ہوئی!۔

جب دھوپ کھسکتی ہوئی گلی کی دیواروں پر چڑھنے لگتی ہے تو کئی بچے کھیلنے لگتے ہیں۔ بچے کمزور، نڈھال اور ناتواں بچے، بچے کالے کالے، گندگی میں نہائے ہوئے بچے، بچے چیتھڑے لگائے ہوئے اور جن کے پاس سے بدبو آتی ہے اور جن کی ناکیں ہمیشہ بہتی رہتی ہیں اور جن کی صورت دیکھتے ہی متلی ہونے لگتی ہے، بچے تکونے جسم والے، چپٹی ناک والے۔ ٹھگنے، موٹے لزوست بچے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانا نہیں کھاتے گھاس کھاتے ہیں۔ انھیں کچھ کام کاج نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر مختلف گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہیں اور اس وقت آتے ہیں۔ یہ گنتی میں کل بارہ ہیں۔ یعنی ایک درجن۔ اور یہ خاص حضرت مولانا کی پیداوار ہیں جن کے سارے حقوق مولانا کے نام محفوظ ہیں۔ یہ بارہ ہیں۔

یہ بارہ بچے مختلف اوقات میں مختلف بیویوں سے دیئے ہیں، وہ بیویاں جو اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں، اپنے بچوں کو چھوڑ کر، تاکہ ہمیشہ اندھیری گلیوں میں بھٹکتے رہیں۔ تاکہ اپنے کالے کالے جسموں اور چیتھڑوں کی نمائش کرتے رہیں۔ تاکہ جہاں کہیں بھی جائیں اپنے ساتھ گندگی اور رذالت لیتے جائیں اور مولانا خوش ہیں کہ یہ ان کے بچے ہیں، اور وہ ان کے باپ!۔

مولانا کی بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی پلٹن میں جتنا ہو سکے اتنا اضافہ کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں مولانا کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ چونکہ حکیم اجمل خاں مر گئے اور ان کے سارے شاگرد مر گئے۔ اب دہلی میں کوئی حکیم زندہ نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ حکیم نہیں۔ حجام ہے، چونکہ وہ اس دوائی سے واقف نہیں جو مولانا کی پلٹن میں اضافہ کر سکے۔ اسی لئے مولانا خاموش ہیں۔ اداس ہیں۔ اور ان کی بیوی اس طویل خاموشی سے اکتا کر دروازہ میں کھڑی رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں؟۔

مولانا کو آتے دیکھ کر بچوں کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور سب چوہوں کی طرح اپنے گھر میں گھس جاتے ہیں۔ بڑی دیر تک مولانا کی بڑی بڑی آوازیں آتی رہتی ہیں اور یہ دن بھر کی تھکاوٹ اور غصہ کو اپنی بھولی بھالی ... پر ... اتارتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک خاص وقت کے بعد یہ آوازیں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔ اور سوائے خاموشی کے کچھ نہیں رہتا۔

یہ ہے ایک گلی

ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ، گلی کی سیدھ میں سامنے والے مکان کے دریچہ میں ایک عورت کو کھڑا دیکھا جاسکتا ہے
آسمان کے آخری کناروں کو گھورا کرتی ہے۔ میں نے اس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر نہیں دیکھی
کسی سوچ میں، ہر وقت سنجیدہ، جیسے وہ مسکرانا جانتی ہی نہیں۔ یہ متانت یہ سنجیدگی تکلیف دہ ہے۔ اس عورت کو
نہیں رہنا چاہئے۔ کسی بھی حسین عورت کو سنجیدہ نہیں رہنا چاہئے، لیکن وہ جانتی نہیں اور وہ خاموش چپکے چپکے
کو گھورا کرتی ہے۔ آسمان کو گھورنا کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں کی عورتیں بات بات پہ آسمان کو گھورا کرتی ہیں۔ کسی کو
نہیں گی۔ کسی کو کچھ نہیں بولیں گی۔ چونکہ یہاں کی عورت کے منہ میں زبان نہیں، گونگی ہے۔ جانور کی طرح۔ اور اگر کچھ
ہے تو آسمان کو گھورنا شروع کردیتی ہے اور جب یہاں کی کوئی عورت آسمان کو گھورتی ہے تو سنتے ہیں کہ آسمان
پھٹتا ہے، زمین دہلنے لگتی ہے، طوفان آتے ہیں۔ غرض بڑا برا ہوتا ہے جب یہاں کی کوئی عورت ——————
سنتے ہیں کہ اللہ میاں کالی عورتوں کو بہت پسند فرماتا ہے۔ ان کی ہر بات کو بڑے غور سے سنتا ہے اور ان کی ہر خواہش
آرزو کو پوری کرتا ہے۔ معلوم نہیں کالی عورتوں میں کیا بات ہے۔

یہ عورت دریچہ میں کھڑی ایک زمانہ سے آسمان کو گھورتی ہوئی آئی ہے۔ آسمان، نیلا آسمان اور آسمان لال آسمان،
رنگ آسمان، یہ آسمان جو ہر وقت رنگ بدلتا رہتا ہے۔ گرگٹ کی طرح … اور یہ عورت گھورتی ہوئی آئی ہے۔ لیکن ابھی تک
پھٹا نہیں، زلزلے آئے نہیں۔ زمین کی گردش میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا شوہر گھر آیا نہیں۔ چار سال ہو چکے ہیں
ختم ہو چکی، لیکن اس کا شوہر آیا نہیں۔ اب اس کا شوہر کبھی نہیں آئیگا، چونکہ اس کا شوہر جنگ میں مارا گیا، وہ اب اس
میل دور کسی تاریک گہرے گڑھ میں پڑا میٹھی نیند سو رہا ہے اور وہ اب کیسے جاگے! وہ اتنا طویل اور لمبا راستہ کیسے
طے کرے، وہ سو رہا ہے، وہ کبھی نہیں جاگیگا، اُسے کسی بات کی فکر نہیں، نہ گھر آنے کی، نہ اپنی بیوی سے ملنے کی۔ اور
اپنے کئے ہوئے وعدے یاد ہیں، اُسے کچھ بھی یاد نہیں کہ اُسے اپنی بیوی کے لئے چاکلیٹی رنگ کی ساڑی خریدنی
نہ اُسے اس بات کا ہوش ہے کہ گھر کو خط بھیجے ہوئے بہت دن ہو چکے۔ اس کی بیوی انتظار کررہی ہوگی۔ اُسے جلد
جانا چاہئے۔ اُسے کچھ بھی یاد نہیں وہ بیہوش ہے۔ وہ خط کبھی نہیں لکھیگا، وہ گھر نہیں آئیگا۔ کبھی نہیں۔ یہ بات
جانتی ہے، گھر کے سارے لوگ جانتے ہیں، پورا محلہ جانتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ آسمان کو گھورا کرتی ہے!۔

روز اسی وقت میں اس عورت کو دریچہ میں کھڑی دیکھتا ہوں۔ یہ عورت سنجیدہ نہ رہے میں سوچتا ہوں۔ اُس کی بجھی
آنکھوں میں پھر سے چمک پیدا ہو جائے اور اس کے اُترے ہوئے چہرے پر پہلی سی رونق آجائے اور اس کے
کی، بے رونق اُداس اور ننگے ہاتھوں میں پھر سے چوڑیاں بجنے لگیں، وہ چوڑیاں جو ٹوٹ چکیں، وہ چوڑیاں، جو
بنی دلہن کو پہناتا ہے، وہ چوڑیاں جو عورت کی زندگی ہیں، وہ چوڑیاں جنھیں عورتیں سب سے زیادہ عزیز رکھتی
وہ چوڑیاں جو سہاگ کی نشانی ہیں اور وہ ٹوٹ چکیں اور یہ ہاتھ بے رونق سے ہوگئے ہیں۔ اتنے حسین ہاتھوں کو
نہیں ہونا چاہئے۔ میں ان اداس ہاتھوں کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ ہاتھ ناپسند نہیں۔ بغیر چوڑیوں کے حسن
ہے، عورت نامکمل ہے، جوانی نامکمل ہے۔ ان ہاتھوں میں چوڑیاں ہونی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان ہاتھوں
چوڑیاں پھر سے بجنے لگیں ——

لیکن اب تک اس کے ہاتھ خالی ہیں اور گلی خاموش ہے!۔

سائے گہرے اور سیاہ ہوتے جاتے ہیں اور گلی پر ایک خوفناک اداسی چھا جاتی ہے اور بوڑھیا ایک بجھو کے کتے
بیٹھی گلی کی رکھوالی کیا کرتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جیسے اُسے کسی کی تلاش ہے، جیسے اُسے کسی کا انتظار ہے

یہ یہاں سے کبھی نہیں ہٹ سکتی اور نہ موت اُسے جدا کر سکتی ہے۔ بوڑھی امر ہے۔ گلی کا اس کا اپنا ہمیشہ ساتھ رہیگا یہ اس گلی کی پرانی سہیلی ہے۔

رات آتی ہے چپکے چپکے، دبے پاؤں۔ اور اُس کے آنے کی کسے بھی خبر نہیں ہوتی اور گلی پر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس وقت گلی اور سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ غالباً یہ کچھ سوچتی ہے۔ یہ کیا سوچتی ہے۔ اسے کیا سوچنا چاہئے۔ یہ نہیں معلوم۔ لیکن ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ سوچتی ضرور ہے۔

چاروں طرف اندھیرا پھیلتا رہتا ہے اور بیچ گلی میں لگی ہوئی بلدیہ کی قندیل ٹمٹماتی رہتی ہے۔ بوڑھی کی طرح۔ اسی وقت استاد چنو کے تانگے کی آواز آنے لگتی ہے۔ وہ گلی پر موڑتے ہوئے اپنے گھوڑے کو منانے لگتا ہے کہ چل بیٹا چل آ گیا اپنا گھر اور گھوڑا ہی ہی کرتا ہوا اپنے مالک سے کہتا ہے کہ ہاں آ گیا اپنا گھر۔

گھوڑے کو باندھتے ہوئے استاد چنو بلند آواز سے گانے لگتا ہے:—

ایک شہر کی لونڈیا نظروں کے تیر چلا گئی —
ہاں نظروں کے تیر چلا گئی
کر کے اشارے بلا گئی
ایک شہر کی لونڈیا —— نظروں کے ——

استاد چنو جیسے ہٹے کٹے نوجوان کا ایک شہر کی لونڈیا کے تیر کا یوں گھائل ہو جانا واقعی ایک عجیب بات ہے۔ میں بار بار یہ سوچتا ہوں کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ چونکہ استاد چنو کے بارے میں کسی لونڈیا کے نظروں کے تیر کا ذکر کچھ جچتا نہیں اور نہ استاد چنو کے فولادی جسم پر نظروں کے تیر کچھ اثر کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ کسی سے آنکھیں لڑائے۔

استاد چنو شہر کی لونڈیوں کے بارے میں بہت کم سوچتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ وہ اس خصوص میں کچھ کبھی نہیں سوچتا، اور اگر سوچتا ہے تو آٹے دال کے بھاؤ کی نسبت۔ چونکہ اس کا ایک پیٹ نہیں اور اُسے کھانے کو نہیں چاہئے بلکہ اس کی ماں کا پیٹ ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی کا پیٹ ہے اور اس کی مری ہوئی بہن کے چار بچوں کا ہے، اور ان سب کے پیٹ بھرنے کا واحد ذمہ دار یہ ہے۔ یہی انھیں کھانے کو دیتا ہے، یہی پہننے کو دیتا ہے، یہی جلاتا ہے، یہی مارتا ہے، یہی ہر چیز پر قادر ہے۔ استاد چنو رازق ہے، رحیم ہے، کریم ہے، معین ہے اور یہ استاد چنو ہے!۔

صبح سے شام تک لمبی لمبی چوڑی چوڑی سڑکوں پر تانگے ہانکنے کے بعد ان کو استاد چنو گھر آتا ہے اور دن بھر پسینہ بہا کر کمائی دولت سیٹھ ہزاری مل کے قدموں پر ڈالتا ہے، چونکہ یہ تانگہ ہزاری مل کا ہے۔ ہزاری مل کا ایک تانگہ نہیں کئی تانگے ہیں اور کئی استاد چنو بڑی بڑی سڑکوں پر ہانکتے پھر رہے ہیں۔ اور سیٹھ اپنے کمرے میں ریشمی صوفہ پر بیٹھا ہوا بڑھتی ہوئی توند پر ہاتھ پھیر رہا ہے!۔

اپنے گھوڑے کو باندھتے ہوئے استاد چنو گانے لگتا ہے ——

ایک شہر کی لونڈیا ——

جب وہ تھک جاتا ہے تو دوسرا گانا شروع کر دیتا ہے۔ ایک ہی چیز کے گاتے رہنے میں اُسے کوئی مزہ نہیں آتا اس لئے وہ سارے گانے گاتا ہے جو اُس نے ہوٹلوں اور سینماؤں میں سنے۔ وہ گاتا ہے۔

رات سیاہ اور تاریک ہو جاتی ہے، وہ گاتا رہتا ہے۔

ہماری گلی آنا!
دیکھو جی
اب کا ہے کو شرمانا
ہماری گلی آنا!

کسی کو ہماری گلی میں بلانے کی خواہش اور آرزو کوئی نئی نہیں۔ کئی دن سے سنتا آیا ہوں کہ استاد چنو ہر رات گلی میں کسی کو آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی اور وہ یونہی چلا چلا کر ہار مان لیتا ہے۔ اور سیٹھ ہزاری لال کے لمبے خراٹے گلی کے خوفناک اندھیرے میں تیرتے رہتے ہیں۔

اسی وقت ایک رکشا اس گلی سے نکل کر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے!

اور بوڑھی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بیٹھی رہتی ہے۔ جیسے اُسے کسی کا انتظار ہے۔ اس کا یہ انتظار کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔ وہ یونہی بیٹھی رہیگی، جب تک کہ اس کا بیٹا، سات آسمانوں کے پرے بسنے والا بیٹا اس دنیا میں آکر۔ اس گلی میں آکر یہ نہ کہہ دے کہ اماں میں آگیا ہوں۔ بوڑھی بیٹھی ہی رہیگی۔ بوڑھی کہیں نہیں ہٹ سکتی۔ بوڑھی امر ہے!

آدھی رات گئے جبکہ گلی پر موت کی سی خاموشی چھا جاتی ہے، پیروں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دیتی ہے۔ میں اس آواز سے واقف ہوں۔ یہ ارشد ہے۔ میرا دوست آرہا ہے۔ لمبی لمبی سڑکوں، فٹ پاتھوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد میرا دوست آرہا ہے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے ہیں اور اس کا سینہ ایک کمان کی طرح اندر کو چلا گیا ہے اور اس کی لمبی گردن آگے کی طرف نکلی ہوئی ہے اور اس کے چہرے پر رات کی سیاہیاں اپنا خوفناک سایہ ڈال رہی ہیں۔ میرا دوست آرہا ہے میں اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتا بلکہ اپنے ہاتھ میں تھمی ہوئی درخواست کو بتا دیتا ہے، جو وہ صبح سویرے لکھ کر لے گیا تھا۔

جیسے وہ کہتا ہو، یار مجھ سے مت پوچھو کہ کیا ہوا۔ تم اس درخواست کو دیکھ لو۔ اس سند کو دیکھ لو۔ جسے لے کر میں ایک زمانے سے پھر رہا ہوں اور جسے کوئی نہیں پوچھتا اور جس کی کوئی قیمت نہیں وہ اب تک میرے پاس ہے مجھے ابھی کتنے دن رکھنا ہوگا۔ بتاؤ یار مجھے ابھی کتنے دن آوارہ گردی کرنا ہوگا۔ بتاؤ یار مجھے ابھی کتنے دن صفیہ کا انتظار کرنا ہوگا۔ صفیہ تم اسے نہیں جانتے کہ میں اُسے کتنا چاہتا ہوں۔ صفیہ! لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے میلوں دور ہوتی جارہی ہے۔ حالانکہ اس کی آسمانوں سے باتیں کرنے والی کوٹھی اسی شہر میں ہے۔ یہاں سے دس منٹ کا راستہ بھی نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ دن بدن لمبا ہوتا جارہا ہے اور وہ مجھ سے دور ہوتی جارہی ہے میلوں دور۔ بتاؤ یار میں کیا کروں۔ اس درخواست کو کیا کروں۔ اس سند کو کیا کروں۔ اس قابلیت کو کیا کروں جو میرے کسی کام کی نہیں۔ جس سے میں ایک صفیہ کو حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک نوکری کو حاصل نہیں کرسکتا۔ بتاؤ یار میں کیا کروں ———

بتاؤ یار ———

رات سیاہ اور تاریک ہوتی جاتی ہے اور ارشد سر جھکائے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر میں گھس جاتا ہے اور گلی بھی خاموش چپکے چپکے اونگھا کرتی ہے بوڑھی کی طرح!

لیکن یہ گلی کچھ نہیں بولتی۔ خاموش ہے!

گلی خاموش ہے اور ایک زمانے سے خاموش ہے۔ حالانکہ گلی ان سب کو دیکھتی ہے۔ مولانا کی لمبی سفید داڑھی کو اور ان کی کمسن بیوی کو اور اُن کے ایک درجن بچوں کو جو چیتھڑے لگائے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر رہے ہیں اور جن کی

مائیں اپنے لالوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ گلی دیکھتی ہے اُس بوڑھی کو جو دن بھر دیوانی کی طرح ٹہلتی رہتی ہے۔ اس ماتا کو جس کے جوان بیٹے کو ذبح کیا گیا محض اس لئے کہ وہ ہندو تھا۔ گلی دیکھتی ہے اُس رکشا کو جو رات کی تاریکی میں ڈوب کر دن کے اُجالے میں نکلتا ہے۔ اُس لڑکی کو جس کے آنکھوں کی چمک اور جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور جس کے گالوں کی سرخی کو ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔ گلی دیکھتی ہے اُس جوان عورت کو جو آسمان کو گھورا کرتی ہے، اور جس کے گلے کی مالا ٹوٹ چکی اور جس کے حسین ہاتھ ننگے ہیں۔ گلی دیکھتی ہے اُس شخص کو جسے مجبوراً رازق، رحیم، کریم بننا پڑا۔ گلی دیکھتی ہے اُس توند کو جو دن بدن بڑھ رہی ہے ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح۔ گلی دیکھتی ہے اُس نوجوان کو جو دن بھر سڑکوں، فٹ پاتھوں پر پھرنے کے بعد رات میں آتا ہے۔ اداس اور خاموش گلی دیکھتی ہے!۔

گلی دیکھتی ہے اور ایک زمانے سے دیکھتی ہوئی آئی ہے۔ ان کی باتوں کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ لیکن کچھ نہیں بولتی۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ایک ہی چال ہے۔ جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ سیدھی بالکل سیدھی، ڈھلوان نام کو نہیں۔ اور یہ سنگلاخ چٹانوں سے بنائی گئی ہے۔ سیدھی اور سخت!۔

آبادی سے دور، شہر کے اس کونے میں یہ ہے ایک گلی!۔

جائزے

ترقی پسند ادب

اس بار

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

ضیاء عظیم آبادی

ترقی پسند ادب

کسی دور کے ادب یا ادیب پر تنقید کرنے سے پہلے ایک سلجھے ہوئے نقاد کا فرض ہے کہ اس کے ماضی کا بغور مطالعہ کرے اس لئے کہ حال کا محل ماضی ہی کے کھنڈرات پر تعمیر کیا جاتا ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر پرانے نقش و نگار نئے رنگ ڈھنگ میں ضرور دعوتِ نظارہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وسعتِ نظر نہ ہونے کے باعث ہمیں ہر منظر جدید تہذیب و تمدن کا شاہکار محسوس ہو اور گذرے ہوئے دور کو ہم ناقص و ناکمل تصور کرنے لگیں۔ مگر یہ ہماری ایک طرفہ فیصلہ ہوگا اور کوئی صحیح الدماغ انسان ہماری رائے کو وقعت دینے کے لئے آمادہ نہ نظر آئیگا۔

دور کیوں جائیے۔ سامنے ہی کی مثال وکٹوریہ میموریل ہال کو لے لیجئے۔ اگر کسی ایسے نوجوان کو دکھلایا جائے [illegible] نہیں کی ہے اور تاریخ ہند سے بھی واقف نہیں ہے تو آپ یقین جانیئے وہ اس کی زیارت سے متاثر ہو [illegible] بزرگوں کو بالکل جاہل تصور کریگا۔ اور دورِ موجودہ کے لوگوں کو صدر میں جگہ دینے [illegible] آمادہ ہو [illegible] جو تاج محل لال قلعہ، اور فتح پور سیکری کو دیکھ چکا ہے تو بلا شبہ کہہ دیگا: قدیم فنِ معماری [illegible] ہے اور جدید [illegible] ضرورتِ وقت کے پیش نظر بڑی کامیاب ردّ و بدل کی ہے۔ اسی کا نام ارتقاء ہے جو فنون [illegible] کی طرح زند[گی] [illegible] جاری و ساری ہے اور اسی لئے ہم اس تحریک کو ترقی پسند کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور جو لوگ [illegible] قائم ہیں یا دورِ گذشتہ کی یاد تازہ کرکے مسرت حاصل کرتے ہیں، انہیں کو ہم رجعت پسند کا لقب دیتے [illegible]

ترقی پسند گروہ کسی خاص شعبے کے لئے مخصوص نہیں ہے اور نہ کسی خاص [illegible] کی پیداوار ہے [illegible] سے ہے۔ جیسے جیسے یہ ترقی کی طرف مائل ہوتی گئی ہے ویسے ویسے ترقی پسند تحریک ابھرتی [illegible] دراصل زندگی کی ضرورت کے ماتحت عالمِ وجود میں آئی اور جس وقت حیاتِ مستعار [illegible] عمودان کو پرسکون اور مطمئن بنانا ہے اور کائنات کی تمام چیزوں کو ہر انسان میں برابر تقسیم کر [illegible] دینے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ بلکہ فطرت کی جملہ تخلیق پر لوگوں کا یکساں حق تسلیم [illegible] سے اس کو مستقل بیر ہے اور یہاں کا نام تک صفحۂ ہستی سے مٹا دینا [illegible] بنانے کی قائل نہیں ہے بلکہ [illegible] انسان کی ہر خواہش کا احترام [illegible] اسی لئے اس کا ہر پہلو ہماری زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ہمیں [illegible]

ادب جو آدم کی تخلیق کے [illegible] اپنے ترقی پسندانہ محرکات کو مسلسل و [illegible] جب سیر و شکار سے شام کو واپس آتے تھے تو [illegible] ان میں کا سب سے عمر رسیدہ [illegible] بڑھنے کی تبلیغ کرتا تھا۔ ہندو ازم نے اسی دستورِ قدیم پر عمل کیا [illegible] نے ارجن کو بالکل اسی عنوان سے درس دیا [illegible]

اس کی حامل تھیں اور ایسی لڑائی میں ارجن کے بیٹے ابھیمنیو کو اُس کی ماں سبھدرا دیوی نے بزرگوں کی کہانیاں سنا سنا کر کچھ اس غیر محسوس طور پر ارتقا کا پیام دیا کہ اٹھارہ سال کے نوجوان کا خون جوش میں آگیا اور آزمودہ کار دشمنوں کے نرغے میں تنہا نکل گیا۔ ہندوستان کی طرح عرب کا دورِ جاہلیت بھی اسی اصول پر کاربند تھا اور بکثرت قصائد اب تک اس جذبے کے حامل موجود ہیں۔ اسلام نے اس رنگ میں تبدیلی کی اور ترقی پسند مذہب ہونے کے باعث اس نے محض جنگ و جدل تک ارتقا کو محدود نہ رکھا بلکہ "نسبی فرق اور مالی اختلاف" وغیرہ کے مٹانے پر بھی زور دیا چنانچہ اس دور کے اربابِ قلم اس سے متاثر ہو کر زندگی کی ترقی کے ساتھ خود بھی چند گام آگے بڑھ گئے۔ ایران کی پُر سکون فضا نے ذہنِ انسانی کو زیادہ غور و فکر کی طرف مائل کیا۔ فلسفہ کی موشگافیاں شروع ہو گئیں، عبد و معبود کے رشتے کو علم کی روشنی میں دیکھنے کی طلب پیدا ہوئی، اخلاقیات کی قدروں کو سمجھنے کا حوصلہ بڑھا، تخلیقِ عالم کے وجوہ پر سوچا جانے لگا۔ یہیں سے تصوف کا وقار بڑھا اور انسان کچھ اور بلند ہو گیا۔ ادب بھی ترقی پذیر ہوا۔ حافظ، خیام، جامی، عرفی، نظیری وغیرہ نے رد مذہب خلاق کو قرار دیکر نوعِ آدم کے قلوب میں غیر معمولی وسعت پیدا کی اور یہ [illegible] اعتبار سے کامیاب ترقی پسندانہ اقدام تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی فارسی شعر و ادب بھی آیا۔ یہاں کے باشندوں نے جب ملکی سیاست میں دخیل ہونے کے لئے آقا کی زبان سیکھی اور عجمی جواہر پاروں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تو انھیں کچھ جنبیت نہ محسوس ہوئی۔ ویدانت کا فلسفہ تو اُن پر مسلط تھا ہی۔ ان کے صوفی مشرب شعرائے اشعار تصوف کا پرچار کر ہی چکے تھے۔ رہی باتیں یہاں بھی غیر معمولی ارتباط بڑھ گیا اور ایران و ہندوستان کچھ ایسا خلط ملط ہوا کہ لاشعوری طور پر ایک کی تہذیب دوسرے پر حاوی ہو گئی اور زبان اردو کے وجود میں آنے کے بعد اگر ہندوستانیوں نے گل و بلبل کا ذکر کرنا شروع کیا تو امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے پنگھٹ، سہاگ اور شاہانے گیت ہندوستانی زبان میں کہکر حد سے زیادہ دلچسپی و محبت کا ثبوت پیش کیا۔ اس سے دونوں کے میل ملاپ کو بہت فائدہ پہنچا اور مغلوں کے زمانے تک ہندوستان کو اپنی حکومت محسوس ہوتی رہی۔ لیکن طبقاتی فرق اس وقت بھی موجود تھا اور بعض حساس لوگ متاثر ہو کر اسے پیش کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ نظیر اکبر آبادی کا نام سب سے اول لئے جانے کے قابل ہے۔ اُن پر یہ جذبہ شدت سے طاری تھا۔ اُن کی شاعری صرف نچلے طبقے کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ غالب بھی باوجود صوفی مشرب ہونے کے بیحد حساس واقع ہوئے تھے اور اپنی مفلوک الحالی کے سبب سے جب دل و دماغ کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے تھے تو بیتاب ہو کر متوسط درجہ کی کشمکش بیان کرنے بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اپنی طبیعت کے عکس جب بادشاہ کی مصاحبت قبول کرنی پڑی اور جا و بیجا تعریف و توصیف کی ضرورت پیش آئی تو اپنی خودداری اور آزادی کا ماتم ان الفاظ میں کرنے لگے :-

غالبِ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا ۔۔۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ترقی پسندی کا معیار [illegible] کے جذبات اور نچلے طبقے [illegible] سو فیصدی [illegible] ترقی [illegible] عظیم [illegible] ہوگا، چونکہ غربت اور [illegible] کا شکوہ ان سے یہاں کی بکثرت [illegible] خواص [illegible] آگے بڑھے تو آزاد [illegible] اس راہ میں گل افشانی کرتے نظر [illegible] کا [illegible] دیتے ہوئے ہیں۔ انھیں [illegible] قدیم طرحی مشاعرہ [illegible] ایسے جلسوں کی بنیاد ڈالی جن میں بجائے غزلوں کے نظمیں پڑھی جاتی تھیں [illegible] جاتے تھے اور [illegible] کے ماتحت کہنے والے اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے انھیں [illegible]

"نشاطِ امید" ۔ "مناظرہ" ۔ "رحم و انصاف" اور "حبِ وطن" کے عنوانات پر شعر کہے ۔ آخر الذکر نظم نے قوم کے سردہ جذبات میں تلاطم برپا کر دیا ۔ لیکن سیاسی قوت تو تھی نہیں لہٰذا مقابلہ کا حوصلہ پیدا نہ ہو سکا ۔ ہاں اس احساس نے قومی نظمیں کہنے کی طرف نوجوانوں کو کثرت سے متوجہ کر دیا اور آج آپ ہندوستان میں جو کچھ انقلابی شاعری دیکھ رہے ہیں اس کے بانی مبانی حالیؔ ہیں ۔ نظم معرّا کی بھی یہی صورت ہے ۔ سرسید کی تحریک جب پروان چڑھی اور مسلمانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی پائیداری محسوس کر کے انگریزی زبان کی طرف مخاطبت شروع کی تو اپنے ادب میں وسعت پیدا کرنے کے لئے تراجم کی رسم کو عام کیا اور سب سے پہلے اس رنگ کی نظم مشہور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شررؔ نے فرمائی ۔ جمود پسند حلقوں میں ہیجان برپا ہوا ۔ اخبار اودھ پنچ نے مذاق اڑانا شروع کیا، مگر اصولِ ارتقاء کے ماتحت جب انسان بڑھ چکا تھا تو پھر اس کے ادب کو کیسے پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا ۔ باوجود مخالفت کے اس قسم کی شاعری کا رواج ہوا ۔ اور اسمٰعیل میرٹھی نے قوافی و قدر نظمیں کہیں ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مغرب کا تحفہ نہیں تھا جس سے رجعت پسند حلقہ بیزاری کا اعلان کر رہا تھا ۔ بغیر ردیف و قوافی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے مرتب کرنا خاص ہندوستان کی چیز ہے ۔ علم موسیقی میں دھرپت ہولی خیال ٹپہ وغیرہ کی بندش بالکل یہی ہوتی ہے ۔ اہلیہ بائی اور میرا بائی کے اکثر گیتوں کی بھی یہی وضع ہے ۔ مگر غیظ و غضب میں اس حقیقت کی طرف خیال بھی نہ گیا اور آزاد شاعری کو مستقل انگریزوں کی ملکیت سمجھ لیا گیا ۔ لیکن اس سمجھنے سمجھانے سے ہوتا کیا ہے ۔ وقت آگے بڑھ رہا تھا ۔ زندگی طرا بسے بھر رہی تھی ۔ ادب اس دوڑ میں برابر کا شریک تھا اور ترقی پسند تحریک عام ہوتی جا رہی تھی ۔ شعر و شاعری نے جب زبان اردو میں وسعت پیدا کر دی اور لوگوں کو نثر کی طرف مخاطب ہونا پڑا تو یہی عنصر اس میں بھی آیا ۔ فرسودہ داستانیں بھی اپنے دور کے اعتبار سے آگے بڑھنے کی خواہاں تھیں ۔ تخیلی کردار بھی حسنِ اخلاق سنوارنے کے طلبگار تھے ۔ پھر وقت نے کچھ اور ترقی پسند فنکار پیدا کئے ۔ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، کسی نے گھریلو زندگی پیش کی، کسی نے تاریخی واقعات سنائے، کسی نے زبان دانی کا درس دیا، کسی نے طبقۂ نسواں کی اصلاح چاہی ۔ الغرض سب کا اقدام ترقی پسندانہ تھا اور اپنے دور کے لحاظ سے کامیاب و کامران ۔

جنگِ عظیم کے بعد ملک میں سیاسی بیداری پھیلی ۔ لوگوں نے حکومت سے نفرت محسوس کی ۔ سرمایہ داری کے عروج کو دیکھا اور غریب کسانوں، مزدوروں کی کشمکش کا اندازہ ہوا ۔ ادب کا رخ مڑا ۔ مسٹر گاندھی نے منشی پریم چند کو اپنا ادبی ایڈیشن منتخب کیا ۔ ہندوستان کو ٹالسٹائی قسم کے مصنف کی ضرورت تو تھی ہی ۔ ان کے رشحاتِ قلم سر آنکھوں پر اٹھائے جانے لگے ۔ ترقی پسندی اب کمال آخری حدوں پر پہنچا ہوا تھا ۔ اسی لئے کہیں پر ان سے پمفلٹ نگاری سرزد نہ ہوئی ۔ اور جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں غیر معمولی ادبیت بھر دی ۔ عظیم بیگ چغتائی متوسط طبقے کے سدھارنے کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کے مذاح میں ایک دنیا پوشیدہ ہونے لگی ۔ زندگی کچھ اور آگے بڑھی ۔ ان لوگوں کے پیغام گھٹے گھٹے محسوس ہوئے اور نوجوانوں نے چاہا کہ کھری کھری باتیں کہیں ۔ لہٰذا "انگارے" کی تخلیق ہوئی جس میں ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر نے شرکت کی تھی ۔ مگر اس کتاب کو حکومت نے ضبط کر لیا ۔ اور پریم چند کی قیادت میں ایک ایسی انجمن بنائی گئی جس میں ادب کو زندہ اور صحت مند ادب پیش کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ۔ چنانچہ گذشتہ دس سال کے اندر اردو ادب نے غیر معمولی ترقی حاصل کی اور ایسے ایسے کامیاب وحساس ادیب و شاعر پیدا کئے جن کی دوربین اور دوررس نگاہیں زندگی کے رگ و ریشہ کا تجزیہ کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ ان سب کا مقصد حال کو بہتر بنانا ہے ۔ لیکن تاثرات مختلف ہیں ۔ کوئی روٹی سے متاثر ہے ۔ کسی کو جنس کا مسئلہ بیچین کئے ہوئے ہے، کسی کو سیاست سے غیر معمولی لگاؤ ہے، کوئی رسم و رواج کا مخالف ہے ۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ ان میں یہ فرق باقی نہ رہے اور سب کو ایک ہی مرکز خیال پر جمع کر دیا جائے مثلاً روٹی کے مسئلہ پر

تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ اوّل تو کوئی سلجھا ہوا فنکار اپنے محسوسات کے خلاف لکھنے پر آمادہ ہی نہ ہوگا اور اگر ہو بھی جائیگا تو اپنی تخلیق میں زندگی نہ پیدا کر سکیگا، اس کا فن جسدِ بے روح ثابت ہوگا۔ سوچنے اور کہنے کی آزادی ہی کا دوسرا نام ترقی پسندی ہے۔ یہ انسان کو محدود نہیں کر سکتی ۔۔۔ ایک شخص فطرتاً مرنجان مرنج واقع ہوا ہے، اپنے افلاس کو محسوس نہیں کرتا، فاقوں میں سکتا ہے۔ آپ اس سے کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ بھوکوں کے جذبات کا احساس کریگا اور ان کی مصوری کرنے پر تیار ہو جائیگا۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ اصولِ ارتقاء زندگی کے ہر شعبے میں جاری ہے اسی لئے ادب کی ترقی پسند تحریک بھی تمام گرد و پیش کو سمیٹے ہوئے ہے اور آپ اس کو محدود کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ زندگی کی مکمل تشریح اگر ادب کے ذریعہ ممکن ہے تو پھر آپ کو وسعتِ نظری سے کام لینا ہوگا اور ہر صاحبِ فکر کو یہ اختیار دینا ہوگا کہ وہ اپنے اپنے طور پر ماحول آفرینی کرے۔ ہمارا مقصد موجودہ نظام میں مکمل انقلاب ہے۔ ہمیں ہر پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے اور ترقی پسند ادب کا مفہوم بھی یہی ہے۔ مانا کہ یہ بحرانی دور ہے لیکن اسی وقت ایک تعمیری پروگرام مرتب ہو جانا چاہیئے اور ذہنی بیداری کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہمارا قدم کس طور پر اٹھے۔ بغاوت تو بہترین چیز ہے اور فرسودہ رسم سے کنارہ کشی بھی لازمی ہے۔ لیکن ایک معیار تو مقرر ہونا چاہیئے کہ کن چیزوں سے بغاوت کی جا سکتی ہے اور کرنا مناسب ہے۔ محض اسی اصول کو قائم نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سینکڑوں نااہل لوگ ادیب بنکر ترقی پسند تحریک کو غیر معمولی حد تک رسوا کر چکے ہیں اور اپنے افکار پریشاں سے مزید کوشش میں مصروف ہیں۔ اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ جو ناقص عناصر ہیں وہ خود بخود فنا میں تحلیل ہو جائیں گے اور تندرست و صحت مند اقدام زندہ رہ جائیں گے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف دل بہلانے کی باتیں ہیں جس عمارت کی بنیاد کمزور ستونوں پر قائم ہو جاتی ہے اس میں کسی نہ کسی وقت نقص پیدا ہو کر ہی رہتا ہے اور عمرِ طبعی تک پہنچنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ آپ کو تو ایسے ادب کی تخلیق لازم ہے جو زندگی کا مجموعی صورت سے مصوّر ہو اور فنی حیثیت سے بھی کم از کم اس قابل ضرور ہو کہ نوجوانانِ مستقبل بالکل گمراہ نہ ہو جائیں اور ادب اور پروپگنڈے میں کوئی امتیاز نہ محسوس کر سکیں۔

ہمارے نئے ادب کے لئے یہ وقت بیحد غور و فکر کا ہے، رجعت پسندوں کی مخالفت دم توڑ چکی ہے۔ قدامت اپنے حملوں کی ناکامی سے شرمندہ ہو کر منہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں "ادب برائے زندگی" کے پرستار پیدا ہو چکے ہیں، اسنئے نئے جرائد و رسائل نکل رہے ہیں، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ترقی پسند تحریک کو واضح اور ہمہ گیر صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ مستقبل کا مورّخ ہمارے فن پاروں کو پمفلٹ نگاری تصور کر کے نظر انداز کر دیگا۔ بلکہ ایک مفید اور کامیاب مقصد کو بھی شدید نقصان پہنچیگا۔ ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ہماری کوششیں محض ہنگامی ہیں اور آنے والے دور کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کا ہر قدم آنے والے زمانہ کے لئے ایک سنگ میل ہے جس کی آب و تاب میں جدید راہیں نظر آئیں گی اور کاروانِ ارتقاء منزل بہ منزل بڑھتا جائیگا۔ جس قدر جامع و مانع نقش ہم چھوڑیں گے اسی قدر ارفع و اعلیٰ مستقبل تعمیر ہوگا۔

سیاست کی اہمیت مسلّم۔ لیکن بقول ممتاز شیریں "اردو میں کسی نے سیاست وغیرہ پر افسانے لکھے بھی ہیں تو اتنے سطحی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس موضوع پر لکھنے کی خاطر افسانہ لکھا گیا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ یہ کہا جاتا ہے۔ ادب میں سیاسی دخل، اسے فن نہیں، پروپگنڈا بنا دیتا ہے۔" دیکھا آپ نے ایک وسیع النظر نقاد نے ہمارے فن پاروں کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو محدود کرنے کا نتیجہ ہے، ہر وہ شخص جو اپنے کو نئے فنکاروں میں شامل کرنا چاہتا ہے بغیر تاثرات کے زبردستی سیاسی رجحانات کی ترجمانی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ بغیر محض فیشن کے طور پر کسی موضوع پر قلم اٹھانے کی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ انھیں اپنے دماغوں سے یہ تخیل نکال دینا چاہیئے

ترقی پسند ادب کسی خاص سیاسی جماعت کے نظریوں کو عام کرنیکا ذریعہ ہے۔ وہ ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اس کا کام تو زندگی کی اصلاح، ترقی اور مصوری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان دنوں ہماری عمر رواں سرمایہ داریت و ملوکیت کی چکی میں بری طرح پس رہی ہے۔ ہر طرف بھوک اور فاقہ کی گرم بازاری ہے، قحط کے آثار نمودار ہیں، خود غرضی بام عروج پر پہنچ چکی ہے۔ انسانیت پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ انفرادیت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سماج کی پابندیاں، قانون کی سختیاں اور قدیم رسم و رواج کی زنجیریں انسان کو اپنے شکنجوں میں کسے ہوئے ہیں ـــــ خود ساختہ تعصب مذہب کے نام پر ہندوستان کو خانہ جنگی کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ سوسائٹی کی زیادتیاں ہر حساس فرد کو جھنجھوڑ چکی ہیں۔ فنکار بھی اسی کے ممبر ہیں۔ اپنی تخلیق کی بنیاد اپنے ماحول کے ماتحت تعمیر کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کا فن بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ پرانی دیواریں گر رہی ہیں، اور ایک مشترکہ مساویانہ نظام کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی سیاسی جذبہ نہیں ہے۔ محض ماحول کے تاثرات کارفرما ہیں۔ جس کا جس قسم کی سوسائٹی سے تعلق ہے اس کا اسی قسم کا مرقع ہے۔ کسی کے یہاں ملوں کے دھوئیں، مزدوروں کی چیخیں۔ سرمایہ داروں کے مظالم شدت سے نمایاں ہیں۔ کوئی دیہات کے جفاکش کسانوں کا مصور ہے۔ کسی کو سماج کے ٹھکرائے ہوئے آوارہ گردوں، اوباشوں اور طوائفوں سے ہمدردی ہے۔ کسی کی دوربین دور رس نگاہیں مغرب زدہ مرد و عورت کے اعمال و اطوار کا تجزیہ کر رہی ہیں۔ کوئی جنسیاتی کشمکش بیان کر رہا ہے۔ کسی نے نفسیاتی حقائق کو عوام الناس تک پہنچانا ضروری سمجھا ہے۔ کوئی قدیم معاشرت کے نقائص پیش کر کے ملک کو اجتناب کی دعوت دے رہا ہے۔ کسی نے متوسط گھروں کی خامیوں کو اجاگر کرنے کا بار اپنے سر لے لیا ہے۔ کوئی فطری خواہشات کی نقاب کشائی میں مصروف ہے ـــــ الغرض کسی کا فن بغیر مقصد نہیں ہے۔ سب مکمل اور پائدار انقلاب کے طلبگار ہیں۔ محض تفریح حاصل کرنا مد نظر نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض جنسی و نفسیاتی فن پاروں میں تلذذ ملتا ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ یہ ادب برائے زندگی ہے یا ترقی پسندانہ اقدام کے خلاف ہے۔ "ادب برائے زندگی" کے معنی ہی یہ ہیں کہ حیات مستعار کا ہر رخ اس میں پایا جائے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ ایک ایسی تحریک جو زندگی کے لئے ہو، وہ کسی خاص نقطہ پر کیسے ٹھہر سکتی ہے۔ انسانیت کی معراج محض روٹی ہی تو نہیں ہے۔ اور بھی فطری ضروریات ہیں، ان سے چشم پوشی کر کے کیسے کوئی تحریک جامعیت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ خصوصاً جنس کا مسئلہ تو زندگی کا اہم ترین جز ہے ـــــ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت آدم کو روٹی سے پہلے عورت کی خواہش ہوئی تھی، اور "حوا" کے وجود میں آنے کے بعد گندم خوری کا جرم ان سے سرزد ہوا تھا ـــــ ہمارا جنسیات سے متاثر ہونا تو فطری چیز ہے۔ اگر اسے ترقی پسندی کی پیشانی پر بدنما دھبہ تصور کیا جائیگا تو نئے ادب کا ایک بڑا قیمتی حصہ ختم ہو کے رہ جائیگا۔ اور زندگی کا نمایاں پہلو تاریکی میں پوشیدہ ہو جائے گا، جس کی بنا پر موجودہ ادب اجتماعی حیثیت سے حیات انسانی کا ترجمان نہ کہلا سکیگا، بلکہ صرف پیٹ کی فریاد بن کر رہ جائیگا۔ جس سے ترقی پسندی کی وضاحت ناممکن ہو جائے گی۔ یہ جامع و مانع لفظ ہمارے چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ صرف روٹی ہی کی بھوک کا اعادہ اس کا نصب العین نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مجموعی صورت سے زندگی میں ارتقا اس کا مفہوم ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ رجعت پسندوں کی طرف سے جنسی ادب کی شدید مخالفت کی جا رہی تھی تو تمام ترقی پسند مصنف متحدہ انداز سے تشفی بخش جوابات دے رہے تھے۔ مگر اب چند سیاسی کارکنان نے اپنے مقاصد کو عام کرنے کے لئے مخالفین کو موافق بنانے کی کوشش کی ہے اور انھیں کو ہم نوا بنا کر نفسیاتی تجزیوں کو ترقی پسندی سے خارج کر دیا ہے۔ میرے خیال میں نئے لوگوں کے لئے یہ اعتراف شکست سخت توہین آمیز ہے۔ کسی وقت انھیں اس مسئلہ پر تبادلہ

ہونا چاہیے کہ جنس پر لکھنے والے ذہنی تعیش کے طالب ہیں یا زندگی سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا تمام تر تعلق حیاتِ انسانی سے ہوتا ہے۔ یہ مفلوکوں کی بستی سے بھاگ کر پناہ لینے کے قائل نہیں ہیں لیکن انسان ہیں اور جذباتِ انسانی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنے کے لئے فطری طور پر مجبور ہیں۔ آپ جن کی ترجمانی فرماتے ہیں ان غربا کو ہی لے لیجئے کیا ہر وقت وہ روٹی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں؟ یقین جانئے وہ تو اس تفکّر سے بھاگ کر دلچسپ ماحول میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے اپنی ہستی کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ اور اس کا بیّن ثبوت ان کی بکثرت اولاد سے ملتا ہے۔ میں اسے ان کی بے حسی نہیں سمجھتا بلکہ زندہ رہنے کے لئے اسے فطری شاغل سبب تصوّر کرتا ہوں۔ آخر انسان ہی تو ہیں کہاں تک پیٹ اور روٹی کے مسئلہ پر سوچے جائیں۔ کچھ دیر تو ضرور بے فکری کی زندگی بسر کرنے کے طلبگار ہوں گے۔ پھر آپ ان ادیبوں کو کیوں مورد الزام سمجھیں جو روٹی کی بھوک سے علیحدہ ہو کر جنسی بھوک کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر آپ اسے قدیم ادب کی بدلی ہوئی صورت قرار دیکر لائق توجہ نہیں سمجھتے تو غربت اور افلاس کا رونا ہوتا کوئی نئی بات ہے۔ اسے بھی نظر انداز فرما دیجئے۔ ترقی و جدّت کا یہ مفہوم تو نہیں ہو سکتا کہ جو باتیں پہلی ہو چکی ہیں وہ دوسرے سرے سے اب نہ ہوں — اگر یہ امکانی چیز ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ لوگ کہتے۔ ہاتھوں سے کھانا کھانا بالکل قدیم رواج ہے پیروں سے کھائیں گے۔ یا ٹانگوں میں پائجامہ پہننا پرانی رسم ہے۔ اب گلے میں پہنیں گے، اور آگے بڑھا جائے تو اللہ میاں سے پھر درخواست کرنے کی خواہش ہوگی کہ آدم سے لیکر اب تک ایک ہی وضع قطع کے انسان پیدا ہوتے جا رہے ہیں آخر یہ کیا قدامت پرستی ہے۔

جدّت کسی حقیقت کے بدل دینے کو نہیں کہتے۔ بلکہ زمانہ کے موافق جو اس میں تغیر و تبدّل ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ مثلاً "ہمہ اوست" کا مسئلہ تصوّف کی جان ہے۔ اور تمام صوفیائے کرام کا اس پر اعتقاد ہے کہ کل کائنات ایک ہی روح کامل کی حرکت سے وجود میں آئی ہے۔ اب اسی کو یورپ کے مشہور سائنسدان سر الیور لاج یوں بیان کرتے ہیں کہ جب زمین پر کوئی پتی توڑی جاتی ہے تو آسمان پر ایک ستارہ متحرک ہو جاتا ہے۔ بات بالکل ایک ہی ہے جب روح کامل واحد ہے تو اشیاء عالم میں رابطہ لازمی ہے۔ اور ایک کی دکھ سے دوسرا یقینی متاثر ہوگا۔ لیکن آپ یقین جانئے سر الیور لاج کے ذہن میں تصوّف کا مسئلہ وحدت الوجود نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اُسے اس نے دہرایا نہیں ہے بلکہ ایک محسوس کی ہوئی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اس میں اگر اسے صوفیائے کرام سے اتفاق ہو گیا ہے تو یہ اور بات ہے۔ بالکل اسی طرح اُدبا و شعرا کے تخیلات کا حال ہے۔ مان لیجئے کہ مومن خاں نے مثنوی خواب و خیال میں جنس کے مسئلہ پر بڑی بیباکی سے اشعار کہے ہیں۔ اور اتفاق سے عصمت، منٹو اور ممتاز مفتی بھی اسی موضوع پر لکھتے ہیں تو کیا آپ ان لوگوں کو قدامت کا مقلد کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اسی طرح برسات کے موسم میں غربا کے حال سے متاثر ہو کر مخدوم ایک نظم کہتا ہے۔ اتفاق سے نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی اسی طرح کی تصویر ملتی ہے۔ کیا آپ مخدوم کو رجعت پسند کہنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ انسان ابھی ارتقا کی آخری منزلوں پر پہنچا نہیں ہے۔ جو محسوسات بالکل بدل جائیں۔ طبعِ بشر تو یکساں ہے اور یکساں رہیگی۔ تعلیم، تربیت، ماحول اور مذہب وغیرہ کے اثرات سوچنے سمجھنے کے انداز میں اختلاف پیدا کر دیں گے۔ اور ہم احساسات کی مکمل ترجمانی پلاٹ کی یکسانیت پر زندگی کی مصوّری دیکھ کر رائے قائم کریں گے۔ اگر اس میں اجتماعیت اور ارتقائی عناصر ہونگے

ادارہ

اس بار

(بغرض تبصرہ حسب ذیل رسائل و کتب موصول ہوئی ہیں !)

کہانی (سہ ماہی سلسلہ)

خالص افسانوی ادب کا سہ ماہی سلسلہ "کہانی" کے زیر عنوان باہتمام موہن لال شیدا جھریا سے شائع ہوا ہے جس کے مرتب سہیل عظیم آبادی ہیں۔ سہیل بحیثیت افسانہ نگار کافی مشہور ہیں اور اردو ادب میں ایک مستقل حیثیت کے مالک ——— لہذا "کہانی" کو اگر سہیل کے مقام سے پرکھا جائے تو ہم کچھ کہنے سے نہ کہنا اچھا سمجھیں گے ——— تاہم مقصد کے لحاظ سے یہ کوشش یقیناً قابل پذیرائی ہے ——— لکھنے والوں میں صرف بعض اچھے نام نظر آتے ہیں بلکہ بعض اچھی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس انتخاب میں جو خامیاں رہ گئی ہیں یا جن لکھنے والوں کو کسی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اُس کے متعلق ہمارا توجہ دلانا اس لئے غیر ضروری ہے کہ سہیل عظیم آبادی افسانوی ادب کے ارتقاء سے بخوبی واقف ہیں۔ "کہانی" جیسا کہ اعلانات سے ظاہر ہے سہ ماہی سلسلہ ہے جو مدت معینہ کی بہترین افسانوں پر مشتمل ہو گی۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کو زیادہ وسیع اور جامع بنایا جائے۔ افسانوں کے انتخاب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تین ماہ میں شائع ہونیوالے تمام بلند پایہ رسالوں کے بہترین افسانے باجازت مصنفین شریک "کہانی" کئے جائیں۔ یا پھر بہترین لکھنے والوں سے اُن کی بہترین کہانیاں حاصل کی جاکر شامل انتخاب کی جائیں ——— بہر حال طریق انتخاب جو بھی ہو، زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی ہونا چاہئے کہ "کہانی" کا ہر نمبر ہر جہت سے مکمل اور بے عیب ہو تاکہ ہندوستان کا افسانوی ادب اپنی مستقل حیثیت حاصل کر سکے۔ کتابت و طباعت غنیمت۔ صفحات ۲۰۲۔ قیمت عہ (دو روپیہ آٹھ آنے)

مِلنے کا پتہ :- دفتر کہانی - جھریا (بہار)۔

شاہکار (بہار نمبر)

کافی انتظار کے بعد "شاہکار" کا بہار نمبر ہمارے پیش نظر ہے ——— فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ بہار نمبر کی ترتیب میں جہاں غیر معروف لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے وہاں مشہور و معروف فنکار بھی موجود ہیں۔ بہار نمبر میں سب ہی کچھ موجود ہے۔ مقالے، نظمیں، قطعات، غزلیات اور افسانے اور ڈرامے ——— اس رنگا رنگی کے باوجود شاہکار کے سابقہ بہار نمبر کی طرح اس بہار نمبر میں بھی ... برائے نام ہے ——— چونکہ شاہکار کا ادارہ پچھلے تین چار سال سے برابر بدلتا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شاہکار کے موجودہ مدیر محمد آصف سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ شاہکار کے ہر نمبر کو شاہکار بنا کر پیش کریں گے۔ بہار نمبر کے بعض مقالات، افسانے اور نظمیں کافی بلند ہیں۔ البتہ غزلیات بہت ہلکی ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی بہار نمبر کامیاب ہے۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت بہار نمبر عا (دو روپیہ)

مِلنے کا پتہ :- ادارۂ ادبیات جدید - مسلم اسٹریٹ - سرکلر روڈ - لاہور۔

آجکل (سالنامہ)

حسب روایات یکم جون ۱۹۴۶ء کو "آجکل" کا سالنامہ شائع ہوا ہے۔ جس میں اچھے لکھنے والے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ آجکل چونکہ سرکاری پرچہ ہے اور لکھنے والوں کو معاوضہ بھی پیش کرتا ہے، اس لئے بہتر سے بہتر لکھنے والوں اور بہتر سے بہتر مضامین و نثر کا فراہم کر لینا اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مرادف نہیں ——— آجکل تاریخ اجراء سے آجتک اپنا خاص معیار و ...

صرف اس لئے حاصل نہیں کر سکا کہ جہاں وہ ترقی پسندوں کو جگہ دیتا ہے وہاں رجعت پسندوں کو بھی فراموش نہیں کرتا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وقار عظیم جیسے بلند پایہ ترقی پسند ادیب کی موجودگی کے باوجود، آجکل کا "سرکاری معیار" (جدید و قدیم کی غیر فطری آمیزش) بدستور قائم ہے۔ ممکن ہے مقصد کے لحاظ سے ادارۂ آجکل اپنے کو کامیاب سمجھتا ہو مگر آج کے دورِ ارتقاء میں یہ دو رنگی بلکہ "دوغلی" پسندیدہ اور معیاری نہیں کہی جا سکتی — موجودہ ترقی یافتہ ادب بہت تیزی سے آگے بڑھ چکا ہے۔ اس لئے نئی قدروں کو پرانی قدروں سے ہم آہنگ کرنا بجائے خود مضحکہ خیز ہے — تاہم آجکل کا "سالنامہ" بحیثیت مجموعی سابقہ سالناموں سے کامیاب ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۰۶۔ قیمت سالنامہ صرف عہ (ایک روپیہ چار آنے)

ملنے کا پتہ :- دفتر آجکل۔ پوسٹ بکس ۱۶۶، دہلی۔

ادبِ لطیف (سالنامہ)

مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کے مالکان کے باہمی نزاع نے ادبِ لطیف کے عام معیار کو کافی نقصان پہنچایا — پچھلے دو سال سے ادبِ لطیف بجائے ترقی کے تنزل کی طرف مائل رہا — بار سے سالنامہ دیکھکر کچھ ڈھارس بندھی — سالنامہ کو مرتب کرنے والے برکت علی چودھری، ممتاز مفتی اور فکر تونسوی ہیں۔ مضامین نظم و نثر کی ترتیب میں کافی حسنِ سلیقہ کا ثبوت دیا گیا ہے — لکھنے والوں میں تقریباً وہ تمام فنکار شامل ہیں جنھوں نے جدید اردو ادب کو سنوارنے اور آگے بڑھانے کا نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان فنکاروں کے ساتھ ساتھ وہ نئے ابھرتے ہوئے فنکار بھی نظر آتے ہیں جن سے مستقبل کے ادب کی بہترین توقعات وابستہ ہیں۔ ادبِ لطیف کا یہ سالنامہ بحیثیت مجموعی اس سال کے شائع ہونیوالے تمام سالناموں پر بھاری ہے۔ ادارہ کی پُرخلوص کوششیں دلی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ کی طرف اگر کچھ اور توجہ دیجا سکتی تو یہ سالنامہ "ادبی معجزہ" سے کسی صورت کم نہ تھا — تمام مضامین نظم و نثر زندہ، صحت مند اور ترقی یافتہ رجحانات کے حامل ہیں، جن کا مطالعہ ترقی پسند ادب سے دلچسپی اور لگاؤ رکھنے والوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ صفحات ۲۵۶۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت سالنامہ سے (تین روپیے)۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ اردو، لاہور۔

سہیل - گیا

ماہنامہ "سہیل" کے مئی اور جون ۱۹۴۷ء کے شمارے پیش نظر ہیں۔ گیا جیسے دور افتادہ مقام سے اتنے کامیاب رسالہ کا اجرا یقیناً باعثِ مسرت ہے — پرچہ کو نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کیا جا رہا ہے — لکھنے والوں میں چند ایک کو چھوڑ کر سب نئے لکھنے والے ہیں۔ مگر ان کی تخلیقات میں مستقبل کی درخشانیاں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ عارف سنسہاردی سہیل کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ امید ہے کہ سہیل اردو زبان و ادب کی بیش از بیش خدمت کریگا۔ مضامین نظم و نثر کافی معیاری ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۵۲۔ قیمت فی پرچہ ۶ر۔ سالانہ للعہ ششماہی ۱۲/۸

ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ سہیل - گیا -

خونی ہندستان

مرتب یکتا امروہوی — انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے فنکاروں نے ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر یہ کتاب تصنیف کی ہے اس موضوع پر یہ کتاب شاید پہلی اور آخری ہے۔ کیونکہ جب اس کے مضامین لکھے گئے اُس وقت خون میں ڈوبا ہوا ہندستان ایک تھا اور اب اس کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہے — آئندہ نسلیں اسے دیکھ کر ہندستان کے اس خونی دور کا پورا پورا اندازہ کر سکیں گی۔ جب انسان انسانیت کا متحمل نہیں رہا تھا۔

جب بھائی چارہ کے مقدس رشتے ٹوٹ گئے تھے، جب بھائی بھائی کا دشمن تھا۔ یہ کتاب اس بحرانی دور کی ایک مفصل تاریخ ثابت ہوگی۔

صہبا لکھنوی، وجدی الحسینی، اسد بھوپالی، محمد علی تاج وغیرہ کی نظمیں، ابراہیم یوسف کا ڈرامہ اور سلمان الارشد، رشدی، اشتیاق عارف، انجم سلمانی، قمر جمالی، عمران الارشد وغیرہ کے افسانے اس کتاب کی زینت ہیں۔ کتابت میں چند غلطیاں نظر آتی ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اس مجموعہ میں چند فنکاروں کی تصاویر بھی شامل ہیں حسین گرد پوش۔ طباعت اچھی۔ کاغذ سفید۔ صفحات تقریباً ۳۰۰ ——— قیمت ۵ روپیے (مجلد)

ملنے کے پتے

(۱) مکتبۂ افکار، بھوپال (۲) گہوارۂ ادب، بہادر گڑھ روڈ۔ دہلی۔

سنگریزے

ادارۂ اردو ادب کلکتہ کی یہ پہلی پیشکش ہے جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں، اس کتاب کو تین افسانہ نگاروں محمد یونس احمر، شاہ خلیل الرحمٰن اور قیصر نشاط مظفر پوری کی پانچ پانچ افسانوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش لفظ افسر ماہ پوری نے تحریر کیا ہے۔ جہاں تک حسن ترتیب کا تعلق ہے یہ کوشش یقیناً کامیاب ہے۔ بیشتر افسانے ماحول کے تلخ تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ ان تین افسانہ نگاروں میں سے دو کو دنیائے ادب بخوبی جانتی ہے۔ اُن کی تخلیقات زندہ اور صحت مند نظریات کی حامل ہیں ——— چند ایک افسانے بہت مختصر اور انشائے لطیف کی طرز کے ہیں ——— بہرحال بحیثیت مجموعی سنگریزے اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ امید کہ ادارۂ اردو ادب تعمیری تصنیفات پیش کر کے اردو زبان و ادب کی بیش از بیش خدمت کریگا۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۱۷۶ ——— قیمت مجلد مع (دو روپیے)

ملنے کا پتہ:— ادارۂ اردو ادب نمبر ۲۰/۱ تانتی بگان لین۔ کلکتہ۔

شہدائے اسلام

اس کتاب کے مؤلف مولانا اخلاق حسین قاسمی ناظم جمعیۃ علما صوبۂ دہلی ہیں۔ شہدائے اسلام میں ابتداءً رسول کریم کی مثالی زندگی کے چند واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد شہدائے اسلام کے تفصیلی واقعات شہادت نہایت شستہ اور پاکیزہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے سرفروشان اسلام کے کارناموں پر نہایت محققانہ نظر ڈالی ہے ——— کتاب اس قابل ہے کہ ہر گھر میں رہے تاکہ چھوٹے اور بڑے اسلام کے شہداء کی زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کر سکیں۔ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۴۴ قیمت مجلد مع (دو روپیے) ———

ملنے کا پتہ:— مکتبہ رضیہ۔ دہلی۔

تذکرۂ آخرت

حکیم ڈاکٹر سید عبدالحمید اپنی گرانقدر طبی تصنیفات کی وجہ سے دنیائے طب میں ایک ممتاز جگہ رکھتے ہیں مرج البحرین، تیر بہدف، اور طب جدید وغیرہ آپ کی وہ قیمتی کتابیں ہیں جو ایک سو زائد بار طبع ہو چکی ہیں۔ "تذکرۂ آخرت" آپ کی تازہ تالیف ہے جو تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں برزخ کا بیان دوسرے میں قیامت کے احوال اور تیسرے میں قرآن پاک اور اس کی بعض سورتوں کے فضائل و خواص اور اسمائے حسنیٰ اور دعاؤں وغیرہ کا بیان صحیح اور معتبر حدیثوں اور روایتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ شہدائے اسلام کی طرح تذکرۂ آخرت بھی ایک اعلیٰ مذہبی کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

انداز بیان میں نہایت سادگی اور چاشنی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں بھی خاص تنوع پایا جاتا ہے۔ نہایت عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۱۶۰۔ حسین سرورق۔ قیمت مجلد صرف عہ

ملنے کا پتہ:— عتیق الرحمٰن اینڈ سنز۔ چوک بازار۔ بھوپال۔

نمائندہ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے!

فلمستان

انڈین موشن پکچرز

انڈین موشن پکچرز کا نواں سالانہ اجلاس گذشتہ ماہ بمبئی میں منعقد ہوا، سبکدوش ہونیوالے صدر مسٹر ڈیسائی نے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فلمسازی پر فسادات کے اثر کا ذکر کیا اور کہا کہ فلمی دنیا میں ناقابل تصور حالات پیش آرہے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ سب ملکر حالات کا مقابلہ کریں۔ اس اجلاس میں نئی ایگزیکیوٹو بھی بنائی گئی جس میں حسب ذیل اراکین شامل کئے گئے:۔ مسٹر سی، ایم، ڈیسائی (صدر)۔ مسٹر کادم (نائب صدر) مسٹر ملنانی (خزانچی)، مسٹر چندولال، رائے بہادر چنی لال، مسٹر سی، ڈی، ڈیسائی مسٹر بھٹ، مسٹر موڈی، مسٹر واڈیا، مسٹر پانڈے مسٹر ایس، ایف جینین، مسٹر بھوانی، مسٹر مفتی، مسٹر آصف

انڈیا فلم کارپوریشن بھوپال

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کمپنی کے پہلے فلم کی باقاعدہ شوٹنگ وسط جولائی کو بمبئی میں شروع ہو رہی ہے۔ کاسٹ کا انتخاب عمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ سردار رل للوانی، مسٹر نایاب علی خاں اور مسٹر عادل بمبئی پہنچ چکے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض مسٹر عادل اور مسٹر امان اللہ خاں انجام دینگے۔ پہلے فلم کو کامیاب بنانے کی زبردست کوشش کیجارہی ہے۔ نغمہ نگاروں میں صہبا لکھنوی اور نخشب جارچوی کا نام لیا جارہا ہے۔

سنٹرل انڈیا تھیٹرز

دہلی اس کا ایک فلمی ادارہ مہوچھا میں قائم ہوا ہے۔ اس ادارہ کے روح رواں مسٹر نند لال جین ایک تاریخی ڈرامہ فلمانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

شیخ اپنے اصلی مقام پر

بیگم پارہ اوّلین بار خانہ بدوش، دوشیزہ

"شہناز" کے لباس میں ودیپ پروڈکشن کے پہلے فلم میں پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہو رہی ہے "شہناز" کی کہانی شیلے کی ایک مشہور نظم سے ماخوذ ہے۔ جس میں مسٹر شیخ نے فلسفۂ محبت کی عملی شرح کی ہے۔ ہدایت موسیقی امیر بائی کرناٹکی انجام دے رہی ہیں۔ مکالمے حضرت رحمن لکھنوی گانے حضرت اختر پیلی بھیتی، حضرت عامر عثمانی کر رہے ہیں۔ اداکاروں میں شوخ اداکارہ بیگم پارہ، لطافت نہال۔ شانتا پٹیل۔ مصطفےٰ۔ پی، ڈی لال۔ شمع گلنار، عصمت سلطانہ اور کیرکٹر ایکٹر و ڈائرکٹر مسٹر شیخ جیسے اداکار اپنی فنکارانہ اداکاری کے جوہر دکھانے میں مصروف ہیں امید ہے کہ "شہناز" سال رواں کی بہترین نغمہ بار تصویر ثابت ہوگی۔

امریکی فلموں کیلئے مارکیٹ

امریکن موشن پکچرز نے اطلاع دی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے تقریباً ۱۰ ممالک میں امریکی فلموں کے لئے مارکٹ از سر نو کھل گئے ہیں جو جنگ کی وجہ سے بند ہو گئے تھے چیکوسلاویکیا اور پولینڈ میں مانوپلی حاصل کرلی گئی ہے جنا۔ مشرق، لہنداسٹروانیہ، ہنگری، جاپان، کوریا اور آسٹریا میں بھی اجازت حاصل کرلی گئی ہے۔ جرمنی میں فلموں کی تقسیم کے لئے اجازت حاصل کی جارہی ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ سیاسی حالات کی بناء پر بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ۔ اور روس میں امریکی فلم ممنوع تھے لیکن اب ان ممالک میں بھی امریکی فلموں کی تقسیم کے انتظامات بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے ہیں۔

"ہری مندر"

پروڈیوسر ایس۔ بی ڈیسائی نے "اوجانے والے" مکمل کرلی ہے جس کے خاص اداکار گیتا ڈیسائی، ترلوک کپور، حسنہ، پانڈے، مہر سلطانہ اور اڈوکانت ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب "ہری مندر" کی تیاریاں [illegible]

اعلان

نادرہ الائیڈ ایجنسیز اختر منزل بھوپال اور اُس کی خدمات

۱۹۴۶ء میں شہر بھوپال میں کمپنی ہذا کی مذکور الصدر نے تین برانچیز انگریزی ادویات کی کھولیں منجملہ تین برانچیز کے ایک برانچ "نادرہ میڈیکل ہال" میں مردوں کے علاج کا معقول انتظام کیا گیا ہے اور دوسری برانچ "نادرہ میڈیکل کلینک" میں عورتوں، بچوں کا علاج کیا جارہا ہے۔ ہر دو ڈسپنسریز میں کوالیفائڈ ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر نیز کمپونڈران اپنی صحیح خدمات انجام دیرہے ہیں۔ تیسری برانچ پیٹنٹ ادویات کی ہے۔ حقیقتاً تینوں برانچیز کی صحیح خدمات سے باشندگان بھوپال کو جو فائدہ پہنچا ہے، وہ زبان زد خلائق ہے۔ اب کمپنی ہذا کا ۱۹۴۷ء میں حسب ذیل پروگرام ہے



بچوں کے پیٹ کے درد، پیٹ پھولنے، مروڑ اور کالی کھانسی وغیرہ کے لئے بابولین سے بہتر کوئی دوسری دوا نہیں۔ دانتوں کے نکلتے وقت بابولین کا استعمال حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے۔

تیار کنندہ
بی بابا کیمیکل ورکس بمبئی نمبر ۲
نمبر ۲ و ۳ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سول ایجنٹس برائے سی پی برار، سی آئی، راجپوتانہ
نادرہ الائیڈ ایجنسیز (رجسٹرڈ)
ہیڈ آفس اختر منزل بھوپال

نوٹ:۔ اسٹاکسٹ ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

ڈسپنسریز معہ ڈاکٹر و لیڈی ڈاکٹر

۱۔ قصبہ سیہور ریاست بھوپال ۲۔ قصبہ بریلی ریاست بھوپال ۳۔ مین مارکیٹ ابراہیم پورہ بھوپال ۴۔ ریاست بیگم گڈھ ۵۔ ریاست گوالیار ۶۔ ریاست ٹونک۔ کمپنی ہذا کے اس نئے پروگرام سے ریاست بھوپال ہی نہیں بلکہ ہمسایہ ریاستوں کو بھی فائدہ پہنچیگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ پبلک ہماری خدمات حاصل کرکے ہماری حوصلہ افزائی کرے گی۔

منظور حسن بی، اے۔ جنرل مینیجر۔ نادرہ الائیڈ ایجنسیز۔ بھوپال۔

اگست ۴۷ء کے چند حسن کار

قاضی نذرالاسلام	ڈاکٹر حبیب الرحمن
یونس احمر	قدوس صہبائی
اشتیاق عارف	اختر عرفانی
مسعود اختر جمال	وجاہت سندیلوی
کمال احمد صدیقی	مسعود بحری
مظفر علی	جلال ملیح آبادی
آل رضا	لطیف انور
احسن علی خاں	اختر پیامی

— ایچ کنول وغیرہ —

٭ مستقل عنوانات ٭

اشاریہ	مد و جزر	یہ فن کار	سنگ و خشت
آبگینے	آبشار	جائزے	اس بار

٭ فلمستان وغیرہ ٭

THE AFKAR BHOPAL

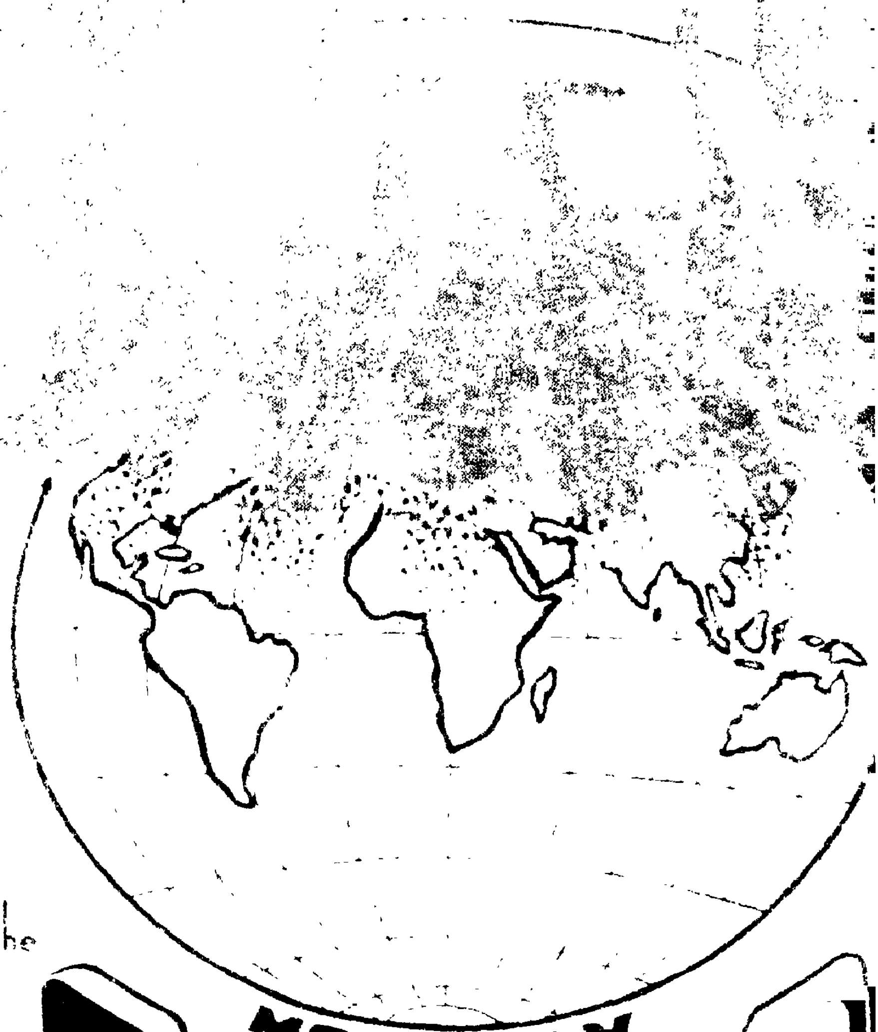
4, Bellasis Road, BOMBAY 8 — Mohan Manzil, NAGPUR (Central) — 300, Risala Abdullah Kaum..., HYDERABAD (Dn.) — Erravagani, ... DELHI

Regd: No. N. 9

VOL. 5 — JULY 194[illegible] — No. 5



منورما «شالیمار» میں



The

MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

PRICE 8 ANNAS

ماہنامہ
افکار
بھوپال

اگست ۱۹۴۷ء

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا ! اقبال

جلد ۵ شمارہ ۶

سرخیاں

ادارہ
رشدی ـ صہباء

بمبئی آفس
۲۶۴ بلاسس روڈ بمبئی

دہلی آفس
قیاش گنج بہادر گڑھ روڈ دہلی

ناگپور آفس
موہن منزل چھاؤنی ـ ناگپور

حیدرآباد آفس
۳۰، رسالہ عبداللہ قدیم حیدرآباد دکن

زر سالانہ [illegible]   ششماہی [illegible]
فی پرچہ ۸

اشاریہ

تقسیم ہند کے بعد زبان اور کلچر کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بڑی پیچیدگیاں رونما ہوگئی ہیں زبان کے بارے میں اس وقت عجب بحرانی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو یا "ہندوستانی" ملک کی مشترکہ اور عام زبان قرار دی جا چکی ہے، کیونکہ یہ زبان ہمارا ایسا مقدس ورثہ ہے جسے صدیوں کے میل ملاپ اور جدوجہد نے آفاقی وضعیت عطا کی ہے۔ ـــــ ملک ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد ڈومینیوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور دو جداگانہ حکومتیں بھی قائم ہوگئی ہیں لیکن زبان کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے، ـــــ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہندوستان کی مجلس دستور ساز کی کانگریس پارٹی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی قرار دی جائے، ـــــ ایک عام اور مشترکہ زبان کی موجودگی میں جسے عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہو، ایک محدود صلاحیت کی زبان کو عام زبان بنانا کسی طرح بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" جیسے کانگریسی نے بھی ہندی کو عام زبان بنائے جانے کے خلاف احتجاج کیا ہے، آپ نے گاندھی جی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور اچاریہ کرپلانی کو اس سلسلہ میں ایک تشویش انگیز تار ارسال کیا ہے اور کہا ہے کہ "دعوی اسپرٹ کے تقاضا یہ اپیل کرتے ہیں کہ ہندوستانی کو عام زبان قرار دیا جائے" گاندھی جی نے بھی اپنے تازہ بیان میں صاف طور پر کہہ دیا ہے " ہندوستان کی قومی زبان وہی ہو سکتی ہے جو ہندوستانی عوام بولتے ہیں اس لئے دیوناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی سہل اردو یا ہندوستانی ہی ملکی زبان کہلا سکتی ہے" جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے۔ اردو عام زبان قرار دی جا چکی ہے، مگر ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اب پوری تنظیم اور سرگرمی سے اردو کی بقا کے لئے جدوجہد شروع کر دی جائے

اس بار چار افسانے ہیں، وجاہت سندیلوی نے اپنی تمثیل میں ایک انقلابی نوجوان کے کردار کو مختلف النوع ترغیبات کے سامنے بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے،

ڈیڈ اسٹون ـــــ قدوس صہبائی ایک طویل عرصہ کی جدائی کے بعد "بزم افکار" میں پہلی بار شامل ہو رہے ہیں دبی متوسط جنسی گھٹن، معاشرتی ضلالت اور زوال پذیر سماجی ماحول، پھر کوئی موقع ملتے ہی آتش فشاں کی طرح اپنے اچھے اور بُرے جذبات کو "اُگل" دینا ـــــ یہ ہے "ڈیڈ اسٹون" کا مرکزی خیال۔

"اللہ چھوٹے نا!" مسعود ہجری کی طنزیہ کہانی ہے، اس میں بھی ہمارے معاشرہ کا ایک الم انگیز رخ پیش کیا گیا ہے،

"جان ہے تو"، مظفر علی کا یہ افسانچہ موجودہ سیاسی حالات پر بڑا گہرا طنز ہے۔ آہ! فلاکت زدہ ہندوستان ـــــ!

"ہم برلن سے بول رہے ہیں" حبیب الرحمن آف برلن ریڈیو نے اس دلچسپ اور معلوماتی مضمون میں زمانۂ جنگ میں برلن سے اردو نشریات کا پس منظر پیش کیا ہے۔ امید کہ یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ "اس بار" ایک خط بھی پیش کیا جا رہا ہے اس میں کیا کچھ تحریر کیا گیا ہے مطالعہ کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرما لیں گے۔

ہاں ـــــ اور یہ ہیں آبگینے ـــــ اس مرتبہ سات نظمیں اور چار غزلیں "آبگینے" کی زینت ہیں ـــــ ان نظموں اور غزلوں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ان کو پیش کرنے والے عصر حاضر کے "چوٹی" کے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں اور بس ـــــ!

ادارہ

مدّ و جزر

مارشل پلان

گذشتہ ماہ پیرس میں یورپ کی امداد سے متعلق مارشل پلان کی روشنی میں جو اہم کانفرنس ہوئی تھی اس کا نتیجہ اس ماہ میں معلوم ہو جائیگا۔ امریکی وزیر خارجہ مسٹر مارشل نے ایک ایسی سکیم بنائی ہے جس کی رو سے امریکہ یورپ کے جنگ زدہ ممالک کی امداد کرنے کو تیار ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلے روس، برطانیہ، فرانس کی ایک کانفرنس پیرس میں طلب کی گئی جو روس کے غیر مصالحانہ رویہ کی وجہ سے ناکام ہو گئی اور روس نے برطانیہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ یورپی ممالک میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی جس میں روس اور مشرقی یورپ کے ممالک نے حصہ نہیں لیا۔ روس کا کہنا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ اس طرح یورپ پر اپنے اثر و اقتدار کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ روس نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ امریکہ ڈالر ڈپلومیسی سے روس کے تعمیری منصوبوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکہ میں پیداواری قوت بہت بڑھ گئی ہے اور اس افراط سے ایک قسم کا اقتصادی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے امریکہ یورپ کے ان ممالک کو اپنی ساختہ اشیاء قرض کے طور پر دینے کے لئے آمادہ ہے، جن کا اقتصادی نظام جنگ کی تباہ کاریوں سے ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح امریکہ اور یہ ممالک اقتصادی بحران سے بچ نکلیں گے۔

امریکہ کا یہ اقدام ان یورپی ممالک کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت قرار نہیں دیا جا سکتا، یورپ میں آجکل مغربی اور مشرقی دو حلقے قائم ہو گئے ہیں۔ ایک پر برطانیہ اور امریکہ کا اثر ہے، اور دوسرے پر روس کا، —— یہ واقعہ ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے ممالک کی کانفرنس میں عدم شرکت سے کافی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ پھر بھی مارشل پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پیرس میں جو قومیں مجتمع ہوئی تھیں اگر ان کے وسائل، فنی صلاحیتوں اور جذبہ کو مفاد عام کی خاطر ایک مرکز پر لے آیا جائے تو اس سے مغربی یورپ اقتصادی لحاظ سے بلند ہو سکتا ہے۔ یورپ کے لئے اب آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، یورپ ہی میں [illegible] اور [illegible] جیسے مہم باز پیدا ہوئے، یورپ ہی نے ڈانٹے اور شیکسپیئر کی لافانی شاعری، ریمبراں کا لاجواب آرٹ اور نیوٹن [illegible] سائنس کے کارنامے پیش کئے —— کیا یہ یورپ تعمیر نو کے اہم کام میں متحد نہیں ہو سکتا؟ ۔ پیرس کانفرنس کا مقصد [illegible] نہیں ہے کہ مارشل پلان کے تحت امریکہ صرف امداد ہی دے بلکہ اس کے پیش نظر یہ امر بھی ہے کہ یورپ کے وسائل اور قوتوں [illegible] مجتمع کر دیا جائے جس سے بعد میں یورپ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے۔

روس کو تمام یورپ کے مشترکہ مفاد کے لئے اپنے رویہ پر نظرثانی کرنا چاہئے۔ بہرکیف مارشل پلان میں کافی وسعت ہے اگر کریملن نے دوبارہ صورت حال پر مصالحانہ جذبہ کے ساتھ غور کیا تو یقیناً اسے امریکی امداد سے استفادہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جہاں تک تعمیر نو کے روسی منصوبوں کا تعلق ہے اُن پر مارشل پلان کا کوئی مضر اثر نہیں پڑ سکتا روس کو ثبت [illegible] حالات کا جائزہ لینا چاہئے —— سیاسی وجوہ کے بجائے اقتصادی لحاظ سے یورپ کی خوشحالی اور [illegible] ترقی [illegible] پیش نظر رہنا چاہئے، —— چیکوسلاویکیا اور پولینڈ زیادہ عرصہ تک اقتصادی طور پر یورپ کے [illegible] ممالک سے [illegible] نہیں رہ سکتے۔

یہ فنکار ———!

وجاہت سندیلوی

صبک

اودھ کی سرزمین اگر جوش جیسے انقلابی شاعر کو جنم دے سکتی ہے تو وجاہت جیسے باغی افسانہ نگار کو بھی پیدا کر سکتی ہے ——— لیکن
Slow but sure کے اصول پر چلنے والے ادیب و شاعر اکثر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ آج کے
ترقی یافتہ ہندوستان میں شاعروں کی کمی ہے نہ افسانہ نگاروں کی ——— لیکن نقاد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ——— اور شاید یہی وجہ ہے
کہ موجودہ ادب کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں قابل ذکر ادیب و شاعر صحیح نقادوں کے فقدان کے باعث گمنامی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔
وجاہت سندیلوی بھی اُن میں ایک ہے۔ یہ فنکار گمنام ہوتے ہوئے بھی اپنا ایک مقام رکھتا ہے ——— منفرد و مخصوص۔ اس کا طرزِ نگارش
کا اچھوتا پن ——— باوجود نقادوں کی بے بضاعتی کے بار بار نقادوں کی طرف مائل ہے۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی کے بعد وکالت کا پیشہ
اختیار کرنے کے باوجود وہ افسانہ نگار ہے، ایک ناز افسانہ نگار ——— جس کے قلم کی ہر جنبش گیتی کے رِستے ہوئے زخموں پر مرہم لگانے کے
بجائے نشتر زنی کرتی ہے اور یہی اُس کی وہ باغیانہ فطرت ہے جس کی نظیر شاید مشکل سے مل سکے۔ زندگی اور ماحول سے بغاوت، سماج اور
معاشرت سے بغاوت، تہذیب اور اخلاق سے بغاوت ——— اُس کے مخصوص اور منفرد افسانوی کے خاکے ہیں جن پر وہ کمال فنکاری سے اظہار خیال
کرتا ہے۔ کرتا چلا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ ایک خاموش اور گوشہ گیر قسم کا انسان ہے، لیکن اُس کی خاموشی اور گوشہ گیری کتنی ہمشر ہالہ
ہے، اس کا اندازہ لگانے والے شاید کم ہوں، جہاں اُس کی فطرت میں بغاوت کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں و محسوس
کرتے ہیں کہ اُس کا فن اور اُس کی فنی صلاحیتوں میں سچے فنکار کا پورا خلوص کارفرما ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے جو کچھ محسوس کرتا ہے اُسے
پوری صداقت اور دیانت داری کے ساتھ پیش کر دیتا ہے اور یہی ایک مخلص فنکار کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔
وہ اپنی افسانوی زندگی کے پچھلے تقریباً پندرہ سال میں شہرت اور نام آوری سے اتنا ہی بے نیاز رہا جتنی کہ خود شہرت اور نام آوری
اُس سے بے نیاز رہی ——— اسے وجاہت کی بدنصیبی سمجھ لیجئے یا ہمارے ادب اور ادب کا جائزہ لینے والوں کی کم نگہی کہ وہ آفتاب ہوتے ہوئے
بھی ذرہ ہی رہا اور سیکڑوں حقیر ذرے اُس کے فن کی نصف زندگی سے پہلے ہی آفتاب بن کر چمک گئے۔
عام افسانہ نگاروں کی طرح وہ صرف لکھنے کے لئے نہیں لکھتا ——— بلکہ اُس وقت لکھتا ہے جب اُس کا ذہن و دماغ اُسے لکھنے پر
مجبور کرتا ہے ——— اُس کی عام زندگی بھی اتنی ہی سادہ و پاکیزہ ہے جتنی کہ اُس کی طرزِ نگارش۔ کتنے ہیں جو اپنے فن اور اپنی زندگی میں توازن
قائم رکھ سکے ہیں، لیکن یہ فنکار زندگی اور ادب کو توازن کے ساتھ پیش کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ اُس کے افسانوی
خاکے نہ صرف ہماری زندگی کے روشن پہلو کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ تاریک گوشہ پر بھی نظر رکھتے ہیں سخت اور گہری ———!
اور پچھلے چند سال سے وہ کامیاب افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگاری اور ناول نویسی میں بھی حیرت انگیز ترقی کر رہا ہے
Slow but sure کے اصول پر چل کر ——— کون کہہ سکتا ہے کہ اُس کے فن کی لازوال قدریں
اُسے عرصہ تک گمنام رکھیں گی ———!!
آج کل وہ سندیلہ میں ہے۔ وکالت کے ساتھ ساتھ اُس کی خاموش ادبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ہماری دانست میں وہ
پیشہ سے زیادہ اپنے فن میں کامیاب ہے!۔

سنگ و خشت

دیریش

علیگڑھ سے شرافت عباسی شمیم نے اپنی ایک نظم عطا فرمائی ہے جس سے ہم قارئین کرام کو محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ سُنئے کیا "بھاکاتی" چیز ہے :-

" تو آپ آج آئی ہیں!
بہت دنوں میں کیسے یاد خاکسار آگئی؟
مگر یہ کیا حال ہے؟ — لبوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں
چہرہ زرد ہے — کہ جیسے کوئی فکر ہے -!
کچھ آپ کو ملال ہے؟ — کچھ آپ سوگوار ہیں؟ -
مزاج تو بخیر ہے؟ -
"ارے معاف کیجئے! — میں پی رہا ہوں اور آپ —
خیال ہی نہیں رہا، یہ لیجئے، یہ پیجئے فرانس کی شراب ہے!
مزے میں لاجواب ہے —
بھلا یہ کوئی بات ہے؟ بس ایک جام ہی سہی! -
ذرا سی چکھ کے دیکھئے —"
"..... ابھی یہ ذکر تھا یہاں
وہی وہ آپ کے ظفر
یہ کہہ رہے تھے آپ نے مجید کو بھی اپنی زلف ناز میں پھنسا لیا!"
"معاف کیجئے اگر کچھ آپ کو برا لگا — یہ تذکرہ ہٹایئے کچھ اور بات کیجئے!
سنا ہے آپ کی کتاب مارکٹ میں آگئی
"ارے یہ آپ لائی ہیں؟"
لکھائی اور چھپائی تو بہت ہی دیدہ زیب ہے،
سرورق بھی خوب ہے،
"امنڈ رہی ہیں بدلیاں
چمک رہی ہیں بجلیاں
فضا میں تیرگی سی ہے
فلک بھی ہے دھواں دھواں
نہ تھا یہ ایک نقش پا چمک اٹھا نہ ظلمتوں میں پوری آب و تاب سے"
"ارے پھر آپ کھو گئیں؟
ضرور کوئی فکر ہے
ضرور کچھ ملال ہے
مزاج تو بخیر ہے!"
"یہ جام اور لیجئے۔ فرانس کی شراب ہے
یہی تو ایک چیز ہے جو آدمی کے درد و غم کا آخری علاج ہے"
— ! اگر آپ کچھ سمجھ گئے ہوں تو یہ یاد رکھئے
"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو"

ایک کرمفرما جودھپور سے رقمطراز ہیں :-

" — عرض ہے کہ میں ادبی خدمت کے سلسلہ میں آپ کے رسالہ "افکار" کی "سب ایڈیٹنگ" چاہتا ہوں۔ میں نے افکار کا ایک شمارہ دیکھا ہے، جسے سچے معنوں میں "سلسلۂ ادب" کی کڑی کہنا بجا ہوگا میں اردو، ہندی، انگریزی بخوبی جانتا ہوں، مطالعہ کافی وسیع ہے ارادہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد 'ادیب عالم' کا امتحان دوں —"

افکار نواز! — "سب ایڈیٹنگ" بڑی سخت کڑی ہے آپ کی "شعریت" بھی مسلم! آپ اپنے امتحان کی فکر کیجئے۔
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!!

اب ایک لطیفہ ملاحظہ کیجئے :-

" پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں ایک زوردار بیان دیا۔ اس موقع پر ہندستان اور بیرون ہند کے بیشمار اخباری نمائندے موجود تھے قائد اعظم پاکستانی حکومت کے نظم و نسق کی وضاحت کر رہے تھے کہ ایک نامہ نگار نے شوخی سے سوال کیا کہ آپ مولویوں کی حکومت بنا رہے ہیں؟"

مسٹر جناح نے فوراً جواب دیا :-

" — اور پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

آبگینے

چل
جا رہا ہوں میں
رقص
دو غزلیں
بھکاری
دو غزلیں
بنت مریم
شاعر کی دُعا
کرفیو

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

چل

شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام کا ایک شہ پارہ

چل من آنند دھام
چل من آنند دھام رے
چل آنند دھام

لیلا بہار پریم لوک
وہاں کہاں روک ٹوک
رنگ روپ کا دھام رے
بنسی و الا شیام رے
چل آنند دھام

دکھ سکھ کا نام نہیں
صبح ہے لیکن شام نہیں
تاروں کا روشن جام رے
سنگیت کا ہے نام رے

چل آنند دھام

ترجمہ

جا رہا ہوں میں

جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں
حیاتِ نو کا اضطراب کھا رہا ہے پیچ و تاب
کہاں سے لاؤں وہ شعور لا سکے جو انقلاب؟
بلند تر ہیں عرش سے بھی عزم کی بلندیاں
کہاں سے لاؤں بازوؤں میں زورِ شہپرِ عقاب
فضا میں اِک جمود ہے پروں میں کچھ سکت نہیں
مگر اِک ارتعاش کے لئے یہ پر ہلا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں

جبیں کی پستیوں سے درسِ سرکشی مِلا مجھے
سلف کی لغزشوں نے ذہنِ ناخلف دیا مجھے
وفا کے بند توڑ کر، چلا جو منہ کو موڑ کر
تو اک نگاہِ بے وفا نے بے وفا کہا مجھے
مری بہشتِ حرّیت، مرے جہانِ آرزو
ترے لئے یہ تہمتیں، یہ تہمتیں اٹھا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں

بقا ہے جب مستقل تو خوفِ دام کس لئے؟
عمل ہے کیف جاوداں تو حرصِ جام کس لئے؟

جا رہا ہوں میں

نہ زندگی کی صبح ہے، نہ زندگی کی شام ہے
اُمیدِ صبح کس لئے، ہراِس شام کس لئے؟
یہ دام کیا، یہ جام کیا، یہ صبح کیا، یہ شام کیا
سبھی کے انفعالِ رہزنی پہ مسکرا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں

———×———

اُٹھے غریب خونِ سُرخ کا نشاں لئے ہوئے
رگوں میں کھولتی ہوئی جوانیاں لئے ہوئے
جو زندگی سے نابلد تھے آج اُن کے واسطے
نیا زمانہ آگیا، پیامِ جاں لئے ہوئے
نیا زمانہ آگیا، نظامِ زر گیا گیا
قدم قدم پہ یہ پیامِ زندگی سنا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں

———×———

جہانِ زر پرست کے غریب میرے ساتھ ہیں
نزولِ انقلاب کے نقیب، میرے ساتھ ہیں
نوازشوں سے وقت کی، عنایتوں سے بخت کی
جو غیر مطمئن ہیں بدنصیب، میرے ساتھ ہیں
نظامِ نو کے دشمنو، مجھے ہوائے زر نہ دو!
ہٹو، ہٹو کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں میں
جا رہا ہوں اپنے آشیاں سے دور ——— دور جا رہا ہوں میں

———×———

(...ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھی گئی)

...علی خاں

رقص

کتنی ہیں رومان خیز نیل کی یہ وادیاں ؟
بادلوں کی آڑ میں
چڑھ رہا ہے آفتاب
آسماں کی سیڑھیاں !
جیسے سنہرہ گلاب
موتیوں کے جھاڑ میں

نرم ہوا کا غرور —— ایک ہی خاموش راگ
نیل سے تھوڑی ہی دور - جل رہی ہے ایک آگ

ہاتھ میں دیپک لئے کوئی اٹھا تھا ابھی
آگ کے چاروں طرف ناچ رہا ہے کوئی !
ننگے پاؤں ریت پر پڑ رہے ہیں تیز تیز،
پھیلتی ہی جاتی ہیں دائروں کی وسعتیں،
ایک ہی آہنگ ہے - قدموں کی یہ لغزشیں !
نیل کی یہ وادیاں کتنی ہیں رومان خیز —!؟

اور سمٹنے لگے اپ تو یہی دائرے
اور اور سے اور تنگ، اور تنگ ہو گئے - !!

بادلوں کے باہر اب ماہتاب زرنگار
دیکھنے کو آگیا اک حسینہ کا شباب،
جسم ... نقش و نگار
حسن کا ... نکھار،
رقص کا اک شاہکار — !!

نہیں —— وہ تو رک گئی !
... اٹھے رہ گئے رقص کے انداز میں،
... جھک آگئی جسم فسوں ساز میں،

اور جسم نازنیں ——
رقص کا اک بل ہے اور ایک حسین لوچ ہے،
رقص کا پیہم سکوت، جیسے کوئی سوچ ہے !
جیسے سکوں پا گیا ایک حسیں اضطراب،
جیسے منظم ہوئیں،
جیسے مجسم ہوئیں،
ایک حسیں روپ میں سیکڑوں ہی بجلیاں - !!

آگ میں یہ کون چیز اس نے ابھی ڈال دی
آگئی ماحول میں ایک نئی زندگی
عنبریں ہوئیں اٹھے،
شعلے تیز ہو گئے،
چاندنی پہ چھا گئیں
نقرئی نیلاہٹیں —— !!

اور وہ تو جھک گئی - !
ریت پہ چلنے لگیں تھرتھراتی انگلیاں
جیسے کئی ناگنیں
ریت پہ بل کھا گئیں
جن پہ بکھرتی رہیں زلف کی پرچھائیاں - !!
شعلے بپھرتے رہے
اور وہی دائرے
اور تیز، اور تیز —— اور تیز ہو گئے
جیسے قلوپطرہ کی روح گھبرائی ہوئی
شعلوں پہ رقصندہ ہے
عیش و مستی کے لئے،
آگ میں تابندہ ہے
ایک ہستی کے لئے
جس کی محبت نہ وہ زندگی میں پا سکی —— !!!

کمال احمد صدیقی

۲ دو غزلیں

(۱)

بے بلائے ہوئے مہمان بیابانوں کے
ایسے بیٹھے ہیں کہ گھر ہی نہیں دیوانوں کے

دل کی لو ہے، کوئی اس لو میں جلے یا نہ جلے
شمع کیوں ناز اٹھانے لگی پروانوں کے

کہنے سننے کے طریقوں کا اثر کیا کہیئے
رخ بدلجاتے ہیں اک بات میں افسانوں کے

آنچ اٹھی، تن میں لگی، ساتھ چلی، گھر میں لگی
حوصلے سیر ہوئے سوختہ سامانوں کے

اب کہاں کشمکش ہوش و جنوں میں جائیں
خانہ بردوش گھروں کے نہ بیابانوں کے

قید میں جب سے کچھ آرام کی عادت ڈالی
اور بگڑے ہوئے تیور ہیں نگہبانوں کے

ہال میں سمجھا، مری کشتی ہی ڈبونا تھا ضرور
اب تو رخ پھیر دیئے جائینگے طوفانوں کے

اب رضا، خوئے وفا، پاس ادب، خودداری
چند فقرے ہیں بنائے ہوئے دیوانوں کے

سید آل رضا

(۲)

تلاش کون و مکاں ہے نہ لامکاں کی تلاش
یہ زندگی ہے غم عشق جاوداں کی تلاش

اسی زمین کو ہمیں آسماں بنانا ہے
ہمیں نہیں ہے کسی اور آسماں کی تلاش

خود آفتاب بھی کرتا ہو جس سے کسب ضیا
مری نظر کو ہے اس نور کہکشاں کی تلاش

تمام عشق و محبت۔ تمام حسن و جمال
حیات سود کی خواہش۔ نہ ہی زیاں کی تلاش

کسی کو منزل عشرت کا غم ہے۔ اور مجھے
ہوئی ہے منزل عشرت پہ کارواں کی تلاش

یہ خواب ہے کہ ہی تعبیر خواب اے غم دل
ہر اک قدم ہے یہاں۔ عمر رائیگاں کی تلاش

بہار لالہ و گل۔ برق بے اماں نکلی
کہاں کہاں نہ رہی۔ میرے آشیاں کی تلاش

ترے سوا مری آشفتگی کی دنیا میں
نہ راز دل ہی کوئی ہے۔ نہ رازداں کی تلاش

جو ہو سکے تو مرا غم ہی جاوداں ہو جائے
جمال مجھکو نہیں عیش جاوداں کی تلاش

مسعود اختر جمال

بھکاری

مانگ بھکاری، مانگ بھکاری
تیرے لئے ہے دنیا ساری

بن تیرا ہے، بستی تیری   تیری بلندی، پستی تیری
تیرا نور، اندھیرا تیرا   ہوش بھی تیرا، مستی تیری

تیرے لئے ہیں سب سنساری
تیرے لئے جگ اتیا چاری

تو آیا تو ہر کوئی آیا کوئی   پہلے تھی انہونی کی چھایا
تو نے آکے اٹھایا پردہ   تو نے آکے کھیل رچایا

تیرے ہیں یہ سب سنساری
مانگ بھکاری مانگ بھکاری

جو بھی روپ انوپ یہاں ہے   اُس میں تیرا ہی تو نشاں ہے
سچ بھی تیرا، جھوٹ بھی تیرا   جانے تیری تھاہ کہاں ہے

سوچ سوچ کر سُدھ بدھ ہاری
مانگ بھکاری مانگ بھکاری

مانگ جو لے تو اپنی بھکشا   مِٹ جائے پھر جگ کی بپتا
دیواستھان بنے یہ دھرتی   ہونی کا ہر قول ہے پورا

سب تیری مایا کے پجاری
مانگ بھکاری مانگ بھکاری

میراجی

دو غزلیں

(۱)

عقل و دانش! تیرے بیش و کم سے جی گھبرا گیا
تو نفی و اثبات "من دانم" سے جی گھبرا گیا

میں کہ سمجھا تھا تلاطم ہی کو ساحل کی نمود
سطحِ دریا! تیرے زیر و بم سے جی گھبرا گیا

زندگی کے قاعدے تھے زندگانی کے لئے
قاعدوں کے طرفہ پیچ و خم سے جی گھبرا گیا

ایک ہی قطرہ پہ مبنی تھی نمودِ گلستاں
جا بجا کی بارشِ شبنم سے جی گھبرا گیا

کثرت و قلت میں کچھ تخصیص ہونی چاہئے
خشک دامانیٔ چشمِ نم سے جی گھبرا گیا

گامزن یوں ہی مرے مقصود کا ہر قافلہ
دو گھڑی کو ہنس لئے جب غم سے جی گھبرا گیا

آجکل اختر نہ جانے کون سے عالم میں ہیں
ان کے اس اندازِ عالم سے جی گھبرا گیا

سید اختر عرفانی

(۲)

پڑتی ہے ذوقِ دید میں مشکل کبھی کبھی
ہوتا ہوں آپ اپنا مقابل کبھی کبھی

تیری طرف سے پرسشِ پیہم کے باوجود
مایوسِ زندگی سے ہوا دل کبھی کبھی

میں سعیٔ ناخدا کا یہاں تک ہوں معترف
مجھ کو ڈبو گیا غمِ ساحل کبھی کبھی

اُس کی امیدِ مرگ پہ تنقید کیا ضرور
جس کو شعورِ زیست ہو حاصل کبھی کبھی

ناپختہ کار ہے ابھی احساسِ گمرہی
ورنہ پکارتی مجھے منزل کبھی کبھی

زندانیٔ وفا کی خبر اس قدر تو ہے
آتی تو ہے صدائے سلاسل کبھی کبھی

کچھ بات ہے کہ انورِ آشفتہ سر بھی
ہوتا ہے بزمِ شعر میں شامل کبھی کبھی

بنتِ مریم

میں ترے جسم کا ہر تار جگا سکتا ہوں
میں تری روح کے نغمات نہیں گا سکتا
ایک ہی پل میں تری نیند اڑا سکتا ہوں
میں ترے خواب کی سرحد پہ نہیں جا سکتا

تمکنت، ناز، سیہ رنگاہوں کا جھکاؤ
کاش مریم کی جبیں اور درخشاں ہو جائے
یا تو اٹھ جائیں یہ بیگانہ روی کے پردے
یا تمدن کا یہی راز، نمایاں ہو جائے

سلسلے آج بھی زنجیر کے پائندہ ہیں
جاوداں آج بھی ہے آدم و حوا کا گناہ
رقص کر رقص کہ ابلیس کی پھر جیت ہوئی
دیکھ بیہوش ہے جنت میں فرشتوں کی سپاہ

اختر پیامی

شاعر کی دُعا

کس خطا پر یہ سزا دی ہے مجھے پروردگار
آہ میری طبع اور یہ جہل کا تاریک غار
ایسے نااہلوں کے نرغے میں ہے تخئیل حسیں
اک کرن جو علم کی برداشت کر سکتے نہیں
آہ! یا کیا ان کی نا اہلی سے گھبراتا ہوں میں
میرا دامن تھام پستی میں گرا جاتا ہوں میں
میرے گرد و پیش کڑوے تیل کے ٹھنڈے چراغ
روشنی دے ان کو، یا تاریک کر میرا دماغ
تیرگی چھائی ہوئی ہے صبح کر دے اے خدا
روشنی سے میری ان کو اک شرر دے، اے خدا
چڑھ کے دامن پر ہوئی جاتی ہیں مجھ سے ہمکنار
ان مکوڑوں سے بچا مجھ کو مرے پروردگار
رحم فرما رحم، شاعر کو نہ یوں برباد کر
جاہلوں کی قید صحبت سے مجھے آزاد کر

جلال ملیح آبادی

کرفیو

ترے پیغام پہ پیغام چلے آتے ہیں!
مری محبوب بتا کس طرح ملنے آؤں!!!

شہر میں پھوٹ پڑا ہندو و مسلم کا فساد
لگ گیا بیس دنوں کے لئے کرفیو آرڈر
شہر کی سڑکوں پہ شیطان مہذب غنڈے
موت کے روپ میں پھرتے ہیں چھپائے خنجر

وہی پُر امن زمیں آج بنی ہے دوزخ
جس کو کل رشکِ جناں کہتے تھے اپنے اجداد
وہی اک دوسرے کے خون کے اب پیاسے ہیں
جو کبھی مل کے سہا کرتے تھے ہر اک بیداد

آج انسانوں نے مذہب کا سہارا لے کر
امن کے عالی شکوہ قلعے پہ دھاوا بولا
یعنی بدبخت غلاموں نے بہ رغبت اب پھر
اجنبی حاکموں کے بوٹ کا "تسمہ کھولا"

میری محبوب، مرے عالمِ دل کی ملکہ
ایسے حالات میں میں تجھ سے نہیں مل سکتا
ایسے ماحول میں اے عالمِ دل کی رونق
غنچۂ شوق کسی طرح نہیں کھل سکتا

راج کنول

آبشار

انقلاب

ڈیڈ اسٹون

اللہ چھوڑیئے نا

جان ہے تو

[illegible]

وجاہت سندیلوی

انقلاب

(ایک ویرانہ۔ کچھ فاصلہ پر شہر کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں موسیقی کی غمناک صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ایک نوجوان آہستہ آہستہ ویرانے کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے اور رُک جاتا ہے۔ اس کے سامنے کئی راستے ہیں)

نوجوان۔ میں کہاں آگیا؟ کدھر؟۔

یہ کونسا ویرانہ ہے؟۔
یہ بیچ راستہ کس طرف جاتا ہے؟۔
یہ غمناک فضا کیسی ہے؟۔
اتفاقات کا بیٹا، حوادث کا شکار!
میں اس طرف کہاں آن پڑا؟
یہ دنیا مکر و فریب کی بستی ہے
یہاں ابلیس حکومت کرتا ہے
یہاں بھائی بھائی کا خون پیتا ہے
یہاں بیٹا ماں کی عزت کا سودا کرتا ہے
یہاں ہر گھڑی انسانیت کا خون ہوتا ہے۔
یہاں ہر قدم پر ایمان [illegible]
یہاں ہر کوئی کنجوس اور کنگال ہے۔
یہاں ہر ایک کی زندگی [illegible] کی میت ہے۔
یہ قصائی کی دکان ہے
یہاں انسانی گوشت [illegible] بکتا ہے۔
یہاں انسانی ہڈیوں کو [illegible] چڑھ چڑھ کر تہذیب و
تمدن کے رنگ [illegible]
یہاں مذہب کے نام پر قتل ہوتے ہیں۔
[illegible]

یہاں ہوس پرستی کا نام محبت.
یہاں درندوں کا نام انسان ہے۔
یہاں ہر شے پر ملکیت کا قفل ہے۔
اور ہر قفل کی کنجی نفرت اور خود غرضی ہے
یہاں آنکھیں اندھی
کان بہرے
اور دماغ ماؤف ہیں
یہاں زندہ رہنے کے لئے صرف
ننگی ہوس کی ضرورت ہے۔
یہاں محبت ایک کمزوری
اور ایمانداری ایک بیماری ہے
یہ کیوں ہے؟ یہ کیسے ہے؟
یہ کیا اندھیر ہے؟
کیا خدا نے خدائی چھوڑ دی؟
یا اُسے شیطان کے ہاتھوں بیچ ڈالا؟
یہ اندھی لڑائی
یہ خون کی جھوٹی پیاس
یہ کیوں ہے۔ کیسے ہے؟
زندگی کے لئے؟
اور زندگی کیا ہے؟
کتنی سستی اور کتنی ذلیل؟
ایک تاریکی سے دوسری تاریکی کے [illegible]
چند قہقہے اور چند سسکیاں!
[illegible]

جس کی منزل کا نہ کوئی پتہ ہے نہ دوست!

مسافر منتشر اور گم کردہ راہ ہیں۔

ایک ہم سفر دوسرے کو لوٹ رہا ہے۔

اور ایک اپنے خون سے دوسرے کو [illegible] رہا ہے۔

یہ دنیا! اس کمینی اور پاگل دنیا میں

میں جاؤں کدھر!

(ساری فضا پر خاموشی چھا جاتی ہے، دفعتاً پیچھے ہلکے ہلکے

اور پھر بہت زور سے طرب ناک نغمے بلند ہوتے ہیں —

یک بیک ایک چھنک کے ساتھ ایک نیم عریاں حسینہ انتہائی

والہانہ انداز میں ناچتی ہوئی اسٹیج پر آ جاتی ہے۔ کچھ دیر تک

وہ بڑے عشوہ و ادا سے ناچتی رہتی ہے، اور پھر

نوجوان کو دیکھ کر رک جاتی ہے)

مستی۔ حیرت سے مخاطب کرتے ہوئے

یہ کون مسافر ہے بے مقام ہے؟

نوجوان۔ میں ہوں ایک مسافر گم کردہ راہ!

مستی۔ تو گم کردہ راہ تو کس دنیا کا باشندہ ہے؟

تو کس کی تلاش میں ہے؟

تیری وحشی آنکھیں کیا ڈھونڈھتی ہیں؟

مجھے تیری جوانی پر رحم آتا ہے

تو کیوں اس [illegible] کے پھیر میں ہے

فکر و تدبر کے [illegible] ہیں

جا [illegible] مستی کے [illegible] میں غرق ہو جا۔

تیری شدید [illegible] کا یہی علاج ہے

[illegible] حسن کی [illegible]

تو کب تک [illegible] ستاتا رہیگا؟

[illegible] تیرا [illegible]

دل دھڑکتا رہیگا

لیکن [illegible] دل دھڑکیگا

تو [illegible]

[illegible]

جوانی کا [illegible] ہے۔

چاند چاندنی سے کیوں نہ شوخ خیال کو لہو سے چمٹا لے۔

جوانی سرکش [illegible]

اور [illegible]

[illegible]

کسی کے سینے کی [illegible] میں پھینک دے

تیرے مشغوں کی یہ تلخی

کسی کے لب شیریں سے ٹھیک ہو جائیگی

تیرے سینے میں جوانی کی [illegible] ہے۔

[illegible] ہے۔

تیری آواز کی یہ کرختگی

بلوری جام کی کھنک میں گم ہو جائیگی۔

تیرے سینے کی [illegible]

کسی کے عارض گلگوں سے [illegible] ہو جائیگی

تیرا سر [illegible] نہیں۔

کسی کے زانوں پر [illegible] کے لئے ہے۔

تیری کڑکتی ہوئی جوانی [illegible]

[illegible]

[illegible] شیاں

مجھے دیکھ [illegible]

(حسینہ رقص کرنے لگتی ہے اور نوجوان [illegible] ہوتا ہے

[illegible] جاتی ہے)

نوجوان۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

تیری [illegible] کی سسکیاں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تو دل [illegible]

[illegible]

تو دل [illegible]

دماغ کے انگاروں کو ٹھنڈا کرتی ہے۔
تو ایک گم کردہ راہ مسافر کو
شباب کی پُر خطر وادی میں لوٹنا چاہتی ہے؟
تو ہمیں حسن و عشق کے سبز باغ دکھا کر
ہمیشہ کے لئے قعرِ ذلت میں جھونکنا چاہتی ہے؟

تو ہمیں رنگ و بو کے فریب میں مبتلا کر کے
ہم سے ہماری زندگی کا جوہر چھیننا چاہتی ہے۔
تو ہمیں کمزور بنا کر
ذلیل و رسوا کرنا چاہتی ہے۔
مجھے تیری وہ شراب نہیں چاہئے
جس میں کسی کے خون کی بو آتی ہے
مجھے دوشیزاؤں کے وہ بوسے نہیں چاہئے
جن میں کچے گوشت کی بساندھ ہے
لعنت ہے اس محبت پر
جس کی نفرت نے آبیاری کی ہے
لعنت ہے اس عیش و عشرت پر
جس کی قیمت چند سکے ہیں۔

(غم ناک نغمے بلند ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ دھیمے ہونے لگتے ہیں حسینہ سر جھکائے آہستہ آہستہ جاتی ہے اور تاریکی چھانے لگتی ہے۔ دفعتاً ایک دھماکے کے ساتھ نغمات بلند ہوتے ہیں۔ روشنی تیز ہو جاتی ہے اور روپیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ زرنگار کپڑے پہنے ہوئے ایک موٹی سی بھدی عورت بڑے غرور اور تمکنت سے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے جسم پر زر و جواہر کے زیورات اور ہار ہیں)۔

دولت۔ آ! اے بھٹکتے ہوئے مسافر!
میں تجھے راستہ دکھا دوں
معدہ خالی ہوتا ہے
تو دماغ بہکنے لگتا ہے۔
میں دولت ہوں دولت!

خدا کی خدائی میں نے خرید لی ہے۔
میں بحر و بر کی ملکہ ہوں
میرا ہر اشارہ قانون
میرا ہر لفظ فرمان ہے
عزت میری ٹھوکر میں
تہذیب میری لونڈی ہے
اور مذہب میرا دربان ہے
عقل میری محتاج
علم میرا بھکاری
اور شرافت میری دست نگر ہے۔
میں جاہل کو عالم بناتی ہوں
اور عالم کو جاہل
میں احمقوں کو عنانِ حکومت سونپ دیتی ہوں
اور پاگلوں کو مختارِ کل بنا دیتی ہوں
میں پارسا کو بوالہوس
اور فرشتے کو شیطان بناتی ہوں
میرے حکم سے باپ بیٹے کو قتل کرتا ہے۔
اور میرے فرمان سے بیٹا ماں کی عزت لیتا ہے۔
میرے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔
میں ہر ناممکن کو ممکن بناتی ہوں
میں جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوں
تو وہ شرم سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیتی ہے
میں مردوں کو زندگی بخشتی ہوں
اور زندوں کی زندگی سلب کر لیتی ہوں
موت اور زندگی میرے کھیل ہیں
وہ میری ٹھوکروں میں چلتے ہیں
میرے ماتھے کی ایک شکن
سیکڑوں ملکوں کو قحط کا شکار بنا سکتی ہے۔
میرے منھ سے نکلا ہوا ایک لفظ
ساری دنیا کو جنگ کے شعلوں میں جھونک سکتا ہے۔
میں دولت ہوں دولت!۔

یہاں ہر چیز کی ایک قیمت ہے
اور کون سی چیز ہے جس کی قیمت میں نہیں ادا کر سکتی؟
میں تریاق کو زہر
اور زہر کو تریاق بناتی ہوں
میں پہاڑوں کو سمندر
اور سمندروں کو پہاڑ بنا سکتی ہوں۔
ہا ہا ہا ہا ہا (قہقہہ) ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ——)
میری فتح و نصرت کا چار دانگ ڈنکا پٹ رہا ہے۔
میری فتوحات سے آسمان بھی محفوظ نہیں۔
ہا ہا ہا ہا ہا ہا (قہقہہ) ہا ہا ہا ہا ہا ہا ——)
اس دنیا کے وحشیوں کو میں نے مہذب بنایا ہے!
تہذیب میں نے بنائی ہے، تمدن میں نے بنایا ہے!
حکومت میں نے بنائی ہے سلطنت میں نے بنائی ہے!
یہ سارا نظامِ کائنات میں نے بنایا ہے!
کیا تو اندھا ہے؟ کیا تو بہرا ہے؟
میں اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان بھی دیتی ہوں!
کیا تو نہیں سنتا؟ کیا تو نہیں دیکھتا؟
آتا ہو تو آ۔
میرے قصر کے پھاٹک بار بار نہیں کھلتے۔

نوجوان ۔ خاموش! کب تک یہ اپنی شیخی خراش ڈینگ
ہانکتی رہیگی۔
بس کر! اے ام الخبائث بس کر!
تجھے یہ شیخیاں مارتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی؟
کیا تیرا نامۂ اعمال تیرے پیش نظر نہیں۔
کسان کا وحشتناک چہرہ دیکھ
تیرے صدیوں کے مظالم کی تاریخ
اس پر جلی حرفوں سے کندہ ہے۔
کمر شکستہ اور ستم یافتہ مزدور کو دیکھ
اس کے گلشن ہستی کو کس نے تاراج کیا؟
تیرے طلائی سکوں کی جھنکار میں
آج پوری انسانیت چیخ رہی ہے

ان یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کو دیکھ!
ان خانماں برباد قافلوں کو دیکھ!
اس ننگی اور بھوکی مخلوق کو دیکھ!
آہ! یہ بھی کبھی انسان تھے!
یہ جنگ کے شعلے اور قحط کے سیلاب دیکھ!
یہ زخمی کراہتی ہوئی دنیا دیکھ!
آج ساری انسانیت کی گردن
تیرے آہنی چنگلوں میں ہے
تیرے طوفان کی رو میں ہر مفلس کا نشیمن ہے۔
اور تیری بجلی کی زد میں ہر دہقان کا خرمن ہے۔
تونے کروروں بچوں کی گردنیں مروڑ دیں
اور تونے کروروں نوجوانوں کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔
تونے معصوم انسانوں کو چور و قاتل بنایا!
تونے اچھوتی دوشیزاؤں کو عصمت فروش بنایا!
تیری تہذیب چھین جھپٹ اور لوٹ مار
تیرا آئین ضمیر فروشی اور تملق
تیرا مسلک مردم آزاری اور مردم خوری
تیرا مذہب سب و شتم اور جبر و ظلم ہے۔
کمزوروں کے خون سے تونے اپنے نغمے تر کئے۔
اور انسانی ہڈیوں کے ساز پر تونے اپنے نغمے بلند کئے
تونے انسان کی انسانیت کا ستیاناس کیا۔
اور اس کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیا
تونے ماؤں کی گودوں سے بچے چھین لئے۔
اور تونے بھرے چنے گھروں میں آگ لگا دی۔
تونے انسان کی حیثیت اور غیرت چھین لی۔
تونے علم کا تاج عقل کی تلوار چرالی
تونے لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کو روند ڈالا
اور تونے کلیوں کو پھول بننے سے پہلے مسل ڈالا۔
تونے اس مقدس سرزمین کو
جو اطمینان اور آسودگی کا
ترقی اور تعمیر کا

گہوارہ بننے والی ہے
جہنم سے بھی بدتر ہے
اور کائنات کے اس عجیب طلسم کدے میں
خون کے دریا اس آگ کے پہاڑ بنا ہے
یہاں کے نغموں اور قہقہوں کو
چیخوں اور سسکیوں میں تبدیل کیا ہے
اُف! تیری سفاکیاں ناقابلِ بیان ہیں!
جا! جا! اپنے قصر میں منہ چھپا لے
قبل اس کے کہ وہ مفلس ترین ہو جائے!

(سناٹا چھا جاتا ہے اور پھر بے پناہ شوروں کے درمیان سے غصے سے قدم بڑھاتی ہوئی عورت واپس جاتی ہے۔ روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی خاموشی کے بعد صرف ایک ہلکا سا ساز بلند ہوتا ہے۔ پھر گھنگھروؤں کے بجنے کی آواز آتی ہے اور ایک بہت سن رسیدہ بزرگ گیروے کپڑے پہنے ہے نمودار ہوتا ہے)

درویش۔ میں پہچان گیا۔ میں پہچان گیا!
میں نے تیرے سوال کی آواز سن لی
تیری روح اس دنیا کی بھول بھلیوں میں
بھٹکتی پھر رہی ہے
تیرے نفس کی تربیت کی
اور تیری روح کو سکون کی ضرورت ہے۔
آ۔ اے نوجوان میں تجھے اپنی خانقاہ میں لے چلوں
اور میں تجھے سب سے اونچے منبر و محراب پر بٹھا دوں
پھر یہ دنیا کیا چیز ہے
وہ دنیا بھی تیری ہے
عرش تیرا ہے! خدا تیرا ہے!
یہ دنیا ایک دھوکہ ہے
طاقت ایک نشہ ہے
اور دولت ایک سراب
تو ان مکروہات کی خاطر
اپنا خون پانی نہ کر۔
دنیا ہمیشہ سے ایسی ہی تھی جیسی کہ اب ہے
اور دنیا ہمیشہ ایسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے۔
اس کے خمیر میں نراج اور بدی ہے
اس کے آب و گل کی خاصیتیں بدلی نہیں جا سکتیں۔
تو سمندر میں قطرہ بن
تو قطرہ سے سمندر پیدا کر دے
آ۔ اس دنیا کو ٹھکرا کر میرے ساتھ آ
میں تجھے جنت کے لازوال گلستان میں لے چلوں گا۔
اپنی قیمتی زندگی یوں بے وجہ نہ گنوا
یہاں کے کھوٹے سکوں پر مت بک
آ اور شراب معرفت کے بحر بیکراں میں غرق ہو جا!
تصوف کے دل فریب پیچ و خم میں گم ہو جا!
یہ دنیا کے مکر و فریب تیرے لئے نہیں ہے
اس سے دامن جھٹک کر علیحدہ ہو جا۔
اس کے ٹمٹماتے ہوئے ظاہری چراغ بجھا دے
اور ان کے بدلے اپنے دل کا آفتاب طلوع کر لے۔

نوجوان۔ سب قزاق ایک ہی کمین گاہ میں بیٹھے ہیں؟
تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو پیرِ خرف؟
میں تمھاری منزل سے دور نکل چکا۔
بہت دور!
تم مجھے عقل و خرد کے وسیع سبزہ زاروں سے
اوہام و روایات کی گندی گلیوں میں واپس لیجانا چاہتے ہو؟
تم میرے تدبر اور تفکر کو مفلوج بنانا چاہتے ہو؟
اور مجھے تقلید اور تعصب کی زنجیریں پہنانا چاہتے ہو؟
یہ دنیا عارضی اور بے حقیقت سہی
لیکن ہم لوگوں کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔
تم ایک عبرتناک غلط فہمی میں مبتلا ہو بڑے میاں!
تم نے دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے بعد
مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دیا ہے
تم زمانہ کے طوفانی دھاروں سے علیحدہ ہو کر
الگ اپنا ایک چھوٹا سا تالاب بنانا چاہتے ہو!

پھسلنی بھول ہے۔
تم ہوس آلائشات کی دلدل سے بھاگنا چاہتے ہو
لیکن اگرچہ تم نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا رکھا ہے
تم اس دلدل میں اور بھی زیادہ دھنستے چلے جا رہے ہو
تمھارے تصوف کا پیچ و خم
زلف پیچاں کا صرف دوسرا سلسلہ ہے
دنیا دوسروں کو دھوکا دیتی ہے
لیکن تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو
تم نفس کی تربیت نہیں کرتے
تم اس کو اور موٹا کر رہے ہو
تم روح کو [illegible] نہیں پہنچاتے
تم اسے موت کی نیند سلانا چاہتے ہو
تم زندگی کی جیتی جاگتی حقیقت سے منہ چھپا کر
اپنی گھڑی کھلی اور خیالی جنت میں کھو جانا چاہتے ہو
اسے حس و حرکت کی ضرورت نہیں
تم خدا کو راحت کا تمنائی سمجھتے ہو
اسے ترقی اور تعمیر کی خواہش نہیں
تم نے اپنے خدا کو بھی
اپنا ہی سا خود غرض سمجھ رکھا ہے
جو دنیا کی بہتری سے آنکھیں بند کر کے
صرف اپنی تعریف و توصیف سننا چاہتا ہے
تم عاقبت کے خواب دیکھ دیکھ کر
جدوجہد اور کشمکش سے بھاگنا چاہتے ہو
تم ایک بزدل مفرور ہو
تم ایک ہارے ہوئے جواری ہو
تم ایک اندھے خریدار ہو

(بڈھا اپنی داڑھی پکڑے ہوئے [illegible]
ہلکے ہلکے غمناک نغمے بلند ہوتے ہیں، ہر طرف تاریکی
چھانے لگتی ہے۔ پھر دفعتاً ایک طویل اور مہیب گرج
سنائی دیتی ہے۔ گڑگڑاہٹ ایک دم سے بہت تیز
زوردار اور بڑھتے ہوئے نغمات بلند ہوتے ہیں، جیسے
کوئی فوج آ رہی ہے۔ جوش کی تیز موسیقی سے نغمات بلند
بند ہو جاتے ہیں، کانوں اور منہ پر [illegible]
ایک قد آور مرد [illegible] چڑھا ہے
آستینیں الٹی ہوئی ہیں، سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے
اور پریشان ہیں)۔

انقلاب ۔ تو سب کی پکار سن چکا۔
اب میری پکار بھی سن
میری آواز میں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
اور میری کڑک سے [illegible]
میں خون کے سمندر سے نکلتا ہوں
اور آگ کے پہاڑ پر چڑھتا ہوں
میں آندھی ہوں، طوفان۔ بغاوت۔ انقلاب
میری آنکھوں میں انتقام کی وحشت ہے
میں سینہ تانے [illegible]
مرنے یا مارنے کے لئے نکلا ہوں
میں شباب کی سرمستیوں میں
آگ اور خون سے کھیلنا چاہتا ہوں
میں شمشیر بکف، کفن بردوش [illegible]
میں جان لیتا ہوں یا جان دیتا ہوں
میری چاپ سے [illegible]
میری ٹھوکر سے تخت و تاج الٹ جاتے ہیں
میری ہیبت سے زمانہ لرزتا ہے
میں نظام عالم کا جنازہ [illegible]
میں کبھی معاف نہیں کرتا
میرا ہر نفس شعلہ ہے
اور میری ہر نظر بجلی ہے
وہ زمانہ گیا، جب میں [illegible]
یا صرف چند حساس انسانوں کے دماغوں میں بند تھا
اور میرے دشمن مجھے مسخرہ سمجھتے تھے
اب طوفانوں اور زلزلوں کی [illegible]
میں مردانہ وار میدان میں کودتا ہوں

[illegible] کی طرح اٹھا ہوں۔
[illegible] بھاگ رہی
اے [illegible] سرد اگر تیرے دل میں ہمت
اور طاقت
اور [illegible] حوصلہ ہے
تو میرے ساتھ آ
میں آزادی اور مساوات کا سرخ پرچم لیکر نکلا ہوں
میں تاج کو [illegible] ٹھوکر [illegible] دوں گا
میں [illegible] کو تباہ ختم کر دوں گا
میں دولت کی تقسیم بند کر دوں گا۔
میں کسانوں کے سر چڑھے ہوئے [illegible]
اور مزدور کی [illegible] کا [illegible] ہوں
میں اس پرانی دنیا
اس ناانصافی اور بے ایمانی کی دنیا کی
اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔
یہ جاگیرداری اور سرمایہ داری!
یہ ہوس [illegible] اور خود مختاری!
میں انتہائی سفاکی ہے۔
ان کی گردنیں مروڑ دوں گا
میں ان کا نام و نشان تک باقی رکھنا نہیں چاہتا۔
میں آمریت کے دیو کو
خود اس کے خون میں غرق کر دوں گا۔
میں انصاف ہوں انصاف!
میں دنیا کے ذرے ذرے کو
ذاتی ملکیت کے خونخوار پنجوں سے نکال کر
عوام الناس کا سرمایہ بناؤں گا۔
میں تنگ نظری کی ذہنی بیماریوں کو
نئی فکر سے یکلخت دور کر دوں گا۔
میں ان فرقہ وارانہ مناقشات کے زہر کو
محبت اور اخوت کے تریاق سے ختم کر دوں گا
میں ان مذہبی ولولوں کو

[illegible] کشت و خون [illegible]!
[illegible] کی [illegible] سے
[illegible] نکال دوں گا۔
کون ہے جو میرا راستہ روک سکے!
کس کی مجال ہے جو مجھے ٹوک دے
میں خون کا پیاسا نہیں
میں قتل و غارتگری کا دلدادہ نہیں
میں امن کا علمبردار ہوں!
لیکن اگر میرا راستہ روکا گیا
مجھے کشت و خون سے دھمکایا گیا
تو پھر میں ان گیدڑ بھبکیوں میں نہ آؤں گا۔
دنیا کے کشت و خون کے سدباب کے لئے
میں کشت و خون کا ایک طوفان نوح لاؤں گا۔
اور خون کے اس طوفان میں
انسان کی تمام کمزوریوں کو غرق کر دوں گا۔
پھر میں ایک نیا سنسار بناؤں گا۔
ایک نئی دنیا بساؤں گا
جس کی بنیاد امن اور مساوات پر ہوگی
اور جس کا خدا خود انسان ہوگا
جس میں انسان انسانوں کی طرح رہیں گے
جس میں خود غرضی اور مکاری نہ ہوگی۔
انسانوں کی ایک یکساں برادری ہوگی
جس کی اخوت اور محبت بے پناہ ہوگی۔
تیرے اور میرے کے جھگڑے نہ ہوں گے
سب کچھ تیرا اور سب کچھ میرا ہوگا۔
انسان آزاد ہوگا! آزاد
صدیوں کی غلامی کے بعد آزاد
جسمانی زنجیروں سے آزاد
ذہنی قید و بند سے آزاد
ضرورت اور احتیاج سے آزاد
بیماری اور جہالت سے آزاد

اس اچھی دنیا کی ہر انسان
ایک جوہر یکتا ہوگا
جس ایک سچے موتی کے بیش بہا اور دیدہ زیب۔
جس کی قدر و قیمت اور خوشنمائی
اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر
دو چند اور سہ چند ہو جاتی ہے
انسانیت کا شیرازہ منظم اور مستحکم ہوگا
اور انسانوں کی لازوال مسرتوں کا ضامن ہوگا
(سرمستی ناچتی ہوئی آتی ہے اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔
سرمستی - بس بس تو نے میرے کان پکا دیئے۔
تو نوجوانوں کو حسن و عشق کی وادیوں سے
اغوا کر لے جانے پر تلا ہوا ہے۔
تو انقلاب و بغاوت کے تھپیڑوں سے
ان کے سروں کو چکنا چور کر دینا چاہتا ہے۔
تو دو شیزاؤں کی داد طلب نگاہیں نہیں دیکھتا۔
کیا وہ یوں ہی مایوس پلٹ جائیں گی؟
نوجوانی کے پگھلتے ہوئے موم سے
فولاد بنانا چاہتا ہے؟
جوانی سرمستی کے لئے ہے
اور سرمستی جوانی کے لئے
تو نوجوانوں کو ان ہی کے حال پر چھوڑ دے
ان کی فطرت کے تقاضوں کو مت کچل!
گلشن حسن و عشق کی بہار سے خزاں کو
پامال کر ڈالنے کا خیال خام چھوڑ دے!
تو زندگی کے رشتۂ ارتباط کو
اپنے کرخت ہاتھوں سے کب تک توڑتا رہیگا!
تو وحشی ہے!
تو باغی ہے!
تیرا انسانوں کی بستی میں کام نہیں!
انقلاب - کون بکتا ہے کہ میں حسن و عشق کا دشمن ہوں

میں حسن کو حسن واقعی
اور عشق کو عشق صادق بنانا چاہتا ہوں
اس وقت تیرا حسن محتاج ہے
تیرا عشق مجبور ہے
انقلاب ہی اس محتاجی اور مجبوری کو ختم کر سکتا ہے۔
انقلاب سب سے بڑا حسن کار ہے!
میں حسینوں کو واقعی حسین بنانا چاہتا ہوں
جن کی قیمت صرف چند ٹکے اور اندھیری رات نہ ہوں
میں خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوں
تاکہ وہاں حسین کلیاں مسکرا سکیں۔
کیا کسان کی بیٹی حسین نہیں؟
کیا مزدور کی بیٹی دل کش نہیں؟
آہ حسن کے نرم و نازک سینے پر
مجبوری اور بیچارگی کے پتھر کی سل ہے
میں عشق کو بوالہوسی کی گندگی سے نکال کر
ایک جذبۂ خود دار بنانا چاہتا ہوں
سرمستیاں سرمستوں کے لئے ہیں
لیکن اس وقت نہیں
جب جنگ گھمسان ہو
اور مورچہ سخت
آج نوجوانوں کے خون کی
تیرے شبستانوں میں ضرورت نہیں
آج ان کے خون کی
میدان جنگ میں ضرورت ہے
تو اپنی زبان بند کر
تو سرمایہ داری کی داشتہ ہے
تو نوجوانوں کو سبز باغ دکھا کر
ان کو غداری پر مجبور کرتی ہے!
(سرمستی ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے، اور نغموں کے درمیان بڑے غصے سے دولت بڑھتی ہے)
دولت - سُن! اے انقلاب کے بچے سن!

تو پاگل ہے - تو سودائی ہے!
تو جس سرپھرے کا خلیفہ بلا ہے
تو انصاف و مساوات کے لیے [illegible] ہے
اپنے سے تجھی اور خون آشامی چھپایا جاتا ہے
تو انسانیت کے جسم پر پھیلا ہوا کوڑھ ہے
تو تہذیب کا دشمن ہے
تو سر پھری وحشت ہے
تو بدنما انتقام ہے
تیرا ہر قدم تخریب کا پیغام ہے
تیرا ہر سانس تعمیر کے منافی ہے
تو آگ بھڑکاتا ہے
لیکن اس کو بجھانا نہیں جانتا!
تو نہیں جانتا کہ تیری یہ جلائی ہوئی آگ
ایک روز خود تجھے بھی بھسم کر دے گی۔
اور اس وقت تیری کچلی ہوئی انسانیت
امن اور اطمینان کا سانس لے گی

انقلاب - کہے جا! کہے جا!
تیری یہ ہوس بھی پوری ہو جائے گی
میں پاگل ہوں - میں سودائی ہوں
کیونکہ میں تیری طرح ریاکار اور مکار نہیں
میں بھوکے پیٹ اور ننگے جسم کی آواز ہوں۔
میں کسان کی امید اور مزدور کی ڈھارس ہوں۔
میں بے رحم ہوں اور خون آشام ہوں؟
رحم اور تیرے لیے؟
ہاں، میں خون آشام ہوں
میں خون بہاتا ہوں
لیکن سماج کا خون فاسد!
جس نے انسانیت کے تمام جسم میں
خود غرضی اور مکاری کا زہر پھیلا دیا ہے
اور جو بغیر میرے نشتر کے نہیں نکل سکتا!
میں خون فاسد بہاتا ہوں

اور تو خون دل! [illegible]
میرے بہائے ہوئے خون سے [illegible]
نہ جانے کتنے چشمے بہتے ہیں [illegible]
اور تیرے بہائے ہوئے خون [illegible]
ہلاکت کے [illegible]
میں تہذیب کا دشمن ہوں؟
تہذیب اور تیری تہذیب [illegible]
تو تعلیم دے ٹکڑوں کی تہذیب
میں بدنما انتقام ہوں!
ہاں تیری اندھی لوٹ کے لیے
میں تخریب کا پیغام ہوں
ہاں اس تعمیر کے لیے جو کہ تو نے بنائی ہے
اور جس کی بنیادوں کے نیچے
کروڑوں انسانوں کی ہڈیاں دبی پڑی ہیں
دبے کچلے ہوئے، چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں
تو کتوں کی طرح بھونکے گی
لیکن میرا قافلہ آگے بڑھتا ہی جائے گا
آج تو تہذیب کی محافظ بنتی ہے!
آج تو تمدن کی دعویدار ہے؟
مکاری کی بھی کوئی انتہا ہونی چاہیے
کسانوں کے لیے کونسی تہذیب تھی
مزدوروں کے لیے کونسا تمدن تھا
کسان نے زمین سے سونا اگلوایا
ساری دنیا [illegible]
لیکن خود ایک پیسے کو ترس گیا
مزدور نے تیرے لیے کیا نہیں کیا؟
تیرے لیے شاندار [illegible]
لیکن خود ننگا اور بھوکا رہا۔
بس۔ بس زبان سنبھال!
وقت کے تقاضے کے ساتھ [illegible]
[illegible]

[illegible]

ہاں مجھے تیرے خون کی ضرورت ہے

مظلوموں کی آہ و بکا کے درمیان

میں گرجتا، گونجتا، اٹھتا، بڑھتا چلا آ رہا ہوں

تم مجھے روک نہیں سکتے

مجھے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی

میں جب کسانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوں

تو جوش انتقام سے

ان میں سے چنگاریاں نکل پڑتی ہیں۔

جب میں مزدوروں کے بازوؤں کو مس کرتا ہوں

تو ان سے غصے کے شعلے نکل پڑتے ہیں۔

[illegible] کارواں دیکھ!

کیا یہ بپھرا ہوا سمندر

اب روکنے سے رک سکتا ہے؟

(مستی کے پاس [illegible] دولت کھڑی ہو جاتی ہے - درویش آگے بڑھتا ہے۔)

درویش - تیری زبان بے لگام نے

مجھ کو بھی نہیں چھوڑا

تو خدا کی لعنت ہے

تو شیطان کی تخلیق ہے

تو کفر ہے تو الحاد ہے!

تو ایک ذہنی طاعون ہے!

جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے

[illegible] منتظر ہیں۔

تو خدا کی خدائی میں مخل ہونا چاہتا ہے؟

میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا!

نہیں، ہو سکتا! نہیں ہو سکتا!

انقلاب - خاموش! تم اپنا پھٹا ہوا بوریا بستر

آسانی سے نہیں اٹھاؤ گے

وہ دن گئے جب سادہ لوح انسانوں کو

تم سلا کر آسانی سے گمراہ کر سکتے

اب باشعور انسان آ رہا ہے

جو خود اپنی قسمت کا مالک ہوگا

اور خود اپنی دنیا بنائے گا

سرمایہ داری کی سازش میں

تم بہت دن شریک رہے ہو

اب وقت آ گیا ہے کہ تم

اس کے انجام میں شریک ہو۔

جب مظلوموں کی ننگی پیٹھوں پر

ظلم و ستم کے تازیانے برس رہے تھے۔

اس وقت تم کہاں تھے؟

تمہارے حلق میں کیوں پھندا پڑ گیا تھا۔

جب کسان اپنی مصیبتوں سے نیم جان تھا

تو تمہاری خانقاہوں میں رنگ محفل جما ہوا تھا۔

جب مزدور اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا

تو تمہارے منبر و محراب گونگے اور بہرے تھے!

تم نے اپنی گندی اور ناپاک حرکتوں سے

اپنے نیک اور پیغمبروں کو بدنام کیا۔

تم نے مذہب کے نام پر قتل و غارتگری کی۔

اور بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنایا۔

تم نے انسانی عقل کے ارتقا کو

اس کے فطری نشو و نما سے باز رکھا

تم نے عقل کے انگاروں کو

ایمان کے پانی سے بجھا دیا۔

تم نے انسان کی سب سے بڑی توہین کی

تم نے خدا کو بندہ بنا دیا۔

اور اسے اپنی فرضی چار دیواری میں محصور کر کے

اس پر اوہام کے پہرے بٹھا دیئے۔

(مستی اور دولت کی صفوں میں درویش بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ نوجوان آگے بڑھتا ہے۔ جنگی نغمات بلند ہوتے ہیں)

نوجوان - میرے رہبر!

تم نے مجھے تاریکی سے روشنی میں لا کر کھڑا کر دیا۔

کے اپنی منزلِ مقصود کا پتہ مل گیا !
چلو اب دیر ہو رہی ہے۔
ظلمات کی تاریکیاں پھیلا رہی ہیں۔
انقلاب - آ میرے رفیق !

راستہ ناہموار ہے
اور منزل دور !
لیکن ہمارا عزم مستقل
ہماری ہمت لامحدود
ہمارے قدم اٹل
اور ہماری کامیابی یقینی ہے
ہمارے دشمن کمین گاہوں میں ہیں۔
لیکن ان کی موت ان کی منتظر ہے۔
بڑھو بہادر سپاہی آگے بڑھو
ایک انقلابی کی پوری شان سے
ہم سمندروں کو روندتے
اور پہاڑوں کو ٹھکراتے آگے بڑھیں گے
تلوار بے نیام کرو
اور سینہ تان لو
جنگ گھمسان ہے
اور مورچہ سخت
کود دو، اس آگ کی بھٹی میں کود دو
انقلاب کے لئے سر کٹانا ہی
سر کٹانے کا انعام ہے۔
بڑھو ! میرے تند جوان آگے بڑھو !
اور بے لوث قربانی کے جوہر دکھاؤ

(نوجوان انقلاب کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ جنگی محاذ بہت زوروں سے بجتا ہے۔ سرمستی، دولت اور بے فکری سراسیمہ نظر آتے ہیں۔ جنگی ترانوں کے درمیان ہر جانب سے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔)

(پردہ)

قدوس صہبائی

ڈیڈ اسٹون

چاروں یاروں میں اختر سب سے کم سِن اور سب سے معصوم تھا، اور باقی تین چھٹے پھٹائے گھاگ! نریندر،
بابولال اور کامل

اختر ریلوے آڈٹ آفس میں اسٹینوگرافر تھا۔ نریندر اور کامل انفارمیشن فلمس میں روزگار سے لگے ہوئے تھے اور
بابولال آل انڈیا ریڈیو میں۔ اختر شاعر تھا مگر آجکل کا شاعر، شاعر یعنی وہ ترقی پسند شاعر تھا، ایسا ترقی پسند جو ہمیشہ
آزاد نظمیں لکھتا۔ جن کا ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ سے کبھی وزن اور بحر میں برابر اور متوازن نہ ہونے پاتے۔ کامل
افسانہ نگار تھا، اور بابولال سے دوستی کی بنا پر اس کے افسانے اچھے ہوں یا بُرے سب رسالے چھاپتے تھے۔ نریندر
محض پاٹی تھا نہ شاعر نہ ادیب بس رئیس کا شوقین اور بابولال ان سب کا سرغنہ۔ اور اختر کے سوا سب نے سب رئیس کر رکھا۔
چاروں ایک کمرے میں رہتے، بابولال کے دوست بہت تھے، لڑکے بھی لڑکیاں بھی۔ وہ ان میں سے اکثر کے نام
فلمی گانوں کی فرمائش کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو سے دریافت کرتا۔ کامل کو عشق کرنے کا شوق تھا۔ نریندر اچھے کپڑے پہنکر
اپنے اوپر کسی پری جمال کو عاشق کرانے کی فکر میں رہتا۔ اور اختر محض بدھو سمجھا جاتا، حالانکہ کبھی کبھی اس کی بے تکی نظمیں سب
پسند کرتے اور بابولال ریڈیو پر بھی پڑھوا دیتا۔ جب سب اکٹھے ہوتے اور عموماً رات کو اکٹھے ہوا کرتے تو پسندیدہ موضوع لڑکیوں
کا تذکرہ ہوتا۔ بابولال ایک اکسپرٹ کی طرح نریندر کو سبق پڑھاتا، کامل اپنے تازہ عشق کا افسانہ سناتا اور اختر سب کی سنتا
اور کچھ نہ بولتا۔ البتہ جب سب موڈ میں ہوتے تو اس کی کوئی نظم سنی جاتی۔

مگر رات دن لڑکیوں کا تذکرہ سُن سُن کر اس کا دل بھی چاہنے لگا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے باتیں کرے۔ اس کے ساتھ
تفریح کرے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبائے، اس کے ریشمی بالوں کو اپنے ہاتھوں سے الجھائے اور سلجھائے، اسے
سینے سے لگائے ——— اور ...... یہ تاثرات اس کی نظموں میں نظر آتے تھے، مگر اسے باہر کسی لڑکی کی طرف
دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی اور دُزدیدہ نگاہوں سے شیواجی پارک سے آڈٹ آفس تک راستہ میں اگر کسی کو دیکھ پاتا تو
خود بخود شرما جاتا۔

ہفتے میں دو تین بار بابولال کے پاس اور کامل کے پاس دو تین گھاگ لڑکیاں یا اگر انھیں لڑکیاں نہ کہا جائے تو
عورتیں آتیں، یہ یا تو پھل اور ترکاریاں بیچنے والیاں ہوتیں یا خط پڑھوانے آتیں ———
اور خط پڑھوانے اور پھل بیچنے کے بعد سائڈ روم میں کبھی پہلے نریندر اور آنیوالی لڑکی یا عورت بند ہو جاتے، پھر وہی لڑکی یا
عورت بابولال کے ساتھ دس پندرہ منٹ بند رہتی پھر کامل کے ساتھ۔ مگر اختر کبھی ایسی گندی اور گھناؤنی لڑکیوں یا عورتوں
کے ساتھ بند ہونا پسند نہ کرتا۔ اور جب دو ساتھی باہر اختر کے ساتھ ہوتے اور ایک لڑکی یا عورت کے ساتھ بند تو باہر والے
اختر کو اکساتے رہتے کہ وہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دے۔ لیکن اختر کی نگاہیں نیچی ہو جاتیں، اسے پسینہ پر پسینہ آنے لگتا۔
کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ اسے غش آ رہا ہے۔ کبھی کبھی جب ایسا ہوتا کہ اکٹھی یہ دو تین لڑکیاں یا عورتیں آ جاتیں اور
دونوں تینوں دوست ان کے ساتھ سائڈ روم میں بند ہو جاتے تو اختر سوچتا کہ یہ لوگ کتنے بے حیا ہیں، اور وہ خود

لگا آپ سے شرمانے لگا۔ اور جب یہ لڑکیاں یا عورتیں یہی باتیں اور سب [illegible]
[illegible] تجربات مشقوں کی طرح ان عورتوں کے جسم کے ایک ایک عضو کی تشریح کر [illegible]
[illegible] بہت بھاگ جانے کو جی چاہتا لیکن وہ بھاگ نہ پاتا اور ان کی باتیں سنتا رہتا اور جب [illegible]
[illegible] بزدل ہے، بزدل ہے اور ہمارے ساتھ رہنے کے قابل نہیں۔ اور جب وہ سب کچھ سنتا رہتا اور کچھ نہ بولتا
محض ایک انفعالی مسکراہٹ کے ساتھ یہ سب باتیں، یہ سب ریمارک برداشت کرتا رہتا تو بابو لال آخری حربے کے
طور پر [illegible] کہتا ۔۔۔ اس کم بخت سے کچھ نہ کہو یہ مجبور ہے، پیدائشی [illegible] ہے۔ مرد میں تھوڑی بہت
غیرت، تھوڑی بہت گرمی، تھوڑا بہت احساس ہونا لازمی ہے ۔۔۔ یہ اس کا قصور نہیں قسمت کا قصور ہے۔
یہ بات شنکر کے دل کو دھکا سا لگتا۔ بابو لال سے شدت کے لہجے میں وہ کہتا کہ "بھائی یہی کچھ ہے تو مگر
[illegible] کبھی نہ چھوڑنا [illegible] اس کا مذاق اڑا دیتے۔ یہاں تک کہ [illegible] آخر بابو لال [illegible]
کے حلقہ احباب میں یہ بچہ ناکارہ [illegible] مشہور ہو گیا۔

[illegible] شہرت کی ابتدا کے ساتھ اختر میں ایک اندرونی جس ایک طاقت [illegible] پیدا ہو [illegible]
[illegible] پیدا ہوتی گئی۔ ممکن ہے یہ ماحول کا نتیجہ ہو یا ذہنی [illegible] یا محض انتقامی جذبہ [illegible]
[illegible] ترقی کرتا گیا۔ اختر نے [illegible] کو اس وقت محسوس کیا جب ایک [illegible] کی بابو لال کے ساتھ
[illegible] دوستی تھی [illegible] کے سامنے اختر کو [illegible] زیادہ [illegible]
[illegible] بات ہے جس [illegible] بیماری کی [illegible] گئی۔ اختر [illegible]
چاہنے لگا کہ [illegible] لگ جا کر رہے لیکن کہاں جا کر رہے [illegible]
[illegible] اختر [illegible] کے [illegible] لیکن [illegible]
تھوڑی دیر یہ منظر دیکھ کر وہ اختر کی طرف [illegible] کی طرف [illegible]
[illegible] اختر [illegible]
[illegible] اگر زیادہ [illegible] تو کہیں چلا جاؤں گا۔ [illegible] اختر [illegible]
[illegible] شفقت سے ہاتھ پھیرنا [illegible]
[illegible] نہیں [illegible]
شاید بابو لال کے اشارے سے یا شاید خود بخود اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا اور [illegible]
[illegible] اختر [illegible]
[illegible] مرغ کی طرح [illegible]
[illegible] پوچھ کر رہی تھی [illegible]
[illegible] اختر [illegible]
[illegible] کی طرح [illegible] زمین پر گر پڑے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] بلکہ
[illegible] کی [illegible] نے [illegible] گیا [illegible] سے
[illegible] جو [illegible] کی [illegible] کہ [illegible] جاری
ہیں۔ وہ اسی حالت میں پڑا رہنا چاہتا تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ کبھی بھی اسی طرح اس کے ساتھ عمر بھر لیٹی پڑی رہے
[illegible] اس احساس سے [illegible] ہے خبر کر دیا تھا۔ اور بیل
[illegible] طرح اپنے [illegible] کر [illegible] سے [illegible] تھی اور
موقع پاکر اس نے اپنے دانتوں سے اختر کا ہونٹ کاٹ لیا تھا۔

اختر کو بے بس اور تڑپتا دیکھ کر بابو لال کو رحم آگیا اس نے بیل سے [illegible] کی کہ اب دانت چھوڑ دے حالانکہ
اختر کی [illegible] کے لئے [illegible] اس لئے کی ہو
[illegible] لیکن [illegible] نے [illegible] اختر نے [illegible]
[illegible] کہ [illegible]
اُسے تمام اعضاء میں درد محسوس ہو رہا تھا لیکن [illegible] دیکھ کر وہ [illegible] بابو لال نے [illegible]
[illegible] سے [illegible]
لیا [illegible] کی جانب [illegible] نے ایک
انداز برتری کے ساتھ اس واقعہ کے متعلق [illegible] تم لوگوں کو شاید
میرے کہنے کا یقین آگیا ہو ——"

[illegible] گالوں کے
[illegible] پسینے کی بوندیں [illegible] تھی بلکہ
[illegible] تھا ——
[illegible] بہت [illegible]
[illegible] ایک
[illegible] نے کہا
[illegible]
[illegible] جواب دیا۔
[illegible] تم
[illegible]
"تجربہ! تجربہ [illegible]"
[illegible] ادا کی
[illegible] تجربہ کی
[illegible]

میری جان! تمہاری عنایت سے زیادہ محبت ہے ——— [illegible]
ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر کرتے ہوئے جیل کو مخاطب کر کے دہرایا "I may [illegible] be [illegible]"
اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا "dead stone Mable."

"Dead stone! I wonder!"

مگر آج اختر بپھرا ہوا تھا ——— جیل کے الفاظ ختم ہوتے ہی اس نے اضافہ کیا "Dead or living, I will show you one day, what am I."

کارل بولے ——— "بسم اللہ ابھی!"

نریندر نے کہا ——— "چڑ گیا ہے ——— بڈھو!"

بابو لال سنجیدہ بن گیا اور اس نے کہا ——— "افسوس ہے اختر! آئندہ تمہیں پریشان نہیں کیا جائیگا ———"
اور جیل نے انگریزی میں دہرایا ——— "I am really sorry Mr. Akhtar."

مگر اختر آج فیصلہ کن موڈ میں تھا ——— اس نے کارل اور نریندر کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہا "حضور! تمہاری شرط ابھی ابھی میں تیار ہوں" اور جیل کو ساؤنڈ روم کی طرف اشارہ کیا ———

سارے کمرے میں ہلکی سی ایک مسرت اور امید و بیم کی فضا پھیل گئی ——— بابو لال اور جیل کی نگاہیں جھک گئیں ——— دونوں اپنے احساسات کا کوئی عکس نہ ظاہر کر سکے ——— نریندر اور کارل نے کھسیانی ہنسی ہنس کر ایک دوسرے کو دیکھا ——— اور اختر نے جیل کا ہاتھ پکڑ کر ساؤنڈ روم کی طرف اُسے گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"جاؤ جیل! ہمت سے" بابو لال نے کہا

"جاؤ! جاؤ!!" ہم آواز ہو کر کارل اور نریندر بولے اور جیل کچھ کھسیانی کچھ خفیف مسکراتی، کچھ جھجکتی ڈرتی، پیچھے پیچھے ہٹی، لیکن اختر نے پوری طاقت سے اُسے ساؤنڈ روم میں گھسیٹ کر دروازہ بند کر لیا۔

پانچ سات منٹ تک اندر سے پھر دھینگا مشتی کی آوازیں آتی رہیں جیسے دو پہلوان گتھم گتھا ہوں اور لڑتے لڑتے ہانپنے لگے ہوں۔ دروازے سے کان لگا کر نریندر سننے کی کوشش کرتا رہا، لیکن کوئی بامعنی آواز نہ سنائی دی صرف ہاں! ہا! نہ! اوہ! ہوں! بس! ـ پھر سمندر میں طوفان کے بعد جو سکون کی کیفیت ہوتی ہے، یہ احساس سب کو ہونے لگا۔ بابو لال نے دروازہ پیٹنا شروع کیا، لیکن دروازہ نہ کھلا مگر دس منٹ کے بعد خود بخود ہی دروازہ کھل گیا۔ جیل اور اختر پسینے میں شرابور تھے۔ جیل کے چہرے کی سرخی کئی گنی زیادہ ہو گئی تھی۔ اختر کا چہرہ بھی تمتما رہا تھا۔ دونوں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جیل کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں وہ کمرے سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔ اُس نے اختر کے نکلنے پر دروازہ پھر بند کر لیا تھا، شاید وہ سسکیاں بھر رہی تھی، لیکن اختر ایک فاتح کی طرح سینہ پھیلائے باہر نکل آیا تھا اور آرام کرسی پر لیٹ گیا تھا ———

تینوں دوست نریندر، کارل اور بابو لال مغلوب کتے کی طرح کان ڈالے چپ چاپ بیٹھے اختر کی جانب کنکھیوں سے دیکھ لیتے اور وہ شاید تھکن سی محسوس کر رہا تھا، اُس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

مسعود عمری

اللہ چھوڑیئے نا!

بیس دنوں کی چھٹیوں میں پانچ مہینے بعد سلیم گھر پہنچا تو نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ وہ بیابان میں تھا اور گھر میں بہار کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ مکان کا بیرونی حصہ بسنتی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ اندرونی حصہ میں نیلا نیلا رنگ خنائی کیفیات پیدا کر رہا تھا۔ امرود کا وہ درخت جس کی نیچی شاخوں میں اس نے اپنا بچپن تیاگ کر جانی کا مدھر سپنا دیکھا تھا غائب ہو چکا تھا۔ کوٹن اور خوشنما پھولوں کے پودے ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر ایک دوسرے کا منہ چوم رہے تھے۔ لوکی اور سیم کی بیلیں صحن کے مغربی حصہ میں زیادہ ترکاری اگانے کی مہم کی رفتار کا پتہ دے رہی تھیں۔ سرخ پھولوں سے لدی ہوئی امربیل کی شاخیں برآمدہ کی دیوار سے رینگتے ہوئے اس کے کمرہ کی کھڑکیوں میں جھانکنے لگی تھیں۔ برآمدہ میں شیشم کا تخت اس ہوہ کی چاندنی، گول کمرہ میں نئے ڈیزائن کا صوفہ سیٹ، آل ویو ہونے کے باوجود صرف لوکل اسٹیشن سننے والے ریڈیو کی بجائے ۲۶ انچ کا مائیکونی، بڈھی دمساز کا رفتہ اماں کی جگہ طرح دار گل جبین، خارش میں الٹ پٹ ناک بہتی ہوئی لونڈے کے بدلے گماؤں سے عبدل کو بلایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ تبدیلیاں بے وجہ نہیں ہو سکتیں۔ ہوسٹل ہی میں اس نے سن پایا تھا کہ نکہت کی شادی کا مسئلہ "عدالت بیم" کے سپرد ہو چکا ہے اور ایک تجربہ کار رشاطہ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی ہیں۔ عدالت "امید" نے یہ خوف ظاہر کر دیا تھا کہ نکہت کی عمر تیس کے قریب پہنچ رہی ہے۔ ہندستان کی موجودہ سیاسی جوش رفت کے مدنظر اُن کی شادی ضروری ہو گئی ہے۔ وہ بھی پھلے پھولے اور مستقبل کے آزاد ہندستان میں وہ نہیں تو کم از کم اُس کی اولاد آزاد ہندستانی کا سائن بورڈ لٹکائے جنم لے۔

تین رات اور دو دن کو ریل کا سفر۔ رات کے بارہ بجے تک اماں جان نے پانچ مہینوں کی جدائی کی کسر نکالی۔ کچھ دیر بھائی بہنوں سے دل بہلایا۔ آنکھ لگی ہی تھی کہ فرشتہ جان پر پہنچا۔

"سرکار ــــ چھوٹے سرکار، چار بج رہے ہیں، سحر کا وقت ختم ہو رہا ہے۔"

"اوں ــــ سونے دے ناشتہ دیر سے کروں گا۔ چل بھاگ یہاں سے" نیند میں کہہ گیا۔

"ناشتہ نہیں سرکار۔ سحری۔ روزہ نہ رکھئے گا۔ بڑے سرکار انتظار کر رہے ہیں" عبدل پائنتی سے چلا رہا تھا۔

"چلو جاؤ یہاں سے، بڑے سرکار چھوٹے سرکار کچھ نہیں جانتے" اس نے عبدل کو جھڑک دیا۔

عبدل چلا گیا، لیکن پھر کسی نے چادر کھینچ کر پھینک دی۔ چادر پھینکنے کی ہمت نکہت کے سوائے کسی کو نہ تھی۔ اماں جان کو کہاں فرصت کہ اسے بیدار کرنے آتیں۔ ابا اس کی نا خلفی سے واقف۔

"دیکھو باجی آپا۔ ہمیں سونے دو، ورنہ برا مان جائیں گے۔ بھئی کہہ جو دیا ہم ناشتہ دیر سے کریں گے، ہمیں سونے کیوں نہیں دیتیں۔ دیجئے ہماری چادر" سردی کی وجہ سے پیٹ میں پیر سکیڑ کر بولا۔

"خاموشی ــــ"

"کیا بیڈھنگا مذاق سوجھا ہے آپ کو۔ کم از کم بتی جلائیے نا۔"

جواب ندارد۔

شب چراغ

"کون ہے۔" نہ جانے وہ کبھی ہوئی چادر میں لپٹے ہوئے بولا۔

پھر وہ چونک گئی۔ وہ کبھی تنہا تھا کمرہ تاریک ہونے لگی۔ چھت سے وہ کافی بے تکلف تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اسے اس کی گود میں۔ "ارے! یہ تو کوئی اور ہے۔ باجی آپا واقعی پاگل ہیں۔ بھاری بھرکم یہ لڑکی کون ہے" گھبرا کر سلیم کی گود کو پرے پھینک کر اٹھا اور بتی کو جلا دیا ——— "ارے آپ کون" وہ بوکھلا سا گیا۔

"جی میں ——— میں ہوں" انھوں نے اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے مذاق کیا۔

"فرمایئے کیسی تکلیف کی جناب نے، رات گئے اس گھپ اندھیرے میں، بہلو میں جوان بیٹا چھوڑ دل اکیلے اس بھیڑیئے کو یہ تکلیف دینے کی وجہ" سلیم بڑا منہ پھٹ تھا۔

"آپ کو بیدار کرنے۔ سحر کا وقت بیتا جا رہا ہے۔ جبدل کو تو آپ نے جھڑک کر بھگا دیا آپ نے۔ سو میں نے کہا آپ کو بیدار کروں"

"محترمہ صاحب کے گھر میں روزے رکھے جانے لگے۔ یہ کیسا ہے" سلیم نے ذرا سی دلچسپی لی انگڑائی لی۔

"اس کی بھی ایک ہی رہی۔ گویا آپ نہیں جانتے" محترمہ نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

"ٹھہریئے بتاتا ہوں" نیند کے شدید خمار کے باوجود سلیم نے محترمہ کو زبردستی گود میں گھسیٹ کر منہ چوم لیا۔

"کوئی دیکھ لے تو۔ آپ بڑے وہ ہیں" تڑپ کر گود سے نکلتے بولیں۔ "چلئے بہت ہو چکا، خالہ جان انتظار کر رہی ہیں۔"

"ابا جان بھی ——— اب سمجھا۔ اللہ میاں کو منایا جا رہا ہے، باجی آپا کی شادی کے لئے" سلیم بولا۔

"اللہ میاں تو من چکے" محترمہ نے انتہائی بھولے پن سے کہا۔

"جاتا ہوں، مہربانی فرما کر آپ تشریف لے جائیں۔ خادم کو نیند آ رہی ہے۔ گیارہ بجے آپ بیدار کر سکتی ہیں اس سے قبل نہیں" سلیم نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ میں تو آپ کو لیکر چلوں گی" وہ بھی زبردستی پر آمادہ ہو گئیں۔

"یہ بات ٹھیک نہیں۔ پھر منہ چوم لوں گا" سلیم نے دھمکی دی۔

"ہم بھی آپ سے نہ بولیں گی۔ اس بھول میں نہ رہنا" ایک خاص انداز سے کہا محترمہ نے۔

"اس کی مجھے پروا نہیں۔ آجکل کی چھوکریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ریشمی تاگے ہیں یہ ——— ہلکے سے جھٹکے سے تنگ بھی ہو جاتی ہیں اور ڈھیلی بھی پڑ جاتی ہیں"

"چھی! آپ بڑے گندے آدمی ہیں" واقعی وہ بد گمان ہو رہی ہیں۔

"سلیم۔ رضیہ سے کیا ٹنٹ لگا رکھی ہے" برآمدے سے امی جان کی گونج سنائی دی۔

"آ رہا ہوں ابا جان" سلیم نے بلند آواز سے جواب دیا، پھر آہستہ سے کہنے لگا۔ "تو آپ رضیہ ہیں۔ باجی آپا کی ہونے والی نند۔ کسی نے مجھے خط میں آپ کا تعارف کروایا تھا" الٹرا ماڈرن گرل (Ultra Modern girl.)۔

"جی ——— ؟"

"چلئے" سلیم پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔

"اب ٹھیک ہوئے آپ، لکڑی کے آگے مکڑی بھی ناچتی ہے" رضیہ غرور سے اکڑ کر بولی۔

"اتنا غرور! تو جاؤ نہیں کرتے سحری، کوئی آپ کی دعوتی ہے" وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

"خالہ جان ... [illegible]

"سلیم" ... پھر گونج اٹھا۔

"جانے بھی دو۔ تین دن کے سفر کا تھکا ماندہ ہے۔ آج نہیں کل رکھ لیگا روزہ" اماں جان نے بیٹے کی تائید کی

دن کے دس بجے تک سلیم سوتا رہا۔ کسی نے جگایا نہیں۔ مزے سے پڑا تین دن کی تھکن اتارتا رہا۔ پلنگ پر اسے بیٹھا پاکر رضیہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ "ہلو کمیونسٹ۔ گڈ آفٹر نون"

سلیم سرہانے سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے بولا "کبھی ذرا بات کرنا سیکھو۔ کوئی سنے تو کیا کہے۔ سلیم کی صحبت میں رہ کر بھی بات کرنے کا ڈھنگ یاد نہیں ——— ہلو کامریڈ۔ گڈ آفٹر نون ——— بدتمیز"

"اس میں بدتمیزی کی کونسی بات تھی" رضیہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"منہ پر طمانچہ رسید کر دیا اور کہتی ہو بدتمیزی نہیں۔ یوں کہو، ہلو! کامریڈ ——— سرخ سلام" سلیم نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

"کامریڈ۔ مجھے آپ جیسا کامریڈ پسند نہیں" سلیم کے ہاتھ سے دیا سلائی لیکر سگریٹ جلاتے ہوئے رضیہ بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر رضیہ نے گھر کی رپورٹ دی "خالو جان مزدور سبھا کی سالانہ کانفرنس کے سلسلہ میں باہر گئے ہیں ماں جان اور خالہ اماں چاندنی پر بیٹھی جاڑے کی نرم نرم دھوپ کھا رہی ہیں۔ باجی آپا اپنے کمرہ میں بیٹھی اپنے جوڑوں کو گوٹا لگا رہی ہیں۔ سارے بچے برآمدہ میں لوڈو کھیل رہے ہیں اور ———"

"اور ———" سلیم رضیہ کے منہ پر دھواں چھوڑ کر بولا "آپ کے ہونٹ جو گدگدائے تو میرے پاس چلی آئیں۔ یہ حوا کی بیٹیاں بڑی وہ ہوتی ہیں۔ لالچی ننھے بالکوں کی طرح۔ ایک دن چاکلیٹ دو، ہر وقت پاس گھیرے رہیں گی۔ چاہے ماں باپ کی قہر آلود نظروں سے ڈر کر منہ سے کچھ نہ کہیں، لیکن آنکھیں کہتی رہیں گی۔ سلیم بھیا ہمیں چاکلیٹ دو"

"چھی" رضیہ اتنا ہی کہہ سکی۔ تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یکایک رضیہ کے چہرے پر شوخیاں لوٹنے لگیں "کچھ سن رکھا ہے۔ آپ کے بارے میں"

"آخر کیا۔ معلوم بھی تو ہو" رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر سلیم بولا۔

"یہی کہ آپ کی قید تنہائی کی مدت ختم ہونے کو ہے" سلیم کے ہاتھ میں رضیہ کی انگلیاں کانپ گئیں۔

"کس نے کہا"

"شادی کے گھر میں کیا کچھ سنا نہیں جاتا"

"تو کیا سنا آپ نے" رضیہ کے ناخن کے پالش کو غیر ارادی طور پر سلیم کریدنے لگا۔

"آپ کی شادی باجی آپا کی سہیلی رخسانہ فاطمہ سے طے ہو رہی ہے"

"دہشت ——— رخسانہ سے میں شادی کروں۔ اس کے تو رخسار ہی نہیں۔ کسی نے چرا لئے ہیں شاید"

"بنئے مت ——— پسند ہے آپ کو" ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"ارے وہ لڑکی بھی ہے۔ نیچے کی طرف انتہائی پتلی، سینہ صندوق اور درمیان میں خواہ مخواہ کی پھولی ہوئی۔ اکیدم غلط۔ کوئی مساوات قائم نہیں ہو سکتی اور تم جانتی ہو گی میں مساوات کا کتنا حامی ہوں" سلیم بولا۔

"ہاں۔ آپ تو رخسار میں خرابی نکالیں گے ہی۔ آپ کو تو سرداراں پسند ہے نا" رضیہ کی شوخی پھر عود کر آئی۔

"ہائیں۔ تم سے کس نے کہا کہ میں سرداراں ——— ٹھہرو ذرا سر پہ اوڑھ لوں" سلیم نے رضیہ کے دوپٹہ کا آنچل سچ مچ سر پر اوڑھ کر کہا "سرداراں واقعی قابل قدر ہستی ہے"

[illegible] رضیہ [illegible]

[illegible] میرا نام کسی کی زبانی سنتی ہے تو کتنا چڑ جاتی ہے۔ کیا ہم مردانے میں [illegible]
[illegible] کے [illegible] بھی نہ [illegible] ہیں۔ سن تمہارا جی بیگم تو مرا جا رہی ہوگی۔"

"اگر خالہ اماں نے وہاں پسند کیا اور شاہد کے ساتھ زبردستی شادی کر دی تو" رضیہ نے معنی خیز نظروں سے کہا۔

"ہاں جان من یہ ساری دنیا مجھے کسی کی مخالفت کی پروا نہیں" آنچل سر سے علیحدہ کرتے ہوئے سلیمہ بولی۔

"خدا جانے کیا ہوگا، خدا آپ کو کامران بنائے" رضیہ کے چہرے پر ہلکی سی زردی چھا گئی اور یکدم اٹھ کر چلی گئی۔ سلیمہ نے دیکھ ہی لیا کہ رضیہ کی آنکھوں میں کچھ چمک رہا تھا۔

(۲)

گھر بھر میں ایک سردار بیگم ہی تھی جو سارا دھندا چلاتی اور پورے کام کاج کا رکھ رکھاؤ کرتی۔ اوسط گھرانہ اور مہنگا زمانہ۔ آدمی بٹنے دشوار۔ اپنے ہاتھ سے کام نہ کرے تو کون مائی کا لال بھیری مار جائیگا۔ دن بھر اسے کام کاج میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ نیند بھرنے بھی نہیں پاتی کہ صبح کا سورج سوا نیزہ کی طرح سر پر کھڑا ہوتا۔ اور وہ ہڑبڑا کر خود بخود یوں جاگ پڑتی جیسے سپنے میں کوئی ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے صبح کی دعا پڑھ کر چہرے پر پھیر لیتی اور سینے پر دم کر کے سیدھی رسوئی میں پہنچ جاتی۔ کچھ لکڑیوں پر ناک بھوں سکیڑ کر چولہا روشن کرتی اور کوئلے دہکنے کو ہوتے تو صبح کی ضروریات سے فارغ ہونے کو دس پانچ منٹ یوں ہی نکال لیتی۔ دن چڑھے جاوید پاؤں پھیلائے لاحول بھیجے پڑے پڑے چلاتا، جواب نہ پاکر آنکھیں چمکارتے گھڑی پر نظر ڈالتا جو ساڑھے آٹھ کا رعب جما رہی تھی۔ ٹک ٹک کرتی، بچھو کی طرح ڈنک لگاتی وقت کی ہڈیاں چباتی رہتی۔

جاوید کو جیسے چکر آتا اور وہ لحاف کو ٹانگوں سے ہٹاتے اٹھ کھڑا ہوتا اور عجلت میں ایک پیر میں سلیپر دوسرے میں کھڑاؤں ڈالے سیدھا غسلخانے کے دروازہ کی طرف وارد ہوتا۔ اس کی کھٹ کھٹ سے اندر کا لوٹا زیادہ تیزی کے ساتھ پانی انڈیلنے لگتا۔ اور دو پل کے اندر سردار بیگم مہریاں جھٹکتی دروازہ کے باہر آ جاتی۔

آدھ گھنٹے کے اندر گرم روٹیوں اور نیم برشت اور رات کے گرم کئے ہوئے سالن سے دسترخوان سج جاتا، مگر کون یہ پوچھے کہ کچی لکڑیوں میں جل بھن کر سردار مائی نے یہ کیسے کھانا تیار کر لیا۔ نئی حوا تو نہ تھی ــــــ دکرے تو اپنی ہی جان رونا پڑے، بھائی وقت پر کھا کر کچہری نہ گیا تو دیر حاضری ہو جائیگی۔ افسر ناراض ہو جائیگا۔ سکنڈ گریڈ کلرک کی بساط ہی کیا۔ نوکری گئی تو اس کی تعلیم کا کیا ہوگا۔ اس کے دل خوش کن تخیلات کا کیا بنے۔ اس سے بڑھ کر اس پیشے کے دونوں نانا وہ بھی کسی زمانے میں رئیس تھے۔ پدرش سلطان بود۔ یہ تو ماضی کی باتیں ہیں۔ جس نے گذرتے گذرتے ہرجائی اور بیوفا معشوق دولت اور جائیداد کو دوسرے آغوش کی حرارت سے روشناس کر دیا ـــــ اب تو سب کچھ اس کا بھائی اور بھائی کی نوکری تھی۔ جب لاڈلے نے پہلی تنخواہ بہن کے ہاتھ میں لا کر دی تھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی اور پچکے گالوں پر جوانی کا نکھار پہلی بار جھلک آیا تھا۔

جاوید کی تنخواہ کا آدھا روپیہ پٹول مہاجن کی تجوری میں چل جاتا، ماں باپ کا قرضہ بھی تو اسے ادا کرنا تھا۔ اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس نے ساری جائیداد گروی رکھدی تھی۔ بچوں کا کیا بھروسہ۔ اس کا باپ تو سیٹھ کے [illegible] تھا۔ یوں بھی لوگ کہتے ہیں پٹول کی توند بھی جاوید کے باپ کی عیش پرستی کی بدولت پھول گئی۔ ورنہ [illegible] تھی نہ یہی [illegible] ــــــ اور پٹول برا آدمی بھی تو نہ تھا، جب جاوید کا باپ آ کر [illegible]

اگست ۱۹۴۷ء اللہ جھوڑ لیجئے [illegible] منزل

ماں جی کہا کرتے تھے کہ اس نے تجہیز و تکفین، زیارت، دسواں، چالیسواں اور دیگر رسومات کے لئے بار بار دیتا رہا تھا۔

جب سے جاوید سال روٹی سے تنگ آ گیا تھا سرور ان کے چار شہلاؤں میں دو اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسے ہی اس کی چائی نے سمجھا کہ اس کے جاگتے بھاگ کی پہلی منزل ہے اور یہی دو شہلاؤں کے شمار سے وہ اپنی منزل کا فاصلہ ناپ لیتی ہو گی۔ یہی دال گلاتے، جھاڑ جھٹکار دیتے، الجبرا جامیٹری کے ادق مسئلے حل کرتے اور ——— ایسی راتوں میں پلنگ پہ پڑے پڑے۔ آبادی سے دور جنگل میں ——— سرو منزل کے کمرہ میں جس کی کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی تھی ———

وہی منزل جو بیٹیوں کے ہاں گروی تھی ——— ایک رات ———

اور کھلی کلیاں کھڑکی کے باہر مہک رہی تھیں اور ہوا کے جھونکے ان کی خوشبو کو، کمرہ کی کھلی فضاؤں میں چاروں طرف سمو کر اندر مستیاں بکھیر رہے تھے۔ معطر فضا کا تو خیر کیا شکوہ مگر اس کے دل میں ہولے ہولے گدگدیاں ہو رہی تھیں اور وہ تکیہ پر سینہ دبائے پلنگ کے سہارے بیٹھی ہوئی لیٹی تھی۔ آنکھیں مچی ہوئی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چاند کی کرنوں میں یوں چمک رہے تھے، جیسے وہ تراش کر تارے ٹمٹما رہے ہوں۔ چاندنی رات ظالم کچھ ایسی بیدرد ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ کیف و سرور کا طوفان امڈ آئے لاتی ہے اور اس طوفان کے جال میں الجھ کر وہ ایسی کھو گئی تھی کہ جیسے اس کچھ شدھ بدھ نہ تھی۔ تکیے کے ریشم میں اس کے دل کی دھڑکنیں یوں گم ہوتی جا رہی تھیں جیسے کوئی نیکی کرتا اور دریا میں ڈال دیتا ہو۔ کچی کلیوں پر بھونرے منڈلا رہے تھے۔ ہوا کے تھپیڑے انھیں چھیڑ چھیڑ کر کمرے میں چلے آتے رہے اور نیلی وسعتوں میں چاندنیا ہی تیرتا رہا، تارے ٹمٹماتے رہے۔ پسینے کے قطرے شہاب ثاقب کی طرح ڈھلکتے رہے، رات بیتتی رہی اور دل کی دھڑکنیں ریشم میں ڈوبتی گئیں ——— کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس کی راہ چاندنی کی روپہلی کرنیں اس کے تب و تاب بدن پر چھک رہی تھیں۔ انہی کرنوں کی مدھ بھی گرمیوں میں سرشار وہ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ جانیوالی رات کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔

ایسی کتنی راتیں آئیں اور جاتی رہیں پر اس کے دل کی بیقراری نہ گئی اور اس نے کوئی رات ایسی نہ دیکھی جس کے اندھیرے میں امید کی ایک بھی دھندلی کرن اسے نظر آئی ہو۔ چاند ہر رات چمکتا اور مسکراتا مگر اس کی چاندنی میں سرواں کے دل کا قرار نہ تھا، مگر ——— یہ رات نرالی رات تھی۔ آشا کی رات تھی ——— دھندلی کرن انگڑائی لیکر نئی روح پا گئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں نیلے رنگ کا ایک خط تھا۔ اس کے بھائی کے جگری دوست سلیم کا ———

"آپ ہی بتائیے ———!

تو کیا یہ گستاخی ہے ——— جی؟ دیکھئے ہر بات کا برا ماننا، بے سوچے سمجھے رائے قائم کر لینا آپ کی عادت ہی ہے۔ لیکن اگر یہ عادت کسی کے دل میں بسنے والی بنا سکتی ہے تو آپ ہی بتائیے کیا یہ اچھی عادت ہے آپ کی ——— میرا مطلب ہے آپ صاحبزادیوں کی۔ دیکھئے! آپ پھر برا ماننے لگیں میرا مطلب کچھ آپ کو پریشان کرنا یا خواہ مخواہ اپنی مرضی پر آپ کو قائل کروا لینا ہرگز نہیں اور آپ اس بات کا یقین حاصل کر لینے کے لئے اپنی مرضی سے جو چاہیں حربہ استعمال فرمائیں، کیونکہ ہم اُف بھی کریں تو بدنامی کا کھٹکا ہی رہتا ہے۔

کیا آپ اپنی ہی آنکھوں سے اپنے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ رکھ سکتی ہیں۔ کیا آپ کی آنکھوں سے جھانکنے والی آپ کی تمنا مجھ سے پردہ کر سکے گی۔ اور اس برافگندہ نقاب کے نیچے دیکھنے صرف دیکھنے کی ... [illegible]

دلچسپ ماس - آپ خفا تو نہیں ہو گئیں ———— ہو گئیں ———— کے

تیرا مطلب ———— نعائیں ————

ایک گستاخ

جس کی پھلواری میں ریت ہی ریت ہے

نوٹ :- اگر گستاخی دیکھی جائے تو میری تمناؤں کی پامالی ہوئی آرزوئیں آ کر ہی پناہ چاہتی ہیں۔

(۳)

نکہت کی شادی تو خیر خوبی سے گذر گئی، لیکن شادی نے جہاں نکہت کی مرجھائی کلیوں کو کھلا دیا وہیں سلیم کی پھلواری کی کلیاں توڑ کر پھینک دیں۔ بچپن سے ضدی تھا، اکلوتے لڑکے ضدی تو ہوتے ہی ہیں۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد خوش نصیبی سے خالہ خالو نے گود لیا۔ اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا۔ خالہ کا حد سے زیادہ لاڈ پیار سونے پر سہاگہ۔ ترقی یافتہ گھرانے کی تہذیب و تمدن اور اعلیٰ تعلیم کے نئے نئے رجحانات نے اسے وہ نہ بنایا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ یہ ماں باپ ———— یہ ہندوستانی ماں باپ، اللہ بچائے ان سے، خواہ کتنے ہی روشن خیال ہوں سکتے ہیں اڈوانس اور [illegible] لیکن شادی بیاہ کے بارے میں جمہوریت پسندانہ پالیسی ترک کر کے آمرانہ روش اختیار کر لیتے ہیں [illegible] ہی تھی۔ [illegible] کی تعریفیں رخسار کے گالوں کے بجائے اس کے گلے پر پڑیں جہاں میرے [illegible] تحریک کا صدر، [illegible] کا معاملہ آن پڑنے پر خود سرمایہ پرست [illegible] جاری رہی۔ دونوں دھن کے پکے۔ نہ ہی [illegible] ہوئے رستے کو ایکدم چھوڑ دیا۔ [illegible] گئے [illegible] کے پردہ میں اس کی جیت تھی۔ اس دوران میں دوست احباب سامنے [illegible] نکہت تھی جو مستقل سے اس کی ہم خیال تھی جس وقت سلیم لے تے ہوئے سنتا کہ [illegible] سلیم نے کبھی [illegible] مساوی [illegible] کے اصول کے مطابق ایک [illegible] نکہت عشق ہوئی تاکہ [illegible] انہوں سے انتقام لیتی۔ یہی تو غضب ہو گیا۔ نکہت کے سوتیلے شوہر نے جو پہلے ہی سے سن رکھا تھا کہ سلیم اور نکہت ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، لیکن [illegible] ہونے کی وجہ بیاہے نہ جا سکے، اس حالت میں دیکھ کر چراغ پا ہو گیا۔ اور مہر کے ۲۰ ہزار کا چیک نکہت کی [illegible] کر سلیم کے گھر کا راستہ دکھا دیا۔ سلیم جو ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بھی نہ طے کر سکا تھا۔ نکہت [illegible] اس کے پاس [illegible] زندگی کے اجڑنے کا اسے کوئی رنج نہ تھا، لیکن [illegible] سال کی عمر میں [illegible] خوشی [illegible] اس کے غم کو اپنا غم سمجھتی تھی یوں سہاگ اجڑ گیا۔ [illegible] سہاگ [illegible]

[illegible]

[illegible] مہینے [illegible] تھا کفایت [illegible] مگر سب سے پہلے سرور منزل کا جو پیش گوہاں [illegible] ایک دیوان کر دیا گیا۔ مصرف سرچھپانے کا سہارا بلکہ پریس بھی وہیں منتقل کر دیا گیا، صرف آفس شہر کے مرکزی مقام پر برقرار تھا۔ اس دوران [illegible] محبت ——— رمان اور چاہ ——— ۱۹۴۲

(۴)

جنگ عالمگیر شروع ہوئی اور بیت بھی گئی۔ ہزاروں ہستیاں پیوند زمین ہوئیں، ہزاروں نے جنم لیا۔ دنیا جہان کی جان بازی فتح کا جشن منایا جا رہا تھا، شہر میں چراغاں ہو رہا تھا، چاروں طرف مسرت اور انبساط کے دریا بہہ رہے تھے۔

سلیم رات کے گیارہ بجے واپس لوٹا۔ سرداراں اور نکہت جاگ رہی تھیں، لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ میز پر جھک گیا۔ ایک کتاب ختم کرنی تھی، دو چار سطریں بھی نہ پڑھی ہوں گی کہ سرداراں آکر سامنے میز پر بیٹھ گئی اور اس پر جھکتے ہوئے ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا دیا۔ یہ تو اس کی عادت سی تھی۔ جب کبھی اکیلے میں سلیم لکھنے یا پڑھنے بیٹھ جاتا، اس پر جھکتے ہوئے بجلی کا بٹن دبا دیتی، اور کمرہ کی مختصر فضا میں گرم لہر دوڑ جاتی۔

"کیا مذاق ہے پڑھنے دو" سلیم نے لیمپ جلا دیا "نواب صاحب کا تقاضہ ہو رہا ہے واپس کرنے کا"

"میں بھی تو دیکھوں کیا پڑھ رہے ہو" سرداراں نے کتاب چھین کر کہا "اچھا قطب شاہ کا دیوان ہے" [illegible]

پیا باج اک پل جیا جائے نا

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

"کھانا نہ کھائیے گا" کتاب کے درمیان انگلی رکھ کے بند کر دی۔ اور نہ قود باتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھوک نہیں"

"اچھی بات ہے۔ پیا باج پیالہ پیا جائے نا" گنگناتی ہوئی سہری کی طرف چل دی۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا۔ بیکار انتظار کیا" کتاب کے اوراق اُلٹتے ہوئے سلیم بولا۔

"نہیں بھوک نہ تھی"

"تم نے یعنی نکہت نے بھی نہیں کھایا" سلیم نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں باجی آپا نے بھی نہیں کھایا۔ بھیا اور بھابی جان بھی بھوکے ہیں۔ کبھی آپ کو چھوڑ کر کھایا ہے ہم نے"

سرداراں کو ہلکا سا غصہ چڑھ رہا تھا۔

"نکہت کہاں ہے" سلیم نے کتاب بند کر دی۔

"تمہارے ساتھ تھا، شاید دعا پڑھ رہی ہوں گی" سرداراں لیٹ گئی۔

"ہوں۔ چلو اٹھو مجھے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے، گلشن سو گئی ہو گی۔ ہم دونوں مل کر دستر خوان لگائیں گے" سلیم

کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرداراں کی آنکھیں مسکرانے لگیں ———

"[illegible] سلیم۔ [illegible] کر بولا۔ رضیہ آئی تھی پارٹی میں۔ مجھے پوچھ رہی تھی"

"[illegible]" سلیم نے جواب دیا "اللہ کے فضل سے میاں بیوی اور ایک بچی [illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی بیرونی رسم ... سلیم بھائی بھابھی نوشابہ کے تحفوں کا پتہ [illegible]
[illegible] ... رہا کیسے پڑتے ہیں۔"

"... شادی کرے ... دو چار مہینوں میں بچہ پیدا ہو تو اس کا نام سلیم کے وزن پر شمیم ... سلیم [illegible]
... ہوئے بولا۔

"... شادی کر لی، دوست احباب کے ... پر قبلہ رہا ہے۔ قسمت سے مل گیا تھا وہ رسالہ۔ اب نوشابہ
... نے ... نکال دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے صاحب بکری ہیں۔ ذاتی اخبار نکلوا دیں گے۔ نئی حوا کے نئے آدم کے لئے اس نے شیشہ
نے ایسی محل کی نئی جنت بھی دے بنا دی، تو کیا معنی رہ جائیں گے بیچارے، میں تو سمجھتا ہوں نکہت کی بددعا خالی نہ گئی۔"
سلیم کھسیاں ... رہا تھا۔

"کیا ذکر لے بیٹھے سلیم بھیا آپ بھی، جب دیکھو رضیہ، رابعہ، ثمینہ، خورشید کچھ اور بھی سوجھتا ہے آپ دونوں کو سچ"
... بڑھاتے ہوئے بھنجھلانے لگی۔

"بھابی ٹھیک ہے۔ بھائی جان پیپر، موضوع نیا آدم نئی حوا۔ ہاتھ میں اخبار۔ پڑی ہوئی چھری تھا ——————
—————— اللہ اکبر" نکہت بڑی دیر میں بولی۔

"یہ بات تو نہیں بڑی بہو۔ سب گندہ مچھلیاں ہیں، جو نہ صرف صحافت اور ادب کو بدنام کر رہی ہیں بلکہ جاری
تہذیب اور معاشرت پر بھی کاری زخم لگا رہی ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ پانچویں کالم، تھالی کے بینگن اور پورے ابن الوقت ...
... آپ ... اس کا علاج ضروری ہے" نکہت کا خسر زندہ ہوتا تو بڑی بہو ہی پکارا کرتا۔ جاوید نے کہہ دیا تو کیا ہوا ——
... ان سب میں وہ بھی بیٹا تو تھا۔

"اللہ چھوڑیئے نا! کیا ذکر لے بیٹھے آپ لوگ بھی" سرداراں مسہری پر کلبلائی "مجھے نیند آ رہی ہے"
"اچھا بھئی۔ شب بخیر" جاوید اور نوشابہ بالائی منزل پر چلے گئے۔
"اور ہم بھی چلیئے" نکہت بولی
"کیوں؟" یہ سلیم تھا۔
"بھول گئے۔ اس مہینہ ہوم گورنمنٹ کی نائب صدر سردار ہے۔ خدا حافظ" بتی بجھاتے ہوئے۔
نکہت اپنے کمرہ میں چلی گئی اور چاندنی رات کے اندھیرے میں سرداراں مسہری پر کلبلائی "اللہ چھوڑیئے نا ——"

ظفر علی

جان ہے تو ؟

اس کے ملک کو سوراج ملنے کا دن نزدیک آگیا تھا۔ لیڈر جلد جلد وائسرائے سے مل رہے تھے۔ ملک کے چاہنے والے بیٹھکوں میں بیٹھے تازہ ترین خبریں سننے کے مشتاق تھے۔ شہر کے سب سے بڑے میدان میں پنڈال بنایا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے جلوس پُرجوش نعروں کے ساتھ نکالے جا رہے تھے اور وہ اول درجہ کا خود غرض محض اپنے متعلق سوچے جا رہا تھا۔۔۔ لیکن! اسے کی آزادی سے ذرا بھی خوشی نہ تھا۔ اس نے نہ جلوسوں میں شرکت کی تھی۔ نہ پنڈال بنانے میں لوگوں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ملک کی آزادی خون مانگتی تھی۔ اس کنجوس نے خون کبھی نہ دیا۔ اور اب بھی آزادی کی دیوی کو نظر انداز کئے اپنے ہی متعلق سوچے جا رہا تھا۔

جس وقت ملک کے چاہنے والے عقلمند لیڈروں کو دل کی بات یہ کہتے ہی سمجھ گئے تھے اور پھر آزادی کی دیوی کو خوش کرنے کے لئے ملک کے بے مصرف لوگوں کا خون بہت فراخدلی کے ساتھ دے رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ دل کی کمزوری اور بیماری کا بہانہ کئے اپنی کوٹھری میں پڑا رہا تھا۔ بے مصرف ہو کر بھی خون نہ دے سکا، فاقہ زدہ ڈھانچہ! ۔۔۔۔ بے مصرف نہیں تو اور کیا تھا۔ ملوں کے مالک آزادی کے لئے لاکھوں روپیہ دے دے کر تحسین حاصل کر رہے تھے ۔۔۔ لاکھوں روپئے اور قربانی پر بل بھی نہیں۔۔۔۔ اور وہ کنجوس خود غرض کہیں کا وہ چیز دینے کے لئے بھی تیار نہ تھا جو اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ بھلا لاکھوں روپیوں کے مقابلہ میں دو مٹھی کی حیثیت ہی کیا تھی۔۔۔۔ روٹی سی حقیر چیز کے بدلے آزادی جیسی نعمت مل رہی تھی، لیکن وہ بیوقوف اس بات کو نہ سمجھ سکتا تھا اور روٹی ہی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔

چاروں طرف ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے، ان لوگوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے ـــــــ جو ملک کے مطالبۂ آزادی کی راہ میں بھینٹ چڑھائے گئے تھے اور جن کے مر جانے کی وجہ سے ملک کے [illegible] میں قابل قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اس معصوم بہن کو بھی بھول گیا تھا جو اس کی طرح روٹی کے انتظار میں [illegible] پڑی تھی اور جو دھرتی ماتا کے خفا ہو جانے کی وجہ سے ملک کے لاکھوں لوگوں کی طرح دل و دماغ کھو بیٹھی تھی۔ جیسے اس وقت ملک کی آزادی کا خیال تھا اور نہ لیڈروں کی قربانیوں کا۔۔۔۔ وہ اس وقت روٹی چاہتی تھی۔ وہ فاقوں کے بھیانک بھوت کی وہ کارفرمائیاں دیکھ چکی تھی، جو ہڈیوں کے ڈھانچوں کی شکل میں سڑکوں پر پڑی ہوئی تھیں، اور وہ اس بھیانک [illegible] [illegible] نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لئے روٹی ضروری تھی۔ آزادی نہیں۔

[illegible] ڈھانچوں [illegible]۔ فاقوں کے بھیانک بھوت سے خوف کھاتا یا جس کا [illegible] [illegible] سے چلایا۔ نہیں نہیں میں روٹی لاؤں گا ضرور لاؤں گا۔" اور ملک کا ایک [illegible] ۔۔۔ پاگل کیسی باتیں کر رہا ہے۔

[illegible] ایک [illegible] "وہ" کھڑے کھڑے تھک چکا تھا۔ اس کی آنکھیں [illegible] چھا رہا تھا، کانوں میں [illegible] محسوس ہو رہے تھے، ہر طرف سے روٹی روٹی پکار [illegible] [illegible] آزادی [illegible] رہا تھا اور "وہ" روٹی کے بدلے اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔

[illegible] کی تحریک ہے اس کی صداقت سے پنڈال کے باہر لوگ آزادی [illegible] ملک کے چاہنے والے اسے یہاں سے بھگانے کے درپے تھے کیونکہ وہ آزادی [illegible] چاہتا [illegible] تھا، اور پھر ان کی اس تحقیق اتفاقی پر کہ وہ ملک کی آزادی پر ایک روٹی کو ترجیح دیتا تھا، وہاں سے [illegible] گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ آزادی کے سب سے بڑے ٹھیکیدار، تو آزادی چاہتا ہے، اور میں روٹی، میری طرح اکثریت کو آزادی سے زیادہ روٹی کی ضرورت ہے۔ تم نے اپنی آزادی کے لئے مجھ جیسے سینکڑوں کا خون لیا ہے جن کے [illegible] یہ سڑکوں پر سڑتے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے تیرے سامنے موجود ہیں، لیکن ہم نے کبھی اپنی روٹی کے لئے نہیں [illegible] کیا، حالانکہ تیرے پاس روٹی موجود ہے۔ اور ہمارے پاس نہ آزادی ہے نہ روٹی۔ وہ چپ بیٹھا گیا، اور وہ [illegible] دھکے [illegible] گئے۔ [illegible] دوزخوں کے ان مالکوں کی شان میں گستاخی کرنے سے ملک کے چاہنے والے برانگیختہ ہو چکے تھے۔ ان سب نے آزادی کے لئے لاکھوں روپے دیئے تھے اور اس نے؟ ... پھر اس کی یہ ہمت ... اور پھر وہ [illegible] وہاں سے چلا [illegible] بھوک نے بہت جلد اس کا دماغ درست کر دیا، اور وہ دوبارہ ان تمام باتوں کو دماغ سے نکال کر اپنی روٹی کے متعلق سوچنے لگا۔

وہ چلتا رہا، اور سوچتا رہا حتیٰ کہ اس کی ٹانگوں نے چلنے سے اور دماغ نے سوچنے سے انکار کر دیا، اور پھر وہ [illegible] کے سڑک کے کنارے پٹری پر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا... سڑک پر چلتی ہوئی حسین مصورہ نے اپنے ساتھ والے مرد کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "کتنا اچھا منظر ہے یہ تصویر بنانے کے لئے... اور بہترین موقع بھی"۔ ساتھ والے مرد نے تائید کرتے ہوئے کہا: "ہاں" وہ تلخی سے سوچنے لگا کتنا اچھا منظر ہے یہ۔ یہ پتوں اور شاخوں سے محروم درخت دوپہر کی تیز دھوپ [illegible] ہوا [illegible] جیسے کوئی فاقہ زدہ پہلوان، جلیوں سے ڈھانچے میں تبدیل ہونے کے بعد افسوس میں ہاتھ مل رہا ہو، اور پھر اس کے نیچے بیٹھا ہوا یہ نوجوان جو غم دوراں کی مار کھا کھا کر ہانپ رہا ہو اور سڑک پر ملکوں کی راہ میں مرنے والوں کی لاشیں سڑتی ہوئی جن سے گدھ اپنا پیٹ بھر چکنے کے بعد مذاق کر رہے ہیں، اور کالی کالی لمبی سی سڑک جو لاشوں کو اپنے سینے پر لٹائے آرام [illegible] ہے۔ اور جس کے سینے سے نکلتے ہوئے گرم بخار اب محسوس بھی ہو رہے ہیں اور نظر بھی آ رہے ہیں... واقعی کتنا اچھا منظر ہے یہ" معاً اس کے بدن میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس حسین مصورہ کو دوڑ کر پکڑ لے اور پھر یہاں لا کر اس درخت سے باندھ دے اور اس کے سامنے چلائے کہ بہت اچھا منظر ہے یہ، اس کی تصویر بناؤ اور اس کا منہ چڑھائے، منہ چڑھائے اور چلائے اور یہ دوپہر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے، حتیٰ کہ چلاتے چلاتے اور منہ چڑھاتے چڑھاتے اس کا گلا بیٹھ جائے اس کی صورت مسخ ہو جائے اور وہ بھوت بن جائے اور وہ حسین مصورہ اس کی خوفناک صورت دیکھ کر [illegible] سے چلاتے چلاتے بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اور لہولہان ہو جائے، اور وہ اس کا خون چاٹنے لگے اور چاٹتا چلا جائے، حتیٰ کہ سارے جنتا ان جو اس منظر کو خوبصورت سمجھتی ہیں، خوف سے بیہوش ہو کر گر جائیں اور ان کے خون سے خشکی پر بھی سمندر بہہ جائے اور وہ اس میں تیرتا پھرے اور قہقہے لگاتا پھرے، چلائے کہ کتنا حسین منظر ہے یہ، بہت ہی حسین، تصویر بناؤ اس کی، خون ہی خون، ہر طرف سرخ سرخ، جس میں سے حسینوں کی خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ کتنا [illegible] منظر ہے ہر طرف سرخی، تیز دھوپ میں چمکتی ہوئی اور پھر... پھر حسینہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور وہ [illegible] اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دوبارہ بغیر کسی ارادہ کے پنڈال کی طرف چل دیا۔ راستے میں ملک کے چاہنے والوں [illegible]

کے کھڑکی کھلی ہوئی تھی، لہذا خوشبوئیں باہر نکل رہی تھیں۔ اس کی ناک میں بھی خوشبو آئی۔ مزیدار اور اشتہا انگیز، وہ سب سے قریب آنے لگا اس کھانے پر جو میز پر رکھا ہوا تھا۔

"ذلیل طوائف!" اس نے سوچا، جیسے وہ شام کو اپنے کوٹھے پر بیٹھ کر اپنے چاہنے والے کو لبھاتی ہے، خواہ راہگیر امیر ہو یا غریب، لیکن صرف جاتی اُس کے پاس ہے جس کی جیب میں چاندی کے گول گول سفید ٹکڑے ہوں — اسی طرح یہ کھانا بھی ہوتا ہے، ہر ایک کو ہوٹل میں بیٹھا اپنی خوشبوؤں سے مست بنا دیتا ہے۔ لیکن آتا صرف اُس کے پاس ہے، جو گول ٹکڑوں کا مالک ہو۔

وہ وہاں کھڑا ہو گیا، کھانا ختم ہو چکا تھا۔ پھلوں کی باری آئی، اور پھل بھی کسی بدو جہد کے بغیر میز کے پاس والے ہاتھوں میں پہنچنے لگے، اس کے ہاتھ خالی تھے، لیکن ناک میں برابر خوشبو آ رہی تھی اور میز کے پاس والے ہاتھوں میں پھل تھے اور اُن کے منھ برابر چل رہے تھے، کیونکہ اُن کی جیب میں پیسے تھے اور اس کی جیب ہی نہیں تھی، پھر بھلا پھل اس کے پاس کیسے آ سکتے تھے؟ اس نے بنیادی نفرت کے ساتھ پھلوں کی طرف سے منھ پھیر لیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بھی ان تمام چیزوں سے کبھی نہ کبھی بدلہ ضرور لیگا، جب اس کے کپڑے بھی صاف اور خوبصورت ہوں گے، اور اس کی جیبیں روپیوں کے بوجھ سے لٹکتی ہوئی ہونگی، اور یہ سب اس کی خوشامدیں کریں گے، لیکن وہ اِن سے خفا ہو کر سڑک پر پڑتا ہوئی غرور سے مُنہ لاشوں کے پاس لیٹ جائیگا، اور پھر اُس نے لاشوں پر نظر ڈالی، جو بہت سکون سے دھرتی ماتا کی آغوش میں چھپی ہوئی تھیں، اور وہ کسی خیال کے تحت کانپ گیا، اسے فوراً فاقوں کے بھیانک بھوت کی شبیہ نظر آ گئی... اور وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلدیا، نہیں نہیں، میں یہاں نہیں بیٹھونگا، اِن فاقوں کے بھیانک بھوت کے شکار کے پاس،

اور گرم ہوا، ایک بہت بڑا بگولا بن کر سرسرائی اور پنجتی ہوئی اوپر کی طرف اُڑ گئی گویا فاقوں کے بھوت نے اس کا خیال کو سمجھ کر طنزیہ قہقہہ لگایا ہو اور یہ خیال آتے ہی وہ کمزوری کے باوجود تیز تیز قدم ... پنڈال کی طرف چلدیا، جہاں سے قہقہوں کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔

بہت جلد وہ پنڈال پر پہنچ گیا۔ نعرے لگ رہے تھے، کارپی گود کھوئے لیڈر کا انتظار کر رہی تھی، اور پھر وہ لیڈر کو اپنی آغوش میں چھپائے تیزی سے چلدی، اور کار نے اسے اپنی گود میں نہیں بٹھایا کیونکہ وہ غریب تھا، اور بھوکا، اور لیڈر کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور کار ہمیشہ پیٹ بھرے لوگوں کو اپنی گود میں بٹھاتی ہے، اس لئے وہ وہیں پر تھکا ہوا کھڑا رہا اور پھر ملک کے چاہنے والوں نے بچا ہوا کھانا اور بچوں، عورتوں اور مردوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، جو بہت دیر سے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے لیڈر بھی بچا ہوا کھانا نہیں کھاتے، کیونکہ بچے ہوئے کھانے کے انتظار میں وقت ضائع کر کے اور اس کو کھا کر ملک کی آزادی میں رکاوٹ پڑتی ہے اور لیڈری کے لئے وقت کی کمی ہو جاتی ہے، اس لئے لیڈر ہمیشہ صاف ستھرا کھانا کھاتے ہیں میز کرسی پر بیٹھ کر اور بعض بعض تو صفائی کے لئے کانٹے چھری سے کھاتے ہیں، اور بعض دماغ کی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے صرف پھل اور دودھ ہی کھاتے ہیں، لیکن غریب لوگ ہمیشہ بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں اور گندی زمین پر بیٹھ کر کیونکہ وہ لیڈر نہیں ہوتے، اور نہ ہی انھیں ملک کی آزادی کا خیال ہوتا ہے، اور اسی لئے انھیں جسمانی اور روحانی تکلیفیں دی جاتی ہیں، فاقے کرائے جاتے ہیں تاکہ ان کے دل میں بھی ملک کی چاہت پیدا ہو جائے۔

اس کی طرف بھی ملک کے ایک چاہنے والے نے پوریوں کے چند ٹکڑے اور مٹھائی کے دو تکلے بڑھائے اور اس نے لے بھی لئے، لیکن نہ معلوم کس خیال کے تحت اُس نے غصہ میں آ کر سب کچھ زمین پر پھینک دیا، کتے نے اسے سونگھا

[illegible]

بہت دور سے کھایا، لیکن بہت افسوس ہونے لگا کیوں اس نے روٹیوں کو پھینک دیا تھا کیوں وہ روٹی کا [illegible] مکان لوگوں نے اُسے گالیاں دیکر وہاں سے بھگا دیا . . . . . لیڈر کے نام پر نعرے لگائے جا رہے تھے۔ کیونکہ وہ لیڈر تھا اور اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور اُسے گالیاں دی جا رہی تھیں کیونکہ اُس نے اتنی [illegible] روٹی [illegible] پھینک دیا تھا

وہ گالیاں کھا کر وہاں سے چلدیا، اور اب وہ خود بھی اپنے کو گالیاں دے رہا تھا اور گالیاں دیتے دیتے جب اس کی زبان پر بہن کی گالی آئی تو اسے بہن یاد آگئی جو اس کے انتظار میں کوٹھری میں پڑی ہوئی تھی یا شاید اُس سے بھی زیادہ روٹی کا انتظار تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کی بہن کمزور ہے، جسے اس کے ماں باپ اس کے بازوؤں میں چھوڑ گئے تھے، اس نے سوچا کہ اُس کی بہن بھوکی ہے۔ اور پھر اس کا دل بہن کی محبت سے لبریز ہو گیا اور اُس کی بھوک کے خیال نے اس کے دل و دماغ میں ایک انتشار پیدا کر دیا، اور وہ بہن کے لئے روٹی حاصل کرنے کے خیال سے آگے چلدیا،

سامنے ایک انگریز سپاہی جا رہا تھا، اور اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا، لیکن انگریز سپاہی اسے منہ چڑاتا ہوا غرور سے آگے چلدیا، گویا غرور اور اکڑ کی آڑ میں کہہ رہا ہو کہ تم کالے آدمی واقعی بہت ذلیل ہو اور بھک منگے بھی اپنے باپ دادا کی حاصل کی ہوئی حکومت ہم تمھیں دینے کو تیار ہیں اور تم اتنی بڑی چیز لینے کے بعد بھی ہاتھ پھیلائے بغیر باز نہیں رہتے۔ اگر تمھیں دوسری چیز دیدی جائے تو تم تیسری کے لئے ہاتھ پھیلاؤ گے، ذلیل کہیں کے کالے آدمی، . . . . .

انگریز سپاہی آگے بڑھ گیا، اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا، اس کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا لیکن خالی . . . پھر وہ بھی انگریز کے پیچھے چلدیا۔ انگریز سپاہی ایک گلی میں مڑ گیا، جہاں بظاہر فاقوں کے بھیانک بھوت کا گذر نہیں تھا لیکن وہاں کے رہنے والوں میں سے اکثر اُس کی شبیہ دیکھ چکے تھے، اور اسی لئے بچ کر اس گلی میں چھپ گئے تھے، یہاں صرف اُن کے پاس ہی لوگ آسکتے تھے، جو فاقے کے معنی بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ بھی انگریز کے پیچھے اسی گلی میں داخل ہو گیا، طبلوں کی تھاپ، جھانجنوں کی جھنجناہٹ، اور گانے کی سریلی آوازیں، وہ بہت جلد سمجھ گیا کہ یہاں فاقوں کے بھیانک بھوت کا گذر نہیں۔ یہاں لیڈر بھی آسکتے ہیں۔ اور ملک کے چاہنے والے بھی، اور جہاں لیڈر اور ملک کے چاہنے والے جاتے ہوں، [illegible] ہوں وہاں اس بھوت کو جاتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان دس پندرہ دنوں میں اُس گلی کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی، کیونکہ فاقوں کے بھوت سے ڈرنے والوں میں سے اکثر جب انتہائی پریشان ہو چکے تھے، اور جب وہ عنقریب اُس بھوت کا شکار ہونے والے ہوتے تھے، تو اُس گلی میں پناہ کی خاطر پہنچ جاتے تھے، اُس کے دل میں بھی کوئی خیال آیا، چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا، اور وہ بہت تیزی سے اپنی کوٹھری کی طرف چلدیا، وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا، اور ایک ہی خیال اُس کے ذہن میں چکر کاٹ رہا تھا۔ گھر پہنچ کر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اُس نے [illegible] بہن کے کان میں کچھ کہا، بہن خاموشی سے رونے لگی، لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ مجھے سب سے انتقام لینا ہے اور [illegible] کے لئے ہر مقصد کی قربانی جائز ہے۔ اور جائز یا ناجائز کا لفظ غریبوں کے لئے تو بنا بھی نہیں ہے اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ بہن تو جوان ہے۔ اُسی رات سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں سے دور اس گلی کی آبادی میں ایک کا اضافہ ہو گیا جہاں ہر ایک دنیا کے غموں سے وقتی طور پر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے دن۔ اُس کا پیٹ بھرا ہوا تھا لیکن آزادی کے لئے [illegible] [illegible] ہاتھ [illegible] ملک کو چاہنے والے لوگ [illegible] لگا رہے تھے، سڑک پر پڑی ہوئی لاشیں [illegible] تھیں [illegible]

[illegible] تھا اور اُس کی [illegible] رہی تھی، لیکن وہ سب نگری سے سڑک پر پڑی ہوئی [illegible]

[illegible]

جائزے

ہم برلن سے بول رہے ہیں

اس بار

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

حبیب الرحمٰن

ہم برلن سے بول رہے ہیں!

زمانۂ جنگ میں مندرجہ عنوان جملہ کتنا کشش انگیز تھا ـــــ اس کی گونج اب تک کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ برلن ریڈیو کے حبیب الرحمٰن اب خود ہندستان آ گئے ہیں اور انھوں نے برلن کی نشریات کی جو کہانی سنائی ہے آج وہ نذرِ قارئین کی جا رہی ہے

ـــــ رشدی

جنگ سے قبل میں جرمنی میں متعدد ہندوستانی اخبارات کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور ایک بیرونی نامہ نگار ہونے کی وجہ سے میں نے یورپ میں مختلف بین الاقوامی معاملات کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس زمانہ میں کئی یورپی اور خاص طور پر سوئٹزرلینڈ کے اخبارات میں مستقل طور پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ صحافیانہ سرگرمی کم و بیش برطانیہ کے منظم اور پُرفریب پروپگنڈہ کا جوابی عمل تھا۔ بہرکیف یورپی عوام کے روبرو ہندستان کی خود مختاری کے مسئلہ کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ برطانوی پروپگنڈہ کا زہر یورپی ذہنیت میں بُری طرح سرایت کر گیا تھا۔ برِاعظم کے لوگوں کے سامنے ہندستان کی پھوٹ اور نااتفاقی کا مبالغہ آمیز ثبوت موجود تھا۔ حتیٰ کہ بے لوث اور سیاسی لحاظ سے ترقی یافتہ جرمنی بھی بارہا ہندستانی امنگوں کے خلاف برطانوی پروپگنڈہ پر اعتبار کرنے کا مرتکب ہو جاتا تھا۔ حالات کی اس پیچیدگی کا انکشاف ۱۹۳۶ء کے اولمپک گیمس کے دوران میں برلن کے مشہور اخبار "ڈوسے الماینے تزائٹونگ" کے ایڈیٹر ہرسلیکس کی گفتگو سے ہوا۔ اس نے مجھے اپنی یہ رائے بتائی کہ ہندستان کسی حملہ آور بحری بیڑہ کی طاقتور یورش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہندستان کے پاس نہ تو بحری بیڑہ ہے۔ نہ ساحلی استحکامات ہیں اور نہ جدید طرز کے بندرگاہی دفاعات ہیں۔ صرف برطانوی ہی اپنے بحری بیڑہ سے اپنی مشرقی سلطنت کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ اس الزام کا میں نے یہ جواب دیا کہ میرے ملک کا ہر دیانتدار شہری برطانیہ کے اس دعوے کو قبول نہیں کر سکتا ہے کہ وہ ہندستان کا محافظ ہے۔ دیدہ و دانستہ برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ وہ ہندستان کو غیر مسلح رکھ کر اسے دوسروں کا دست نگر بنا دے اور بحری استحکامات اور دفاعات کو کوئی اہمیت نہ دے۔ اس لئے برطانوی حکام نے فوج کے بڑے بڑے عہدوں سے ہندستانیوں کو محروم رکھا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ برطانیہ یورپ کی چھوٹی حکومتوں ـ چیکوسلاواکیا اور پولینڈ کا واقعی "محافظ" ہے۔ جبکہ چالیس کروڑ ہندستانیوں کو اس نے آزادی سے محروم کر رکھا ہے اور ان کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ میں اپنے مضامین میں بار بار ان برطانوی تصورات کی تردید کرتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت برطانیہ نے اگست ۱۹۳۹ء میں میرے خلاف اپنی کارروائی شروع کر دی اور میرے مضامین کی اشاعت پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایک ماہ بعد یورپ پر جنگ کے بادل چھا گئے، تاریکیاں بڑھتی گئیں اور تمام کرۂ ارض لپیٹ میں آ گیا۔ جرمنی میں ہم ہندستانی باشندوں کے لئے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اب ہندستان سے اپنے روابط کس طرح قائم و مستحکم رکھیں ـــــ

جب جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں اس وقت ولہلمشٹراس میں عام طور پر یقین کیا جا رہا تھا کہ انگلستان اس مرتبہ جرمنی کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول نہیں لیگا۔ کیونکہ وہ تیار نہیں تھا۔ جرمنی کی قیادت [illegible] کہ پولینڈ کے ساتھ انگلستان نے جو معاہدات کئے ہیں ان کے متعلق اس کا ٹھیک اندازہ کیا ہے۔ لیکن انگلستان نے



طرزِ عمل نے اس کو یقینی بنا دیا۔ اب ہندستان سے ہمارے تعلقات منقطع ہو گئے اور ہم عارضی طور پر خلا میں معلق رہ گئے۔ پولینڈ میں جنگ شروع ہونے کے بعد حیرت انگیز طور پر بہت ہی کم وقت میں میں نے وزیر نشریات ڈاکٹر جوزف گوئبلز کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ برلن کو ہندستان کے لئے ہندستانی زبان میں ایک نئی ریڈیو سروس جاری کر دینا چاہئے۔ اس وقت ہندستان میں سننے والوں کے لئے شارٹ ویو کی سہولتیں باقاعدہ طور پر مہیا نہیں کی گئی تھیں۔

تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد میں نے پولش مسئلہ کے متعلق ہٹلر کے ۱۶ نکات کا خلاصہ منتخب کیا جس کے خاص خاص پہلو یہ تھے کہ ڈینزگ جرمنی کو واپس کر دیا جائے۔ گڈینیا پولش ہی رہے اور بین الاقوامی نگرانی میں استصواب عامہ کے ذریعہ پولش کاریڈور کا فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ہندستان کے سننے والوں کے لئے اس کا ہندستانی ترجمہ براڈکاسٹ کیا۔ جرمنی میں ریڈیائی پروپگنڈہ کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا — کیونکہ پہلی مرتبہ ہندستان کے لئے برلن سے ہندستانی میں براڈکاسٹ کیا گیا اور انتہا یہ کہ اس کا نہ تو پہلے کوئی اعلان کیا گیا تھا اور نہ انتظام تھا۔

شاندار خیر مقدم

دوسرے دن میں نے پھر ہندستان کو یہی براڈکاسٹ کیا اور ممکنہ ردعمل کی اطلاعات کا نہایت اضطراب کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے براہ راست فرانس سے

[illegible] ہم برلن سے بول رہے ہیں

[illegible] ہندستانی خبریں بہت ہی [illegible] ہندستانی [illegible] خبریں براڈکاسٹ کی جاتی تھیں۔

میں نے ہندستانی زبان میں نشریات کا اس لئے فیصلہ کیا کہ یہی زبان ہے جو [illegible] صاف طور پر میرا مقصد تھا کہ ۔ [illegible] میری [illegible] یہ چاہا تھا کہ ہندستانی زبان [illegible] مستقل [illegible] اس کی عالمگیر حیثیت نمایاں ہوئی۔ یورپ میں اردو نشریات کی پہل کا فخر برلن ہی کو حاصل ہے۔ [illegible] لندن۔ ماسکو اور انقرہ نے بھی اردو میں نشریات کا آغاز کر دیا۔

میں اپنی پوری معلومات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق وسطیٰ کے لوگ برلن ریڈیو کی نشریات میں گہری دلچسپی لیتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے جنگ سے قبل برلن سے مستقل طور پر عربی نشریات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جرمن شارٹ ویو اسٹیشنوں کی طاقت اور تیزی سے برطانوی ڈھنڈورچی آگ بگولہ ہو گئے اور ان کی بہت سی شاطرانہ سکیمیں خاک میں مل گئیں ہر حال ہمیں تکنیکی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا کیونکہ ریڈیائی نشریات پر موسم کا بہت اثر پڑتا ہے، علاوہ ازیں شارٹ ویو [illegible] کا کام ہوتا تھا کہ مزید گنجائش نکالنا مشکل تھا، پھر بھی ہم نے تین نہایت صاف اور طاقتور ویولینتھ حاصل کر لی تھیں ہم نے موسمی حالات کی مناسبت سے ویولینتھ بدل بدل کر تجربے بھی کرلئے تھے۔ براڈکاسٹ کا نہایت اچھا وقت مقرر کیا گیا تھا کہ ہندستان میں ہمارے بھائی رات کے کھانے کے بعد اطمینان کے ساتھ خبریں سن سکتے تھے۔ ان تکنیکی مشکلات کے علاوہ پروپگنڈہ وزارت کے جھگڑے گروپس میں کشمکش پیدا ہو جانے سے حالت بہت نازک ہو گئی۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ مشرق اور ہندستان کے متعلق اس جدید ریڈیائی شعبہ پر اپنا کنٹرول رکھے، لیکن ان تمام موانعات پر قابو پانے کے بعد ہم نے ستمبر ۱۹۳۹ء کے آخری ہفتے سے، ہندستان کے لئے براڈکاسٹ کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا۔

میں نے ڈاکٹر گوئبلز اور ڈیلیوناتھ سے اپنی جداگانہ اور طویل ملاقاتوں میں اس پر زور دیا کہ ہندستان کی جنگ آزادی میں جرمنی کی دلچسپی کا ان نشریات میں خاص طور پر ذکر ہونا چاہئے، جبتک ہندستان برطانوی سلطنت سے منسلک ہے وہ برطانوی حاکموں کے مفادات کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہوتا رہیگا۔ لیکن جب مکمل آزادی حاصل کریگا اس وقت وہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیگا۔ پروپگنڈہ وزارت سے طے کر لیا گیا تھا کہ ہم ریڈیائی نشریات میں ہندستانی لیڈروں پر نکتہ چینی نہیں کریں گے خواہ وہ ہٹلر کی حکومت اور ریش کے خلاف عام بیانات ہی کیوں نہ دیں۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ ہندستان کے متعلق جو بھی تقاریر نشر کی جائیں وہ پہلے ہمیں بتائی جایا کریں اور آخر کار ہم نے ہندستانی معاملات پر اپنے ذاتی ریڈیائی تبصرے نشر کرنے کا حق حاصل کر لیا۔

اس مقصد کے لئے میں نے ایک "ریڈکشن" (ایڈیٹوریل ہیڈ) تشکیل دیا جس کے ڈاکٹر [illegible] اور مسٹر [illegible] عابد حسن اراکین تھے ——— آپ تعجب تو ضرور کرتے ہونگے کہ جنگ کے زمانہ میں ہم ہندستان کی خبریں کیسے معلوم کر لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے خصوصی انتظامات کر رکھے تھے جن کے ذریعہ ہمیں ہندستان کی صحیح خبریں ملا کرتی تھیں اس کی تفصیلات آگے چل کر بیان کروں گا۔

سخت کنٹرول اور دوہرے احتساب کے باوجود اکثر کوئی غلط خبر نشر ہو جاتی تھی۔ ایسا شاذ ہی ہوتا تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا: ایک بار ہمیں یہ خبر ملی کہ راجہ آف [illegible] نے ہندستان میں برطانوی حکومت کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے، جہاں تک مجھے معلوم تھا ہندستان میں کوئی راجہ آف [illegible] نہیں تھا [illegible] ریاست تھی، اس تحقیق کے باوجود میں اس خبر کو نشریات میں شامل [illegible] چاہتا تھا جب [illegible]

[illegible] نے تمام خبروں کو [illegible]

ہم نے [illegible] کی نشریات پر خاص طور سے توجہ دی [illegible]

[illegible] نے اس [illegible] کی اشارہ نہیں کیا [illegible]

[illegible]

[illegible] پوچھا تھا تو میری جان [illegible]

موت و حیات کی جنگ لڑ رہی ہو [illegible]

[illegible] جنگ کے [illegible] کی خبر [illegible] کام کرنا بالکل [illegible] مشکل ہے

کئی سیاسی وجوہ کی بنا پر جرمن حکومت کے [illegible] سے سبھاش بوس نے [illegible] رکھا جائے۔ اس "جبر و سکوت" کے دوران میں ہم نے ہندوستانی سننے والوں کی [illegible] کی ہندوستانی [illegible] نہیں [illegible] کیا گیا۔ سننے والوں پر یہ اثر ڈالنے کے لئے کہ نیتا جی یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے سے بول [illegible] کے ساتھ صوتی اثرات کے ریکارڈ کو شامل کر دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بہت تیز ہوا چل رہی ہے [illegible] اور فضا [illegible] کی وجہ سے صاف نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے اعلان کیا کہ ہمارے [illegible] آواز سنائی دی ہے جسے ہم فضائی [illegible] کے باوجود اس کی اہمیت کے پیش نظر [illegible] جس کے ذریعہ ہم ہندوستانیوں کو بوس کی آواز سنایا کرتے تھے۔

برطانوی [illegible] نے اس عرصہ میں نیتا جی کے مرنے کی خبر پھیلائی۔ [illegible] رکھا گیا۔ جب دشمن نے یہ غلط خبریں پھیلائیں تو نیتا جی [illegible] کر [illegible] موسم خزاں میں [illegible] اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا [illegible]

[illegible]

آئندہ [illegible]

[illegible] جب ہم نے [illegible]

[illegible] شروع کر دیا۔ [illegible]

انتشار!

۱۹۴۳ء میں [illegible] مشرقی ایشیا میں [illegible] مستقل [illegible] قائم کرنے کے لئے [illegible]

[illegible] بیماری کی [illegible]

[illegible] خوفناک [illegible] بیماری [illegible]

[illegible] وقت [illegible] سنبھال لیتا [illegible]

[illegible] ہم نے [illegible]

[illegible] جب بیماری [illegible] برداشت [illegible]

[illegible] آئندہ [illegible] کام کے لئے [illegible]

[illegible] منتقل [illegible] کے [illegible]

[illegible] تیرہ سو [illegible] کے [illegible] انگریز [illegible] سے [illegible]

[illegible] کی تعداد [illegible] کے ساتھ [illegible] آتے [illegible]

[illegible] ہندو مرکز [illegible] نے جرمنی [illegible] کے مقام پر منتقل [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] نے [illegible] جرمن [illegible] سفر کرتا تھا [illegible]

[illegible] پر کام کرنے والی برطانوی خفیہ پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ برلن [illegible] میں

[illegible] کے مقام پر منتقل کر دیا گیا، جہاں اس نے بالکل دم توڑ دیا۔ [illegible] احمد بیگ [illegible] نے [illegible]

[illegible] ہندوستانی [illegible] نے ــــ گرفتار کر لیا۔ ان کو گرفتار کرنے والے [illegible] سے بڑی خوشی ہوئی کہ [illegible] گیا۔

[illegible] جنگ [illegible] پہنچ گئی۔ بہرکیف وہ اس [illegible] یہ بھول گئے کہ برطانوی [illegible] ہو گیا۔

[illegible] ایک خطرناک لمحات کی یاد سے [illegible] جن ہندوستانیوں نے کروڑوں ہندوستانیوں کے [illegible] کے تمام

[illegible] شکست [illegible] ناراض، بیماری، [illegible] ــــ کے درمیان برلن کی آواز کو زندہ رکھا انہیں [illegible]

[illegible] جلا کر [illegible] اور اکثر وحشیانہ برتاؤ کیا گیا، میں اپنے کو قابل فخر سمجھوں گا اگر اس کا اعتراف کر لیا جائے کہ ہم نے

[illegible] رکھا، جیلیں، قید و بند، بھوک پیاس اور اذیت کا یہ دور اس وقت ختم ہوا جب ہندوستان

[illegible] میں اپنے محبوب وطن میں پھر واپس آنے کی جد و جہد کی ــــ ایک بار میں نے برلن سے [illegible]

[illegible] کی خدمت میں اپنے قلم و زبان سے ــــ اور اگر ضرورت ہوئی تو اپنے خون سے، وطن کی خدمت کروں گا!۔

بقیہ صفحہ ۴

[illegible] بن سکتی ہیں۔ مگر [illegible] کسی کے لئے جنت نہیں بن سکتیں وہ روح کی غذا بن سکتی ہیں مگر جسم کا نہیں [illegible] کس قسم کے [illegible] اشیاء [illegible] ہیں! [illegible] [illegible] اور کیا [illegible] ان کو [illegible] تسکین مل سکتی ہے!

[illegible] صاحب کا [illegible] کے پیار سے پیارے افسانے [illegible] اور اس [illegible] کے لوگ ان افسانوں کی نزاکت، ہر گیری اور حسن خیال سے [illegible] ہیں۔ [illegible] تذکرہ [illegible] ان افسانوں کی قدر و قیمت [illegible] [illegible]

[illegible] افسانہ کا آخری حصہ اور اس کا اختتام [illegible] افسانہ [illegible] ختم ہو جاتی ہے۔ انور صاحب نے شاید بہت [illegible] میرے خیال میں انور صاحب [illegible]

[illegible]

اس بار

ایک خط

جھانسی

۴۷-۷-۲۰

مکرمی ! تسلیم

کل ساگر سے جھانسی لوٹ رہا تھا۔ بک سٹال پر [illegible] تازہ پرچہ ملا۔ میں نے [illegible] نہیں دیکھا تھا۔ دہلی کے اسٹال پر جو اردو رسالے ملتے ہیں ان میں سے [illegible] ایسے محض منو کے چند گھٹیا افسانوں [illegible] شائع ہوتے ہیں [illegible] سے خرید لیا۔ [illegible] رسالے بھی پیش ہوتے ہیں، اور انہیں رسالوں کے ڈھیر میں [illegible] اور [illegible] ... اور دیکھتے رہ گئے !

[illegible] سے متعلق جو [illegible] ہے، ایسے میں [illegible] کو [illegible] کی تمام [illegible] ماشاء اللہ [illegible] اور ایسے خیالات کا [illegible] زبان پر [illegible] آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے [illegible] ترقی پسند ادب کے لئے [illegible] ہے [illegible]

[illegible] قوم کی سیاسی [illegible] کی [illegible] آواز [illegible] رہی ہے۔ اور [illegible] کی تقلید میں تمام [illegible] ہندوستان اور پاکستان [illegible] اردو کی [illegible] پاکستان [illegible] اردو [illegible] قوم و ملت کو نقصان پہنچا رہے تھے [illegible] ادیبوں کو [illegible] دیتا ہوں کہ وہ اردو کے دائرے کو وسیع کر کے دکھائیں اور اپنے خیالات [illegible] ہندوستان [illegible] ہندوستان سے باہر [illegible] ہم پاکستان ! [illegible] اردو [illegible] والوں کے [illegible] پاکستان ! [illegible]

[illegible] ہائے پیارے اسے پیارے !

یہ [illegible] کے تحت [illegible] کے مشہور ادیبوں کو مختصر الفاظ میں روشناس کراتے ہیں [illegible] اردو کے [illegible] ادیبوں کی تصویریں بھی شائع کرتا ہے۔

[illegible] اس سلسلے میں [illegible] کام لیا گیا ہے اس حد تک [illegible] آغاز [illegible] نظم نہایت خوب ہے اور اس کا انتخاب [illegible] قابلیت اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے [illegible] بہتر ہیں [illegible] کی لطافت ہے [illegible] ہے۔ اور [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] اردو شاعری [illegible] شاعری [illegible] ہے [illegible] آبادی صاحب [illegible] شاعری [illegible] نہیں [illegible] اقبال [illegible] شاعری [illegible]

[illegible] ہو [illegible] !

[illegible]

[illegible] ہیں ۔

[illegible] افسانوں [illegible]

[illegible] نیلے [illegible] کو [illegible]

[illegible] خواب [illegible] خیال [illegible] صاحب کا یہ افسانہ شروع [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] احساس [illegible]

[illegible] ایسے گھروں [illegible] میں [illegible] ہے ۔

[illegible]

[illegible]

طبی دواخانہ یونانی کی مشہور [illegible] دوا !!



شاہی (رجسٹرڈ)

دل و دماغ اور پھیپھڑوں کو قوت دیتی، ہاضمہ کو درست کرکے بدن میں خون صالح پیدا کرتی ہے کھانسی کی دافع ہے سل و دق کے ابتدائی درجہ میں نہایت مجرب [illegible] عورتوں کے امراض مخصوص دلیکوریا و ہسٹیریا، کیلئے اکسیر، ایام حمل میں اسکے استعمال سے کبھی اسقاط کی شکایت نہیں ہوتی اور بچہ [illegible] میں نہایت تندرست و توانا پیدا ہوتا ہے۔ ہر موسم میں بے خطر استعمال ہو سکتی ہے۔

(قیمت چھوٹی شیشی (۱۲ خوراک) دو روپیہ آٹھ آنہ)

بڑی شیشی (۳۶ خوراک) سات روپیہ چار آنے

طبی دواخانہ یونانی اندور (رجسٹرڈ)

چوک بازار اندور، مہاتما گاندھی روڈ اندور، ۷۷ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳ چوک بازار [illegible]

ایجنٹ

ملا اسغار حسین حسن علی، نزد ڈاکخانہ [illegible]

تار کا پتہ — شاہی اندور۔

آزادی کے بعد!

نادرہ الائیڈ انجینیرز (رجسٹرڈ) اختر منزل بھوپال نے

پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ ماہ ستمبر ۴۷ء سے بازار ابراہیم پورہ میں ایک نئی شاخ قائم کی جارہی ہے جہاں آپکی ضروریات کی حسب ذیل اشیاء ہر وقت ملیں گی:-



ادویہ انگریزی، دیسی و ہر قسم،

ٹائیلیٹ، سینٹ، لیونڈرس

اسٹیشنری ہر قسم، موزے بنیائن

تولیہ وغیرہ ریڈی میڈ کلاتھ، سامان بجلی،

سامان کھیل وغیرہ،

ہمیں امید ہے کہ باشندگان بھوپال حسب سابق ہماری اس شاخ کی بھی سرپرستی فرمائینگے!

المشتہر

منظور حسن بی اے جنرل منیجر

نادرہ الائیڈ انجینیرز (رجسٹرڈ) اختر منزل بھوپال



اعلان مسرّت!

ریاست بھوپال میں عرصہ دراز سے ایک کتب و اسٹیشنری ڈپو کے وسیع
پیمانہ پر قیام کی شدید ضرورت تھی جنگ اور جنگ کے مابعد اثرات نے ہمیں اس کی کوشش کا کبھی
موقع نہیں دیا لیکن آج ہم یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے [illegible]
لاکر "اسٹوڈینٹس کمرشیل ہاؤس" قائم کر دیا ہے۔ جس کا صدر دفتر اختر منزل
بھوپال میں ہے۔ ہمیں اپنے عزیز وطنی بھائیوں اور بہنوں سے امید ہے کہ
وہ "اسٹوڈینٹس کمرشیل ہاؤس" کی سرپرستی اپنا وطنی فرض
سمجھینگے۔

"اسٹوڈینٹس کمرشیل ہاؤس" میں حسب ذیل اشیاء آپ کو
[illegible]ت مل سکتی ہیں۔

مختلف ہر قسم کورس کی کتابیں، جملہ اسٹیشنری، قلم، دوات، پنسلیں، فاؤنٹین پین، نب، [illegible]
[illegible] ہر قسم [illegible] اسپورٹس کا جملہ سامان۔

[illegible] اصول ہے۔

[illegible] اختر منزل بھوپال

بچو! یاد رکھو!!!

حکیم پیر پرشاد آگرہ وال علی گڑھ کی اصلی گھٹی رجسٹرڈ

بال جیون گھٹی بچوں کی ہر ایک بیماری کو دور کرتی، کمزور بچوں کو تندرست و طاقتور بناتی ہے

ماں کی دودھ پلانے سے بچے کبھی ہرگز بیمار نہیں ہونگے

سب جگہ فروخت ہوتی ہے۔ نقلی گھٹی سے بچیں۔ قیمت فی شیشی ۵ روپے

مینیجر بال جیون کاریالیہ علی گڈھ (یو۔ پی)

کلکتہ کے سول ایجنٹ

میسرز کلکتہ نیوز ایجنسی

ستمبر ۱۹۴۷ء کے چند حسن کار!

شبینہ ملک	محمود غزالی	اشفاق احمد
عظیم	ظہور نظر	محمد علی تاج
شگفتہ سوزی	آصف طرب	منظر سلیم
اختر ہوشیارپوری	کنول پرشاد کنول	اشتیاق ...
سراج لکھنوی	نشاط شاہدی	... ندیم

ذاہد فتحپوری اور دوسرے

مستقل عنوانات

اشارے	مدوجزر	فن کار
چٹکیاں	آبشار	جائزے

گلستان وغیرہ

آرام ۔۔۔۔۔ مکمل سکون!



گرائپ واٹر

بچوں کی شکمی بیماری کیلئے

ووڈورڈ اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ